مقالاتِ حالی

مصنف:
مولانا الطاف حسین حالی

تحقیق، ترتیب و تدوین
ڈاکٹر سید تقی عابدی

ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز، نئی دہلی

مقالاتِ حالی
مصنف مولانا الطاف حسین حالی
ڈاکٹر سید تقی عابدی

مقالاتِ حالی

الطاف حسین حالی

تحقیق، ترتیب وتدوین

سید تقی عابدی

ایم۔آر۔پبلی کیشنز، نئی دہلی

کتاب : مقالاتِ حالی
تصنیف : الطاف حسین حالی
مولف : ڈاکٹر سید تقی عابدی
مطبع : ایچ ایس آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی۔
پیش کش : عبدالصمد دہلوی
ناشر : ایم۔آر۔پبلی کیشنز
10 میٹروپول مارکیٹ، 25-2724 کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی

Maqalaat e Hali
by: **Altaf Husain Hali**
Compiled by: **Dr. Syed Taqi Abidi**
Email: ttaqiabedi@gmail.com

ISBN: 978-93-90568-61-1
First Edition :2023
Price: ` 700/-
Library Edition: ` 895/-

Printed & Published by
M. R. Publications
Printers, Publishers, Book Sellers & Distributors of Literary Books
10 Metropole Market, 2724-25 First Floor
Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002
Cell: 09810784549, 09873156910, 8368305471 (Whatsapp)
E-mail: abdus26@hotmail.com

انتساب

مولانا حالی کی نشانی، شاہکار انگریزی کتاب مسدّسِ حالی کی مصنفہ

ڈاکٹر سیّدہ سیدین حمید

کے نام

جن کی محبت اور امن کا پیغام مولانا حالی کے پیغام کا نقیب ہے

فہرست

مضامین

تقاریر

تقاریظ

رو میں ہے رخشِ عمر

نام	:	سیّد تقی حسن عابدی
ادبی نام	:	تقی عابدی
تخلص	:	تقؔی
والد کا نام	:	سیّد سبط نبی عابدی (مرحوم)
والدہ کا نام	:	سنجیدہ بیگم (مرحومہ)
تاریخ پیدائش	:	یکم مارچ 1952ء
مقام پیدائش	:	دہلی [انڈیا]
تعلیم	:	ایم بی بی ایس (حیدرآباد، انڈیا)___ایم ایس (برطانیہ)
	:	ایف سی اے پی (امریکہ)______ایف آر سی پی (کینیڈا)
پیشہ	:	طبابت
ذوق	:	شاعری، ادبی تحقیق و تنقید
شریکِ حیات	:	گیتی
اولاد	:	دو بیٹیاں (معصوما اور رویا)
		دو بیٹے (رضا و مرتضیٰ)

تصانیف : (72) شہید (1982)، جوشِ مودّت، گلشنِ رویا، اقبالؔ کے عرفانی زاویے، انشاء اللہ خاں انشاؔء رموزِ شاعری، اظہارِ حق، مجتہدِ نظم مرزا دبیرؔ، طالع مہر، سلکِ سلام دبیرؔ، تجزیہ یادگارِ انیسؔ، ابواب المصائب، ذکر دُرباران، عروسِ سخن، مصحف فارسی دبیرؔ، مثنویاتِ دبیرؔ، کائناتِ نجمؔ، روپ کنوار کماری، دُر بارِؐ رسالت فکرِ مطمئنہ، خوشۂ انجم، دُرِ دریائے نجف، تاثیر ماتم، نجمی مایا، روشِ انقلاب، مصحفِ تغزل، ھوالنجم، تعشقؔ لکھنوی، ادبی معجزہ، غالبؔ دیوان نعت ومنقبت، چوں مرگ آید، رباعیاتِ دبیرؔ، سبدِ سخن، دیوانِ غالبؔ فارسی، فیضؔ فہمی، مطالعہ دبیرؔ کی روایت، اُردو کی دو شاہکار نظمیں، رباعیاتِ رشیدؔ لکھنوی، رباعیاتِ انیسؔ، فیضؔ شناسی، حالؔی فہمی، مسدس حالؔی، کلیاتِ حالؔی بچوں کے حالؔی، کلام وسلام انیسؔ، کلیاتِ سعید شہیدؔی، تروینی، باقیات ونادرات فیضؔ احمد فیض، برج شرف، منشی بال مکند بے صبرؔ، مطالعۂ رباعیات فراقؔ گورکھپوری، حالؔی کی نظمیں، حالؔی کی نعتیہ شاعری، حالؔی کی غزلیں اور قطعات، گلستان ہند، تعمیر بقا، نیرنگِ سرحدی: شخصیت اور فن، سید تقی عابدی کے مقالات کا بن، موالات حالی۔

زیرِ تصنیف : حالؔی کے قصیدے اور حالؔی کے شخصی مرثیے، تجزیۂ شکوہ جوابِ شکوہ فانؔی لافانؔی، اقبالؔ کے چار مصرے، رباعیات بیدلؔ، رباعیاتِ صادقین، دیوانِ فارسی حالؔی، فراقؔ فہمی، دیوان کامل فراقؔ گورکھپوری۔

حالی کی حیات اور شخصیت

نام:

خواجہ الطاف حسین

تخلص:

حالؔی۔(بعض افراد نے لکھا کہ آغاز شاعری میں حالؔی خستہ تخلص کرتے تھے جو صحیح نہیں)

تاریخ ولادت:

بقول حالؔی ''میری ولادت تقریباً 1253ھ مطابق 1837ء میں ہوئی۔'' (1253ہجری سال اپریل 1837ء سے شروع ہوتا ہے۔ چناں چہ حالؔی اپریل اور دسمبر 1837ء کے درمیان پیدا ہوئے)۔

نوٹ:...... تذکرۂ حالی میں شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے حالؔی کی تاریخ ولادت 1253ھ مطابق 1836ء لکھی ہے جو صحیح نہیں۔

مقام ولادت:

پانی پت ضلع کرنال۔

والد:

خواجہ ایزد بخش متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ انگریز سرکار کے پرمٹ ڈپارٹمنٹ میں ملازم تھے۔ چالیس سال کی عمر میں انتقال کر گئے اس وقت حالؔی صرف نو سال کے تھے۔

والدہ:

حالؔی بچپن ہی سے والدہ کی توجہ تربیت اور محبت سے محروم رہے حالؔی کی ولادت کے فوری بعد ان کی والدہ کا دماغی توازن بگڑ چکا تھا چناں چہ ان کی تربیت اور پرورش ان کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے کی۔

دادا:

خواجہ بوعلی بخش۔

پردادا:

خواجہ محمد بخش۔

جد:

خواجہ ملک علی جو ہرات کے بادشاہ میرک علی کے بیٹے تھے اور غیاث الدین بلبن کے دور حکومت میں ہندوستان آئے۔ بلبن نے ان کے علم وفضل وکمال سے متاثر ہوکر کرنال کے قصبہ پانی پت میں جاگیر عطا کی اور یہ خاندان 1276 ہجری سے پانی پت میں مقیم ہوگیا۔

خاندان:

حالؔی کا شجرہ دادھیال سے بیالیسویں پشت میں حضرت ابوایوب انصاری سے ملتا ہے اور نانھیال سے چھتیسویں پشت میں حضور اکرمa سے جاملتا ہے اِسی بناپر صالحہ عابد حسین نے لکھا کہ حالی کی ماں سیدانی تھی۔ حالؔی لکھتے ہیں میری والدہ سادات کے ایک معزز گھرانے کی جو یہاں سادات شہداپور کے نام سے مشہور ہیں؛ بیٹی تھیں۔

بھائی بہن:

حالؔی کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین اور دو بڑی بہنیں امتہ الحسین اور وجیہہ النساء تھیں۔ چونکہ حالی سب سے چھوٹے تھے اوران کی ماں ذہنی توازن کھو چکی تھیں اس لیے بڑے بھائی اور دونوں بڑی بہنوں نے حالی کی تربیت اور دیکھ بھال اپنے ذمہ لے لی۔ بقول حالؔی: ’’میری ولادت کے بعد میری والدہ کا دماغ مختل ہوگیا تھا۔ میرے والد نے انتقال کیا جب کہ میں نو برس کا تھا۔‘‘

تعلیم:

(ا) بقول حالؔی: ’’میں نے ہوش سنبھال کر اپنا سرپرست بھائی بہنوں کے سوا کسی کو نہیں پایا۔ انہوں نے مجھ کو قرآن حفظ کرایا۔‘‘

صالحہ عابد حسین ’’یادگار حالی‘‘ میں لکھتی ہیں۔ ’’پرانے زمانے کے دستور کے موافق ساڑھے چار سال کی عمر میں الطاف حسین کی بسم اللہ ہوئی۔ الطاف حسین کو پانی پت کے ایک جید قاری حافظ ممتاز حسین کے پاس قرآن شریف کی تعلیم کے لیے بٹھایا گیا۔ اُن کو پڑھنے کا بچپن سے بے حد شوق تھا اور حافظہ غیر معمولی طور پر اچھا تھا چناں چہ انہوں نے جلد ہی قرآن شریف حفظ

کرلیا۔ وہ بچپن سے قرآن شریف اس قدر خوش الحانی اور صحت کے ساتھ پڑھتے کہ بڑے بڑے قاری اور عالم تعریف کرتے تھے۔

(ب) سید جعفر علی سے جو ممنون دہلوی کے بھتیجے اور داماد بھی تھے حآلی نے دو چار فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور ان کی صحبت میں فارسی لٹریچر سے دلچسپی ہوگئی۔ یہ انہی کی صحبت کا اثر تھا کہ حآلی کے مزاج میں جو فطری شاعری کی اپج تھی اُسے ابھرنے کا موقع بھی ملا۔

(ج) حاجی ابراہیم حسین انصاری سے عربی صرف ونحو پڑھی جو لکھنو سے تحصیل علم کے بعد پانی پت میں مقیم تھے۔

(د) دلی پہنچ کر جامع مسجد کے قریب حسین بخش کے مدرسہ میں داخلہ لیا اور مولوی نوازش علی سے کچھ کتابیں صرف ونحو اور منطق کی پڑھیں۔

دلی ہی میں شرح مسلم، ملا حسن اور میبذی پڑھنا شروع کیا۔

(ھ) دلی میں ڈیڑھ سال رہ کر پانی پت واپس ہوئے اور مولوی عبدالرحمان، مولوی محبّ اللہ اور مولوی قلندر علی سے بغیر کسی خاص ترتیب اور نظام کے منطق، فلسفہ کبھی حدیث اور تفسیر پڑھتے رہے۔ حالی لکھتے ہیں: ''بھائی بہن نے جن کو میں بمنزلہ والدین کے سمجھتا تھا تاہل پر مجبور کیا۔ اس وقت میری عمر (17) برس کی تھی۔ یہ جوا میرے کندھے پر رکھا گیا اب بظاہر تعلیم کے دروازے چاروں طرف سے مسدود ہو گئے۔ سب کی یہ خواہش تھی کہ میں نوکری تلاش کروں۔ مگر تعلیم کا شوق غالب تھا اور بیوی کا میکا آسودہ حال تھا۔ میں گھر والوں سے روپوش ہو کر دلی چلا گیا اور قریب ڈیڑھ برس وہاں رہ کر عزیزوں اور بزرگوں کے جبر سے چار ناچار مجھ کو دلی چھوڑنا اور پانی پت واپس آنا پڑا۔ دلی سے آ کر برس ڈیڑھ تک پانی پت سے کہیں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہاں بطور خود اکثر بے پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا۔ 1856ء میں مجھے ضلع حصار میں ایک قلیل تنخواہ کی آسامی صاحب کلکٹر کے دفتر میں مل گئی۔ لیکن 1858ء میں جب کہ سپاہ باغی کا فتنہ ہندوستان میں برپا ہوا تو میں پانی پت واپس چلا آیا اور قریب چار برس کے بے کاری کی حالت میں گزرے۔ یہاں علم ادب کی کتابیں شروح اور لغات کی مدد سے اکثر دیکھتا تھا اور کبھی کبھی عربی نظم ونثر بھی بغیر کسی کی اصلاح یا

مشورے کے لکھتا تھا۔ مگر اس پر اطمینان نہ ہوتا تھا۔

دلی کالج سے بےزاری:

جس وقت حالی دلّی گئے اس وقت قدیم دہلی کالج خوب رونق پر تھا لیکن اس ڈیڑھ سال کی مدت میں حالی نے کالج کو جا کر آنکھ سے دیکھا تک نہیں اور نہ کالج کے طلبا سے ملاقات کی جن میں محمد حسین آزاد، ماسٹر رام چندر، ماسٹر پیارے لال ڈپٹی نظیر احمد اور ذکاء اللہ وغیرہ جیسے طالب علم موجود تھے جس کی وجہ سے حالی کا پانی پت کا ماحول اور ان کی محدود سوسائٹی تھی جہاں تعلیم کو صرف عربی اور فارسی زبان پر ہی منحصر سمجھا جاتا تھا۔ انگریزی تعلیم کو صرف سرکاری نوکری کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا اسی لیے یہ افراد انگریزی مدرسوں کو جاہلوں کے مدرسے یا مجہلے کہتے تھے۔

تلاش علم:

صالحہ عابد حسین کہتی ہیں: ''حالی کی شادی تو ہوگئی مگر علم کی پیاس کم نہیں ہوئی۔ بیوی خوش حال گھرانے کی تھیں۔ الطاف حسین نے اُس کو غنیمت جانا کہ ابھی بیوی کا باران کے اوپر نہیں۔ اس فرصت سے پورا فائدہ اٹھانے کے لیے انہوں نے فیصلہ کیا کہ دلّی جا کر جو اس اجڑی حالت میں علوم وفنون کا مرکز تھی؛ تحصیل علم کریں۔ دلّی اگرچہ پانی پت سے صرف پچپن میل ہی ہے۔ ریل اس وقت تک جاری نہیں ہوئی تھی۔ اونٹ گاڑی یا بیل گاڑی پر یا پیدل سفر کرنا ہوتا تھا۔ الطاف حسین جانتے تھے انہیں دلّی جانے کی اجازت نہ ملے گی۔ ایک دن جب ان کی بیوی میکے گئی ہوئی تھیں وہ بغیر کسی سے کچھ کہے سنے اور بغیر کسی سامان کے پا پیادہ دلّی کی طرف روانہ ہو گئے۔ شاید راستے میں اونٹ گاڑی اور بیل گاڑی میں کچھ مسافت طے کی ہو۔ علم کا یہ سچا شیدائی جب دلی پہنچا تو بالکل خالی ہاتھ تھا خدا ہی جانے یہ کٹھن زمانہ کس طرح کاٹا۔ کیسے گزر بسر کے قابل پیسہ کمایا۔ اُس زمانے کا مفصل حال کہیں دستیاب نہیں ہوتا۔''

راقم کی نظر میں سچ بات یہ بھی ہے کہ ہم صرف سکّے کے ایک رخ یعنی علم کی طلب اور اس کے حاصل کرنے کی قربانیوں کو دیکھ رہے ہیں لیکن سکّے کے دوسرے رخ پر ایک تازہ شادی شدہ دلہن کے احساسات جذبات اور دنیا بھر کے تشویش ناک خیالات کا ذمہ دار کس کو ٹھہرایا جائے؟ اس بات کا امکان ہوسکتا ہے کہ حالی اپنے اس عمل سے شرمندہ تھے جس کا نتیجہ ان کی تخلیقات میں

آ گے چل کر عورتوں کی کسمپرسی اور حقوق پر بیوہ کی مناجات اور چپ کی داد جیسی نظمیں اور ساری عمر اپنی بیوی کی تعریف اور توقیر رہی ہو۔

شریکِ حیات:

بقول حاؔلی: ''بھائی بہن نے جن کو میں بمنزلہ والدین کے سمجھتا تھا تاہّل پر مجبور کیا اس وقت میری عمر سترہ (17) برس کی تھی۔''

خواجہ امداد حسین نے ماموں کی بیٹی اسلام النساء سے شادی کر دی۔ صالحہ عابد حسین نے جو خود حاؔلی کے خاندان کی فرد ہیں خاندان کے بزرگوں کے بیانات اور خواجہ غلام السبطین مرحوم کی غیر مطبوعہ ڈائری کے حوالے سے حالی اور ان کی بیوی کے حالات یادگار حالی میں جمع کیے ہیں۔ ہم کچھ مستند واقعات کا ذکر اس لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ اس سے میاں بیوی کے تعلقات کے علاوہ دونوں کے حسن اخلاق پر روشنی پڑتی ہے اور انہی واقعات سے حاؔلی کے معاملات کی صفائی بھی ہو جاتی ہے کیوں کہ حالی حقوق نسواں کے حامی تھے اور یہ حمایت گھر سے شروع ہوتی ہے۔

بی اسلام النساء بڑی با سلیقہ، منظّم، ہمدرد، فیاض اور خدمت گزار خاتون تھیں۔ تقریباً نصف صدی کی مشترک زندگی میں حاؔلی کی اور اُن کی کبھی اَن بن نہیں ہوئی۔ انہوں نے کبھی اپنے شوہر کی علمی اور قومی زندگی کی مصروفیتوں میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کی۔ البتہ وہ بڑے تیز مزاج کی تھیں اور جب غصہ آتا تھا تو آپے سے باہر ہو جاتی تھیں لیکن پھر بڑی جلدی پشیمان بھی ہو جاتی تھیں۔ برخلاف اس کے حالی کا مزاج اتنا ہی نرم واقع ہوا تھا۔ اِس لیے کبھی لڑائی جھگڑے کی نوبت نہیں آتی تھی۔

واقعہ:

خواجہ غلام السبطین مرحوم نے اپنی (غیر مطبوعہ) ڈائری میں اسی قسم کا ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ ایک مرتبہ محرم کی نو تاریخ کو حاؔلی اپنے بیٹے خواجہ سجاد حسین اور اپنے سالے میر فیاض حسین کے ساتھ کہیں تانگے میں بیٹھ کر گئے۔ بیوی کو حاؔلی کی یہ بات سخت ناگوار گزری (واضح رہے کہ حاؔلی سنی تھے اور بیوی شیعہ اور اس خاندان میں انتہائی رواداری تھی اور اس قسم کی شادیاں بلا تامل ہوتی تھیں) اتفاق سے تانگا الٹ گیا۔ جب یہ لوگ واپس آئے تو سیدانی کا جلال انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ انہوں نے میاں، بیٹے اور بھائی کو دل کھول کر بُرا بھلا کہا کہ نبی a کے نواسے پر تو قیامت کا

وقت پڑ رہا ہے، اُن کے بچے بھوک پیاس سے تڑپ رہے ہیں اور تم سواریوں میں بیٹھے سیر کر رہے ہو۔ اچھا ہوا تانگا الٹ گیا وغیرہ وغیرہ۔ میر فیاض حسین اور خواجہ سجاد حسین کو یہ بات ناگوار گزری کہ مولانا کو ایسی سخت باتیں کہی جائیں لیکن فرشتہ منش حالؔی نے صرف اتنا کہا: ''سیدانی غصے میں ہے اور حق پر۔ غلطی ہماری ہی تھی کہ آج کے دن سواری پر بیٹھے، وہ جو کہتی ہیں بجا ہے۔''

خواجہ سجاد حسین کی بیوی، اُن کے ماموں کی بیٹی تھیں اور وہ بھی اپنی پھوپی اور باپ کی طرح تیز مزاج تھیں اور ساس بہو میں اکثر نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔ حالؔی اوپر کے کمرے میں بیٹھے لکھتے ہوتے اور یہ ساری باتیں سنتے مگر ایک لفظ نہ بولتے۔ بیوی کا بہت خیال کرتے تھے اور بہو کو بھی بہت چاہتے تھے، اکثر ان ہی جھگڑوں میں شام ہو جاتی تو وہ اپنا کام ختم کر کے اٹھتے اور کمرے کی کھڑکی کھول کر مسکراتے ہوئے شیریں لہجے میں جھک کر کہتے۔ ''بس بی بس......اب تو شام بھی ہوگئی۔ اب تو لڑائی تغاری (مٹی کا کونڈا جسے پانی پت میں تغاری کہتے تھے) کے نیچے دبا دو۔ اس وقت تو بھٹیاریاں بھی نہیں لڑتیں۔''

کہہ سکتے ہیں کہ اُن کی ازدواجی زندگی کامیاب تھی۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کرتے اور اپنے اپنے فرائض پوری ذمے داری سے ادا کرتے تھے۔ دونوں کی زندگی کے دھارے الگ الگ تھے لیکن کہیں نہ کہیں آ کر مل بھی جاتے تھے۔

بی اسلام النساء کبھی اپنے شوہر کے کسی کام میں رکاوٹ نہیں ڈالتی تھیں۔ وہ جہاں چاہیں رہیں جو چاہیں کریں وہ دخل نہ دیتی تھیں اور گھر کی ساری فکریں اور پریشانیاں، ساری ذمہ داریاں بھی، جس حد تک پرانے زمانے کی کوئی عورت اٹھا سکتی تھی، نہایت خوش اسلوبی سے اٹھاتی تھیں۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے حقوق سے جو بھر دستبردار نہ ہوتی تھیں اور اگر شوہر کی کوئی بات ناگوار ہوتی تو اس کے اظہار میں ذرا سا تامل نہ کرتیں۔

شادی بیاہ، نسبت ناتے اور ہر قسم کے اہم کام جو اولاد اور اولاد کی اولاد سے متعلق ہوتے، اُن میں حالؔی کی رائے سے زیادہ ان کی بیوی کی رائے کو اہمیت حاصل تھی۔ حالؔی کو جو وظیفہ ملتا تھا وہ سارے کا سارا بیوی کے ہاتھ میں رکھ دیتے اور پھر اس کے بارے میں الٹ کر نہیں پوچھتے تھے۔ ان کے ذاتی خرچ کے لیے زیادہ تر خواجہ سجاد حسین اُن کو کچھ روپے بھیج دیتے تھے۔

حالؔی نجی خطوں میں اکثر اپنی بیوی کا ذکر کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں ان کا کس قدر پاس تھا بیٹوں، بھتیجوں، پوتیوں وغیرہ کو ان کی طرف سے خاص طور پر سلام و پیام، دعا پیار اور اُن کی صحت کا حال لکھتے اور اُن کو باقاعدہ خط لکھتے رہنے کی تاکید کرتے۔ ہر خط میں کسی نہ کسی طرح اُن کا ذکر ضرور آتا ہے۔ اُن کا ایک چھوٹا سا مکان تھا جس کے بدلے میں حالؔی اور خواجہ سجاد حسین ایک دکان لینا چاہتے تھے۔ مگر یہ تجویز مولانا کی بیوی کو پسند نہ تھی۔ اس بارے میں انہوں نے کئی خطوں میں بیٹے کو لکھا کہ بغیر ان کی مرضی کے دکان نہیں لینی چاہیے۔ ''اگر چہ مناسب تو یہی تھا مگر مستورات کی بغیر مرضی کے تبادلہ نہیں ہوسکتا، خصوصاً تمہاری والدہ اس کے بہت خلاف ہیں۔''

ایک اور خط میں لکھتے ہیں: ''تمہاری والدہ اب اچھی ہیں اور کمزوری کے باوجود گھر کا سارا کام کاج کیے جاتی ہیں۔''

تمہاری والدہ نے باوجود کمزوری کے سب روزے رکھے اور باوجود اس کے سارا کام اگلے اور پچھلے کو خود کرتی رہیں۔ 1900ء میں بی اسلام النساء کا ہیضے سے انتقال ہو گیا۔ اُن کے انتقال پر مولانا حالؔی نے خواجہ سجاد حسین کو جو اطلاعی اور تعزیتی خط لکھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں اپنی بیوی کی کتنی قدر تھی۔

''پرسوں تمہاری والدہ کو دس بجے رات کے اس کا (ہیضے کا) اثر ہوا اور کل نو بجے رات انتقال ہو گیا۔ اِنّـا لِـلّٰه وَاِنَّا اِلَیه رَاجِعُون. اگر چہ اس حادثہ ناگہانی سے جو صدمہ سب عزیزوں اور متعلقوں اور ہمسایوں اور راہ چلتوں کو ہوا ہے، اُس کا بیان کرنا مشکل ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اُن کی اولاد کو سب سے زیادہ صدمہ ہوا ہے اور ہوگا۔ مگر میری جان! والدین کا اولاد کے سامنے گزر جانا والدین کی خوش نصیبی اور اولاد کا قدیم ورثہ ہے۔ تمہاری والدہ کی جیسی عمدہ زندگی اور عمدہ موت ہوئی ہے اُس کی ہر شخص کو تمنا ہونی چاہیے۔ خدا کا شکر ہے کہ انہوں نے سعادت مند اولاد چھوڑی ہے اور ان کو بفضلہٖ تعالیٰ اچھی حالت میں چھوڑا ہے۔ ایک زمانے کو اپنا مداح اور ثنا خوان اور شکر گزار چھوڑا ہے۔ وہ اپنی حقیقی اور اصلی نیکیوں کی تمام عشیرہ میں ایک عمدہ مثال تھیں۔ انہوں نے ہر ادنیٰ اور اعلیٰ کی خدمت گزاری سے مخدومیت کا درجہ حاصل کیا تھا۔ آخر وقت میں

جب تک اُن کو ہوش رہا برابر خدا کی یاد اُن کے وِردِ زبان رہی۔ جس شخص کی ایسی عمدہ زندگی اور ایسی عمدہ موت ہو اُس سے زیادہ کون خوش نصیب ہوسکتا ہے۔''

حالؔی کا ضبط دیکھیے کہ ذکر محض مرحومہ کی خوبیوں کا ہے۔ اپنے رنج وغم کے بارے میں ایک حرف نہیں۔ پھر بھی اُس کے ایک ایک لفظ سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ حالؔی کی بی بی کیسی اعلیٰ سیرت کی مالک تھیں اور حالؔی کے دل میں اُن کی کتنی قدر ومنزلت تھی۔ حالؔی کو بیٹوں کے خطوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں سخت رنجیدہ ہیں تو کس طرح صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ ''تم کو چاہیے کہ اپنی والدہ کی محبت اور خوبیوں کو بہت مت یاد کیا کرو اور اس دعا کا ورد رکھو۔ ''الٰہی مجھے اپنی محبت اپنی جان سے اور اپنے کنبے سے اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ دے۔'' خدا ہم سب کو اپنی محبت عنایت کرے کہ یہی ہر ایک رنج وغم کا بہترین علاج ہے۔''

اولادیں:

حالؔی کے یہاں چھے بچے پیدا ہوئے۔ تین بچے جن میں اعتقاد حسین اور رقیہ بیگم شامل تھیں بچپن ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی زندہ رہے۔

(الف) خواجہ اخلاق حسین، پیدائش قبل از: 1857ء۔ وفات: 2/فروری 1924ء

(ب) عنایت فاطمہ، پیدائش: 1859ء۔ وفات: 1915ء

(ج) خواجہ سجاد حسین، پیدائش: 1861ء۔ وفات: جولائی 1946ء

خواجہ اخلاق حسین کو حالؔی کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے گود لے لیا تھا اسی لیے حالؔی ان کو برادر زادہ کہتے تھے۔ خواجہ اخلاق حسین کی چار اولادیں تھیں۔ بڑی بیٹی مشتاق فاطمہ تھیں جن کی شادی خواجہ غلام الثقلین سے ہوئی۔ اُردو ادب کے مایہ ناز ادیب خواجہ غلام السیدین اور معروف ادیبہ صالحہ عابد حسین ان ہی کی اولاد تھے۔ دو بیٹے خواجہ احقاق حسین، خواجہ اکرام حسین اور چھوٹی بیٹی صدیقۃ النساء اخلاق حسین کی آخری اولاد تھی۔

خواجہ اخلاق حسین کی اولاد نے اُردو شعر وادب کی شمع جلائی رکھی ہے اور اس کی روشنی آج بھی ہمیں نظر آتی ہے۔ محترمہ سیدہ سیدین اور پروفیسر صغریٰ مہدی کا تعلق اسی خاندان سے ہے حالؔی کی بیٹی عنایت فاطمہ کی شادی خواجہ عبدالعلی سے ہوئی۔ ان کے دو بیٹے خواجہ فرزند علی اور خواجہ

عبدالولی اور ایک بیٹی سعیدہ بیگم تھیں۔

حاؔلی کے خطوط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حاؔلی اپنی گھریلو زندگی سے پریشان رہتے تھے جس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو ان کے داماد خواجہ عبدالعلی کچھ محنتی آدمی نہ تھے وہ ہمیشہ مختلف شہروں میں معمولی جگہ پر ملازم تھے اور اپنی بیوی بچوں سے لا پروا اور بیگانہ تھے اور ان کے خاندان کا سارا بوجھ حاؔلی پر تھا۔ دوسری اہم وجہ حاؔلی کے نواسے عبدالولی کو مرگی کی بیماری تھی جس نے حاؔلی کا سکون چھین لیا تھا۔ حاؔلی کی حالت ان کے ایک خط سے ظاہر ہے جو انہوں نے اپنے شاگرد عبدالرحیم خاں بیدل کو لکھا تھا۔ ''عبدالولی جس کے علاج کو دہلی گیا تھا اس کے صرع کے دورے تو رک گئے مگر جنون بڑھتا جاتا ہے میرا ناک میں دم ہے۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ زندگی وبال ہوگئی ہے۔ یہ یقین ہوگیا ہے کہ زیست کے برس دو برس جو باقی ہیں بہت بری طرح سے گزریں گے۔''

حاؔلی ذہنی اور مالی طور پر بہت پریشان تھے اور آخری عمر میں کسی سکون کے مقام کی تلاش میں تھے تا کہ اپنی نظم اور نثر کی تحریروں کو ترتیب دے سکیں لیکن انہیں اس کی فرصت نہ تھی۔ حاؔلی نے اپنے نواسے کی بیماری پر ہزاروں روپیہ صرف کیا لیکن افاقہ نہ ہوا نواسے کا مزاج جنون کی کیفیت اختیار کرتا گیا اور بعض اوقات وہ آپے سے باہر ہو جاتا۔ چناں چہ ایک مرتبہ خواجہ عبدالولی نے مولانا سے گستاخی کی اور انہیں شدید دھکا دیا جس سے مولانا گر پڑے۔ خواجہ سجاد حسین اُس وقت موجود تھے اُن کا مزاج بڑا حلیم تھا لیکن وہ کسی کی بدتمیزی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے بھانجے کو ڈانٹا اور ایک طمانچا بھی مارا۔ حاؔلی کو یہ بات بہت ناگوار گزری اور جب تک خواجہ سجاد حسین نے بھانجے کو منا نہیں لیا حاؔلی نے اپنے لائق بیٹے سے بات چیت نہیں کی۔ وہ اس بیماری کے مارے غم زدہ نوجوان کی ذرا سی دل آزاری کبھی گوارا نہیں کرتے تھے۔

حاؔلی کے دوسرے نواسے خواجہ فرزند علی نے حاؔلی کی تصانیف کی اشاعت کا بندوبست کیا۔ چناں چہ حاؔلی کی تصنیف مولود شریف کی پشت پر خواجہ فرزند علی کی حسب ذیل تحریر ہے: ''ایک عرصے سے پانی پت میں ایک مطبع جاری کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ مولانا حاؔلی کی زندگی میں ان کے دوست جناب مولانا وحید الدین صاحب سلیم نے ایک مطبع اس نام کا جاری کیا تھا جو چند سال نہایت مفید کام کرنے کے بعد بند ہوگیا۔ اب میں نے اپنے نانا صاحب (مولانا خواجہ

الطاف حسین صاحب حالی) مرحوم ومغفور کی یادگار میں ایک نیا مطبع بنام حالی پریس جاری کیا ہے اس کا مقدم مقصد یہ ہے کہ مولانا حالؔی مرحوم کی تمام تصانیف ایک سلسلے کی صورت میں اور ایک تقطیع پر چھپوائی جائیں اور ان کی تصحیح کا پورا اہتمام کیا جائے۔''

حالؔی کے چھوٹے بیٹے خواجہ سجاد حسین کا شمار اینگلو اورینٹل کالج کے پہلے تعلیم یافتوں میں کیا جاتا ہے۔ وہ اسکولوں کے انسپکٹر جنرل کے عہدے پر فائز رہے۔ خواجہ سجاد حسین کی کاوشوں سے بہت سے اہم مسودے حالی کی تصانیف کے محفوظ ہو گئے اور شائع ہو کر عوام کی دسترس میں آئے۔

حالؔی اور فیملی:

حالؔی صحیح معنی میں کنبہ پرور تھے۔ وہ صرف اپنے بیمار نواسے کی بیماری سے متفکر نہ تھے بلکہ اپنے دوسرے نواسوں، نواسیوں، پوتوں اور پوتیوں سے بھی پوری طرح پیار ومحبت کرتے تھے اور انہیں تمام لڑکوں اور لڑکیوں کی صحت، تعلیم اور جذبات کا خیال رہتا ذیل کے چند واقعات ہماری بات کے ثبوت میں پیش کیے جاتے ہیں۔

☆ حالؔی ہمیشہ لڑکوں اور بچوں کے خط کا جواب اُسی پابندی سے دیتے جیسے بڑے آدمیوں کے خطوں کا۔ اُن کا طرزِ تحریر یوں بھی سادہ، شستہ اور آسان ہے لیکن عورتوں اور بچوں کو جب خط لکھتے تو خاص طور پر وہ لہجہ اور زبان استعمال کرتے تھے جس کو وہ اچھی طرح سمجھ سکیں اور ساتھ ہی اس کی کوشش بھی کرتے تھے کہ بہت خوش خط اور صاف صاف لکھیں تاکہ انہیں پڑھنے میں آسانی ہو۔

خواجہ فرزند علی کو لکھتے ہیں: ''میری جان اب کے لکھنے پڑھنے میں ایسی کوشش کرو کہ امتحان کے موقع پر پورا پورا اطمینان رہے۔''

☆ خواجہ فرزند علی مولانا کے بڑے نواسے کھیل کود کے بڑے شوقین تھے۔ اسکول کی بندشوں سے گھبراتے اور کتابی تعلیم سے بھاگتے تھے۔ مولانا کو اُن کی تعلیم کی بڑی فکر رہتی تھی اور وہ ہر طرح اس کی کوشش کرتے تھے کہ اُن کا دل لکھنے پڑھنے میں لگے۔ خواجہ سجاد حسین اور خواجہ تصدق حسین کے نام سینکڑوں خطوں میں ان کا ذکر ہے۔ مولانا حالؔی نے ہر ممکن کوشش

کی کہ وہ اعلیٰ تعلیم پائیں آخر اس کی طرف اُن کی توجہ نہ دیکھ کر انہیں ایف۔اے کے بعد انجینئر نگ میں بھیج دیا تھا جہاں انہوں نے کامیابی حاصل کی۔خواجہ فرزند علی مرحوم بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ: ''دیکھو مولانا حالؔی کو مجھ سے کتنی محبت اور میرا کتنا خیال تھا کہ تقریباً ہر خط میں میرا ذکر موجود ہے۔''

☆ مولانا حالؔی کے بڑے بیٹے خواجہ اخلاق حسین ایک صوفی منش بزرگ تھے اور وہ بھی خاندانی معاملات اور بچوں کی تعلیم وغیرہ کی کچھ زیادہ فکر نہ کرتے تھے۔اس لیے اُن کے دونوں بیٹوں خواجہ احقاق حسین اور خواجہ اکرم حسین کی تعلیم و تربیت کی ساری ذمہ داری بھی مولانا حالؔی ہی پر تھی۔ایک خط میں لکھتے ہیں:

''حقن (احقاق حسین) انگریزی میں تو چل نکلا ہے۔مگر حساب میں ابھی تک صفر ہے۔ ابھی دھیان اور توجہ لکھنے پڑھنے میں پیدا نہیں ہوئی۔لیکن خصلتیں عمدہ معلوم ہوتی ہیں۔اطاعت اور حکم برداری مزاج میں بہت ہے، کاہل نہیں ہے اور روز بروز قریب ہوتا جاتا ہے، گھر جانے کا کبھی نام نہیں لیتا۔جس بات کو منع کر و پھر نہیں کرتا......اگر اس کے دل میں کچھ شوق اور توجہ پیدا ہو جائے تو اسے علی گڑھ ظہور حسین وارڈ میں داخل کر دیا جائے۔''

☆ رشتے کے ایک پوتے کے فیل ہونے کی خبر سنی تو بہت افسوس ہوا۔اُن کے والد کو خط لکھا جس میں اظہار افسوس کے ساتھ ہی کس دل سوزی سے لکھتے ہیں: ''طالب علم کتنا ہی بدشوق ہو مگر فیل ہونے کا رنج وملال سب کو یکساں ہوتا ہے۔جہاں تک ہو سکے اس کی دلجوئی کرنا چاہیے اور ملامت ونفرین سے احتراز کرنا چاہیے...... کہہ دینا رنج کی کوئی بات نہیں ہے۔ نہایت استقلال سے پھر کوشش کرو۔ان شاءاللہ ضرور کامیاب ہو گے۔''

☆ خواجہ غلام السیدین اُن کی پوتی کے بڑے بیٹے ہیں۔اس لیے خاندان بھر کے لاڈلے تھے۔جب ماں اپنے دادا کے ہاں جاتیں تو نیچے کے مکان میں دادی کے پاس ٹھہرا کرتی تھیں۔اوپر دیوان خانے میں مولانا حالؔی رہتے تھے۔سیدین مولانا سے بہت مانوس تھے۔ جب وہ نیچے سے اوپر چلے جاتے تو یہ نیچے سے پکارتے ''بابا'' اور مولانا آواز سن کر نیچے اترتے، بچے کو پیار کرتے اور پھر اوپر چلے جاتے۔سیدین پھر پکارتے ''بابا'' اور وہ پھر اسی

طرح نیچے آتے پیار کرتے اور چلے جاتے۔ بچوں کو تو کسی بات کی تکرار میں مزہ آتا ہے۔ والدہ مرحومہ سنایا کرتی تھیں کہ سید ین جتنی مرتبہ انہیں ''بابا'' کہہ کر بلاتا وہ اس ضعیفی کے عالم میں ہر مرتبہ نیچے اُتر کر آتے اور اُسے پیار کرتے تھے۔

☆ سید ین صاحب کی چھوٹی بہن سیدہ خاتون (مرحومہ) بڑی پیاری، بھولی اور ذہین بچی تھی اور مولانا حالؔی اس بچی کو بے حد چاہتے تھے۔ انہوں نے سیدہ خاتون پر ایک چالیس بیت کی نظم بھی لکھی ہے۔ جو علاوہ ذاتی لحاظ سے دلچسپ ہونے کے اُن کے مشاہدے کی باریکی پر بھی روشنی ڈالتی ہے:

سیدہ کیسی پیاری بچی ہے صورت اچھی، سمجھ بھی اچھی ہے
ہے ابھی دو برس کی خیر سے جان پر ہے اچھے بُرے کی سب پہچان

اس نظم کو پڑھ کر جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بچی سے مولانا کو کس قدر لگاؤ تھا۔ وہاں یہ اندازہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ بچوں کی طبیعت اور نفسیات کو بھی خوب سمجھتے تھے:

جھوٹ موٹ اُس کو گر ڈراتے ہیں بات ڈر کی کوئی سناتے ہیں
پکے پن سے یقین نہیں کرتی دیر تک ہے نہیں نہیں کرتی

اور

اوپری شکل سے ہے گھبراتی ہے مگر جلد سب سے ہل جاتی

اوپر تلے کے بھائی بہن میں جو مزید ارلاگ ہوتی ہے۔ اُس کا ذکر دیکھیے:

پر ذرا بھائی سے ہے لاگ اُس کو کیوں کہ اُوپر تلے کے ہیں دونوں
پس جہاں بھائی ماں کے پاس آیا اور وہیں اس نے ہاتھ پھیلایا
جا لپٹی ہے دوڑ کر ماں سے بھائی سے کہتی ہے ہٹو یاں سے

اور کس پیار بھرے انداز میں بچی کی توتلی زبان کی تعریف کرتے ہیں:

یوں تو تھی جب ہی پیاری اس کی زبان جب کہ کرنے لگی تھی وہ غوغاں
پھر تو آتا ہے اس پہ اور بھی پیار ہوتی جاتی ہے جس قدر ہشیار
نہیں منہ سے نکلتے پورے بول بولتی ہے سدا ادھورے بول

لوٹ جاتے ہیں ہنستے ہنستے سب   زرگری اپنی بولتی ہے جب

اس پوری نظم کو پڑھیے ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی بچوں کی سیدھی سادی پیاری زبان میں اُن سے باتیں کر رہا ہے۔

☆ حاؔلی بچوں سے بہت محبت کرتے تھے اگر چہ وہ خاندانی رشتہ دار ہو یا ہمسایہ یا بیگانہ یہ فرشتہ صفت انسان کے درجنوں واقعات آج ایک صدی سے زیادہ وقت گزرنے پر بھی دل کو تڑپا دیتے ہیں اور ان کے اخلاق کا کلمہ پڑھوا دیتے ہیں۔

پانی پت میں ایک مرتبہ حاؔلی کسی جگہ سے تانگے میں بیٹھے گزر رہے تھے کہ دیکھا ایک بھنگی کا چھوٹا سا لڑکا نالی میں گرا پڑا ہے اور کیچڑ اور گندگی میں لت پت پڑا چلّا رہا ہے۔ آس پاس بہت سے آدمی جمع کھڑے دیکھ رہے تھے اور رام رام کر رہے تھے مگر کوئی اُسے اٹھاتا نہیں۔ مولانا نے فوراً اپنا تانگا ٹھہرایا۔ پاس گئے بڑی آہستگی سے اُسے نالی میں سے نکالا۔ اپنے ہاتھ سے اُس کے کپڑے اتارے اور اس کے ماں باپ کا پتا پوچھ کر خود وہاں چھوڑ کر آئے۔ چلتے ہوئے لوگوں سے کہا: ''جس رام کا نام آپ جپ رہے ہیں اگر چاہتے تو اُسی رام کا جلوہ اس ننھے بچے میں آپ کو نظر آ سکتا تھا۔'' یہ ایک جملہ ایک کتاب پر بھاری ہے۔

اخلاق و کردار:

یہ سچ ہے کہ حاؔلی کے اخلاق اور کردار کا کلمہ دوست دشمن سب نے پڑھا ہے۔ حاؔلی ایک بلند مرتبہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم انسان بھی تھے۔ وہ عملاً میر انیؔس کے شعر کے مصداق تھے۔

کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی
چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے

حاؔلی معمولی سے معمولی شخص کی عزت اور شخصیت کا خیال رکھتے تھے۔ کبھی کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا دشنام دینا، کوسنا، غصہ کرنا، دھتکارنا وغیرہ تو ایک طرف کبھی کسی سے آواز بلند گفت گو نہ کی۔ حاؔلی بچوں میں بچے، بیماریوں میں مسیحا، دردمندوں کے ہمدرد، غریبوں کے مددگار اور حاجت مندوں کے سہارا تھے۔ اگر چہ ان کی آمدنی قلیل تھی لیکن ان کا دل کشادہ تھا کیوں کہ ان کی فطرت میں قناعت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ کہتے ہیں:

ع خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے

انگریزی محاورہ ہے، "It is Difficult to be humble when you are great." مگر حالی نے اپنے کرداراور عجز وانکسار سے یہ ثابت کر دیا کہ عظیم شخص وہی ہے جس کے اخلاق اور کردار بلند ہوں۔ چونکہ اُردو ادب میں یہ گوہر نایاب خاص طور پر شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں میں خال خال ہے اِس لیے ہم چند معتبر اور مستند واقعات جو حالؔی کی فرشتہ صفت شخصیت کی عکاسی کرتے ہیں یہاں پیش کرتے ہیں۔

شاعروں کی چشمک اور معرکہ آرائیوں سے اُردو کے قارئین بے خبر نہیں ہیں۔ تعلّی شاعر کا پیدائشی حق تو ہے لیکن مشاعروں کی سیاسی تجلی اور بازی گری نے ادبی اور شعری آموزش گاہ کو شعرا کا دنگل بنا دیا ہے اس ماحول میں حالی کی سیرت کو دیکھیے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کہتے ہیں: خواجہ اکرام اللہ مرحوم نے دہلی کے ایک مشاعرے کا حال مجھے سنایا تھا، جس میں خواجہ حالؔی مرحوم اور داؔغ مرحوم دونوں شریک ہوئے تھے۔ طرح تھی۔ ''خبر کہاں''، ''نظر کہاں''، داغ مرحوم کی غزل مشہور ہے:

اس مبتدا کی دیکھیے نکلی خبر کہاں

مشاعرے میں سب غزلیں پڑھ چکے تھے۔ خواجہ صاحب اور داؔغ مرحوم باقی رہ گئے تھے۔ پہلے شمع خواجہ صاحب کے سامنے آئی اور اُنھوں نے اپنی غزل سنائی:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں　　اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں
اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق　　رکھی ہے آج لذّتِ زخمِ جگر کہاں
حالؔی نشاط نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اَب　　آئے ہو وقتِ صبح ، رہے رات بھر کہاں؟

اکرام اللہ خاں مرحوم کہتے تھے، غزل تمام مشاعرے پر چھا گئی اور مدح وتحسین کا ایسا ہنگامہ گرم ہوا کہ لوگوں نے خیال کیا، اب داغ مرحوم کے لیے کچھ نہیں رہا۔ خود داؔغ نے کہا۔ ''اس غزل کے سننے کے بعد میری غزل خود میری نگاہ سے گر گئی، جی چاہتا ہے، پرچہ چاک کر دوں۔''

ایک عرصے کے بعد خواجہ صاحب مرحوم سے نیاز حاصل ہوا تو میں نے غدر کے بعد کے مشاعروں کا تذکرہ چھیڑ دیا اور خصوصیت کے ساتھ اس مشاعرے کا حال دریافت کیا۔ خواجہ صاحب

حالات بیان کرنے لگے اور تفصیلات کی رو میں دور تک نکل گئے۔ لیکن پھر اچانک انہیں احساس ہوا کہ اب مجھے غزل کی مدح و تحسین کے واقعات بیان کرنے پڑیں گے، اس لیے کہتے کہتے یک قلم رک گئے۔ اَب میں ہر چند اصرار کرکے پوچھتا ہوں، فرمائیے، اس کے بعد کیا ہوا؟ لیکن وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہتے کہ ''جی ہاں! بس غزل پڑھی گئی اور مشاعرہ ختم ہوگیا۔'' میں نے بار بار پوچھا: آپ کی غزل پر داغؔ مرحوم نے کیا خیال ظاہر کیا تھا؟ لیکن ''جی ہاں، کیا کہا جائے۔'' کے سوا اور کوئی جواب نہیں ملا ''جی ہاں'' کی ''ہآں'' کو وہ جس طرح تمدید کے ساتھ ادا کرتے تھے، اُسے قید کتابت میں لانے کا اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں پاتا کہ ''جی ہاں'' کی ''ہآں'' پر ایک لمبی مد کھینچ دوں۔

حالیؔ کے پڑپوتے خواجہ غلام الحسنین اپنے مضمون ''حالیؔ'' میں لکھتے ہیں:

''خوش قسمتی سے مجھے تینتیس سال تک دہلی اور پانی پت میں مولانا کی خدمت سے فیض یاب ہونے کی عزت حاصل رہی۔ اگرچہ مجھے اس مدت میں بوجہ ملازمت سررشتہ تعلیم ساڑھے چار سال تک پانی پت سے باہر رہنے کا اتفاق ہوا۔ تاہم تعطیلات میں اور رخصت لے کر بھی اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا اور چونکہ مجھ کو مولانا سے قرابت قریبہ حاصل تھی اس لیے کسی وقت بھی ان کی خدمت میں کوئی رکاوٹ میرے لیے نہیں تھی، خواہ مولانا اندر تشریف رکھتے ہوں، یا باہر مردانہ مکان میں۔ اور بعض اوقات گھنٹوں ان کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔ ان وجوہ سے مولانا کی نشست و برخاست، اخلاق و آداب، عادات و خصائل، المختصر ان کی پبلک اور پرائیویٹ زندگی کے متعلق اصلی حالات معلوم کرنے کے بے شمار مواقع جو مجھے حاصل ہوئے کسی کو حاصل نہ ہوئے۔ اس کے علاوہ میں نے مولانا کے کلام کا مطالعہ بھی بہت کچھ کیا ہے اور جو کچھ ان کے کلام میں پایا ہے، وہی ان کی عملی زندگی میں دیکھا۔ لہٰذا میرے بیان کا دارومدار سنی سنائی پر نہیں، بلکہ ذاتی مشاہدات اور ان واقعات پر ہے جن کی تصدیق خود مولانا کے قلم یا زبان سے ہو چکی ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب اپنے ایک مضمون میں مولانا حالیؔ کے متعلق لکھتے ہیں:

''ایک بڑے شخص کا قول ہے کہ ادیب کا کلام اس کے دماغ کا آئینہ ہوتا ہے۔ اگر اس معیار پر مولانا حالیؔ کے کلام کو جانچا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی سیرت اور ان کی حیات سرتاپا ان کے کلام میں موجود ہے۔ وہ مجسم ہمدردی اور مجسم درد تھے اور

یہی ان کے کلام کی خصوصیت ہے۔ ان کا ہر ایک مصرع درد بھرا تڑپتا ہوا جگر پارہ ہے۔ ہماری زبان میں اور بھی ایسے شاعر ہوئے ہیں جن کے کلام میں عجیب اثر اور درد ہے۔ لیکن ان کا درد ذاتی اور محدود ہے۔ حالؔی کا درد ساری قوم کا درد ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے پُر درد نغموں نے قوم کے دلوں کو ہلا دیا۔ سوتوں کو جگا دیا اور کاہلوں کو ہوشیار کر دیا۔''

میرے بھائی آنریبل خواجہ غلام الثقلین مرحوم جو ہر بات کو نہایت گہری نظر سے دیکھتے تھے۔ انہوں نے مولانا کی وفات پر جو 31 دسمبر 1914ء کو واقع ہوئی، اپنے اخبار ''عصر جدید'' میں ان کی سیرت کے متعلق نہایت جچی تلی رائے لکھی تھی جس پر میں اس تقریر کو ختم کرتا ہوں:

''مولانا یونانی خیالات کی رُو سے ایک معتدل اور متوسط کامل انسان اور صوفیہ خیالات کی رُو سے ایک صاحب باطن ولی تھے۔ کبھی کسی کی برائی ان کی زبان سے نہیں سنی گئی۔ ہر شخص کے عیب کی نرم تاویل کرنا پسند فرماتے تھے۔ عزیزوں سے محبت رکھتے تھے۔ غریبوں کی امداد کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ کسی مذہب کے قائل سے سچ اور عمدہ بات سنتے تھے تو اس کی قدر کرتے اور تعریف کرتے تھے۔ مذہباً نہایت بے تعصب تھے۔ آپ بلند خیال، بے نفس، محبّ اہل بیت اور صوفی منش سنی تھے۔ مسلمانوں کے مذہبی اختلافات کو نہایت مکروہ سمجھتے تھے اور طریقِ نماز کے علاوہ اور کسی طرح اختلاف کے اظہار کو پسند نہ کرتے تھے۔ ان کی اولاد اور خاندان میں دونوں طریقہ کے لوگ موجود ہیں اور وہ کسی کو یہ نہ کہتے تھے کہ وہ کیا طریقہ اختیار کرے۔ ان کے پاس بیٹھنے اور باتیں سننے سے نہایت بد باطن شخص بھی روحانی فیض پاتے تھے۔ عدل اور میانہ روی مولانا کی خاص صفت تھی۔ اس کے ساتھ رحم و مروّت۔ پانی پت بلکہ اس تمام علاقے کو فخر ہو سکتا ہے کہ ایسا انسانِ کامل اس میں پیدا ہوا جس نے خود کو کبھی غیر معمولی آدمی بھی نہ سمجھا۔ اخلاق میں، عادات میں، برتاؤ میں، مروّت میں، فیاضی میں اعلیٰ درجہ کا اعتدال تھا۔ عزیزوں اور اولاد کی محبت، تعلیم کا خیال، عالم کی خیر خواہی، نیک آدمیوں کی قدر دانی میں ان کی مثال

ضرور ملے گی مگر کم۔ آخر زمانے میں جبکہ دماغ بیکار ہو گیا تھا اور لوگ اپنی عادت کے موافق مختلف خیالات سے جنگ کی خبروں کا ذکر کرتے تھے تو مولانا مرحوم جب بہت سے آدمیوں کے مقتول ہونے کا ذکر سنتے تھے تو اس قدر تاسف سے آہ کرتے تھے گویا خود اپنے کسی عزیز کے مرنے کی خبر سنی ہو۔ خدمت گار اُن کو الگ روتے ہیں کہ ایسا آقا دیکھا نہ تھا۔ یہی حالت رشتہ داروں اور اہل شہر کی ہے۔ قوم میں بھی کچھ کم افسوس نہ ہوگا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔"

بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے حالی کی سیرت میں دو خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ ایک سادگی دوسرے درد دل یہ دونوں خصوصیتیں ان کے کلام میں بھی ہیں، سیرت میں ہیں۔ دراصل ان کا کلام اور ان کی سیرت ایک دوسرے کا عکس ہیں۔

نواب عماد الملک کہتے تھے سرسید کی جماعت میں بحیثیت انسان کے حالی کا مرتبہ بہت بلند تھا اس بات میں سرسید بھی نہیں پہنچتے تھے۔

حالی ہر چھوٹے اور بڑے سے خلوص اور محبت سے ملتے تھے وہ بڑوں اور چھوٹوں کا ادب کرتے تھے علی گڑھ کی طالب علمی کے زمانے میں جب عبدالحق اور حمید الدین حالی سے ملنے گئے تو وہ تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے۔ حمید الدین نے کہا کہ آپ تعظیم کر کے ہمیں شرمندہ کرتے ہیں تو کہنے لگے: "آپ لوگوں کی تعظیم نہ کروں تو کس کی تعظیم کروں۔ آیندہ آپ ہی تو قوم کے ناخدا ہونے والے ہیں۔"

اپنی کتابوں پر جو اصلی معنوں میں تصنیف ہوتی تھیں ہمیشہ "مرتبہ" لکھا مولفہ یا مصنفہ کا لفظ نہ لکھا۔ رفتار و گفتار، رہن سہن ملنے ملانے میں اتنی سادگی اور خاکساری تھی کہ ملنے والے کو مشکل سے یقین ہوتا کہ یہ اُردو کا عظیم شاعر و ادیب حآلی ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حآلی نے اپنے ہم عصروں کی کتابوں پر عمدہ ریویو کیے انہیں سراہا لیکن اُنہی ہم عصروں نے سوائے سرسید کے حالی کی تصانیف پر خاموشی اختیار کی جس کا حالی نے کبھی نوٹس نہیں لیا بلکہ ان کی حمایت میں کہتے اور لکھتے رہے۔

مولوی ظفر علی خان نے "دکن ریویو" میں شبلی کی کتاب پر بے جا شوخی سے کام لیا تو حآلی نے

محبت بھرے جملوں سے نصیحت کرنی شروع کردی۔ میں تنقید سے منع نہیں کرتا تنقید بہت اچھی چیز ہے اور اگر آپ لوگ تنقید نہ کریں گے تو ہماری اصلاح کیوں کر ہوگی لیکن تنقید میں ذاتیات سے بحث کرنا یا ہنسی اڑانا منصب تنقید کے خلاف ہے۔

1903ء میں جب مولوی فضل الحسن حسرت موہانی نے علی گڑھ سے ''اُردوئے معلیٰ'' جاری کیا تو جدید شاعری کے اِس مجدد اعظم پر بھی اعتراضات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کیا۔ مولانا کے پاس اگرچہ ''اردوئے معلیٰ'' باقاعدہ پہنچتا تھا مگر نہ آپ نے کبھی اعتراضات کا جواب دیا اور نہ مخالفت پر ناراضگی کا اظہار فرمایا۔

علی گڑھ کالج میں کوئی عظیم الشان تقریب تھی۔ نواب محسن الملک مرحوم کے اصرار پر مولانا حالؔی بھی اس میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے اور حسب معمول سید زین العابدین مرحوم کے مکان پر فروکش ہوئے۔ ایک صبح حسرتؔ موہانی دو دوستوں کو ساتھ لیے ہوئے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چندے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوا کیں، اتنے میں سید صاحب موصوف نے بھی اپنے کمرے سے حسرتؔ کو دیکھا۔ اِن مرحوم میں لڑکپن کی شوخی اب تک باقی تھی۔ اپنے کتب خانہ میں گئے اور ''اردوئے معلیٰ'' کے دو تین پرچے اُٹھالائے۔ حسرتؔ اور اُن کے دوستوں کا ماتھا ٹھنکا کہ اب خیر نہیں اور اُٹھ کر جانے پر آمادہ ہوئے۔ مگر زین العابدین کب جانے دیتے۔ خود پاس بیٹھ گئے، ایک پرچے کے ورق اُلٹنا شروع کیے اور مولانا حالؔی کو مخاطب کر کے حسرتؔ اور اُردوئے معلیٰ کی تعریفوں کے پل باندھ دیے۔ کسی کسی مضمون کی دو چار سطریں پڑھتے اور ''واہ! خوب لکھا'' کہہ کر داد دیتے تھے حالؔی بھی ''ہوں ہاں'' سے تائید کرتے جاتے تھے۔ مگر حسرتؔ کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

اتنے میں سید صاحب مصنوعی حیرت بلکہ وحشت کا اظہار کر کے بولے، ارے مولانا یہ دیکھیے آپ کی نسبت کیا لکھا ہے اور کچھ اِس قسم کے الفاظ پڑھنا شروع کیے ''سچ تو یہ ہے کہ حالؔی سے بڑھ کر مخرب زبان کوئی ہو نہیں سکتا اور وہ جتنی جلدی اپنے کو اردو کی خدمت سے روکیں اتنا ہی اچھا ہے۔''

فرشتہ منش حالؔی ذرا مکدر نہیں ہوئے اور مسکرا کر کہا تو یہ کہا کہ ''نکتہ چینی اصلاحِ زبان کا ایک

بہترین ذریعہ ہے اور یہ کچھ عیب میں داخل نہیں۔''

کئی روز بعد ایک دوست نے حسرتؔ سے پوچھا کہ حالیؔ کے خلاف اب بھی کچھ لکھو گے؟ جواب دیا کہ جو کچھ لکھ چکا ہوں اسی کا ملال اب تک دل پر ہے۔

حالیؔ کے اخلاق اور کردار کے جو دوست اور دشمن مداح تھے وہ ان کی انسانیت تھی۔ افسوس کے ساتھ اس تلخ حقیقت کو دہرانا پڑتا ہے کہ بڑے بڑے لوگوں میں انسانیت کے جوہر کی کمی دیکھی گئی ہے۔ حیدرآباد دکن کی علمی اور ثقافتی تہذیب کے نمایاں شخص عماد الملک سید حسین بلگرامی جو سرسید کے قریبی دوست بھی تھے کہتے تھے، سرسید احمد خان کی جماعت میں کوئی شخص انسانیت کے اعتبار سے حالی کے پایہ کا نہ تھا اور اس خاص بات میں خود سرسید احمد خاں بھی انہیں نہیں پہنچتے تھے۔

حالیؔ نے خود انسانیت کی تعریف سرسید احمد خان کے فارسی مرثیے میں کی ہے جو سچ کہیں تو حالیؔ ہی پر صادق آتی ہے:

چیست انسانی! تپیدن از تپ ھمسایگان

از سموم نجد در باغِ عدن پژماں شدن

(انسانیت کیا ہے! ہمسایوں کے رنج اور زحمت سے رنجیدہ رہنا۔ جنت میں بھی نجد کی گرم وزہریلی ہوا کے احساس سے افسردہ اور مرجھائے ہوئے رہنا)

خوار دیدن خویش را از خواری ابنائے جنس

درشبستاں تنگ دل از محنت زنداں شدن

(اپنے کو تمام کم ترینوں سے کم تر سمجھنا اور قفس کی تکلیف دہ زندگی کے احساس سے محل میں بھی بے چین رہنا)

آتش قحطی کہ در کنعان بسوزد باغ و کشت

برفراز تخت مصر از تاب آں بریاں شدن

(وہ قحط کی آگ جس سے مصر کے باغ اور کھیت جل چکے اس کی گرمی اور جلن سے تخت شاہی مصر پر بھی بھن جانا)

بی مڑیا کی نگہداشت:

حالی ایک فرشتہ صفت انسان تھے۔ غدر میں دلی اجڑی اور کئی شریف خاندانوں کی عورتیں پانی پت کے گردونواح میں عزت و جان بچانے کے لیے زندگی بسر کرنے لگیں۔ ان ستم زدہ بدبخت افراد میں بی مڑیا بھی شامل تھی جنہوں نے حالی کے گھر میں پناہ لی اور ساری عمر حالی کے کنبے کے ساتھ گزار دی۔ صالحہ عابد حسین یادگار حالی میں لکھتی ہیں کہ ایک اَسّی (80) سالہ بوڑھی بی مڑیا کو خود انہوں نے دیکھا تھا جو غدر میں دس سال کی تھیں، عقد ہو چکا تھا رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ غدر کا ہنگامہ برپا ہوا۔ شوہر، ماں باپ عزیز واقارب سب مارے گئے اور اس اکیلی کم سن لڑکی نے حالی کے گھر میں پناہ لی اور ساری عمر چھوٹے موٹے کام جیسے سلائی، کشیدے کاری وغیرہ کر کے اپنا خرچ چلاتی رہیں اور عزت وخودداری سے زندگی گزار دی۔ حالی کے انتقال کے بعد ان کی پوتی مشتاق فاطمہ نے بی مڑیا کی اس طرح خدمت کی جیسے ایک بیٹی اپنی ماں کی خدمت کرتی ہے۔ ان واقعات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حالی صرف جذباتی شاعری ہی نہیں کرتے تھے بلکہ عملی طور پر جس قدر بھی ہو سکے عورتوں کے مسائل کو حل کرنے میں پیش پیش رہتے۔

نوکروں سے برتاؤ:

حالی کے دو خاص ملازم تھے۔ نانوں خان اور عطاء اللہ۔

حالی ان دونوں ملازموں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ کبھی کبھار نانوں خان جب سجاد حسین کے ساتھ دوسرے شہر جاتا تو اس کی نگہداری کی تاکید کرتے اور نانوں خان کو خط لکھنے کی تاکید بھی کرتے۔ ایک مرتبہ نانوں خاں غلطی سے کروسین تیل گھی سمجھ کر پی گیا۔ حالی نے فوراً ڈاکٹر کو بلوایا اور نواب لوہارو کے ہاں کی دعوت کو جانا ملتوی کر دیا۔ عطاء اللہ مزاج کا سخت اور بہت اونچا سنتا تھا لیکن وہ بھی حالی کا چہیتا تھا جس کو حالی اپنی جاکٹ رضائی اور کھانے پینے کی اشیا دیتے رہتے تھے۔ حالی کے انتقال کے بعد یہ دونوں ملازمین دن رات ان کے گن گاتے رہتے تھے۔

مولانا روم نے بہت صحیح انہی لوگوں کے بارے میں کہا ہے:

دل بدست آرد کہ حج اکبر است
از ھزاراں کعبہ یک دل بہتر است

مذہب:

حالی کی پڑپوتی صالحہ عابد حسین یادگار حالی میں لکھتی ہیں۔ حالی عقیدتاً حنفی سنی مسلمان تھے اور حالی کی بیوی شیعہ تھی۔ وہ حنفی المذہب سنی تھے لیکن اہل بیت اطہار سے اور جناب علی مرتضیٰ b سے انہیں بڑے بڑے شیعوں سے زیادہ عقیدت تھی۔ ان کا یہ شعر اس احترام اور عقیدت کا پورا ثبوت دیتا ہے۔

ایماں جسے کہتے ہیں عقیدے میں ہمارے   وہ تیری محبت تری عترت کی وِلا ہے

پانی پت میں صرف اُن کے خاندان کے شیعہ حضرات ہی نہیں بلکہ شہر بھر کے شیعہ اُن کے مذہبی عقیدے کی بھی اُسی طرح عزت کرتے تھے جس طرح ان کی ذات کی۔ جب حالی کی وفات ہوئی تو شاید پہلی مرتبہ پانی پت میں شیعوں اور سنیوں دونوں نے ایک ہی شخص کی نماز جنازہ پڑھی اور اس کے بعد یہی واقعہ مولانا حالی کی پوتی کی وفات پر ہوا جو اپنے دادا ہی کی طرح بے تعصبی اور عالی ظرفی میں ضرب المثل تھیں۔

آں حضرت a سے حالی کو وہ گہری عقیدت اور والہانہ عشق تھا جس کا ثبوت ہر اُس شعر سے مل سکتا ہے جو انہوں نے ہادی برحق a کی شان میں کہا ہے۔ انہوں نے جہاں کہیں اس موضوع پر لکھا ہے قلم توڑ دیا ہے۔ ''مسدس حالی'' کے چند نعتیہ بند اردو شاعری کے سارے نعتیہ کلام پر بھاری کہے جا سکتے ہیں۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا   مرادیں غریبوں کی بَر لانے والا

وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا   مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا

غریبوں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ

یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

قناعت: قناعت ایک خداداد انسانی قدر ہے جسے انسان اپنے نفس کی پاکیزگی سے نمو دیتا ہے میر انیس نے کہا تھا۔

کریم جو تجھے دینا ہے بے طلب دے دے

فقیر ہوں پہ نہیں حاجتِ سوال مجھے

کسی کے سامنے کیوں ہاتھ جا کے پھیلاؤں
مرا کریم تو دیتا ہے بے سوال مجھے

انسان کو جینے کے لیے معاش اور روزگار کی ضرورت ہے۔ زندگی کی گاڑی کا ایندھن یہی روپیہ اور مال ہے جس سے پیٹ کی آگ بجھائی اور بدن کی ضروریات کو پورا کیا جاتا ہے۔ حاؔلی کی زندگی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اوائل زندگی سے آخری عمر تک کبھی حریص وطمع نہیں کیا بلکہ قانع رہے جو کچھ بھی انہیں روزگار نے فراہم کیا۔ انیؔس کا شعر حاؔلی کی وضع داری اور قناعت پر صادق ہوتا ہے:

کیا قبول قناعت سے بحرِ عالم میں
صدف کی طرح میسر جو آب و دانہ ہوا

واقعہ:

جب حیدرآباد کے نواب سر آسمان جاہ نے حاؔلی کی شعری اور ادبی کاوشوں سے متاثر ہو کر انہیں ماہانہ وظیفہ دینے کا فیصلہ کیا تو سرسید نے پوچھا آپ کو گذر بسر کرنے کے لیے کتنا وظیفہ چاہیے۔ حاؔلی نے جواب دیا۔ مجھے اینگلوعربک اسکول سے جو ساٹھ روپے ماہوار ملتے ہیں تو حیدرآباد کے سکہ رائج الوقت کے پچھتر روپے ہوتے ہیں یہی میری زندگی بسر کرنے کے لیے کافی ہے۔

☆ لاہور کے قیام کے دوران ڈاکٹر لٹز کی ارضیات پر کتاب کا عربی سے اُردو میں ترجمہ کیا جو بعد میں گورنمنٹ کالج کے نصاب میں شامل رہی۔ حاؔلی نے اس ترجمہ اور کتاب کو کالج کے لیے بغیر کسی معاوضہ کے انجام دیا۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ حالی لاہور میں غریب الوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور تھوڑے سے پیسوں کی خاطر اپنے وطن اور اہل وعیال سے دور تھے اور خاندان کی ساری ذمہ داریاں حاؔلی پر تھیں۔

☆ حاؔلی نے اپنی تصنیفات سے مالی فائدہ نہیں اٹھایا۔ سوائے ایک آدھ کتاب کی رجسٹری یا حقوق محفوظ کروائے ہوں گے ان کی تمام تر کتابیں پبلشرز جب چاہتے شائع کر کے فائدہ اٹھا لیتے۔ مسدس حاؔلی کے درجنوں ایڈیشن شائع ہوئے لیکن حالی کو کوڑی بھی نہیں ملی شاید اُردو ادب میں اس قسم کے استحصال کی دوسری مثال نہ ہو۔

☆ حالؔی نے اپنی تمام تر زندگی ایک معمولی مکان میں گزار دی۔ آخری عمر میں چھوٹے بیٹے سجاد حسین جو گورنمنٹ کے بڑے عہدے پر فائز تھے ایک قطعہ زمین لے کر نسبتاً آرام دہ گھر بنایا جس کے اوپری حصے میں حالؔی رہتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ حالؔی کے ہمدرد عالی شان بنگلوں اور کوٹھیوں میں زندگی بسر کرتے تھے۔ وقار الامرا نے حیدر آباد میں اپنے رہنے کے لیے ایک عظیم الشان محل فلک نما بنوایا تھا جس کا ذکر حالؔی نے اپنی نظم میں بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے حالؔی کا یہ مکان دیکھا ہے جس کے مالک اُس وقت ایک سردار صاحب تھے۔ ہمیں پتا نہیں اس عظیم شخص نے جس گھر میں پچیس برس گزارے ہوں وہ اب کس حالت اور کس کی تحویل میں ہے۔ کیا عمدہ ہوتا اگر اس گھر کو حالی میوزیم میں تبدیل کر کے ان کے نادرات کے ساتھ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا جاتا۔ پروفیسر عزیز الدین ڈایریکٹر رام پور لائبریری نے راقم کو بتایا کہ انہوں نے گورنر قدوائی کی مدد سے اس مکان کو حالی میوزیم میں محفوظ کروایا ہے۔

☆ حالؔی کی مالی حالت خستہ اور کمزور ہونے کی وجہ سے بہت سے کام وہ اپنی زندگی میں نہ کر سکے۔

(الف) حالؔی دلّی میں ایک مطبع کھولنا چاہتے تھے تا کہ فارسی عربی اور اُردو کی عمدہ نایاب اور کم یاب کتابوں کو عمدہ طریقے پر شائع کر سکیں لیکن پیسہ نہ ہونے سے یہ خواب شرمندہ تعبیر رہا۔

(ب) حالؔی ایک عمدہ میگزین نکالنا چاہتے تھے لیکن یہ کام بھی مالی مشکلات نے انجام ہونے نہ دیا۔

(ج) حالؔی اپنی تصانیف بھی اچھی طرح سے شائع نہ کر پائے۔ حالؔی کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے بیٹے خواجہ سجاد حسین اور نواسے خواجہ فرزند علی نے حالی پریس قائم کر کے حالؔی کی کتابوں کو شائع کیا۔

☆ مختلف واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ حالؔی کو جو کچھ بھی ملتا تھا وہ اپنے اقرو با رشتہ دار اور غریبوں میں صرف کر دیتے تھے۔ جب کبھی کسی شہر جاتے وہاں سے تحفے سوغات خصوصاً خاندان کی لڑکیوں اور عورتوں کے لیے ضرور لاتے۔ یادگار حالؔی میں کئی واقعات ملتے ہیں۔

☆ حالؔی کے ملازم عطاء اللہ کے واقعات میں شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے تذکرۂ حالی میں لکھا ہے کہ حالؔی اپنے بنوائے کپڑے عطاء اللہ کو دے دیتے تھے۔ ایک مرتبہ سردی کے موسم میں

جب عطاء اللہ نے حالی سے کہا کہ رات کو بڑی سردی لگتی تو حالؔی نے اپنی نئی بنوائی ہوئی رضائی عطاء اللہ کو دے دی جب اُس نے کہا کہ یہ تو آپ نے کل ہی بنوائی ہے کوئی پرانی رضائی دے دیجئے تب حالؔی نے کہا یہ تم لے لو ہم اور بنوالیں گے۔

مسافرت:

حالؔی پانی پت میں پیدا ہوئے اور وہیں دفن ہوئے۔ تقریباً زندگی کا ایک چوتھائی حصہ مختلف شہروں میں گزرا۔ زندگی کا پہلا سفر پانی پت سے دلّی کا پیدل کیا جو حصول علم کا آغاز تھا اور آخری سفر فرید آباد کا تھا جو ان کی تخلیقات کی جمع آوری کا تکملہ تھا۔ حالؔی سات سال جہانگیر آباد، چار سال لاہور اور کئی سال دہلی میں اور متعدد بار مقیم رہے۔ علی گڑھ حیدر آباد کراچی الہٰ آباد بھوپال آگرہ بمبئی کے علاوہ ایک درجن سے زیادہ مقامات پر جاتے آتے رہے۔ صحت کی کمزوری، سفر کی تکالیف ان کے مقاصد میں حائل نہ ہوسکیں۔

شمس العلماء کا خطاب:

حالؔی کو جون 1904ء میں شمس العلماء کا خطاب دیا گیا۔ حالؔی کو 1875ء میں ان کی تصنیف مجالس النساء پر چار سو روپے کا انعام دیا گیا تھا۔ ان دونوں واقعات میں تیس سال کا فرق ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کی یہ تحریر کہ شمس العلماء کا خطاب اور انعام حالؔی کو جون 1904ء میں پیش کیا گیا صحیح نہیں معلوم ہوتی کیونکہ خود ڈاکٹر خلیق انجم نے یہ بھی لکھا ہے کہ: ''کوشش کے باوجود مجھے یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ حالؔی کو شمس العلماء کا خطاب اور چار سو روپے کا انعام دونوں ایک ساتھ ملے تھے یا الگ الگ۔''

حالؔی اگر چہ اس خطاب کے بہت پہلے ہی سے حق دار تھے لیکن بعض مصلحتوں کی وجہ سے یہ خطاب انہیں عمر کے آخری حصے میں نصیب ہوا۔ حالؔی کو جب یہ خطاب ملا تو وہ فکر مند اور نگران بھی رہے چناں چہ اپنے چھوٹے بیٹے خواجہ سجاد حسین کو لکھتے ہیں:

> ''خطاب کی تحریک جہاں تک معلوم ہوئی ہے برخوردار تصدق حسین نے معرفت ڈائریکٹر صاحب کے دربار تاجپوشی سے بہت پہلے کی تھی۔ کیوں کہ انہوں نے ڈائریکٹر صاحب کو دینے کے لیے میرے پاس سے میری سب کتابیں اس زمانے میں منگوائی تھیں۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر آرنلڈ نے ڈائریکٹر صاحب کو میرے

حالات سے بخوبی مطلع کر دیا تھا اور اس باب میں بھی تصدق حسین برخوردار نے بہت کچھ تائید کی تھی۔ کیوں کہ خطاب کے شائع ہونے کے بعد انہوں نے مجھے لکھا تھا کہ میں نے ڈائریکٹر صاحب کو اور آرنلڈ صاحب کو اسی معاملے کے متعلق ولایت چٹھیاں بھیجی ہیں۔......اس سے پہلے سائم صاحب کے زمانے میں ماسٹر پیارے لال صاحب نے میرے اور مولانا نذیر احمد صاحب کے لیے ضروری تحریک کی تھی۔ مگر اس وقت معلوم نہیں کیوں التوا ہوا۔

اگر چہ گورنمنٹ کی طرف سے یہ ایک ایسا اعزاز ہے جس کی ہمارے ہم چشم آرزو رکھتے ہیں۔ مگر مجھے تو ایک مصیبت معلوم ہوتی ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں کسی حاکم یا افسر سے کبھی نہ ملتا تھا اور ایسے مواقع سے ہمیشہ الگ تھلگ رہتا تھا۔ مگر اب جب کوئی حاکم ضلع پانی پت میں آوے گا یا جب کوئی نیا ڈپٹی کمشنر کرنال میں بدل کر آوے گا لامحالہ وہاں جانا پڑے گا۔ آج چوتھا روز ہے کہ ٹامسن صاحب ڈپٹی کمشنر کرنال کی خدمت میں حسب تحریر برخوردار تصدیق حسین کے گیا تھا وہ چوں کہ نہایت مہذب اور خلیق ہیں بہت اچھی طرح ملے اور یہ بھی کہہ دیا کہ میں آج ہی پانی پت جاتا ہوں وہاں تفصیلی ملاقات ہوگی۔ چناں چہ وہ تین روز سے یہاں آئے ہوئے ہیں اور کل اُن کے ملنے کو جاؤں گا۔ انہوں نے میری کتابوں کے دیکھنے کی بھی خواہش کی ہے وہ بھی اِدھر سے اُدھر سے مانگ تانگ کر لے جاؤں گا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ درگاہ قلندر صاحب اور کابل باغ وغیرہ عمارتِ قدیمہ کے دیکھتے وقت مجھے بھی بلایا جاوے گا۔ بھلا میں کہاں اور یہ دردِ سر کہاں؟''

پوشاک:

حالؔی کے بیٹے سجاد حسین کہتے ہیں۔ حالؔی کی پسند نفیس تھی۔ کپڑا خریدتے تو بہت دیکھ بھال کر کے رنگ ڈیزائن اور قسم سب موزوں ہو۔ جوانی میں باریک اور نفیس کپڑا پہننا پسند کرتے تھے چونکہ سودیشی کے حامی تھے اس لیے اگر پانی پت کی بنی ہوئی باریک کھدر مل جاتی تو اس کے کپڑے پہن کر خوش ہوتے۔ عام طور سے کرتا پاجامہ اور اچکن پر سردیوں میں چوغہ یا روئی کا دگلہ پہن لیتے

گلے میں مفلر اور سر پر گول سی ٹوپی بھی پہن لیتے ۔

خوراک:

حالیؔ کی خوراک کم اور سادہ تھی ۔ ترکاریاں بہت پسند تھیں ۔ پھلوں میں آم اور خربوزوں کے عاشق تھے ۔ آم کی شناخت تھی اور اچھے آم خریدتے تھے ۔ چائے اور بسکٹ ہمیشہ تیار رکھتے ۔ پان تمباکو اور افیون کی گولیاں کھاتے حقے کا استعمال بھی ہر روز کرتے رہتے ۔ آخری عمر میں دانتوں کی تکلیف کی وجہ سے پان کھانے میں کمی کر دی تھی ۔

خوراک میں انتخاب اور اعتدال تھا جو آخری عمر تک برقرار رہا۔

آغاز شاعری:

ہمیں تحقیق اور تلاش کے باوجود یہ صحیح طور پر معلوم نہ ہوسکا کہ حالیؔ نے کس عمر میں شعر کہنا شروع کیا اور ان کا پہلا شعر یا پہلی غزل کون سی ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ حالیؔ فطری شاعر تھے چناں چہ دہلی جانے سے پہلے ہی یہ شاعری کا پودا ان کے دل و دماغ میں نشو ونما پانے لگا جس کا ایک سبب پانی پت میں موجود حالیؔ کے استاد سید جعفر علی تھے جو ممنون دہلوی کے بھتیجے اور داماد بھی تھے جن سے فارسی لٹریچر کی کتابیں پڑھی تھیں اس وقت حالی کی عمر پندرہ سولہ برس سے بھی کم تھی ۔ اس کی دوسری وجوہات میں حالی کا حافظہ، گیرائی اور مشاہدے کی گہرائی کے علاوہ بچپن ہی سے رنج و مصائب سے دوچار ہونے کے سبب دل و دماغ کا سوز و گداز بھی تھا۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ حالیؔ جب پہلی بار ڈیڑھ سال دلی میں رہے اس وقت ادبی اور شعری محفلوں میں شرکت کرتے تھے غالبًا دوسری بار جب 1861ء میں ملازمت کی تلاش میں دلی آئے تو شعر وسخن کی محفلوں میں شرکت کرنے لگے ۔ دہلی میں محمد اکرام خان شیدا کا دیوان خانہ ادبی مرکز بنا ہوا تھا جہاں شعر وسخن کی محفلیں ہوتی تھیں جن میں سید انور، سید ظہیر اور مرزا سالک کے ساتھ حالیؔ بھی شریک بزم رہتے ۔ حالیؔ اپنی کہانی میں لکھتے ہیں:

> ''جس زمانہ میں میرا دلی جانا ہوا تھا۔ مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ مرحوم کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا اور اکثر ان کے اردو فارسی دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے ان کے معنی ان سے پوچھا کرتا تھا اور

چند فارسی قصیدے انہوں نے اپنے دیوان میں سے مجھے پڑھائے بھی تھے۔ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکرِ شعر کرنے سے منع کیا کرتے تھے مگر میں نے جو ایک آدھ غزل اردو یا فارسی کی لکھ کر ان کو دکھائی تو انہوں نے مجھ سے یہ کہا کہ اگر چہ میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمہاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔مگر اس زمانے میں ایک دو غزل سے زیادہ دلی میں شعر لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔''

حالؔی کی اس تحریر سے یہ پتا چلتا ہے کہ انہوں نے تئیس (23) چوبیس (24) برس کی عمر میں شعر گوئی شروع کی۔ غالبؔ کی نصیحت نے حالؔی کو پابند مشقِ سخن کر دیا تھا لیکن بعد میں وہ ہمیشہ فکرِ شعر گوئی میں مشغول ہو گئے۔اس زمانے میں وہ دلّی کے ماحول سے متاثر رہ کر عشقیہ شعر کہتے اور عاشقانہ اشعار پسند کرتے تھے۔

پڑھنے کا انداز:

حالؔی کے شعر پڑھنے کا انداز فطری اور پر تاثیر تھا۔ وہ تحت اللفظ پڑھتے تھے اور آواز میں دلکشی تھی۔مولوی عبدالحق نے انہیں کئی جگہ پڑھتے سنا تھا چناں چہ اپنی کتاب ''چند ہم عصر'' میں لکھتے ہیں: آج کل تو ہمارے اکثر شاعر لَے سے یا خاص طور پر گا کر پڑھتے ہیں اُن کا ذکر نہیں، لیکن جو تحت اللفظ پڑھتے ہیں ان میں بعض طرح طرح سے چشم و ابرو، ہاتھ، گردن اور دوسرے اعضا سے کام لیتے اور بعض اوقات ایسی صورتیں بناتے ہیں کہ بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔مولانا سیدھے سادے طور سے پڑھتے تھے البتہ موقع کے لحاظ سے اس طرح ادا کرتے ہیں کہ اس سے اثر پیدا ہوتا تھا۔ ایک بار علی گڑھ کالج میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ تھا۔مولانا کا مزاج کچھ علیل تھا انہوں نے اپنی نظم پڑھنے کے لیے مولوی وحید الدین سلیم صاحب کو دی، جو بلند آواز مقرر اور پڑھنے میں کمال رکھتے تھے۔سلیمؔ صاحب ایک بند ہی پڑھنے پائے تھے کہ مولانا سے نہ رہا گیا نظم ان کے ہاتھ سے لے لی، اور خود پڑھنی شروع کی، ذرا سی دیر میں ساری مجلس میں کہرام مچ گیا۔

شیفتہ کی مصاحبت:

حالیؔ کی زندگی میں نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کی صحبت غالبؔ سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے جیسا کہ انہوں نے خود اپنے قلم سے اپنی کہانی میں لکھا ہے۔

"غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں بیکاری کی حالت میں گذر گئے تو فکر معاش نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا حسن اتفاق سے نواب مصطفیٰ خاں مرحوم رئیس دہلی وتعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر سے جو فارسی میں حسرتیؔ اور اردو میں شیفتہ تخلّص کرتے تھے اور شاعری کا اعلیٰ درجہ کا مذاق رکھتے تھے شناسائی ہوگئی اور آٹھ سات برس تک بطور مصاحبت کے ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔ نواب صاحب جس درجہ کے فارسی اور اُردو زبان کے شاعر تھے۔ اس کی بہ نسبت ان کا مذاق شاعری بمراتب بلندتر اور اعلیٰ تر واقع ہوا تھا۔ انہوں نے ابتدا میں اپنا فارسی اور اردو کلام مومن خاں کو دکھایا تھا۔ مگر ان کے بعد وہ مرزا غالب سے مشورہ سخن کرنے لگے تھے۔ میرے وہاں جانے سے ان کا پرانا شعر وسخن کا شوق جو مدت سے افسردہ ہورہا تھا تازہ ہوگیا اور ان کی صحبت میں میرا طبعی میلان بھی جو اب تک مکروہات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا چمک اٹھا۔ اسی زمانہ میں اُردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ انہیں کے ساتھ میں بھی جہانگیر آباد سے اپنا کلام مرزا غالب کے پاس بھیجتا تھا۔ مگر درحقیقت مرزا کے مشورہ و اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا۔ بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا وہ نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔ وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق وواقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانا منتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے چھچھورے اور بازاری الفاظ ومحاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہؔ اور غالبؔ دونوں متنفر تھے۔ نواب شیفتہؔ کے مذاق کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہوسکتا ہے کہ ایک روز انیس کا ذکر ہورہا تھا۔ انہوں نے انیس کے مرثیہ کا یہ مصرع پڑھا۔ ع

آج شبیر پہ کیا عالمِ تنہائی ہے

اور کہا کہ انیسؔ نے ناحق مرثیہ لکھا یہی ایک مصرع بجائے خود ایک مرثیہ کے برابر تھا۔ ان کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ہوگیا۔"

حالؔی کی تحریر سے شیفتہ سے تعلقات کے علاوہ ان کی شخصیت اور ان کے فن پر بھی روشنی پڑتی ہے اسی راستے سے حالؔی کو غالبؔ کی منزل ملی اور غالب نے حالؔی کی شعری اور فکری دنیا میں وہ تبدیلیاں لائیں جو ایک خستہ شاعر کو خالی سے حالی بنا دیا۔ غالب کا مشہور قطعہ جو حالؔی کی نصیحت کے جواب میں لکھا گیا اس کا مخاطب مصطفیٰ خان شیفتہ ہی ہے۔

تو ای شیفتہ و حسرتی لقب داری　　ہمی بہ لطف تو خود را امیدوار کنم
چو حالؔی از من آشفتہ بی سبب رنجید　　تو گر شفیع نگردی بگو چہ کار کنم
دوبارہ عمر دہندم اگر بفرض محال　　براں سرم کہ دراں عمر این دو کار کنم
یکی ادائے عبادت عمر پیشینہ　　دگر بہ پیش گاہی حالی اعتذار کنم

یعنی تو جو شیفتہ اور حسرتی لقب رکھتا ہے میں صرف تیری محبت اور لطف پر بھروسہ رکھتا ہوں حالؔی مجھ سے خفا اور بغیر کسی وجہ کے رنجیدہ ہے اگر تو سفارش نہ کرے تو کہہ میں کیا کروں۔ اگر دوبارہ مجھے اس دنیا میں پیدا کیا جائے تو میں صرف دو کام کروں گا ایک گذشتہ عمر کی عبادت جو میں نے نہیں کی اور دوسرے حالؔی سے معذرت خواہی۔

حالؔی کی ملاقات شیفتہ سے دلّی میں ہوئی تھی اور پھر حالی جہانگیر آباد میں جو شیفتہ کی جاگیر تھی سات آٹھ سال مقیم رہے۔ صالحہ عابد حسین اور مالک رام نے لکھا ہے کہ شیفتہ نے اپنے چھوٹے بیٹے نقش بند خان کی اتالیقی کے لیے حالؔی کا استخدام کیا جس کی شدت سے تردید کرتے ہوئے ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں۔ ''مالک رام صاحب نے حالؔی کے بارے میں شیفتہ کی جو رائے نقل کی ہے مجھے اس کا علم نہیں کہ اس کا ماخذ کیا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ مالک رام صاحب کے بیان کی بنیاد حالؔی سے ان کی عقیدت اور حالؔی کے خاندان کے لوگوں سے ان کے ذاتی تعلقات ہیں......

مالک رام صاحب اور صالحہ عابد حسین کو یہ محسوس ہوا کہ اگر حالؔی کو شیفتہ کا مصاحب بتایا جائے تو اردو ادب میں حالؔی کی قدر و قیمت کم ہو جائے گی حالاں کہ حالؔی یہ نہیں سوچتے تھے۔ انہوں نے خود کہا ہے کہ وہ شیفتہ کے مصاحب تھے۔ اگر وہ شیفتہ کے چھوٹے بیٹے نقش خان یا ان کے بچوں کے اتالیق ہوتے تو اس کا ذکر ضرور کرتے۔ شیفتہ کا مصاحب ہونا حالؔی کے لیے نہیں مالک رام اور صالحہ عابد حسین کے لیے شرم کی بات تھی۔''

راقم کی نظر میں مصاحب ہونا یا اتالیق ہونا شخصیت کے علم وفضل اور عمر کی نسبت سے ہوتا ہے۔ حالؔی سات آٹھ سال جہانگیر آباد میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہ تھے۔ مصاحبت ان دنوں کچھ شام کے گھنٹوں پر مبنی تھی۔ یہ سچ ہے کہ حالؔی اپنی کہانی میں سات آٹھ جملوں میں شیفتہ کی مصاحبت کی سات آٹھ سالہ مصروفیات کو مکمل اور مستند طور پر بیان نہیں کر سکتے تھے ان دنوں کی گزارشات کو گھر کے افراد ہی بہتر بتا سکیں گے۔ صالحہ نے اپنے والدین سے جو سنا ہے ہم کو اُسے صحیح ماننا پڑے گا جب تک کہ کسی مستند حوالے سے اس کی تردید کی جا سکے۔ حالؔی بچپن سے ہی تعلیم کے شیدا تھے وہ ایک عمدہ معلم بھی تھے اور انہوں نے ساری عمر تعلیم اور علم کے فراہم کرنے میں صرف کردی یہ تو شیفتہ کے لیے مایہ افتخار ہے کہ حالؔی جیسا عمدہ انسان ان کی صحبت میں رہا اور شیفتہ کے بچوں کے لیے باعث فخر کہ حالی ان کے اتالیق رہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شیفتہ کی صحبت نے حالؔی کی فکری اور شعری جہتوں کو مہمیز کیا۔ ان کی فکر سے مولویت کم کی اور وسعت نظری سے ہم کنار کیا۔ حالؔی مالی لحاظ سے آسودہ خیال رہے چناں چہ ان کے انتقال کے بعد پھر روزگار کی تلاش میں لاہور میں پناہ لی۔ شیفتہ ہی کے ذریعے غالب کے قریب پہنچے اور غالب کی مصاحبت اور استادی کے فیض سے مستفید ہوئے۔ غدر کے زمانے اور اس کے بعد بھی جہانگیر آباد نسبتاً ایک ایسا مقام تھا جہاں حالؔی اپنے فن اور شخصیت کو سنوار رہے تھے۔ کیا خوب ہوتا کہ حالؔی یادگارِ شیفتہ لکھ دیتے تا کہ ہمیں ان مسئلوں میں الجھنے کی ضرورت نہ ہوتی۔

بیماریاں:

حالؔی جوانی سے کئی امراض سے دوچار تھے اس کی وجوہات ان کی صحت کی دیکھ بھال سے غفلت، ورزش وغیرہ سے دوری اور پان تمباکو اور حقے کا استعمال تھا۔ چونکہ طبیعت میں اعتدال تھا اس لیے ان تمام مسائل کے باوجود اپنے زمانے اور مقام کے لحاظ سے اچھی عمر بسر کی۔

- ☆ جوانی میں اسہال نے بہت کمزور کر دیا تھا۔ اسی زمانے سے انہیں بواسیر کی بھی شکایت تھی۔
- ☆ نزلہ، کھانسی، دمہ اور سانس کی تنگی شاید تمباکو اور حقے کے استعمال کے باعث برونکائیٹس کے سبب ہو۔ حالؔی کے داہنے بازو میں درد و سوزش کی وجہ سے پلاسٹر وغیرہ بھی لگایا گیا تھا۔
- ☆ سوزش سینہ اور درد معدہ قلب کی وجہ سے ہو سکتا تھا۔

☆ دانتوں کی تکلیف، مسوڑوں میں سوجھن وغیرہ دانتوں کی حفاظت سے غفلت اور پان وغیرہ کے باعث تھی۔

☆ کم خونی بے وجہ فصد کھولنے کے باعث تھی۔

☆ سانس کی تنگی قلب کی نارسائی، کم خونی اور دمے کے باعث تھی۔

☆ نیند کا کم ہونا دماغی Stress یا کم قوتی کا سبب ہوسکتی ہے۔

☆ حالی کی بینائی میں کمی رعشہ بھی اعصاب کی کمزوری کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔ کم بینائی موتیا اترنے یا Catract کے باعث تھی۔ چناں چہ انہوں نے دو مرحلوں میں پٹیالہ اور لکھنو کے سرجنوں سے عمل جراحی کروا کر عینک کے استعمال سے کسی حد تک اپنی بینائی کو برقرار رکھا جس کے سبب وہ اپنی تصنیف و تالیف کے علاوہ روزمرہ کے کام مکتوب نگاری وغیرہ خود انجام دیتے تھے۔

حالؔی نے اپنے خطوں میں اپنی صحت سے غفلت اور بیماریوں کا ذکر کیا ہے۔ حالؔی کی طبیعت میں جو کسی کام کرنے کی سچی لگن تھی وہ انہیں ان تمام مشکلات اور بیماریوں کے باوجود اُس کام کو بدرجہ احسن انجام دینے میں مددگار ثابت ہوئی۔

مرض الموت:

مولانا اسماعیل پانی پتی، خواجہ عبدالحمید اور صالحہ عابد حسین کی تحریروں سے حالؔی کے آخری زمانے کے حالات سے واقفیت ہوتی ہے۔ آخری وقت حالؔی اپنے اطراف اور ماحول سے واقف تھے۔ کوئی بات کرتا تو سمجھ جاتے تھے اور چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی جو بعد میں بے بسی میں تبدیل ہو جاتی کیوں کہ جواب نہیں دے سکتے تھے۔ بعض اوقات ایک دو لفظ کہہ لیتے۔ یہ تمام علامتیں شدید دماغی Deppression اور Dementia کی ہوسکتی ہیں جو روز بروز بد سے بدتر ہوتی گئیں اور آخرکار 31 دسمبر 1914ء رات کے 1 بجے حالی اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔

تجہیز و تکفین:

انتقال کے بارہ گھنٹے بعد یعنی یکم جنوری 2 بجے دن حالؔی کو حضرت شاہ شرف الدین بوعلی

قلندر کی درگاہ میں مدفون کر دیا گیا۔ صالحہ عابد حسین لکھتی ہیں: ''جب حالی کی وفات ہوئی تو شاید پہلی مرتبہ پانی پت میں شیعوں اور سنیوں دونوں نے ایک ہی شخص کی نماز جنازہ پڑھی اور اس کے بعد یہی واقعہ مولانا حالی کی پوتی کی وفات پر ہوا جو اپنے دادا کی طرح بے تعصبی اور عالی ظرفی میں ضرب المثل تھیں۔ حالی کے لوح مزار پر علامہ اقبال کا فارسی شعر کندہ ہے۔

طوافِ مرقد حالی سزد ارباب معنی را
نوائے او بجان ہا فگند شوری کہ من دارم

یعنی حالی کی قبر کا طواف اہل فہم کو جچتا ہے کیوں کہ ان کے کلام کی آواز لوگوں کی زندگی میں انقلاب بپا کر دیتی ہے جس سے میں واقف ہوں۔

راقم نے اس پورے قطعہ کو جو اقبال نے حالی کی سوسالہ سالگرہ کے موقع پر پانی پت میں پڑھا تھا ایک جداگانہ مضمون میں ترجمہ کے ساتھ پیش کیا ہے تا کہ حالی سے اقبال کی عقیدت ظاہر ہو جائے۔ اقبال نے حالی کی موت کے مضمون کو بھی بانگِ درا کا جز قرار دیا ان کی نظم حالی وشبلی میں لکھتے ہیں:

شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہلِ گل ستاں
حالی بھی ہو گیا سوئے فردوس رہ نورد

ملک بھر میں حالی کے انتقال پر جلسے، مجالس منعقد کیے گئے۔ کئی نامور اشخاص نے منظوم اور نثری خراج عقیدت پیش کیا۔ بعض عمدہ قطعہ تاریخ وفات بطور نمونہ یہاں درج کی جاتی ہیں۔

حامد حسن قادری نے ہجری اور عیسوی میں وفات کی تاریخیں نکالیں۔

تاریخ از کلام پاک

1333 ہجری

فبشرہ بمغفرۃ

1914 عیسوی

حالی کی فاتحہ خوانی چہلم 21 فروری 1915ء کو پانی پت میں شاندار پیمانے پر منائی گئی جس میں ملک بھر کے مشاہیر شریک ہوئے اور یہ طے پایا کہ حالی کی یاد میں ہائی اسکول قائم کیا جائے۔

منظوم کلام:

جدول اشعار حالؔی

شمارہ	عنوان	تعداد	زبان	ہیئت	تعداد شعر
۱	قطعات اُردو	٦٧	اُردو	قطعہ	۴٧٠
۲	رباعیات اُردو	١٦١	اُردو	رباعی	٣٢٢
٣	غزلیات اُردو	١٢٣	اُردو	غزل	١٢٦١
۴	قصاید اُردو	٨	اُردو	قصیدہ	٣٢٦
۵	منظومات سپاس مدح دعائیہ اُردو	١٩	اُردو	قطعہ	٣٢٠
٦	شخصی مراثی اُردو	٧	اُردو	متفرق ہیت	٣٨١
٧	نظمیں اُردو	٣٣	اُردو	قطعہ/مثنوی/متفرق	٣٢٩٥
٨	بچوں کی نظمیں اُردو	١۴	اُردو	متفرق ہیت	٣٦٧
٩	مسدس مع ضمیمہ اُردو	١	اُردو	مسدس	١٣٧۴
١٠	قطعات تاریخ اُردو	٨	اُردو	قطعہ	٣٨
١١	تراجم اُردو	۴	اُردو	متفرق ہیت	٢٦٣
١٢	متفرقات اُردو		اُردو	متفرق ہیت	١٠٣
١٣	اشعار فارسی		فارسی	متفرق ہیت	٦٨٧
١۴	اشعار عربی		عربی	متفرق ہیت	١١۵

تعداد کل اُردو اشعار:8518

تعداد کل فارسی اشعار:687

تعداد کل عربی اشعار:115

تعداد کل اشعار مطبوعہ:9322

شجرہ مولانا حالیؔ

خواجہ ایزد بخش

خواجہ امداد حسین (لاولد) — صاحبزادی — خواجہ الطاف حسین

خواجہ اخلاق حسین — عنایت فاطمہ — خواجہ سجاد حسین

مشتاق فاطمہ — خواجہ انفاق حسین — خواجہ اکرام حسین — صدیقہ خاتون

انعام حسین — افضال حسین

ناظورۃ النساء — مسرورۃ النساء

احمد فاطمہ — خواجہ احمد عباس — اختر فاطمہ

فرزند علی — سعیدہ خاتون — عبدالولی

ناظورۃ النساء

محمد ناظم

قریش علی

محمود علی — مسعود علی

مختار فاطمہ — خواجہ غلام السیدین — خواجہ اظہر عباس — سیدہ خاتون — مصداق فاطمہ (صالحہ عابد حسین) (مصنفہ یادگار حالی)

سیدہ سیدین حمید مصنفہ (Hali Mussads)

اس شجرے کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حالی کے دونوں بیٹوں خواجہ اخلاق حسین اور خواجہ سجاد حسین کی اولاد نے اُردو کو عمدہ ادیب نقاد افسانہ نگار اور ماہرین تعلیم دیے۔ خواجہ اخلاق حسین کے نواسے اور نواسی خواجہ غلام السیدین مصنف آندھی میں چراغ، صالحہ عابد حسین مصنفہ یادگار حالی، خواجہ غلام السیدین کی بیٹی سیدہ سیدین حمید اور خواجہ سجاد حسین کی بیٹی کے بیٹے خواجہ احمد عباس ہماری گفتگو کا ثبوت ہیں۔

پیش گفتار

یہ کہنا درست ہے کہ الطاف حسین حآلی کی شاعری بخصوص ان کے مسدس ''مد و جزر اسلام'' کی قدر کی گئی اور وہ نظم عوام میں مقبول بھی ہوئی لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ حآلی کی نثر کے ساتھ انصاف نہیں ہوا جب کہ وہ ایک عمدہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم ادیب اور معتبر نثار بھی تھے۔ حآلی درحقیقت نظم اور نثر دونوں کے مجدّد تھے۔

چنانچہ راقم نے ''مقالاتِ حآلی'' حصّہ اوّل اور حصّہ دوم کو یکجاہ جمع کر کے پرستارانِ اُردو کی خدمت میں پیش کرنے کا موقع حاصل کیا۔ ''مقالاتِ حآلی'' آج سے تقریباً پچھتّر (75) اسّی (80) برس قبل انجمن ترقی اُردو کی جانب سے مولوی عبدالحق نے دو حصّوں میں شائع کیا تھا۔ حصّہ اوّل میں حآلی کے بتیس (32) مقالات اور حصّے دوم میں حآلی کی بارہ (12) تقاریر اور ستائیس (27) تقاریظ شامل تھیں۔ حآلی نے تقاریر مختلف جلسوں، محافلوں اور اجلاسوں میں کیں اور تقاریظ اور ریو یو مختلف کتابوں پر کیا جو کتابوں کے علاوہ کئی رسالوں اور میگزینوں میں شائع بھی ہوئے۔ حآلی کے مضامین کا ایک مختصر مجموعہ سب سے پہلے پروفیسر وحیدالدین سلیم نے 1902ء میں شائع کیا۔ حآلی کے انتقال کے بعد شیخ محمد اسماعیل سکریٹری اورینٹل پبلک لائبریری نے اپنی جستجو اور محنت سے مزید کچھ مضامین ڈھونڈ کر انجمن ترقی اُردو کو دیے جس پر نظر ثانی کر کے مولوی عبدالحق نے مقالات کے نام سے شائع کروایا تھا۔

یہ بھی زمانے کی ستم ظریفی ہے کہ ان مضامین، تقاریر اور تقاریظ سے عوام کے ساتھ

خواص بھی بڑی حد تک ناواقف ہیں۔ یہ تحریریں اور تقریریں حالؔی شناسی کے لیے اس لیے بھی ضروری ہیں کہ یہ مطالب اگر چہ ان کی شاعری میں بھی کم وبیش موجود ہیں لیکن یہاں واضح طور پر بیان کیے گئے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ حالؔی کی شاعری ادب برائے ادب سے زیادہ ادب برائے ہدف اور مقصدیت کی حامی ہے۔ جس کی جیتی جاگتی مثال مسدسِ حالؔی ہے جس کے بارے میں مصلح قوم سرسید نے کیا تھا کہ ''جب (قیامت میں) خدا (مجھ سے) پوچھے گا کہ تو (اعمال میں سے) کیا لایا؟ میں کہوں گا کہ حالؔی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں۔''

جس طرح حالؔی نے شعر و شاعری کی پاکیزگی کی ترغیب دی، اسے جنسیت، عریانیت ابتذال اور سوقیانہ پن سے دور کرنے کی مہم چلائی اُسی طرح حالؔی نے خود اپنی شاعری میں سیاسی، معاشرتی، اصلاحی، مذہبی، اخلاقی، قومی، ملی کے علاوہ حقوق زنان اور بچوں کی تہذیب و تربیت پر بھی عمدہ نظمیں لکھیں۔ حالؔی نے ستّر (70) سے زیادہ تحریریں اور تقریریں انہی موضوعات پر بڑے دلکش اور دل سوز طریقے سے برصغیر کے افراد بخصوص مسلمانوں کو بیدار کرنے اور ان کی غلط فہمیوں کو دور کرنے اور معاشرے کو خوب سے خوب تر بنانے اور ان میں تعلیمی رجحان بڑھانے کے لیے پیش کیں جو اس صحیفۂ میں موجود ہیں۔ ان مقالات سے قاری کو سرسید احمد خان کے کارناموں، خدمات اور ان کی وژن کا پتہ چلتا ہے۔ اگر چہ حالؔی نے احمد خان کی مکمل بائیوگرافی ''حیات جاوید'' ایک ہزار صفحات میں لکھّی لیکن اس کا نچوڑ ''سید احمد خان اور ان کے کام''، ''سرسید کی مذہبی خدمات''، ''مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ''، ''سرسید مرحوم''، ''علی گڑھ کالج میں ایک تقریر''، ''تقریر متعلق مجوزہ مسلم یونی ورسٹی'' وغیرہ جیسے چند مضامین سے حاصل ہو جاتا ہے۔ 31/ دسمبر 1899ء لاہور میں پہلی بار مسلمانوں کے لیے ایک علاحدہ مسلم یونی ورسٹی کی تجویز کا اجلاس ہوا۔ اس موقع پر ہم حالؔی کے بیان کو اس لیے بھی نقل کرنا چاہتے ہیں کہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کا ریزولیوشن علی گڑھ میں نہیں بلکہ لاہور میں پیش ہوا جس سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔

''صاحبو! یہ ریزولیوشن جس کی تحریک کرنے کی مجھے عزت دی گئی ہے،

میں سمجھتا ہوں کہ اس سے زیادہ ضروری کوئی ریزولیوشن آج تک کانفرنس کے کسی اجلاس میں پیش نہیں ہوا۔ غالباً آپ صاحبوں کو معلوم ہوگا کہ سرسید مرحوم نے جب ولایت سے واپس آ کر مسلمانوں کی تعلیم کی بنیاد ڈالنی چاہی تھی، اُس وقت اُن کا ارادہ بجائے محمڈن کالج کے جو اُنھوں نے قائم کیا، درحقیقت ایک محمڈن یونی ورسٹی قائم کرنے کا تھا۔ چناں چہ جو اسکیم آنریبل سید محمود نے ۱۰رفروری ۱۸۷۳ء کو کالج فنڈ کمیٹی میں پیش کی تھی، اُس میں انھوں نے صاف اس بات کی تصریح کی تھی کہ غرض صرف ایک مدرسہ یا کالج ہی قائم کرنا نہیں ہے بلکہ ایک یونی ورسٹی قائم کرنی ہے۔ اور اس اسکیم کی جو کاپی گورنمنٹ میں بھیجی گئی تھی اُس میں بھی یونی ورسٹی کا لفظ لکھا گیا تھا۔ مگر گورنمنٹ شمال مغرب نے اس لحاظ سے کہ اس وقت کمیٹی کی ابتدائی حالت تھی اور اُس کی آئندہ کارروائیوں پر کسی طرح اطمینان نہیں ہوسکتا تھا، کمیٹی کو یہ جواب دیا تھا کہ اگر وہ محمڈن یونی ورسٹی قائم کرنا چاہتی ہے تو گورنمنٹ اُس میں گرانٹ ایڈ نہیں دے گی۔ باوجود اس کے بھی سرسید کا ارادہ مدت تک یہی رہا کہ محمڈن یونی ورسٹی قائم کی جائے اور گورنمنٹ کی امداد سے بالکل قطع نظر کی جاوے۔ مگر بغیر گورنمنٹ کی منظوری کے یونی ورسٹی قائم کرنے میں بے شمار مشکلات کا سامنا تھا اس لیے اُنھوں نے آخر کار محمڈن کالج قائم کرنے پر قناعت کی۔ مگر ۲۶ربرس کے عرصہ میں محمڈن کالج نے توقع سے زیادہ ترقی کی ہے اور گورنمنٹ کی نظر میں بہت کچھ اعتبار کرلیا ہے۔ اس لیے جیسا کہ تھیوڈر ماریسن اسکوائر نے ایک موقع پر پچھلے دنوں میں اپنا خیال ظاہر کیا تھا کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ گورنمنٹ مسلمانوں کو جو اپنی تعلیم کا کام اپنے ہاتھ میں لینا اور گورنمنٹ کو اس بوجھ سے سبکدوش کرنا چاہتے ہیں، مجوزہ یونی ورسٹی قائم کرنے سے مانع آئے گی۔''

''پس جو ریزولیوشن اس وقت پیش ہوا ہے اگر مسلمانوں کو متفقہ کوشش سے یہ تجویز پوری ہوگئی تو اُن کو ایک ایسی عظیم الشان کامیابی حاصل ہوگی جو اُن کے بزرگ لیڈر سر سید مرحوم کو باوجود چالیس برس کی لگا تار کوشش کے اپنی زندگی میں حاصل نہیں ہوئی یہاں تک کہ اس تمنا کو وہ اپنے ساتھ قبر میں لے گئے۔ اور دُنیا پر روشن ہو جائے گا کہ اُس مرحوم نے جو بیج مسلمانوں میں فوقیت کا بویا تھا وہ اکارت نہیں کیا گیا۔''

حالؔی برصغیر کے مسلمانوں کی غلط فہمیاں، نادانیاں، محرومیاں جانتے تھے۔ وہ سرسید کے ہم خیال تھے۔ مذہبی تعصب اور مسلمان فرقوں میں تفرقہ، جاگیرداری نظام اور انگریزوں کی تفرقہ انداز سیاست سے واقف تھے اس لیے ''تہذیب اخلاق'' اور دوسرے رسالوں میں اصلاحی، تعمیری، تعلیمی، سماجی اور قومی بیداری کے حقائق مختلف عناوین کے تحت بیان کرتے تھے۔ مثال کے طور پر ''کیا مسلمان ترقی کر سکتے ہیں؟''، ''دین کی سہولتیں''، ''الدین یسر''، ''مسلمانوں میں عملی قوت کیوں نہیں رہی''، ''موجودہ مذہبی مناظرے''، ''مسلمانوں میں مسئلہ خیرات'' اور ''دُنیا کی کل علم سے چلتی ہے یا عمل سے'' وغیرہ وغیرہ۔ حالؔی جس بات کو سچ سمجھتے اس کے اظہار میں بے باکانہ رویّہ اختیار کرتے اگر چہ کہ وہ کسی کو ناگوار گزرے چناں چہ ان کی تحریروں اور تقریروں میں اس کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔

ان مضامین سے پتہ چلتا ہے کہ حالؔی عالم دین تھے۔ انھیں قرآن، احادیث بنویؐ اور تاریخ اسلام سے واقفیت تھی جس کی روشنی ان کی گفتار سے روشن ہے۔ بعض مضامین جیسے ''انبیاء''، ''قرون اولیٰ کی حق گوئی وحق پسندی''، ''قرآن مجید میں اب نئی تفسیر کی گنجائش باقی ہے یا نہیں؟''، ''مسئلہ حجاب'' وغیرہ وغیرہ، سب مدلّل اور مطمئن بخش متن سے آراستہ ہیں۔

حالؔی سماجی اور اخلاقی قدروں کو اُبھارنا چاہتے تھے کبھی حکیم اجمل خان کے خطاب ملنے پر تہنیت پیش کر رہے ہیں اور کبھی جلسہ تعزیت میں حکیم محمود خان دہلوی کا مرثیہ سُنا رہے ہیں کبھی ''مزاح'' اور کبھی ''حسب نسب'' اور ''تجارت کا اثر عقل اور اخلاق'' پر بیان کر رہے ہیں۔

حاؔلی کا لہجہ دھیما اور پُر اثر تھا یعنی حاؔلی کی زبان سے علم بولتا تھا۔ حاؔلی نے ڈھائی درجن سے زیادہ کتابوں پر تقریظات اور ریویو لکھّے جس کے مطالعے سے کتاب کا متن اور صاحب کتاب کا فن اور منشا عمدگی سے آشکار ہو جاتا ہے۔

وہ حقدار کو حق دینے میں بخیل نہیں تھے مگر مبالغہ بھی ان کی عادت نہیں تھا۔ چند صفحات جو کسی تخلیق، تنقید یا تشریح پر لکھتے تھے تو حاؔلی وہ سب بیان کر دیتے تھے جو بعض افراد دفتر کے دفتر سیاہ کر کے بھی نہیں کہہ سکتے، اس کا راز یہ بھی تھی کہ وہ کلیدی لفظ کو جملوں میں اس طرح رکھ دیتے ہیں کہ اس سے بہتر اس کا مقام اور معنی آفرینی کا اہتمام نہیں ہو سکتا تھا۔

حاؔلی عربی اور فارسی زبان کے بھی ادیب اور شاعر تھے چناں چہ انھوں نے اُردو، عربی اور فارسی میں شاعری بھی کی ہے جو ان کے کلیات میں موجود ہے۔ وہ ترجمے میں یدطولیٰ رکھتے ہیں۔ اس مجموعہ میں جگہ جگہ پر ان کی عربی فارسی دانی کا اعتراف کیے بغیر قاری خاموش نہیں رہ سکتا۔ حاؔلی تخلیقی قدرت کے علاوہ علمی ادبی اور مذہبی علوم کی دولت سے سرفراز تھے اسی لیے جس مسئلہ کو بیان کرتے ہیں اس کو قرآن، احادیث، اسلامی تاریخ اور منطق سے اس طرح سلجھاتے ہیں کہ اس سے اچھا شاید ممکن نہ ہو۔ یہ مضامین تقاریر اور ریویوز وں میں دریا کے مانند بند ہیں جو ذہن کی پیاسی زمینوں کو سیراب کرتے رہیں گے۔

ہمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ اتنے متفرق اور وسیع موضوعات کی بحث اس مختصر سی تحریر میں کریں چناں چہ اس سے مکمل طور پر مستفید ہونے کا تنہا راستہ ان مضامین کا دقیق مطالعہ ہے جس سے ہر شخص عامی اور عالم اپنی اپنی فکری استطاعت کے مطابق فیض حاصل کرے گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حاؔلی شاعر ہونے کے علاوہ ایک باوقار عمدہ ادیب اور عظیم نثار بھی تھے۔ جس طرح وہ نظم کے مجدّد تھے اُسی طرح انھوں نے نثر کو بھی نیا جلوہ دیا ہے۔ آج کی رائج الوقت نثر حاؔلی کی رہین منت ہے۔ حاؔلی چھوٹے بڑے جملوں میں سلیقے اور سادگی کے ساتھ متن کے حوالے سے مناسب الفاظ سے معنی آفرینی کے جوہر دکھاتے ہیں۔ ان کی نثر میں ابلاغ اور ترسیل کے ساتھ تفہیم کو بڑا دخل ہے جس کے لیے وہ ہر مروّجہ

زبان کے نرم الفاظ جس میں زیادہ تر مروّجہ انگریزی الفاظ ہوتے ہیں بغیر کسی ترجمے کے یا کوئی ادق لفظ کے عوض لاتے تھے۔ ''سرسید کی مذہبی خدمات'' کے مضمون کے ایک صفحے سے دو جملوں میں انگریزی الفاظ کی جلوہ گری اور متن کے سمجھنے کی آسانی ہمارے گفتگو کے ثبوت ہیں۔

> ''ایک اِسے (مضمون) میں جو سرسید کے ریویو کے بعد تھیالوجکل ریویو میں شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریمارک کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''اس مصنف کو مبالغے کا جن بسا اوقات نہایت پریشان کرتا ہے اور بہتر ہوتا اگر اس جن کو وہ اتار دیتا۔'' ہم نے سنا ہے کہ کئی برس پہلے سے جو بنگال میں وہابیوں کی گرفتاری برابر جاری تھی سرسید کا ریویو نکلنے کے بعد پھر کوئی وہابی گرفتار نہیں کیا گیا۔''
>
> ''اس تفسیر کی نسبت فرانس کا مشہور اورنٹیلسٹ (مستشرق) مسٹر گارسن ڈی ٹاسی پروفیسر اُردو لٹریچر اپنے ایک لکچر میں لکھا ہے۔''

آخیر میں ہم مشکور ہیں عبدالصمد دہلوی سرپرست ایم آر پبلی کیشنز اور ان کے اراکین کا جن کی وساطت سے یہ مجموعہ منظر عام پر آ کر پرستارانِ اُردو کے لیے ایک عمدہ ادبی علمی تہذیبی اور سماجی تحفہ تلقین کیا جائے گا۔

خیر اندیش

سید تقی عابدی

ٹورنٹو

اپریل 2021ء

دیباچہ

مولانا حالیؔ مرحوم ہماری زبان کے اُن بلند پایہ ادیبوں میں سے ہیں جو شاعر بھی ہیں اور نثار بھی۔ اُردو شاعری میں جو انقلاب انھوں نے پیدا کیا اس کا احسان ہم کبھی نہیں بھول سکتے۔ اُردو نثر بھی اُن کی بہت کچھ زیر بار منت ہے۔ اُن سے پہلے اُردو نثر کو یہ رتبہ حاصل نہیں ہوا تھا جو ان کی بدولت ہوا۔ ان کی نثر نہایت جچی تلی اور متین ہوتی ہے۔ اُن میں ضبط اور اعتدال ایسا ہے جو بڑی مشکل سے نصیب ہوتا ہے اور صرف بڑے بڑے اساتذہ ہی اُس پر قادر ہوسکتے ہیں۔ ورنہ اکثر اچھے اچھے انشا پرداز اپنے جذبات سے مغلوب ہوکر کہیں کے کہیں بھٹک کر نکل جاتے ہیں اور غیر متعلق باتیں کہنے لگتے ہیں۔ اور بعض اوقات بجائے کچھ کہنے کے چیخنے چلانے لگتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جو زیادہ چیخے چلائے گا اُسی کی آواز زیادہ سُنائی دے گی۔ وہ دھوکے میں ہیں، وہ نہ انسانی فطرت سے واقف ہیں اور نہ انشا پردازی کے گُر سے۔ مولانا حالیؔ اُس وقت تک کبھی کچھ نہیں کہتے جب تک کہ انھیں کسی بات کے کہنے یا خیال کے ظاہر کرنے کی حقیقی ضرورت پیش نہیں آتی اور جو کہتے ہیں وہ ایسی کہ دل میں اُتر جائے۔ جب کوئی خیال دماغ میں صحیح اور صاف نہیں ہوتا تو بیان میں بھی صحت اور صفائی نہیں آتی اور ہزار عبارت آرائی کیجیے، دھندلا پن نہیں جاتا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہم خیال ادا تو کرتے ہیں مگر جو ہم چاہتے ہیں وہ بات پیدا نہیں ہوتی، اِس لیے فقروں کے ردّے پہ ردّے چڑھائے چلے جاتے ہیں اور پھر بھی

بات نہیں بنتی۔ ہے کیا؟ ایک لفظ کی کمی ہے جو اس موقع پر آنا چاہیے تھا اور وہ نہیں سوجھا۔ یہ گُر مولانا حالؔی سے سیکھنا چاہیے۔ انھیں لفظ کے صحیح اور برمحل استعمال میں کمال حاصل ہے۔ بعض وقت وہ ہندی کا پرانا یا کوئی غریب لفظ استعمال کر جاتے ہیں لیکن وہ ایسا برمحل ہوتا ہے کہ کلام میں جان پڑ جاتی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم ہار کر نثری شاعری کرنے لگتے ہیں۔ یہ شیوہ صنعت ادبیّت کی دلیل ہے۔ مولانا حتی الامکان کبھی نثر میں شاعرانہ رنگ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ کیوں کہ یہ نہ نظم ہوتی ہے نہ نثر اور خیال کی صحت اور قوت کو ضعیف کر دیتی ہے۔ ان کی نثر میں متانت، قوت، صفائی اور ضبط پایا جاتا ہے جو اعلیٰ نثر کے جوہر ہیں۔

میرا منشا یہاں مولانا حالؔی کی نثر نگاری پر بحث کرنے کا نہیں۔ یہ میں کسی دوسرے وقت کے لیے اُٹھا رکھتا ہوں۔ میں صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ ہم نے اُن کی نثر کی ابھی پوری قدر نہیں کی۔ ان کی نثر کی کتابیں بار ہا طبع ہو چکی ہیں اور اچھی خاصی مقبول ہیں۔ لیکن ان کے مضامین جو وقتاً فوقتاً مختلف رسالوں اور اخباروں میں شائع ہوئے وہ اب تک یکجا جمع نہیں کیے گئے۔ مولوی وحیدالدین سلیم مرحوم نے ایک مجموعہ شائع کیا تھا لیکن وہ بہت مختصر تھا۔ اِن سب کا جمع کرنا آسان کام نہ تھا۔ اوّل تو اُن اخبارات اور رسائل کے نام ہی معلوم کرنا مشکل تھا جن میں یہ مضامین شائع ہوئے تھے، پھر اُن کا بہم پہنچانا اس سے بھی زیادہ مشکل اور کٹھن تھا اور اگر خوش قسمتی سے تلاش اور جستجو کے بعد ان کے فائل کہیں دستیاب ہو گئے تو اُس انبار میں سے ڈھونڈ کر نکالنا کچھ کم دردسری کا کام نہ تھا۔ میں شیخ محمد اسمٰعیل صاحب سکریٹری اورینٹل پبلک لائبریری پانی پت کا ممنون ہوں کہ انھوں نے ایک مدت کی جستجو اور محنت کے بعد یہ مضامین بہم پہنچا کر مرتب کیے اور انجمن ترقی اُردو کو طبع کے لیے دیئے۔ بعض مضامین جو انھیں نہیں ملے تھے وہ میں نے دوسرے ذرائع سے بہم پہنچائے۔ ان مضامین کے حاشیئے بھی شیخ صاحب ہی کے لکھے ہوئے ہیں، میں نے نظرِ ثانی کرتے وقت حسبِ ضرورت کہیں کہیں کمی بیشی کر دی ہے ورنہ یہ سب کام انھیں کا کیا ہوا ہے۔

یہ مضامین جو ''مقالات'' کے نام سے شائع کیے گئے ہیں دو حصوں پر مشتمل ہیں۔ ایک میں عام مضامین ہیں اور دوسرے حصّے میں کتابوں کے تبصرے اور وہ تقریریں ہیں جو مولانا نے بعض مجلسوں یا کانفرنسوں میں فرمائیں۔

میرے خیال میں یہ مجموعہ مکمل ہے اور اب شاید ہی کوئی ایسا مضمون ہوگا جو بچ گیا ہو۔ اس پر بھی اگر مولانا کا کوئی مضمون یا تبصرہ وغیرہ ہماری نظر سے رہ گیا ہے اور کسی صاحب کو اِس کی اطلاع ہو تو وہ براہ کرم اس سے مطلع فرمائیں، طبع ثانی میں شریک کر دیا جائے گا۔

حیدرآباد دکن
۳۰؍اگست ۱۹۳۴ء

عبدالحق
آنریری سکریٹری انجمن ترقی اُردو

مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مناجات بدرگاہِ قاضی الحاجات

(مولانا حالّی نے ۱۸۶۴ء اور ۱۸۷۰ء کے درمیان ایک ''مولود شریف''
اُردو میں لکھا تھا مگر وہ اُن کی زندگی میں نہ چھپ سکا۔ ۱۹۳۲ء میں مولانا
کے فرزند خواجہ سجاد حسین صاحب نے اُسے پہلی مرتبہ شائع کیا۔ یہ
مناجات اُس مولود شریف سے لے کر مضامین کے شروع میں تبرکاً درج
کی جاتی ہے۔)

الٰہی تیرا کرم وسیع، تیری عنایت شامل، تیرا فیض عام، تیرے ہاتھ کشادہ، تیرا ملک بے زوال، تیرے خزانے بے حساب، تیری نعمتیں سرمدی، تجھ سے کیا کیا مانگئے؟ اور کہاں تک مانگئے؟ تجھ سے دولتِ کونین پر راضی ہونا ایسا ہے جیسے بحرِ قلزم سے پیاسا پھرنا۔ تجھ سے دُنیا اور آخرت مانگنی ایسی جیسے خوانِ یغما سے بھوکا اُٹھنا۔ تیرا گدا نہیں جو ہفت اقلیم کی سلطنت پر لات نہ مارے، تیرا بھوکا نہیں جو نعیم جنّت کے لیے ہاتھ پسارے جس نے تجھ سے تیرے سوا آرزو کی اُس نے آرزو کرنی نہ جانی۔ جس نے تیرے ہوتے عرش اور ما دون العرش پر خاک نہ ڈالی اُس نے تیری قدر نہ پہچانی ؎

آنچہ خواہند و بیا بند نخواہند آزا
دیں سخن شمۂ از ہمتِ درویشان است

الٰہی! اگر ظرفِ مختصر میں دریائے بیکراں نہیں سماتا تو ہمارے حوصلے فراخ کر۔ الٰہی! اگر زمینِ شور میں ابرِ فیض رساں اپنا رنگ نہیں جماتا تو ہم کو جوہرِ قابل دے ؎

اگر زیں نا سزا دل عار داری
کرم بسیار و دل بسیار داری

الٰہی! جس طرح اپنے شریک کو صفحۂ امکان سے مٹایا اُسی نقشِ غیر ہماری لوحِ خاطر سے محو فرما۔ الٰہی! جس طرح ستاروں کو سورج کی روشنی میں کھپایا، اُسی طرح ہم کو انوارِ ذات میں مضمحل کر۔ الٰہی! وہ جلوہ دکھا جس کا حجاب اُسی کی یکتائی ہے۔ جس کی اوٹ دیدۂ تماشائی ہے، جو علم و ادراک کے پردوں میں مستور ہے، جس کا منشاء خفا غائتِ ظہور ہے۔ جس کے طالب کو وصول سے قطع نظر ہے، جس کا ملنا حوصلۂ توقع سے باہر ہے، جو تقریر میں نہ آئے، جو تحریر میں نہ سمائے ؎

وہ مانگتا ہوں جس کے بیاں سے زباں ہے لال
اے وائے! گر روانہ ہو مطلب فقیر کا

سیّد احمد خاں اور اُن کے کام

(از ''علی گڑھ انسی ٹیٹوٹ گزٹ''، ۱۸۷۱ء، صفحہ: ۱۱۸)

اِن دنوں میں جناب مولوی سیّد احمد خاں بہادر تمام ہندوستان کی تربیت میں عموماً اور ہماری قوم کی تہذیب اور اصلاح میں خصوصاً جوانمردانہ سعی اور کوشش کررہے ہیں اور اپنے اُس احسان کی بنیاد ڈال رہے ہیں جس کے بوجھ سے ہم اور ہمارے اخلاف کبھی سبکدوش نہ ہوں گے۔

اہل ملک میں سے جولوگ سیّد صاحب کی سرگرمی اور جاں فشانی کو شائبۂ اغراضِ نفسانی سے پاک اور منزّہ نہیں جانتے یا اُن کی رائے قرین صواب نہیں سمجھتے۔ یا اُن کو مسنلکِ ہُدیٰ سے متجاوز رکھتے ہیں، اگر چہ میں نہ کبھی پہلے اُن کو ہم زبان ہوا نہ اب ہوں اور اُمید ہے کہ آگے کو بھی نہ ہوں گا، مگر اس میں شک نہیں کہ اس تحریر سے پہلے اُن کے باب میں میری رائے کبھی تذبذب اور تردد سے خالی نہیں رہی لیکن الحمدللہ کہ میرے تذبذب کا منشا کوئی داعیۂ نفسانی نہ تھا۔ لہٰذا میرے خلوص نے مجھے اس مرض سے نجات دی اور جو رائے میری اب ہے غالباً یہی قرین صواب بھی ہے۔

میرے نزدیک سیّد صاحب کی نسبت لوگوں کا سوءِظن بہ حسب اختلافِ طبائع اِن چار وجہوں میں سے کسی نہ کسی وجہ پر مبنی ہے۔

۱۔ یا تو یہ بات ہے کہ ہم جنسوں کی خیر خواہی اور اُن کی بہبودگی کے لیے تہ دل سے کوشش کرنی اور اپنے عزیز وقت کا ایک معتد بہ حصہ خاص ایسے کام میں صرف کرنا اور بہ حسب بہ مقتضائے مقام، عقل اور مالی تدبیروں میں مضائقہ نہ کرنا اس زمانے

میں ایسا نادرالوجود ہے کہ اگر مردانِ خدا میں سے کوئی جواں مرد اس راہ میں قدم رکھتا ہے تو وہ شوائبِ غرض سے پاک نہیں سمجھا جاتا اور اُس کا خلوص ریاکاری کے سوا اور کسی بات پر محمول نہیں ہوتا۔

۲۔ یا جیسا کہ ہر قوم، ہر ملک اور ہر زمانے میں جن لوگوں نے گزشتہ زمانہ کی رسوم و عادات پر اعتراض کیا ہے یا سلف کے قانونِ معاشرت میں کوئی نیا انقلاب پیدا کرنا چاہا ہے وہ ضرور ہدفِ طعن و ملامت ہوئے ہیں، اسی طرح سیّد صاحب کے حسنِ قبول میں خلل واقع ہوا۔

۳۔ یا یہ کہ سیّد صاحب اپنی صاف باطنی اور کھرے پن سے بعض کلمات ایسے کہہ اُٹھتے ہیں جن کو سن کر بعض سامعین کا حوصلہ تنگی کرتا ہے اور وہ کلمات بجائے محبّت کے اُن کے دلوں میں مخالفت کی بنیاد ڈالتے ہیں۔

۴۔ کیا عجب ہے کہ سیّد صاحب کا تقرب سلطانی بھی کسی تنگ ظرف اور تنگ چشم کی نظروں میں کھٹکتا ہو۔

ان چاروں وجوہات میں سے کوئی وجہ ایسی نہیں معلوم ہوتی جس کی طرف کچھ التفات کیا جائے اور جس سے اُن کی حقیقی اور نفس الامری خوبیوں کو کچھ ضرر پہنچے۔

اور بعض لوگ سیّد صاحب پر جو اعتراض کرتے ہیں کہ اولاد کی دنیوی تعلیم میں اس قدر کوشش کرنی اور آدابِ دین سے بالکل کورا رکھنا کہاں تک قرینِ صواب ہے؟

لباس و طعام وغیرہ میں ابنائے جنس کی مخالفت پر اس قدر مبالغہ کرنا جیسے کوئی فرض و واجبات پر کرتا ہے اور جو نتائج قوم کی تالیف اور موافقت پر مترتب ہوتے ہیں اُن پر لحاظ نہ فرمانا کون سی مصلحت کا مقتضا ہے؟

پہلی بات کا جواب دُنیا ہمارے ذمہ نہیں کیوں کہ جو امور سیّد صاحب کی ذاتِ خاص سے متعلق ہیں وہ ہماری بحث سے خارج ہیں۔

دوسرا امر بے شک ایسا ہے کہ جب تک اُس کا جواب نہ دیا جائے گا اُس وقت تک سیّد صاحب اور اُن کے خاص مددگار اپنے ذمہ سے فارغ نہ ہوں گے۔ اور میں صرف اس

جواب پر اکتفا کرتا ہوں کہ میں نے سیّد صاحب کے معصوم ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔
مگر اِس قدر ضرور جانتا ہوں کہ آج سیّد صاحب اپنی کوششوں کے اعتبار سے اس حدیث کے صحیح مصداق ہیں کہ سیدالقوم خادمھم۔

سیّد صاحب کے کارنامے

کتاب ''خطباتِ احمدیہ'' جو اُنھوں نے لندن میں جا کر تالیف کی ہے ظاہر ہے کہ اپنے لیے ایک عمدہ ذخیرہ آخرت کا مہیا کیا ہے اور کیا عجب ہے کہ فریضۂ حج جو باوجود استطاعت اور قربِ مسافت کے اُن سے ادا نہ ہوسکا اُس کی تلافی اُسی تالیف سے ہوجائے مگر قوم کو بھی اِس احسان کی شکرگزاری سے چارہ نہیں۔ اگرچہ اِس کتاب میں اکثر مضامین اور خیالات ایسے ہیں جن میں ہم جناب مؤلف کو منفرد نہیں کہہ سکتے ہیں لیکن اور بہت سی حیثیتیں ایسی ہیں جن کے اعتبار سے اِس کتاب کو اثباتِ نبوت کی پہلی کتاب کہنا چاہیے اور جن لحاظ سے یہ کہنا غیرموزوں نہیں کہ آج مولوی سیّد احمد خاں صاحب کے سوا دوسرے سے اس کام کا سرانجام ہونا محال تھا۔

رعیت کی آزادی جو اس سلطنت کی بے بہا اور برگزیدہ خاصیتوں میں سے ایک خاصیت ہے اور جس کی حقیقت نہ جاننے سے سلطنت کی بڑی خوبی ہماری آنکھوں سے چھپی ہوئی تھی، اگر سچ پوچھئے تو اس کی معرفت کا دروازہ جو ہم پر کھلا، اُس کی کنجی سیّد صاحب کی آزاد تحریریں ہیں۔ ہم کو وہ زمانہ یاد ہے کہ ایامِ غدر کے بعد ہنوز بغاوت کی آگ مدھم نہیں ہوئی تھی اور گورنمنٹ کی نگاہ تمام ہندوستانیوں پر عموماً اور مسلمانوں پر خصوصاً غضب آلود پڑتی تھی اور چند نااہلوں اور خیرہ سروں کے الزام نے برٹش انڈیا کی کُل قوموں کو خوف ورجا اور اُمید وبیم کے بھنور میں ڈال رکھا تھا اور کیا دوست اور کیا دشمن اور کیا مخالف اور کیا موافق سب کے دلوں پر رعب سلطنت چھایا ہوا تھا۔ اُس وقت اِس الوالعزم جواں مرد نے وہ کام کیا جس سے گورنمنٹ کی حق پسندی اور حق شناسی رعایا پر، اور رعایا کی بیگناہی اور بے جرمی گورنمنٹ پر کَالشَّمس فِی رَابِعَۃُ النَّھَارِ آشکار ہوگئی۔ رسالہ ''اسباب بغاوتِ ہند''

کا لکھنا اگر چہ سیّد صاحب کی آزاد اور بے باک طبیعت کی بے شمار موجوں میں سے ایک موج تھی لیکن ہمارے گرانبار کرنے کو یہ احسان کچھ کم نہ تھا۔

انگلستان سے جو وہ ہر فن اور علم کی منتخب کتابیں اپنے ساتھ لائے ہیں اور یہاں اُن کے اُردو میں ترجمہ کرانے کی سبیلیں نکالنے میں سرگرم ہیں، اگر غور سے دیکھئے تو یہ ہمارے اُن مقاصد جلیلہ میں ہے جن کے حاصل ہونے کی توقع ہم کو اس سے پہلے گورنمنٹ کے سوا اور کسی سے نہ تھی اور جن پر ہمارے وہ کام اٹکے ہوئے ہیں جن کے نہ ہونے سے ہم پر **انسان بالفعل** کا اطلاق اب تک صحیح نہیں ہوا۔

پرچہ ''تہذیب الاخلاق'' جو سیّد صاحب کی حسنِ توجہ سے ابھی جاری ہوا ہے یہ بھی ہماری حدّتِ بصر اور تیزیٔ نظر کے لیے ایک بہت عمدہ وسیلہ ہے۔ بعض لوگ اس پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ''امرِ معاش میں اس قدر منہمک ہونے کی ترغیب دینی گویا امرِ معاد کی طرف سے بالکل ذہول اور غفلت کا پردہ ڈالنا ہے کیوں کہ چین، مصر اور یونان کی تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن لوگوں کی عقلِ معاش کو جس قدر ترقی ہوتی گئی اسی قدر عقلِ معاد میں تنزل ہوتا گیا، اور رفتہ رفتہ امرِ دین میں ایسے کوتاہ بیں اور ناعاقبت اندیش ہو گئے کہ اُن کی حماقت کی مثالیں شمار اور بیان کی حد سے باہر ہیں اور اب یورپ کی اعلیٰ درجہ کی ترقی سے جو نتائج دین اور مذہب پر مترتب ہوئے ہیں وہ ایسے روشن اور ظاہر ہیں کہ اُن کے بیان کرنے کی حاجت نہیں۔'' اگر چہ یہ اعتراض ایسا نہیں ہے جس سے ''تہذیب الاخلاق'' کی خوبی کو دھبہ لگے لیکن اس سے بچنے کے لیے میانہ روئی اختیار کرنی اور دونوں مصلحتوں کو ملحوظ رکھنا اور اعتدال کی حد سے تجاوز نہ کرنا قرینِ صواب ہے نہیں بلکہ واجب ہے اور اس پرچہ کا مقبولِ خاص و عام ہونا زیادہ تر اِسی بات پر موقوف ہے۔

علی گڑھ سوسائٹی جو اپنے بانی کے حسنِ سلیقہ اور نیک نیتی پر گواہی دیتی ہے اور جس کی دیکھا دیکھی اور بہت سی علمی مجلسیں ہندوستان میں منعقد ہوئیں اگر چہ آج تک اُس کی خوبی کو نہیں پہنچیں۔ اُس کی مثال ہماری نسبت ایسی ہے جیسے ایک خشک پودے میں پانی دیا جائے۔ جس طرح پانی دینے سے خشک پودا اُسی وقت سرسبز اور بارور نہیں ہو جاتا، اسی طرح

اِس سوسائٹی کے فوائد اور منافع اگرچہ بالفعل محسوس نہیں ہوتے، لیکن ہم لوگ اُن سے برابر متمتع ہوتے چلے جاتے ہیں اور اب جو اس کے بانی اور سرگردہ اور میر مجلس یعنی مولوی سیّد احمد خاں بہادر عنقریب علی گڑھ میں رونق افروز ہونے والے ہیں، اُمید ہے کہ اُن کی موجودگی میں اُس کی کوششیں اور زیادہ بارآور ہوں گی۔

کمیٹی خواست گارِ ترقی اہلِ اسلام جس کے سرِ منشاء اور مہتمم سیّد صاحب ممدوح ہیں۔ اس کا قائم ہونا اس مرض کا علاج ہے جس نے ہماری قوم میں اُنس باقی نہیں رکھا اور جو اس کمیٹی کے قائم ہونے سے پہلے لاعلاج معلوم ہوتا تھا۔

کاش! ہمارے ملک کے دولت مند مسلمان اِس کمیٹی کے مطلب اور مقاصد کو غور سے دیکھیں اور سمجھیں کہ سیّد صاحب نے اُن کے اور اُن کی قوم کے لیے کیسا اعلیٰ طریقہ نکالا ہے اور وہ بارگراں جو سیّد صاحب نے محض بہ مقتضائے رقت جنسیت اپنے سر پر رکھا ہے اُس کے اُٹھانے میں آپ بھی شریک ہوں اور صرف روپے پیسے ہی سے نہیں بلکہ جان و دل سے اُن کی امداد کریں۔

یہاں کے مسلمانوں میں جو روز بروز جہل پھیلتا جاتا ہے اور جس بات میں وہ ہندوستان کی عام قوموں میں ممتاز گنے جاتے تھے اب اُسی بات میں سب سے زیادہ مبتذل ہوتے جاتے ہیں، اس کا بڑا سبب دولت مند مسلمانوں کی بے اعتنائی، تن آسانی اور نفس پروری ہے، کیا وہ اس بات کو گوارا کرتے ہیں کہ دلّی اور لکھنؤ سے شہر جو ہندوستان کے بڑے دارالعلم گنے جاتے ہیں، اُن میں کوئی اتنا نہ رہے جس سے یہ پوچھا جائے کہ نماز میں کتنے فرض ہیں؟ اور وضو کن کن چیزوں سے ٹوٹتا ہے؟ کیا وہ اس بات کو جائز رکھتے ہیں کہ جو شائستہ قوم آج ہندوستان میں فرمانروا ہے اور جس کے زن و مرد اور پیر و جوان سب علم و دانش کے پتلے اور جہل و ناشائستگی کے دشمن ہیں اُن کے عہد میں مسلمانوں سے زیادہ کوئی ذلیل و خوار نہ رہے۔

سیّد صاحب کی جو یہ تمنّا ہے کہ مسلمانوں کے حسنِ اتفاق سے ہر ضلع میں کم سے کم ایک مدرسہ ایسا قائم ہو جس میں علومِ قدیمہ اور فنونِ جدیدہ کی تعلیم بوجہِ شائستہ ممکن ہو، سو

خدا تعالیٰ ان کی یہ آرزو پوری کرے۔

ظاہراً اس کوشش کے بارور ہونے میں ابھی بہت دن باقی ہیں، ہاں اگر دولت مند اور ذی مقدور مسلمانوں نے اس مہمِ عظیم کا بوجھ صرف سیّد صاحب ہی پر نہ ڈالا اور اُن کے درد میں آپ بھی شریک ہوئے اور اپنے عیش وعشرت کے اوقات ومصارف کا ایک معتد بہ حصہ اُن کی غم خواری میں صرف کیا تو البتہ خدا تعالیٰ کی ذات سے اُمید ہے کہ ہندوستان کے پانچ سات بڑے بڑے شہروں میں ایسے مدرسوں کی بنیاد پڑ جائے اور جو تاریکی ساری قوم پر چھا رہی ہے اُس کے دور ہونے کی کچھ کچھ اُمید بندھے۔

اگر مسلمانوں نے اب بھی بے پرواہی کو کام فرمایا اور سیّد صاحب کا ساتھ دینے میں کوتاہی کی اور اپنی آئندہ نسلوں کے لیے کچھ پود نہ لگائی تو اُن کی وہی مثل ہوگی جیسا کہ شمالی امریکہ کے وحشیوں کے حال میں لکھا ہے کہ جس وقت لین کسٹو کا وہ عہد نامہ لکھا گیا جو ۱۷۴۴ء میں سلطنت ورجنیا اور چھ قوموں میں بہ مقام پنسل وینیا قرار پایا تھا اُس کے لکھے جانے کے بعد سلطنت ورجنیا کے ایلچیوں نے امریکہ والوں سے کہا کہ ''وانمیز برگ میں ایک کالج ہے اُس میں اِس ملک کے لڑکوں کی تربیت کے لیے کچھ روپیہ جمع ہے، اگر تم میں سے چھ قوموں کے سردار اپنے لڑکے کالج میں بھیج دیں تو ہماری سرکار سے ہر شئے کا سرانجام ہوسکتا ہے اور یورپ کے کُل علوم اُن کو سکھائے جائیں گے۔'' اُن وحشیوں نے کہا: ''پہلے ایک بار ہمارے لڑکوں نے اضلاعِ شمالی کے کالجوں میں تعلیم پائی تھی اور ان کو تمہارے علوم سکھائے گئے تھے مگر وہ پڑھ لکھ کر آئے تو ہمارے کام کے نہ تھے۔ بھاگنا، جنگل میں رہنا، کوٹھا بنانا تا ہرن پکڑنا، کچھ نہ جانتے تھے۔ ہم کو منظور نہیں کہ اپنی اولاد کو علم پڑھا کر اپنے کاموں سے بالکل کھودیں۔''

میں نے یہ جو کچھ لکھا ہے اس سے مجھ کو مولوی سیّد احمد خاں کا خوش کرنا منظور نہیں نہ اُن کے مخالفوں سے بحث کرنی مقصود۔ بلکہ اس کا منشا وہ ضرورت اور وہ مصلحت ہے جس کے سبب سے بھولے کو راہ بتائی جاتی اور مریض کو دوائے تلخ کی ترغیب دی جاتی ہے۔

وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ

انبیاء

نبی کی ضرورت پر ایک وجدانی شہادت

(از: رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جلد: ٦، نمبر ١٣، بابت یکم شوال ١٢٩٢ھ، صفحہ: ١٦٠ تا ١٦٤)

جو باتیں انسان کو مذہب نے تعلیم کی ہیں اور جن کو وہ الہامی جانتا ہے وہ عموماً
یا تو خدا تعالیٰ کی ذات وصفات سے علاقہ رکھتی ہیں۔
یا اُس سزا و جزا سے جس کا وقت موت کے بعد مقرر کیا گیا ہے۔ اور اس لیے ہم تمام مذہبی تعلیمات کو علم مبدأ و معاد کہتے ہیں۔

پس ''نبی کی ضرورت'' ثابت کرنے کے لیے، ہم کو دو باتوں کا ثبوت دینا کافی ہے۔

ایک یہ کہ ''مبدأ و معاد'' نفس الامر میں ایسی دو حقیقتیں ہیں جن کا علم حاصل کرنا انسان پر واجب ہے۔

دوسرے یہ کہ ''مبدأ و معاد'' کا علم نبی کے سوا کسی اور ذریعہ سے حاصل نہیں ہوسکتا۔

جس طرح مثلاً عملِ کیمیا کے ذریعہ سے ہم اِس بات کا مشاہدہ کرا سکتے ہیں کہ پانی بسیط نہیں ہے بلکہ دو مختلف گیسوں یعنی او کسیجن اور ہائیڈروجن سے مرکب ہے، اس طرح ہم یہ ہرگز نہیں دکھا سکتے کہ یہ مبدا ہے اور یہ معاد۔ لیکن ہم ان دونوں چیزوں کے وجود پر انسان کی اصل فطرت کو گواہ کر سکتے ہیں اور اُس کی گواہی ہمارے نزدیک مشاہدہ سے بھی زیادہ یقینی ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ انسان کا حال جو تفحص کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے تو ادنیٰ تامل کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو اکثر چیزوں کا علم محنت کرنے، سیکھنے اور غور

کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔اس کو کسبی علم کہتے ہیں جیسے پڑھنا لکھنا، ایجادات واختراعات کرنا، کھانا پکانا، بونا اور کاٹنا وغیرہ۔

بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کا علم انسان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔اس کو فطرتی یا وہبی یا قدرتی علم کہتے ہیں۔مثلاً ضرورت کے وقت کھانا پینا، دھوپ اور مینھ میں سایہ ڈھونڈنا، جاڑے میں گرم ہونے کی تدبیریں کرنی۔ یہ باتیں اس کو فطرت کے سوا کسی نے نہیں سکھائیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہم یہی باتیں اس کے ابنائے جنس یعنی دیگر حیوانات میں بھی مشاہدہ کرتے ہیں جن کا معلم اور استاد قطعاً قدرت کے سوا کسی اور کو نہیں ٹھہرا سکتے۔

جب ہم گھونسلا بنانے میں بئے کی کاری گری اور شہد کے حاصل کرنے میں مکھی کی حکمت اور جالا پورنے میں مکڑی کا ہنر دیکھتے ہیں اور اکتساب کی راہیں چاروں طرف سے مسدود پاتے ہیں تو ہم کو اِس بات میں بالکل شک نہیں رہتا کہ قدرتی علم صرف میلِ طبعی ہی کا نام نہیں ہے بلکہ بعضے ایسے دقائق اور صنائع بھی اُس میں داخل ہیں جو بادی النظر میں قوتِ متفکرہ کے نتائج معلوم ہوتے ہیں لیکن جب ذرا اور تامل کیا جاتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسی قدرتی علم کے لحاظ سے انسان اور اس کے ابنائے جنس میں دو طرح کا امتیاز رکھا گیا ہے۔

ایک یہ کہ حیوانات کا قدرتی علم ہمیشہ ایک خاص درجہ پر محدود رہتا ہے، کبھی اس سے تجاوز نہیں کرتا۔مثلاً جو گھونسلا ابابیل نے حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی میں بنایا تھا اُس میں اور اس زمانے کے گھونسلوں میں ہرگز کچھ تفاوت نہ ہوگا۔ بہ خلاف انسان کے کہ اُس کا قدرتی علم ہمیشہ ایک ہی حالت پر نہیں رہتا۔مثلاً اگر چار پانچ ہزار برس پہلے کی بعض انسانی عمارتوں کا مقابلہ زمانۂ موجودہ کی عمارات سے کیا جائے تو شاید اس بات کا یقین بہت مشکل سے آئے کہ دونوں کام ایک ہی نوع کے افراد بنائے ہیں۔

دوسرے یہ کہ حیوانات کو صرف وہ باتیں سکھائی گئی ہیں جو ان کے مصالحِ جزیۂ اور اغراضِ محسوسہ کے لیے مفید ہوں اور بُری بھلی طرح اُن کی حاجت رفع کر دیں جیسے بھوک کے وقت دانہ یا گھاس یا گوشت وغیرہ کھالینا، پیاس کے وقت پانی پینا، شبَق کی حالت میں

اپنی مادہ کے ساتھ نزدیکی کرنی، دھوپ اور مینہ یا سردی کے بچاؤ کے لیے گھونسلا یا بل یا بھٹ وغیرہ بنانا، اپنے بچوں کی ایک خاص مدت تک پرورش کرنی۔ بہ خلاف انسان کے کہ اُس کے سینے ان باتوں کے سوا وہ علوم بھی القا کیے گئے ہیں جن کے ذریعہ سے وہ اپنے مصالح کلیّہ اور منافعِ آئندہ کا سراغ لگا سکتا ہے جیسے جھوٹ یا زنا یا خیانت کو بُرا جاننا اور سچ یا عصمت یا امانت کو اچھا سمجھنا۔

جب ذرا اور تامل کیا جاتا ہے تو انسان کے قدرتی اور اکتسابی علم میں تین طرح کا امتیاز ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اوّل یہ کہ قدرتی علم کی اصل تمام نوع میں متحقق ہونی ضرور ہے کیوں کہ ہم اس علم کے آثار دیگر حیوانات میں اسی طرح مشاہدہ کرتے ہیں مثلاً شہد کی مکھی جس طرح سے شہد حاصل کرتی ہے اور مکڑی جس ہنر سے جالا پورتی ہے وہ طریقہ اور وہ ہنر اُن کے تمام بنی نوع میں پایا جاتا ہے مگر چوں کہ انسان کو خدا تعالیٰ نے عقل عنایت کی ہے اور عقل کا مقتضا تمام افراد میں یکساں نہیں ہوتا اس لیے وہ قدرتی اصل ایک صورت پر قائم نہیں رہتی۔ مثلاً عورت اور مرد کو بغیر کسی تخصیص کے ایک دوسرے پر حرام جاننا ایک عام قانون ہے جو کہ انسان کو فطرت نے تعلیم کیا ہے مگر اس کی تخصیص کی صورتیں ہر قوم میں جدا جدا ہیں۔ مسلمانوں کے ہاں اور طریقہ ہے، ہندوؤں کے ہاں اور دستور ہے، عیسائیوں کے ہاں اور قاعدہ ہے۔ بہ خلاف اکتسابی علم کے کہ وہ نوع کے بعض افراد میں متحقق ہوتا ہے۔ بعض میں نہیں ہوتا، جیسے علم جیولوجی اور علم برق کہ یہ دونوں علم آج کل اہل یورپ کے ساتھ مختص ہیں یا جیسے حرکاتِ کواکب کا علم، علم ہندسہ کہ ایک زمانہ میں اہل مصر کے ساتھ مختص تھا۔

دوسرے یہ کہ جب انسان کو کوئی ایسی بات تعلیم کی جائے جو قدرت نے اس کو پہلے سے سکھا رکھی ہے تو ضرور ہے کہ وہ بات بغیر دلیل اور برہان کے اُس کے دل میں تہ نشین ہو جائے بہ خلاف اکتسابی علم کے کہ جب تک اُس پر کافی دلیلیں قائم نہ کی جائیں تب تک اُس کی صداقت پر ہر گز دل گواہی نہیں دے سکتا۔ مثلاً اگر ہمارے سامنے کوئی یہ کہے کہ "گرمی کی شدت میں سرد ہوا سے نہایت فرحت حاصل ہوتی ہے۔" تو خواہ وہ اس کا طبعی سبب بیان

کرے خواہ نہ کرے ہم کو اُس کے تسلیم کر لینے میں کوئی عذر نہیں ہوتا۔لیکن اگر وہ ہم سے یہ آ کر کہے کہ ''ہوا دو مختلف گیسوں یعنی اوکسیجن اور ہائیڈروجن سے مرکب ہے۔'' تو ہم اِس بات کے خواہاں ہوں گے کہ وہ عملِ کیمیا کے ذریعہ سے ہوا کے اجزا تحلیل کر کے ہم کو دکھاوے۔

تیسرے جو علم انسان کو قدرت نے تعلیم کیا ہے ضرور ہے کہ وہ سچا اور مطابق واقع کے ہو۔ بہ خلاف اکتسابی علم کے کہ اس میں غلطی اور خطا کا احتمال بھی ہوسکتا ہے۔مثلاً صحت کی حالت میں ٹھنڈے پانی سے پیاس کا بجھانا جو انسان کو قدرت نے تعلیم کیا ہے، اُس میں کبھی خطا واقع نہیں ہوتی لیکن مرض کی حالت میں جب پیاس اس قدر بڑھ جائے تو ممکن ہے کہ وہ بالکل فائدہ نہ بخشے یا پیاس کو اور زیادہ کر دے۔

ان سب باتوں پر غور کرنے کے بعد جب ہم اپنے اصل مقصود کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ہم اس کو اس بات کا اقرار کرنا پڑتا ہے کہ جہاں قدرت نے انسان کو اور ہزاروں باتیں تعلیم کی ہیں انھیں باتوں میں سے مبدأ و معاد کا علم اجمالی بھی ہے۔یعنی اس قدر جاننا کہ ''ہمارا کوئی صانع ہے اور مرنے کے بعد ہم کو کچھ نہ کچھ اپنی بُرائی بھلائی کا ثمرہ ملنے والا ہے۔'' یہ انسان کی اصل فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے اور ہمارے پاس اس کی دو زبردست دلیلیں ہیں:-

جہاں تک ہماری نگاہ پہنچتی ہے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آدمی عام اس سے کہ مذہب کا پابند ہو یا نہ ہو اور عام اس سے کہ الوہیت کا قائل ہو یا منکر، بہر حال جس وقت وہ کسی ایسی خطرناک حالت میں پھنس جاتا ہے جس سے جانبر ہونے کی کوئی تدبیر نظر نہیں آتی اور جن وسائل پر اس کو بھروسا تھا وہ سب منقطع ہو جاتے ہیں تو جس طرح لوہا مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے اسی طرح اس کی دلی توجہ اور باطنی ہمت چاروں طرف سے سمٹ کر ایک ایسی بن دیکھی اور اَن سمجھی ذات کی طرف کھنچتی ہے جس کو وہ اڑے وقت کا سہارا اور اپنی تمام تدبیروں کا منتہا سمجھتا ہے۔

دوسرے جہاں تک ہم کو معلوم ہے، ہم نوع انسان کے کسی فرد کو اس بات سے خالی

نہیں پاتے کہ وہ بعض برائیوں سے نہ کسی دنیوی مضرت کے اندیشہ سے بلکہ ایک ایسے خوف کے سبب سے بچتا ہے یا بچنے کا ارادہ کرتا ہے جس کا کھٹکا اس کو مرنے کے بعد ہے۔ اور بعض بھلائیاں نہ کسی دنیوی منفعت کے لیے بلکہ ایک ایسی توقع پر کرتا ہے یا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے جس کے پورے ہونے کی اُمید اس کو مرنے کے بعد ہے۔ اسی مطلب کو ہم یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ ہر فرد انسانی بعضے کاموں کو نہ کسی دنیوی مضرت یا منفعت کے لحاظ سے بلکہ محض دل کی شہادت سے مذموم یا محمود جانتا ہے۔ پس متذکرۂ بالا بیان سے اس کے سوا کوئی بات ذہن میں نہیں آتی کہ ''معاد کا اجمالی علم'' جو اس کی فطرت میں رکھا گیا ہے، صرف اسی کی ہدایت سے وہ اُن کاموں کو بُرا یا بھلا جانتا ہے۔

اس ساری تقریر سے یہ نتیجہ نکلا کہ ''مبدأ و معاد کا اجمالی علم'' انسان کو قدرت نے تعلیم کیا ہے کیوں کہ اگر اکتساب سے حاصل ہوتا تو اس کے آثار تمام بنی نوع میں بلا استثنا ہرگز نہ پائے جاتے۔

یہاں ایک شبہہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید یہ خیالات انسان کی اصل فطرت میں ودیعت نہ کیے گئے ہوں بلکہ مذہبی تعلیمات کے سبب رفتہ رفتہ تمام دُنیا میں پھیل گئے ہوں۔ مگر یہ شبہہ ہم کو ایک ایسی دلیل کی طرف ہدایت کرتا ہے جس سے ہمارے مطلب کو اور زیادہ تقویت حاصل ہوتی ہے، ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ قدرتی علم کا ایک یہ بھی خاصہ ہے کہ جب کوئی بات اس کے موافق انسان کو تعلیم کی جاتی ہے تو وہ اس کو بغیر دلیل اور بُرہان کے تسلیم کر لیتا ہے۔ پس اگر یہ بات مان لے جائے کہ خیالاتِ مذکورہ مذہبی تعلیمات کے سبب دُنیا میں شائع ہوئے ہیں تو بھی ہمارا مطلب کہیں نہیں جاتا کیوں کہ اگر یہ دونوں اصول یعنی مبدأ و معاد مجملاً انسان کی فطرت میں مخفی نہ ہوتے تو کسی طرح ممکن نہ تھا کہ سارا جہان ایسی دو نادیدہ باتوں کے تسلیم کرنے پر متفق ہو جاتا جن کا نمونہ سلسلۂ محسوسات میں کہیں نظر نہیں آتا۔

ہم اوپر یہ بھی لکھ چکے ہیں کہ قدرتی علم میں اکتسابی علم کی طرح غلطی اور خطا کا احتمال کبھی نہیں ہوتا بلکہ وہ ہمیشہ سچا اور مطابق واقع کے ہوتا ہے۔ پس جب کہ ہم یہ بات

ثابت کر چکے کہ ''مبدأ و معاد کا اجمالی علم'' قدرتی ہے اکتسابی نہیں، تو ضرور ہے کہ جیسا ''مبدأ و معاد'' کی نسبت ہمارا اعتقاد ہے اُسی طرح واقع میں بھی ہمارا کوئی صانع ہے اور مرنے کے بعد ہماری بُرائی بھلائی کا ثمرہ ہم کو ملنے والا ہے۔

جب یہ بات ثابت ہو چکی کہ مبدأ و معاد کا اعتقاد صحیح اور مطابق واقع کے ہے تو ہماری عقل ہرگز جائز نہیں رکھتی کہ جس فیاض حکیم نے بغیر طلب اور خواہش کے اس اجمالی علم کی چاٹ لگا کر ہم اُس کی تفصیل کا مشتاق بلکہ ایسا حاجت مند کیا جیسے بیمار دوا کا اور پیاسا پانی کا محتاج ہوتا ہے، وہ باوجود ہماری طلب اور خواہش کے اُس کی تفصیل کا دروازہ ہم پر نہ کھولے۔ ہمارے نزدیک اگر مبدأ و معاد کا تفصیلی علم حاصل کرنے کے وسائل اگر ہم سے منقطع کیے جائیں تو ہمارا حال یا تو بعینہ اُس پیاسے کا سا ہو جس کو ایک سرد اور شیریں اور شفاف پانی کے چشمے سے دو گھونٹ پلا کر اُس چشمے کی راہیں چاروں طرف سے مسدود کر دے جائیں یا اُس غلام کا سا حال ہو جس کو اُس کا آقا کسی دور دراز مسافت پر ایک خطرناک راستے سے بھیجے اور سوا اس کے اس راستے کا خطرناک ہونا اس کو کسی طرح نہ جتائے۔ اُن خطرات کی حقیقت یا اُن کے موقع و محل سے آگاہ نہ کرے اور کوئی تدبیر اُن سے بچنے کی اس کو نہ سمجھائے۔ کیا ہمارا دلی نعمت جس کو ہم جود و کرم کے ساتھ متصف اور بخل و خست سے مترّہ جانتے ہیں وہ ہمارے ساتھ ایسا معاملہ کر سکتا؟ نہیں! ہرگز نہیں کر سکتا، بلکہ ضرور ہے کہ ہمارے لیے کوئی ایسی شمع روشن کرے جو اس اجمالی کے دھندلکے پر تفصیل کی روشنی پھیلا کر ہمارے جہل و تردد کو علم و یقین کے ساتھ مبدل کر دے۔

یہاں شاید ہمارے دل میں یہ خیال گزرے کہ وہ شمع ممکن ہے کہ ہماری عقل ہو جو کہ ہم میں اور ہمارے ابنائے جنس (حیوانات) میں مابہ الامتیاز ہے اور جس کے سبب سے ہم کو تمام محسوسات پر شرف اور فضیلت حاصل ہے اور جس کی بدولت ہمارے بنی نوع پر موجوداتِ عالم کے اسرار روز بروز کھلتے چلے جاتے ہیں۔

ہم کو اُمید نہیں کہ اِس خیال کو ہمارے دل میں پانی کے بلبلے سے زیادہ قیام ہو کیوں کہ ہم جو اپنے گریبان میں منہ ڈالا کر دیکھتے ہیں تو اپنی عقل کو مبدأ و معاد کی حقیقت کے

ساتھ وہ نسبت پاتے ہیں جو آنکھوں والے کو ایک اندھیری کوٹھڑی کے ساتھ ہوتی ہے۔ کیا کسی کو یہ اُمید ہے کہ آنکھوں کی روشنی ایک کلبۂ تیرو تار میں کچھ کام دے سکتی ہے؟ نہیں! ہر گز نہیں دے سکتی۔ اسی طرح آدمی کی عقل مبدأ و معاد کی حقیقت کا سراغ ہرگز نہیں لگا سکتی۔

بڑے بڑے حکیم اور فیلسوف اور بڑے بڑے محقق اور دانش مند جنھوں نے سارے جہان کی چیزوں کو چھان مارا اور حقائقِ اشیاء پر جو جہالت کے پردے پڑے ہوئے تھے اُن کو مرتفع کیا اور قانونِ قدرت سے وہ اصول اور وہ قاعدے استنباط کیے جن کے سبب سے انسان کے چہرہ پر خلافتِ رحمانی کا منصب دار ہونا کھل گیا۔ جب انھوں نے اپنی حد سے آگے قدم بڑھایا یعنی بے اس کے کہ اسی شمعِ غیبی سے اپنا چراغ روشن کریں، اپنی اٹکل سے مبدأ و معاد کا سراغ ڈھونڈنے لگے تو صرف یہی نہیں کہ وہ منزلِ مقصود تک نہ پہنچ سکے بلکہ انھوں نے ایسی ٹھوکریں کھائیں اور اُن کی رایوں نے ایسی غلطیاں کیں کہ جب اُن کے دیگر مقالات کے ساتھ مبدأ و معاد کے متعلق خیالات کو دیکھا جاتا ہے تو اُن میں وہ نسبت معلوم ہوتی ہے جو کہ عاقل اور مجنوں کے کلام کے درمیان ہونی چاہیے۔ اور بڑی دلیل اس بات کی کہ یہ گروہ اپنی اس سعی میں ناکام رہا، یہ ہے کہ اس بے شمار گروہ میں سے شاید دو شخصوں کی رائیں ایسی نہ نکلیں جو کہ باہم اتحادِ کلّی رکھتی ہوں۔

یہاں ہم کو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مطلب کے زیادہ تر دل نشیں کرنے کے لیے قدیم مصر والوں کا تھوڑا سا ضروری حال رولن صاحب کی تاریخ سے بطورِ انتخاب نقل کریں:-

جس طرح اس زمانے میں اہلِ یورپ اپنے تئیں پورا شائستہ اور اپنے سوا تمام عالم کو وحشی یا نیم وحشی خیال کرتے ہیں اسی طرح اہلِ مصر غیر قوموں اور غیر ملکوں کے لوگوں کو وحشی کہا کرتے تھے۔ چناں چہ جب نکیو بادشاہ تخت پر بیٹھا تو اُس نے اوّل دریائے نیل کی نہر پر بدستورِ سابق مدد جاری رکھی مگر تھوڑا عرصہ گذرنے کے بعد ایک غیبی فال سے خوف کھا کر اُس نہر کی تعمیر بند کرا دی کیوں کہ اُس کو یہ بات کہی گئی کہ اس نہر کے بننے سے وحشی قوموں کے لیے مصر میں آنے کی راہ کھل جائے گی۔

پہلے لوگ مصر کو فنون و آدابِ سلطنت کا ایک عمدہ مدرسہ (جہاں سے علوم کو نشو و نما اور روز بروز ترقی ہو) سمجھتے تھے۔ اور حقیقت میں بھی عمدہ عمدہ فن وہاں ایجاد ہوتے تھے اور اِس ملک سے نہایت عمدہ عمدہ ہنر اور عجیب عجیب فن اُن لوگوں کو جو علم و ہنر میں ترقی کرنے کی کوشش کرتے تھے، حاصل ہوتے تھے۔

یونان کے بڑے بڑے لوگوں مثل ہومر[1] اور فیثا غورث[2] اور افلاطون[3] اور وہاں کے اچھے اچھے مقنّنوں نے مثل لائیکرگس[4] اور سولن[5] مع اور بہت سے نامیوں کے جن کا بیان یہاں ضروری نہیں بہ نظرِ تکمیلِ علوم مصر کا سفر اختیار کیا۔ اور خدا تعالیٰ نے بھی (کتاب مقدس میں) مصر کی تعریف کی ہے کیوں کہ اُس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا کہ

> ''وہ مصریوں کے ہر طرح کے علم و ہنر میں کامل تھا...... مصری ایک عجیب طرح کی موجد طبیعت رکھتے تھے اور ہر کام میں نئی نئی ایجادیں نکالتے تھے۔ انھوں نے اپنی طبیعت کو مفید کاموں کی ایجاد کی طرف متوجہ کیا تھا،

---

[1] ہومر: یونان کا نہایت قدیم اور مشہور و معروف شاعر ہے۔ مشہور یونانی مورخ ہیروڈوٹس اُس کا زمانہ ساڑھے آٹھ سو برس قبل حضرت عیسیٰؑ بتاتا ہے لیکن بعد کے مورخین کا خیال ہے کہ گیارہوں صدی قبل مسیحی میں تھا۔ اُس کی رزمیہ نظمیں الیڈ اور اُڈ لیے یونانی علم ادب کی جان ہیں۔

[2] فیثا غورث: یہ مشہور حکیم ۵۷۰ تا ۵۰۰ قبل حضرت مسیحؑ کے درمیان گزرا ہے۔ شاعری، موسیقی، حکمت، فلسفہ، ہندسہ، طبیعات، ہیئت، جغرافیہ اور بہت سے علوم و فنون کا بے نظیر ماہر تھا۔ علوم طبیعہ کے متعلق اس نے بہت سی نئی باتیں دریافت کیں۔ دُنیا میں چل پھر کر جغرافیائی معلومات حاصل کیں۔ زمین کے متحرک ہونے کا مسئلہ سب سے پہلے اسی نے دُنیا کے سامنے پیش کیا۔

[3] افلاطون: شہر ایتھنز کا باشندہ۔ سقراط کا شاگرد اور ارسطو کا استاد تھا (۴۲۷ تا ۳۶۰ قبل مسیح) دُنیا کا نہایت نامور فلسفی جس کے فلسفے کا اثر اب تک دُنیا پر ہے۔

[4] لائیکرگس: ۸۲۵ قبل مسیحی اسپارٹا واقع یونان کا زبردست فاضل اور مقنّن تھا۔ مدت تک مصر و شام کی سیاحی کرنے اور وہاں کے آئین سلطنت کو بہ نظر امعان مطالعہ کرنے کے بعد سلطنت اسپاڑ کے لیے نہایت قابلیت سے قوانین وضع کیے جو مدت مدید تک ملک میں جاری رہے۔

[5] سولن: ٦٣٨ تا ۵۵۸ ق.م. یونان کا مشہور مقنّن اور فاضل تھا۔ اس نے لائیکرگس کی طرح اپنی سلطنت کے لیے ایک مجموعہ قوانین مرتب کیا تھا جس پر ملک میں مدت تک عمل درآمد ہوتا رہا۔

اور اُن کے زمانے کے علماء نے جو کہ مرکری کہلاتے تھے مصر کو عجیب عجیب ایجادوں سے معمور کر دیا تھا، انھوں نے کسی ایسی چیز سے جس سے طبیعتِ انسانی کی تکمیل ہوتی ہے یا جس سے آرام یا خوشی حاصل ہوتی ہے مصر کو محروم نہ رکھا تھا۔ ستاروں کی حرکات پر وہ لوگ سب سے پہلے مطلع ہوئے اور سب سے پہلے انھوں ہی نے علم ہندسہ ایجاد کیا۔ موجوداتِ عالم کے حالات اور خواص دریافت کرنے میں یہ لوگ بہت کوشش کرتے تھے...... مصریوں نے فنِ عمارت اور رنگ آمیزی اور سنگ تراشی اور تمام فنون کو کمال پر پہنچایا تھا۔ جن لوگوں نے قواعدِ حکمت و حکومت کو خوب سمجھا اُن میں سب سے اوّل مصری تھے۔ اس قوم نے یہ بات سب سے پہلے دریافت کی فنون قواعد سلطنت کا اصلی مطلب یہ ہے کہ اپنی زندگی مزے سے کٹے اور رعیت آباد رہے......''

مگر دین کے معاملات میں جس قدر مصری احمق تھے کوئی نہ تھا۔ اُن کے ہاں باایں دعوائے تہذیب و شائستگی بتوں کی بہت کثرت تھی۔ اُن کی تقسیم اور اُن کے درجے جدا جدا تھے۔ اُن بتوں میں اوسرس اور اسس جن کو وہ چاند اور سورج تصور کرتے تھے بہت بڑے بت تھے، اُن کی پرستش عموماً ہوتی تھی، اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اُن میں سیاروں کی پرستش سے بت پرستی نے ظہور پایا۔

ان کے سوا بیل اور کتا اور بھیڑ اور بلّی اور باز اور مگر اور لک لک کی بھی پرستش ہوتی تھی اور ان میں سے بعض جانور ایسے تھے کہ خاص خاص شہروں میں پوجے جاتے تھے اور یہ نقشہ تھا کہ ایک قوم ایک جانور کو قبلہ و کعبہ سمجھ کر دیوتا کی طرح پوجتی تھی اور دوسری قوم اس کی صورت سے نفرت کرتی تھی۔ ان جانوروں میں سانڈ ا ایپس نہایت ممتاز سمجھا جاتا تھا۔ اس کے نام کے بڑے بڑے عالی شان مندر بنائے جاتے تھے اور اُس کے مر جانے کے بعد بہ نسبت اس کے ایامِ حیات کے اُس کی عزت اور توقیر زیادہ ہوتی تھی۔ تمام مصر اس کے سوگ میں ماتم کرتا تھا اور اس کی تجہیز و تکفین اس دھوم دھام سے ہوتی تھی کہ اُس پر مشکل

سے یقین آتا ہے۔ٹولیمی لیگس کے زمانے میں جب ایک ایسا جانور ضعیف ہوکر مرا تو اُس کے ساز وسامان میں معمولی اخراجات کے علاوہ ایک لاکھ بارہ ہزار پانچ سو روپیہ صرف ہوا تھا۔ جب اُس کی تجہیز وتکفین سے فراغت ہوتی تھی تو اس کی جگہ دوسرے سانڈ کے مقرر کرنے کی فکر ہوتی تھی اور تمام مصر اس کی تلاش میں جاتا تھا۔ اس سانڈ میں چند علامتیں ہونی ضرور تھیں جن کے سبب وہ اور سانڈوں سے ممتاز ہوتا تھا۔ پیشانی پر ہلال کی شکل، پشت پر عقاب کی صورت، زبان پر بھونری کا نقشہ ہونا ضرور تھا۔ اور جب قسمت سے ایسا سانڈ ہاتھ آجاتا تھا تو تمام مصر میں گھر گھر خوشی ہوتی تھی اور ماتم جاتا رہتا تھا۔ جب شاہ کیمبس اتھوپیا کی مہم سے ناکام واپس آیا تو وہ ایسے دنوں میں مصر پر گزرا کہ مصری نئے سانڈ ایپس کے ملنے کی خوشیوں میں کھیل کود رہے تھے۔ یہ ناکام دل سوختہ اُن کو خوشیاں کرتا دیکھ کر یہ سمجھا کہ یہ لوگ میری ناکامی پر ہنستے ہیں۔ اس نے اس نئے سانڈ کو جس نے اپنی خدائی کا لطف بہت کم اُٹھایا تھا، قتل کرا دیا اور تمام مصریوں کو بےخدا کا کر دیا...... مصریوں نے صرف جانوروں کے آگے خوشبوئیں جلانے پر ہی اکتفا نہ کیا تھا بلکہ اپنے باغوں کی نباتات کو بھی دیوتا سمجھتے تھے۔

نہایت تعجب کی بات ہے کہ جو لوگ تمام دُنیا سے فضل و ہنر میں فائق ہوں اور وہ آپ کو ایسا ہی سمجھتے بھی ہوں، وہ ایسی حماقت میں گرفتار ہو جائیں اور جھوٹے معبودوں کی پرستش میں ایسے اندھا دھند پڑ جائیں کہ تھوڑی سی سمجھ والا بھی اُسے پسند نہ کرے۔ جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کا مندروں میں پوجنا اور کمال احتیاط سے ان کو پالنا اور اُن کے قاتلوں سے قصاص لینا اور مرنے کے بعد اُن جانوروں کو عطریات سے بھرنا اور بڑی دھوم دھام سے قبروں میں دفنانا اور رفتہ رفتہ پیاز اور لہسن کو بھی پوجنا اور اڑے وقتوں میں اُن سے مدد مانگنی اور اُن پر بھروسا کرنا ایسی نادانی کی باتیں ہیں کہ اس زمانے میں اُن پر مشکل سے یقین آتا ہے۔ مگر اگلے لوگ ان سب باتوں پر گواہی دیتے چلے آئے ہیں۔ لوشین صاحب لکھتے ہیں کہ

''اگر تم کسی ایسے عالی شان مندر میں جاؤ جو سونے چاندی سے جگمگا رہا

ہواور چاند سورج اس کی ٹیپ ٹاپ کی تاب نہ لاسکیں تو تم کو اس مندر کے دیوتا کے دیکھنے کا بہت شوق ہوگا اور تم نہایت مشتاق ہوکر جب اندر جاؤ گے تو کیا دیکھو گے کہ لک لک یا بلّی یا بندر بڑی شان وشوکت اور تمام کروفر سے وہاں جلوہ فرما ہیں۔''

خدا تعالیٰ نے بے شک اس بات کے دکھانے کو کہ انسان اگر اپنی عقل پر چھوڑ دیا جائے تو اس کا یہ روپ ہو جاتا ہے کہ اہل مصر جیسے لوگوں کو جنھوں نے عقلِ انسانی کو نہایت اعلیٰ درجہ پر پہنچا دیا تھا، ایسی نفرت انگیز اور بے ہودہ بت پرستی میں پھنسا رہنے دیا تا کہ لوگوں کی تماشا گاہ بنیں۔

مصریوں کے علاوہ اہل یونان کا حال بھی اسی کے قریب قریب تھا اور یہ اس بات کا نہایت کامل ثبوت ہے کہ انسان کی عقلِ معاش کیسی ہی اعلیٰ درجہ پر کیوں نہ پہنچ جائے مگر مبدأ و معاد کا علم حاصل کرنے میں ہرگز کافی نہیں ہوسکتی۔

تاریخ یونان میں لکھا ہے کہ

''جب ہائرو بادشاہ سسلی نے حکیم سائیمونیڈیز[1] سے باری تعالیٰ کی حقیقت دریافت کی تو اس نے پہلے روز ایک دن کی اور دوسرے روز دو دن کی مہلت چاہی اور اسی طرح روزانہ مہلت مانگتا رہا۔ آخر ایک دن بادشاہ نے بار بار مہلت مانگنے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ '' یہ مضمون سمجھ اور فکر سے اس قدر بعید ہے کہ جس قدر اس میں غور کرتا ہوں اُسی قدر تحیر زیادہ ہوتا ہے اور تاریکی چھائی جاتی ہے۔''

کنفیوشس[2] جو حکمائے چین کا سرگروہ اور اہل چین کا مقتدا ہے اور جس کی تعلیمات کا مدار محض عقل ورائے پر ہے، جب اُس سے لوگوں نے آخرت کا حال پوچھا تو اس نے

---

۱ حکیم سائیمونیڈیز یونان کا ایک نامور حکیم اور شاعر گزرا ہے۔ ۵۵۰ قبل مسیح جزیرہ کیوسی میں پیدا ہوا۔

۲ کنفیوشس (۵۵۱ تا ۴۷۸ ق.م.) ملک چین کا نہایت نامور حکیم اور ہمدرد خلائق رفارمر تھا۔ اس کے پیرو اب تک چین و جاپان میں بے شمار ہیں۔

اُس کا جواب دینے میں اپنی کمال دانائی اور انصاف ظاہر کیا۔ اس نے کہا کہ ’’جب دُنیا ہی کی ہزاروں چیزیں ہماری نظر سے مخفی ہیں تو وہاں تک ہماری عقل کیوں کر پہنچ سکتی ہے۔‘‘

بہر حال اگر ہماری رائے سے جو اوپر بیان کی گئی (یا کسی اور دلیل سے) یہ بات ثابت ہو جائے کہ واقع میں ہمارا کوئی صانع ہے اور مرنے کے بعد ہم کو اپنی بُرائی بھلائی کا ثمرہ ضرور ملنے والا ہے تو بے شک ہم کو ان دونوں باتوں کا تفصیلی علم حاصل کرنے کے لیے اپنی عقلِ ناقص کے سوا کوئی اور ذریعہ ڈھونڈنا پڑے گا اور وہ ذریعہ نہیں ہے مگر وجود صاحبِ الہام وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی اٰلا تِمَامِ۔

زمانہ

''جب زمانہ بدلے تم بھی بدل جاؤ''

(از رسالہ ''تہذیب الاخلاق''، جلد: ٦، نمبر ١٥، بابت یکم ذی الحجہ ١٢٩٢ھ، صفحہ: ٢١٢ تا ٣٠٦)

زمانہ کی نیرنگیاں مشہور اور اس کی تلون مزاجیاں ضرب المثل ہیں۔ وہ سدا ایک حال پر نہیں رہتا۔ وہ ہمیشہ ایک چال پر نہیں چلتا۔ وہ گرگٹ کی طرح برابر رنگ بدلتا رہتا ہے۔ وہ اُس پتھر کی طرح جو پہاڑ کی چوٹی سے لُڑکا یا جائے، ہزاروں پلٹے کھاتا چلا جاتا ہے۔ وہ جو روپ بھرتا ہے اس کے چہرہ پر کھل جاتا ہے۔ وہ جو ٹھاٹھ بدلتا ہے اُس کا رنگ ساری مجلس پر چھا جاتا ہے۔ وہ کبھی دن کی روشنی میں اور کبھی رات کی تاریکی میں، کبھی گرمی کی تپش میں اور کبھی جاڑے کی ٹھر میں ظہور کرتا ہے پر کسی بھیس میں اس کا رنگ جمے بغیر نہیں رہتا۔ جب وہ دن کا بانا بدلتا ہے تو رات کے سارے عمل باطل کر دیتا ہے۔ سوتوں کو نیند سے جگاتا ہے۔ نکمّوں کو کام پر لگاتا ہے۔ طبیعتوں سے سستی کو دور کرتا ہے اور دلوں کو اُمنگوں سے بھر دیتا ہے۔ جب وہ رات کا برقع اوڑھتا تو دن کی ساری کائنات حرفِ غلط کی طرح مٹا دیتا ہے۔ مزدوروں کا دل محنت سے اچاٹ کرتا ہے، جفاکشوں کو بستر راحت کی طرف کھینچ کر لاتا ہے اور ساری دُنیا پر غفلت کا پردا ڈال دیتا ہے گرمی میں اس کی بازی کا نقشہ کچھ اور ہے اور جاڑے میں اُس کی حکومت کا ڈھنگ کچھ اور۔

مبارک ہیں وہ جنھوں نے اس کے تیور پہچانے اور اُس کی چال ڈھال کو نگاہ میں رکھا۔ جدھر کو وہ چلا اُس کے ساتھ ہو لیے اور جدھر سے اُس نے رُخ پھیرا اُس کے ساتھ پھر گئے۔ گرمی میں گرمی کا سامان کیا اور جاڑے میں جاڑے کی تیاری کی۔ دن کو دن کی طرح بسر

کیا اور رات کو رات کی طرح کاٹا۔ اور بدنصیب ہیں وہ جنھوں نے اس کی پیروی سے جی چرایا اور اُس کی ہمراہی سے ناک چڑھائی۔ گرمی پڑے پر انھوں نے جاڑے کے کپڑے نہ اتارے اور ہلکے پھلکے نہ بنے۔ دن نکلا پر انھوں نے کروٹ نہ بدلی اور خوب شبینہ سے بیدار نہ ہوئے۔ اور اب وہ بہت جلد دیکھیں گے کہ پیچھے کون رہا اور منزل تک کون پہنچا؟

جو لوگ زمانے کی پیروی نہیں کرتے وہ گویا زمانے کو اپنا پیرو بنانا چاہتے ہیں مگر یہ اُن کی سخت خام خیالی ہے۔ چند مچھلیاں دریا کے بہاؤ کو نہیں روک سکتیں اور چند جھاڑیاں ہوا کا رُخ نہیں پھیر سکتیں۔ اسی لیے ایک پختہ کار شاعر نے کہا ہے۔ ع

زمانہ باتو نہ سازد تو با زمانہ بساز

اور عرب کے ایک حکیم کا قول ہے کہ ''دُرْمَعَ الدِھْرِ کَیْفَ مَادَار.'' (یعنی ''جدھر کو زمانہ پھرے اُس کے ساتھ پھر جاؤ۔'') شیخ اکبر[1] فرماتے ہیں کہ ''صرْھِیُولٰی لِکُلِّ صُوْرۃ۔'' (یعنی ''اپنی ذات میں ایسی قابلیت پیدا کرو کہ جس رنگ کو چاہے فوراً قبول کر لے۔'') یہ اس لیے فرمایا کہ زمانہ کبھی انقلاب سے خالی نہیں رہتا اور اُس کا مقابلہ انسانِ ضعیف البنیان سے نہیں ہوسکتا۔ پس انسان میں ایسی قابلیت ہونی ضرور ہے کہ جیسی ضرورت دیکھے ویسا بن جائے تاکہ زمانے کا کوئی انقلاب اُس کو سخت صدمہ نہ پہنچائے۔ آندھی کے پُر زور حملے انھیں تناور درختوں کو نقصان پہنچاتے ہیں جو اپنی جگہ سے ٹلنا نہیں چاہتے پر چھوٹے چھوٹے لچک دار پورے جو ہوا کے ہر جھوکے کے ساتھ جھک جاتے ہیں ہمیشہ برقرار رہتے ہیں۔

اس بات کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عارضی یا چند روزہ کامیابی مقتضائے وقت کی مخالفت میں بھی حاصل ہوسکتی ہے مگر جو لوگ دُنیا میں آ کر کامیابی کا پورا پورا استحقاق حاصل کر گئے، وہ وہی تھے جنھوں نے مقتضائے وقت کو ہاتھ سے نہ دیا اور جیسا زمانہ دیکھا ویسے بن گئے۔

---

[1] محی الدین ابن عربی ملقب بہ شیخ اکبر: ''فتوحات مکیہ'' اور ''فصوص'' کے مصنف بہت سے علوم بالخصوص تصوف اور فلسفہ کے زبردست عالم، اندلس کے شہر مرسیہ میں ۱۰ر رمضان ۵۶۰ھ کو پیدا ہوئے۔ کثیر التصانیف آزاد نڈر اور نہایت صاف بیان شخص تھے۔ آپ نے ۶۳۸ھ میں بمقام دمشق رحلت کی اور میدان قاسیون میں دفن ہوئے۔

حکیم اوحدالدین انوری[1] جس نے اپنے زمانے کے تمام علوم میں کامل دست گاہ حاصل کی تھی اور پھر عجم کے ان تین شاعروں میں شمار کیا گیا جو "پیمبر شعر" مانے گئے[2] ہیں۔ اگر وہ مقتضائے وقت کی پیروی نہ کرتا تو یہ شہرت اور عزت اُس کو ہرگز حاصل نہ ہوتی۔ وہ خراسان کی ایک بستی زاکان نامی میں ٹھہرا ہوا تھا کہ اتفاق سے اُس عہد کے ملک الشعراء ابوالفرح سنجری کا لشکر بھی وہیں آ کر ٹھہرا۔ انوری نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ سارا جلوس سنجری کے ساتھ ہے، کہا: "سبحان اللہ علم کا مرتبہ ایسا بلند اور میں اس قدر مفلس، میں ایسا ذلیل اور اس شخص کو یہ جاہ و حشمت؟ اب مجھ کو بھی قسم ہے جو شاعر ہی بن کر نہ دکھاؤں۔" چناں چہ اُسی رات کو ایک[3] قصیدہ سلطان سنجر کی مدح میں لکھ کر تمام کیا، جس کا مطلع یہ ہے ؎

گر دل دوست بحر و کاں باشد   دل دستِ خدائیگاں باشد

پھر تمام عمر شاعری کی بدولت خوش حال اور فارغ البال رہا اور دُنیا میں شہرت اور بلند نامی حاصل کی۔

ایک مجلس میں شیخ ابوالفضل[4] کے کمالات اور ترقیات کا مذکور تھا۔ ایک صاحب

---

[1] انوریؔ فارسی زبان کا اعلیٰ درجہ کا شاعر، بڑا حکیم اور فلسفی تھا۔ اہل سخن اسے پیغمبر سخن مانتے ہیں آپ کو نجوم کا بھی دعویٰ تھا جس کی بدولت بڑی بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔ سلطان سنجر کے دربار سے بھاگ کر بلخ چلا گیا۔ بلخ والوں سے ناراض ہو کر بلخ اور اہل بلخ کی ہجو میں ایک قصیدہ لکھا۔ اس پر لوگوں نے ناراض ہو کر ۵۸۲ھ قتل کر ڈالا۔

[2] اس فقرے میں اس مشہور و معروف رباعی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ؎

در شعر سہ کس پیمبر اند   ہر چند کہ لانبی بعدی
ابیات قصیدہ و غزل را   فردوسی و انوری و سعدی

[3] سلطان سنجر: فارس کا نہایت مشہور اور علم دوست بادشاہ تھا۔ ۱۰۹۳ء میں تخت پر بیٹھا۔ ۱۱۵۳ء میں ترکمانوں پر حملہ کیا۔ وہاں گرفتار ہو گیا۔ چار سال تک اُن کی قید میں رہا۔ اس کی غیر حاضری میں اس کی بیوی سلطانہ خاتون نہایت قابلیت اور خوبی کے ساتھ حکومت کرتی رہی۔ سنجر آخر قید سے فرار ہوا۔ اور تھوڑے ہی دن حکومت کرنے پایا تھا کہ ۱۱۵۷ء میں پیغام اجل آ گیا۔

[4] شیخ ابوالفضل نہایت فاضل، بڑا ادیب اور شہنشاہ اکبر کا وزیر اعظم تھا۔ "آئین اکبری" اور "اکبر نامہ" اس کی مشہور تصانیف ہیں۔ فیضی کا بھائی اور شیخ مبارک کا بیٹا تھا۔ ۹۵۷ھ میں پیدا ہوا اور صرف ۳۳ سال کی عمر میں وزیر اعظم ہو گیا۔ جہانگیر کے اشارہ سے نرسنگھ دیو نے ۱۰۱۱ھ میں قتل کیا۔

بولے: ''وہ بااِیں ہمہ کمالات اگر اس زمانہ'' (یعنی ''انیسویں صدی) میں ہوتا تو شاید عدالتوں میں عرضی نویسی کر کے اپنا پیٹ پالتا۔'' ہم نے کہا: ''اگر وہ اس زمانے میں ہوتا تو ہرگز اپنی کامیابی کا ذریعہ اُس لیاقت کو نہ گردانتا جس کی بدولت اُس نے سولھویں صدی عیسوی میں ترقیات حاصل کی تھیں بلکہ اس عہد میں وہ کم سے کم ایم.اے. یا ایل ایل.ڈی کا درجہ ضرور حاصل کرتا اور کچھ نہیں تو لندن کے کسی نام گرامی اخبار کا کارسپانڈنٹ (نامہ نگار) ضرور ہوتا۔'' یہ ہمارا ایک سرسری جواب تھا جو اُس وقت بلا تامل زبان سے نکل گیا۔ مگر اب غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جواب بالکل صحیح تھا۔ ابوالفضل کی ذات میں ہر زمانے کا رنگ بدلنے اسی قابلیت تھی کہ وہ جس زمانے میں ہوتا اُس زمانے حیثیت کے موافق ضرور اپنے ہم چشموں میں ممتاز ہوتا۔ وہ ایک رقعے میں جو غالباً اس نے اپنے باپ کے نام لکھا ہے تحریر کرتا ہے کہ ''بعض لوگ میری نسبت یہ کہتے ہیں کہ ایک طالب علم کو اس قدر منصبِ جلیل تک پہنچا دینا بادشاہ کو زیبا نہ تھا۔ اس لیے میری بھی اب یہی تمنا ہے کہ سپہ گری کا کوئی کارِنمایاں دکھاؤں۔'' اُس کا یہ قول نِرا دعویٰ ہی دعویٰ نہ تھا بلکہ اس نے مرتے وقت نرسنگھ دیو بندیلے[1] کے مقابلے میں اپنی قابلیت کا جوہر سب پر ظاہر کر دیا۔ مقابلے کے وقت اُس کے اکثر ہمراہی بھاگ گئے تھے اور چند آدمی جو بچے تھے وہ اس کو یہ صلاح دے رہے تھے کہ اس تھوڑی سی جمعیت پر بندیلے کا مقابلہ کرنا مصلحت نہیں مگر وہ نہایت ترشی سے یہ کہہ کر کہ ''مگر بگریزم؟'' اکیلا فوج مخالف میں جا گھسا۔ لیکن چوں کہ پیمانۂ عمر لبریز ہو چکا تھا گھوڑا ٹھوکر کھا کر گرا اور اس کے گرتے ہی مخالفوں نے تیغ کا کام تمام کر دیا۔

سلطان شہاب الدین غوری[2] کو مورخوں نے بہت اور تند مزاج لکھا ہے۔

---

[1] نرسنگھ دیو بندیلہ دکن کا ایک لیٹرا اور قزاق تھا۔ جب بادشاہ نے ابوالفضل کو دکن کی مہم پر بھیجا تو اسی نرسنگھ دیو نے شہزادۂ سلیم کی تحریک سے ابوالفضل پر اس مہم کی واپسی پر اجین کے قریب حملہ کیا۔ ابوالفضل کمال شجاعت اور بہادری سے لڑا لیکن مارا گیا۔

[2] شہاب الدین غوری: افغانستان کے پہاڑی علاقہ غور کا حاکم، ہندوستان میں سلطنت اسلامیہ کی بنیاد ڈالنے والا اور نہایت الوالعزم اور باہمت بادشاہ تھا۔ اس نے ۱۲۸۲ء تک حکومت کی ہے۔ ہندوستان پر پہلے حملے میں پرتھی راج والیٔ دہلی و اجمیر سے شکست کھا کر واپس لوٹ گیا مگر تیسرے بقیہ اگلے صفحے پر

اور اس کے ثبوت کے لیے اُس کی وہ زیادتی پیش کرتے ہیں جو فتح اجمیر کے بعد اُس سے ظہور میں آئی یعنی کئی ہزار آدمی جو فتح کے بعد بچ رہے تھے اُن سب کو تیغِ بیدریغ کے حوالے کیا۔ مگر باوجود اس کے اُس کی سختی اور تندمزاجی کو اس سبب سے مذموم نہیں سمجھا کہ جس فتنہ و فساد کے زمانے میں وہ تسلط ہوا تھا اُس کے لیے ایسے ہی مزاج کا بادشاہ ہونا سزاوار تھا۔

جس طرح دُنیا کی بہبودی کا مدار مقتضائے وقت کی موافقت پر ہے اسی طرح دین کی کامیابی بھی اسی پر موقوف ہے۔ کتاب مقدس ''توریت'' میں خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بڑی تعریف اس بات پر کی ہے کہ وہ مصریوں کے تمام علوم میں کامل تھے۔ اس سے ثابت ہوا کہ نبوت جیسا جلیل القدر منصب بھی اُسی شخص کو عطا ہوتا ہے جس میں زمانۂ حال کے حسب حال ہونے کی پوری پوری قابلیت ہوتی ہے۔

ہمارے نبی برحق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو دعوتِ اسلام میں نمایاں کامیابی حاصل کی اُس کا بڑا ذریعہ عباراتِ قرآنی کی حلاوت اور ملاحت تھی۔ جس کا مدار بالکل مقتضائے وقت کی موافقت پر تھا۔ کیوں کہ اُس وقت شعر و شاعری کے شور سے تمام عرب گونج رہا تھا اور فصاحت و بلاغت کے دعوے نہایت توجہ سے سنے جاتے تھے۔ کوئی کمال علمِ ادب کے ہم پلہ نہ سمجھا جاتا تھا اور کوئی ہتھیار تیغِ زبان کے برابر کارگر نہ ہوتا تھا۔

آنحضرت صلعم کے بعد پہلی اور دوسری خلافت میں جو اسلام کو ترقی روز افزوں نصیب ہوئی اور کوئی فتنہ ایسا حادث نہ ہوا جو اس کے زور و طاقت کی مزاحمت کرتا، اُس کا اصلی سبب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ منصبِ خلافت کے لیے آگے پیچھے ایسے دو شخص انتخاب کیے گئے جن کا چلن اور برتاؤ بالکل مقتضائے وقت کے موافق تھا اور اس سبب سے زمانہ اُن کا معین و مددگار بن گیا۔ چناں چہ اسی مصلحت کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

بقیہ پچھلے صفحے سے

سال ۱۱۹۳ء میں پرتھی راج کو تھانیسر کے مقام پر بڑی سخت شکست دی جس میں تقریباً ایک سو پچاس راجہ پرتھی راج کی امداد کو اپنی اپنی فوجیں لے کر آئے تھے۔ اس فتح سے تمام شمالی ہندوستان شہاب الدین کے قبضہ میں آ گیا۔ واپسی پر شہاب الدین اپنے غلام قطب الدین نامی کو ہندوستان کا بادشاہ کر کے چھوڑ گیا جس کی اولاد نے مدتوں یہاں سلطنت ہی ہے۔

جناب مرتضویؓ کے استخلاف کی نسبت وَاِنِّی لاٰ اَرَاکُمْ فَاعِلِیْنَ[1]. فرمایا اور شیخینؓ[2] کی نسبت کچھ تردد ظاہر نہ فرمایا۔

عمر فاروقؓ[3] کی شدت چوں کہ مقتضائے وقت کے موافق تھی اس لیے مزرعہ اسلام کے حق میں ابرِ رحمت کا کام کرگئی اور عثمانؓ[4] ذی النورینؓ کی مروت جو انھوں نے مروان بن الحکم[5] وغیرہ کے ساتھ برتی۔ چوں کہ وہ مقتضائے وقت کے موافق نہ تھی اسی لیے اُس فتنۂ عظیم کی اصل قرار دی گئی جو آپؓ کے آخر عہدِ خلافت میں رونما ہوا اور جس کا نتیجہ آپ کی شہادت تھا۔

ایک زمانہ میں مقتضائے وقت یہ تھا کہ محدثین اسلام (اسی خیال سے کہ رسول مقبولؐ کے ارشادات تمام وکمال فراہم ہو جائیں) روایات کے اخذ کرنے میں رطب و

---

1. یعنی ''میں تمھیں کرنے والا نہیں دیکھتا۔''
2. شیخین سے مراد حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق ہیں۔
3. عمر فاروق، صدیق اکبر کے جانشین، اسلام کے دوسرے خلیفہ۔ آپ کے عہد مبارک میں تمام عراق، عرب، شام، ایران اور مصر کے ممالک مسلمانوں کے قبضے میں آئے اور اسلام کو وہ شوکت حاصل ہوئی جس کی نظیر مستقبل میں پھر نہ مل سکی۔ ساڑھے دس سال خلافت کرنے کے بعد صبح کی نماز پڑھتے ہوئے ایک غلام کے ہاتھ سے شہید ہوئے۔ آپ نے ۱۳ھ (۶۳۴ء) سے ۲۳ھ (۶۴۲ء) تک خلافت کی۔ آپ کا بے نظیر عدل، انتہا درجے کی سادگی، خوش انتظامی مشہور معروف ہے۔
4. عثمان ذی النورین اسلام کے تیسرے خلیفہ ہیں۔ فارس کے اکثر شہر، شاہ روم کا علاقہ اور شمالی افریقہ کے بعض ممالک آپ کے عہد میں اسلامی حکومت میں شامل ہوئے۔ نہایت رحمدل رقیق القلب اور منکسر المزاج تھے۔ ۱۲ سال خلافت کرنے کے بعد ۷۵ سال کی عمر میں شہید ہوئے۔ آپ نے ۲۳ھ (۶۴۴ء) سے ۳۵ھ (۶۵۶ء) تک خلافت کی ہے۔
5. مروان بن الحکم: حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حقیقی عم زاد بھائی اور بڑا عیار شخص تھا۔ اسی کی شرارتیں اور چالاکیاں حضرت خلیفہ ثالثؓ کی پر الم شہادت کا باعث ہوئیں۔ بنی امیہ کی حکومت قائم ہونے پر یہ اپنی ہوشیاری سے معاویہ ثانی کی وفات کے بعد ۶۴ھ (۶۸۴ء) میں تمام دُنیائے اسلام کا بادشاہ ہوگیا۔ مگر صرف ۲۹۸ دن حکومت کرنے پایا تھا کہ اس کی بیوی زینب نے ۲؍رمضان ۶۵ھ مطابق ۱۲؍اپریل ۶۸۵ء کو اسے زہر دے کر مار ڈالا۔

یابس کی کچھ تمیز نہ کرتے تھے۔ پھر دوسرے زمانے کا مقتضا یہ ہوا کہ اُن روایتوں کی تنقید اور اُن کے راویوں کی چھان بین کی جائے اور صحیح کو سقیم سے، قوی کو ضعیف سے معروف کو منکر سے اور ثابت کو موضوع سے جدا کیا جائے۔ اگر وہ پہلا طبقہ مقتضائے وقت کا لحاظ نہ کرتا تو علمِ نبیؐ کا ایک بڑا حصہ ضائع ہو جاتا۔ اور اگر یہ دوسرا گروہ کھڑا نہ ہوتا تو حق و باطل اور صدق و کذب کا امتیاز دشوار ہو جاتا۔

بڑی دلیل اس بات کی کہ مقتضائے وقت کا لحاظ ضروریات دین سے ہے۔ وہ روایت ہے جس کو مسلم[1] نے ابو ہریرہ[2] سے روایت کیا ہے۔ اس روایت کا ماحصل یہ ہے کہ آنحضرت صلعم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ ''جو شخص صدق دل سے لاَاِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہ کہے گا وہ ضرور بخشا جائے گا۔'' عمر فاروقؓ یہ سن کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ ''اس بشارت سے لوگ اعمالِ صالحہ کی بجا آوری میں قصور کریں گے۔ آپؐ نے فاروق اعظمؓ کی اس رائے کو پسند فرمایا اور تاوقتیکہ روایات کی تدوین کرنے ضرورت نہ پڑی یہ خوش خبری تمام امت میں عام نہ ہوئی۔

الغرض دُنیا کی بہبودی یا دین کی کامیابی مقتضائے وقت کی موافقت کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔

مگر اس موافقت سے ہماری یہ مراد ہرگز نہیں کہ مثلاً بے دینی اور الحاد کے زمانے میں دین و مذہب سے ہاتھ اٹھا بیٹھیں اور عیش و عشرت کے زمانے میں جفاکشی اور محنت سے دست بردار ہو جائیں، یا جہاں خوشامد کا بازار گرم ہو وہاں خوشامدی بن جائیں اور جہاں مسخرہ پن کا زور ہو وہاں غیرت اور حمیت کو بالائے طاق رکھ دیں نہیں بلکہ ہماری رائے میں کوئی بُرے سے بُرا زمانہ ایسا نہیں ہوتا جس میں مقتضائے وقت کے موافق کوئی نہ کوئی جائز طریقہ کامیابی کا موجود نہ ہو۔

---

1. مسلم: امام مسلم بن حجاج نیشاپوری بہت بڑے محدث اور امام المحدثین حضرت امام بخاری کے خاص اور ممتاز شاگردوں میں سے تھے۔ صحاح ستہ کی کتابوں میں ''صحیح بخاری'' کے بعد آپ کی کتاب کا درجہ ہے جو عام طور پر ''صحیح مسلم'' کے نام سے مشہور ہے۔ ۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۶۱ھ میں انتقال فرمایا۔
2. ابو ہریرہؓ: حضور صلعم کے بڑے پایہ کے صحابیوں میں سے ہیں۔ ۵۷ھ میں وفات پائی۔

جب فلسفہ یونانیہ یونانی زبان سے عربی زبان میں منتقل ہوا اور بطلیموس[1] اور ارسطو[2] کے خیالات عرب اور عجم کے گلی کوچوں میں منتشر ہو گئے تو الحاد اور بے دینی نے لوگوں کے دلوں میں چٹکیاں لینی شروع کیں۔ یہاں تک کہ نصوصِ قرآنی اور احادیث نبوی پر دھڑا دھڑ اعتراض ہونے لگے اور جابجا دین میں رخنے نکلنے لگے، اُس وقت علما کے فروغ اور کامیابی کے دو طریقے پائے جاتے تھے۔ ایک ناجائز اور دوسرا جائز۔

ناجائز طریقہ یہ تھا کہ مسائلِ فلسفیہ کی تائید کر کے الحاد کی آگ کو اور مشتعل کر دیتے اور آزادی جیسی من بھاتی چیز کو دُنیا میں پھیلا کر دنیوی فروغ حاصل کرتے۔

جائز ذریعہ یہ تھا کہ شریعت اور حکمت میں تطبیق یا مسائلِ حکمیہ کی تغلیط کر کے الحاد کی آنچ سے دین کو بچاتے اور معترضوں کی زبان بند کرتے۔

چناں چہ علمائے اسلام نے **اشکر اللّٰہ شعیھم** یہی جائز طریقہ اختیار کیا اور فلسفۂ یونانیہ کے مقابلے میں ایک جدا فلسفہ قائم کیا جو اہلِ اسلام میں علمِ کلام کے نام سے مشہور ہے۔

جلال الدین اکبر کا زمانہ (جیسا کہ اکثر مورخوں نے لکھا ہے) ظاہرا بے دینی اور الحاد کا زمانہ ثابت ہوتا ہے اور اس سبب سے ممکن ہے کہ بہت سے لوگوں کی کامیابی کا ذریعہ یہی بے دینی اور الحاد ہو، مگر تاریخ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے عہد میں کامیابی کا بڑا ذریعہ شجاعت و بہادری یا فضل و کمال اور علم و ہنر تھا۔ کیوں کہ اُس کے درباریوں اور مقربوں میں کوئی آدمی ایسا نہیں معلوم ہوتا جس نے بغیر کسی کمال یا ہنر کے محض بے دینی اور الحاد کے ذریعہ سے معتد بہ امتیاز حاصل کیا ہو بلکہ اس کے ارکانِ دولت

---

[1] بطلیموس: مصر کا ایک مشہور مہندس، علم نجوم و ہندسہ کا ماہر، پہلا جغرافیہ داں اور ہیئت کی مشہور کتاب ''مجسطی'' کا منصف ہے۔ اسی نے پہلے پہل کرۂ ارض کا نقشہ بنایا اور نظام شمسی کی تحقیقات کی۔ ۸۰ سال کی عمر میں ۲۴۷ قبل مسیح وفات پائی۔

[2] ارسطو معروف بہ ارسطاطالیس: حکمائے یونان کا سرگروہ، شہنشاہ سکندر اعظم کا استاد اور افلاطون کا شاگرد تھا۔ صرف ونحو، ادب، معانی، علم الاخلاق، سیاست مدن، طبیعات، الٰہیات اور ریاضیات کا زبردست عالم تھا۔ اہل علم میں ''معلمِ اوّل'' کے نام سے مشہور ہے۔ ۳۸۴ ق م پیدا ہوا اور ۳۲۲ ق م وفات پائی۔

میں ایسے آدمی پائے جاتے ہیں جو اپنے مذہبی قواعد کے نہایت پابند تھے اور جنھوں نے صرف اپنے فضل و کمال کی بدولت بادشاہ کے دل میں جگہ پائی تھی جیسے ملا فتح اللہ[1] شیرازی مسلمانوں، اور راجہ ٹوڈرمل[2] ہندوؤں میں یہ دونوں شخص اکبری دور میں مذہب کے نہایت متعصب گنے جاتے تھے بااین ہمہ ملاّ نے اپنے علوم عقلیہ ونقلیہ کے سبب اور راجہ نے حساب سیاق کی مہارت سے یا دانش مندی اور حسن تدبیر کی جہت سے دربارشاہی میں جو مرتبہ حاصل کیا وہ سب پر روشن وہویدا ہے۔

بہرحال جہاں کامیابی کے دو چار ناجائز طریقے پائے جاتے ہیں وہاں کوئی نہ کوئی جائز طریقہ بھی ضرور موجود ہوتا ہے اور جو کامیابی اُن ناجائز طریقوں سے حاصل ہوتی ہے وہ اُس کامیابی کے برابر کبھی پائدار اور مستحکم نہیں ہوتی جو جائز طریقہ سے حاصل ہوسکتی ہے، ہم نے بارہا تجربہ کیا ہے کہ جن درباروں میں مثلاً خوشامد کا بازار گرم تھا اور جہاں حاکم کی مرضی کے خلاف بولنا جرائم کبیرہ کے ارتکاب سے زیادہ خطرناک سمجھا جاتا تھا، جب وہاں کوئی سچا اور آزاد طبیعت کا آدمی پہنچا تو اگرچہ اس کو چند روز اپنی آزاد طبیعت کی کسی قدر روک تھام کرنی پڑی لیکن آخر اُس کی راستی اپنا رنگ جمائے بغیر نہ رہی، رفتہ رفتہ اسی کا قول معتبر ٹھہرا اور اسی کی صلاح نیک سمجھی گئی۔

ان تمام شہادتوں سے ہم بآسانی یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ہندوستان کی اکثر قومیں جو روز بروز اقبال مند ہوتی جاتی ہیں اور مسلمانوں کی قوم بداقبالی کے بھنور اور ذلت کی دلدل سے کسی طرح نہیں نکلتی، اس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ اور لوگ اپنی حالت کو زمانے کے موافق بناتے جاتے ہیں لیکن مسلمان اپنی وضع داری کو ہاتھ سے نہیں دیتے۔

---

1. ملا فتح اللہ شیرازی: دربار اکبری کا نہایت گراں پایہ عالم اور مقتدر رئیس تھا۔ باوجود تقدس مذہبی کے علوم عقلیہ مثلاً ہیئت و ہندسہ، نجوم، رمل، حساب، طلسمات، نیرنجات خوب جانتا تھا۔ خصوصاً علم ہیئت میں نہایت کامل تھا، اور علوم عربیہ حدیث تفسیر اور علم کلام سے بھی خوب واقف تھا۔ کشمیر میں ۹۹۷ھ میں وفات پائی۔
2. ٹوڈرمل: عہد اکبر کا بہت بڑا محاسب اور قانون مال گزاری کا مدون، اکبر اُس سے بہت خوش تھا اور اس کو اپنے بہترین رفیقوں میں سے سمجھتا تھا۔ ۱۵۸۹ء میں وفات پائی۔

اے ہندوستان کے مسلمانو! کیا تم ابھی اُسی عالم میں ہو جس میں تمہارے آباؤ اجداد زندگی بسر کر گئے ہیں؟ اور کیا تم اُسی کھیتی کے پروان چڑھنے کے منتظر ہو جس میں تمہارے بزرگوں نے تخم افشانی کی تھی؟ مدت ہوئی کہ وہ عالم گذر گیا اور وہ کھیتی دریا برد ہوگئی۔ ذرا آنکھیں کھولو اور دیکھو کہ تم کون ہو؟ اور کہاں ہو؟ تمہاری گرہ میں جو دام ہیں وہ بازار میں آج پھوٹی کوڑی کو نہیں چلتے، تمہاری دوکان میں جو مال ہے اُسے کوئی مفت بھی لینا نہیں چاہتا۔ تمہارے چراغ میں جو تیل تھا وہ جل لیا اور تمہاری کھیتی میں جو پانی تھا وہ سوکھ گیا۔ دیکھو! تمہاری ناؤ بودی ہے اور دریا دم بدم چڑھتا جاتا ہے۔ تمہارا قافلہ پیادہ ہے اور منزلیں کٹھن آتی جاتی ہیں۔

اس تمہید سے ناظرین کو ضرور یہ خیال پیدا ہوگا کہ ہم آگے چل کر اپنی قوم کو انگریزی پڑھنے، میز کرسی لگانے، کوٹ پتلون پہننے اور چھری کانٹے سے کھانے کی ترغیب دیں گے۔ کیوں کہ ظاہراً زمانۂ حال کا مقتضا یہی معلوم ہوتا ہے۔ مگر ان کی یاد رہے کہ ہماری مراد اس تمہید سے یہ ہرگز نہیں ہے بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ جس بُری حالت میں ہیں اس سے نکلنے کی جو سیدھی راہ اُنھیں نظر آئے اُسی راہ کو اختیار کریں اور جس طرح ہو سکے اپنا قدم آگے بڑھائیں کیوں کہ زمانہ بآواز بلند کہہ رہا ہے من استویٰ یوماہ فھو مغبون یعنی جس کے دو دن ایک حالت پر گذریں وہ خسارہ میں رہا اور در و دیوار سے یہ صدا آرہی ہے کہ ع

یا قدم آگے بڑھاؤ ورنہ لو راہِ عدم

دُنیا میں آج کل ایک عام گھوڑ دوڑ کا تماشا ہو رہا ہے۔ ہر گروہ کے شہسوار جوق جوق اس میں آتے ہیں اور اپنے اپنے ہنر دکھاتے جاتے ہیں۔ کچھ اُن میں سے گجر دم آتے ہی برق خاطف کی طرح ایک آن واحد میں گذر گئے، کچھ اُن سے پیچھے پیچھے، کچھ راہ میں ہیں مگر افتاں و خیزاں چلے جاتے ہیں۔ کتنوں نے اپنے گھوڑوں کی ابھی باگ اُٹھائی ہے۔ کتنے چلنے کی تیاری کر رہے ہیں لیکن بہتوں کو ابھی گھوڑ دوڑ کی خبر بھی نہیں پہنچی، اُن کے گھوڑے تھان پر بندھے ہوئے ہیں اور خود آرام سے پڑے سوتے ہیں۔ شاید وہ اُس وقت بیدار ہوں گے جب گھوڑ دوڑ کا وقت نکل جائے اور وہ ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔ اے

مسلمانو! ہم کو خوف ہے کہ وہ ناکام گروہ کہیں تمہاری ہی قوم نہ ہو! اور وہ ہاتھ جو حسرت سے ملے جائیں گے تمہاری ہی ہاتھ نہ ہوں۔

یاد مسلمانو! تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ جو شے تم کو اُبھرنے نہیں دیتی وہ کیا ہے؟ اور جس کے سبب تم جنبش نہیں کر سکتے وہ کونسی بندش ہے؟

تا در کھو وہ تمہاری بے ہودہ تقلید ہے جس نے تم کو مذہبی امور ہی میں مجبور اور بے اختیار نہیں کیا بلکہ تجارت میں، زراعت میں، علم و ہنر میں، حرفے اور پیشے میں، غرض ہر کام میں تمہاری عقلوں پر پردہ اور ہر راہ میں تمہارے پاؤں میں بیڑی ڈال رکھی ہے۔ اور تم کو اس پرند جانور کی مانند بے بس کر رکھا ہے جس کے پُر کٹے ہوں اور آنکھیں سی ہوئی ہوں، نہ تم میں طاقت پرواز ہے نہ نگاہ دور بین۔ تقلید نے تم کو تمام دینی اور دنیوی ترقیوں سے فارغ البال کر رکھا ہے اور تمہارے کان میں یہ پھونک دیا ہے کہ جو کچھ کرنا تھا سو اگلے کر گئے، اب اس سے زیادہ کرنا غیر ممکن ہے۔ تمہارے نزدیک جس قطع کی کشتی طوفان نوحؑ میں بنائی گئی تھی اُس سے بہتر کوئی وضع انسان کے ذہن میں نہیں آسکتی اور جو پیشہ آج سے ہزار برس پہلے تمہارے بزرگوں نے اختیار کیا تھا اُس کے سوا کسی حیلے سے تم روٹی نہیں کما سکتے، تمہارے نزدیک تمام عقل انسانی پہلے طبقوں پر تقسیم ہوگئی اور انھوں نے تمہارے لیے کوئی موقع ایسا نہ چھوڑا جس میں تم کو اپنی انسانیت سے کچھ کام لینے کی ضرورت پڑے۔ شیخ[1] نے قانون میں بدن انسان کی تشریح جو لکھ دی اور محمد حسین دکنی ''بُرہانِ قاطع'' میں لغات فارسی کی تحقیق کر گیا سو کر گیا۔ اب کون ہے جو قانون سے کچھ بڑھ کر لکھ سکے یا بُرہان میں کوئی عیب نکال سکے؟

---

1. شیخ الرئیس بوعلی حسین بن علی بن سینا: حکمائے اسلام میں بڑا حاذق طبیب اور بے نظیر، فاضل گذرا ہے صرف ونحو، زبان دانی، طب، ہندسہ و ہیئت، منطق اور فلسفہ وغیرہ تمام مزوجۂ وقت علوم وفنون میں صرف سولہ سال کی عمر میں وہ کمال پیدا کیا کہ شیخ (پروفیسر یا استاد) کے لقب سے پکارا جانے لگا۔ ''قانون'' اس کی طبی تصانیف میں ایسی جامع کتاب ہے جس کی نظیر نہیں۔ اس کے علاوہ مختلف علوم و فنون پر اس نے اور بھی بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ ۳/صفر ۳۷۵ھ کو پیدا ہوا اور ۵۳ سال کی عمر میں درد قولنج سے ۴۲۸ھ میں وفات پائی۔

تم صرف انھیں لوگوں کی تقلید نہیں کرتے جن کے ساتھ تم کو حسن عقیدت ہے بلکہ طب میں جالینوس[1] کی منطق میں ارسطو کی ہندوستان کی رسموں میں ہندوؤں کی تقلید کو بھی اُسی قدر ضروری جانتے ہو جس قدر مذہب میں امام[2] اعظمؒ کی تقلید تمہارے نزدیک واجب و لازم ہے۔ اگر کسی کو اس بات میں تامل ہو تو نکاح بیوگان کے معاملہ میں غور کرے اور دیکھے کہ اُس کا مجوز کون ہے؟ اور مانع کون؟ اور ہندوستان کے عام مسلمانوں نے مجوز کے حکم کی تعمیل کی ہے یا مانع کا کہنا مانا ہے۔

اسی تقلید کی بدولت تم میں ایک اور مرض پیدا ہو گیا ہے جس نے تمہاری رہی سہی ہمت خاک میں ملا دی ہے اور تم کو بالکل اپاہج کر دیا ہے۔ پوچھو وہ کیا ہے؟ وہ خانہ خراب وضع داری ہے، جس کی ہدایت سے تم ترقی کرنے والوں کو متلون مزاج سمجھتے ہو اور ڈھور ڈنگروں کی طرح سدا ایک حالت پر رہنے کو کمال نفس انسانی قرار دیتے ہو۔

ہندوستان کے وضع داروں کی یہ رائے ہے کہ آدمی اپنی زندگی میں جو طریقہ یا جو حالت اختیار کرے اُس کو آخر عمر تک ترک نہیں کرنا چاہیے۔ جوانی میں اگر ڈاڑھی منڈھانے کی عادت ہو جائے تو سنِ شیخوخت تک اس وضع کو نباہنا ضرور ہے۔ اور بچپن میں اگر کامدار ٹوپی پہننے کا لپکا پڑ جائے تو بڑھاپے کے جھریائے ہوئے چہرے کو بھی اُس سے محروم نہیں رکھنا چاہیے۔

چناں چہ معتبر راویوں سے سنا گیا ہے کہ دو بزرگوار نجف خانی جن کا سن شریف ساٹھ پینسٹھ سے متجاوز ہو گیا تھا اور نہایت متقی اور متورع آدمی تھے ہر جمعہ کو شاہ

---

1. جالینوس: یونان کا مشہور حکیم اور اعلیٰ درجہ کا طبیب تھا۔ (۱۳۰ تا ۲۰۱ ق.م.)
2. امام اعظم: نعمان بن ثابت نام۔ ابو حنیفہ کنیت اور امام اعظم لقب ہے۔ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے۔ اہل سنت والجماعت کے امام، بہت بڑے فقیہ، مجتہد اور محقق شریعت تھے۔ خلیفۂ وقت نے باوجود اصرار کے عہدہ قضاء قبول نہ کرنے کی وجہ سے قید کر دیا تھا اور وہیں ۱۵۰ھ میں خفیہ طور پر زہر دے کر اس آفتاب علم کا خاتمہ کر دیا گیا۔

عبدالعزیز[1] صاحب کے درس میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ شاہ صاحب بھی اُن کی کمال تعظیم کرتے تھے۔ بااین ہمہ تقدس دونوں حضرت ڈاڑھی گھٹواتے تھے۔ بعضے منھ پھٹ آدمیوں نے جو اُن پر اعتراض کیا تو یہ فرمایا کہ ''ہم خود اس حرکت سے منفعل ہیں مگر کیا کریں جو وضع قدیم سے چلی آتی ہے اُس کے خلاف کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔''

اسی طرح ایک شریفوں کی بستی میں ایک صاحب سن رسیدہ بڑے نمازی اور پرہیزگار تھے مگر عشاء کی نماز کبھی نہ پڑھتے تھے لوگوں نے سبب پوچھا تو فرمایا کہ ''بچپن میں تو اس سبب سے نہ پڑھی کہ کھانا کھاتے ہی شام سے سو رہتے تھے، جوانی میں لہو ولعب مانع رہا، اب بڑھاپے میں نئی بات کرتے ہوئے جی ہچکچاتا ہے۔''

خیر ہم اپنے قدما کی اس رائے پر اعتراض نہیں کرتے کیوں کہ اُس وقت زمانے کا مقتضا یہی تھا۔ سلطنت مغلیہ پر زوال آچکا تھا، ترقی کی راہیں فتنہ وفساد کے سبب چاروں طرف سے مسدود تھیں، طبیعتوں پر مایوسی اور افسردگی چھائی ہوئی تھی، ایسے وقت میں تنزل کے جس قدر آثار مسلمانوں میں پائے جاتے تھوڑے تھے، مگر ہم کو اپنے ہمعصروں کے حال پر بے اختیار رونا آتا ہے جو اس امن اور آزادی کے زمانے میں بھی وضع داری کے حصار سے باہر نہیں نکلتے اور مقتضائے وقت کو نہیں دیکھتے۔ نہ آپ ترقی کرنا چاہتے ہیں اور نہ اوروں کی ترقی کو پسند کرتے ہیں۔ جو شخص اپنی پست حالت سے نکل کر اچھی حالت میں آنا چاہتا ہے اُس کو نرا متلون مزاج یا بے استقلال ہی نہیں بتاتے بلکہ اُس پر انواع واقسام کی رائیں لگاتے ہیں جن میں سب سے ہلکا الحاد کا فتویٰ ہے۔

شائستہ ملکوں میں آج کل ترقی کی یہ صورت ہے کہ جو شخص پانچ سات برس کہیں پردیس میں رہ آتا ہے وہ اس قابل نہیں رہتا کہ وطن میں پہنچ کر اُسی وقت وہاں کی عام مجلسوں میں شریک ہو جائے۔ جتنے دنوں وہ باہر رہتا ہے اتنی مدت میں وہاں اس قدر ترقی ہو جاتی

---

[1] شاہ عبدالعزیز: ہندوستان کے قابل فخر اور مایۂ ناز محدث حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ کے نامور فرزند اور نہایت قابل اور عالمِ باعمل بزرگ تھے۔ ''تفسیر فتح العزیز''، ''تحفہ اثنا عشریہ'' اور ''سر الشہادتین'' آپ کی مشہور کتابیں ہیں۔ ۱۱۵۹ھ (۱۷۴۶ء) میں پیدا ہوئے اور ۱۲۳۹ھ (۱۸۲۴ء) میں انتقال فرمایا۔

ہے یہ وہاں پہنچ کر ایک دوسرا عالم دیکھتا ہے اور اپنے تئیں اس شعر کا مصداق پاتا ہے ؎

عبارت کوتہ و دل تنگ و خاصانِ ملک زیبا
چہ داند مردِ صحرائی طریقِ کار سازی را

سچ یہ ہے کہ آیۃً کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِي شَانٍ کے معنی ایسے ہی ملکوں میں جا کر کھلتے ہیں اور انسان کا اشرف المخلوقات اور خلیفۂ الرحمٰن ہونا وہیں جا کر ثابت ہوتا ہے نہ کہ ہندوستان میں اور خاص کر ہمارے بھائی مسلمانوں میں، جن کی حالت کو دیکھ کر خدا تعالیٰ کی قدرت اور اس فیاضی ایک خاص حد تک محدود معلوم ہوتی ہے اور اس آیت کے معنی صرف اعتقاداً تسلیم کرنے پڑتے ہیں کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا.[1] بارخدایا! ہماری قوم کو تقلید بے جا اور وضع داری بے سروپا سے نجات دے اور اُن کو دینی و دنیوی ترقیات پر آمادہ کر۔ اُن کا ادب اُن کو قدما سے آگے نہیں بڑھنے دیتا اور اُن کی وضع داری پستی سے بلندی کی طرف نہیں جانے دیتی، کاش یہ بے ادب متلون مزاج ہی بن کر قدم آگے بڑھائیں اور جو ہر قابل کی قدر پہنچانیں جو تو نے بنی انسان کے تمام اگلے اور پچھلے طبقوں کو یکساں عنایت کیا ہے ؎

سرِ روحانیاں داری ولے خود را نہ دیدستی
بخوابِ خود در آتا قبلۂ روحانیاں بینی

---

[1] یہ آیت پندرھویں پارہ اور سورہ بنی اسرائیل کے ساتویں رکوع کے آخر میں ہے۔ ''اور البتہ ہم نے بزرگی دی انسان کو اور اس کو بحر و بر پر حاکم بنایا اور تمام پاکیزہ اشیا میں اُس کے لیے سامانِ معاش رکھے اور جتنی چیزیں ہم نے پیدا کی ہیں اُن میں سے اکثر پر انسان کو فضیلت دی۔''

مُدّعیانِ تہذیب کی بداعمالیاں

(یہ مضمون مولانا کی مشہور نظم ''زمزمہ قیصری'' کے ایک طویل فٹ نوٹ کی نقل ہے۔ یہ نظم مولانا نے ۱۸۷۸ء میں لکھی تھی اور ایک انگریزی نظم کا ترجمہ ہے۔)

انگریزی مورخوں اور شاعروں کو جب یہ منظور ہوتا ہے کہ لوگوں کو اپنی رحمدلی اور انسانی ہمدردی پر فریفتہ اور مسلمانوں پر غضب ناک اور برافروختہ کریں تو وہ محمود غزنوی اور تیمور وغیرہ کی سختی اور تشدد کو خوب چھڑک چھڑک کر جلوہ گر کرتے ہیں۔

مسٹر ایسٹوک ایک مصنف نے ''دربارِ قیصری'' منعقدہ ۱۸۷۸ء کے موقع پر ایک انگریزی نظم لکھی تھی جس کے تین حصے تھے۔ پہلے حصے میں ہندوستان اور مسلمان بادشاہوں اور انگریزی سلطنت کی ابتدا اور ترقی کا ذکر ہے۔ دوسرے اور تیسرے حصے میں اُن ہندوستانی رؤسا اور والیان ریاست کا تذکرہ ہے جو ''دربارِ قیصری'' میں شریک ہوئے تھے۔ پہلے حصہ میں مصنف نے بعض مسلمان بادشاہوں پر نکتہ چینی کی ہے جس کے ایک بند کا ترجمہ مثالاً پیش کیا جاتا ہے ؎

پھر ہوا اسلام کے اقبال کا تارا بلند
جانب ہندوستاں محمؔود نے ہانکا سمند
وہ مسلمانوں کے حق میں ابرِ رحمت تھا مگر
ہندوؤں کے دل رہے اُس کے ستم سے دردمند
وہ پہنچتا تھا جہاں، ہوتی تھی واں آفت بپا
اور چلتا تھا جلو میں اُس کے آسیب و گزند

غش پہ غش آتے تھے ہر ذی روح کو پیہم وہاں
سانس لیتا تھا جہاں وہ اژدہائے زور مند
روندتا تھا جس کو وہ کھیتی نہ ہوتی تھی ہری
صلح سے بجھتا نہ تھا ہوتا تھا جو شعلہ بلند
خوف تھا دل میں خدا کا اور نہ کچھ بندوں پہ رحم
قتل اور تاراج تھا اک بازیٔ سلطان پسند
جب وہ آیا تھا تو سرتا پا گلستاں تھا یہ ملک
جب گیا یہاں سے تو مثلِ دشتِ ویراں تھا یہ ملک

اسی طرح ایک اور انگریز نے محمود کے متعلق کچھ اشعار نظم کیے ہیں جن کا ترجمہ یہ ہے ؎

اے ملکِ زر نگار[1] قدم ہے یہ وہ کونسا
حملے سے جس کے ہے ترے ارکاں میں زلزلہ
وہ تیرے قصر اور ستوں دار سائباں
معبد وہ جو پہاڑوں کے غاروں میں ہیں نہاں
ٹھاکر اور اُن کے مندر، راجا اور اُن کے تخت
حملے سے اُس کے آکے پڑا سب پہ وقت سخت
پتلا غضب کا کون سا وہ ہولناک ہے
اے ملکِ زر نگاہ وہ غزنیں کی خاک ہے
آتا ہے لوٹتا ہوا اس بزم گاہ میں
پھرتے ہیں بکھرے تاج بہت اُس کی راہ میں
کتّے جو اُس کے ساتھ شکاری ہیں بے شمار
اُن کے گلوں میں ہیں وہ جواہر نگار ہار
بے رحم فوج لائی ہے جو لوٹ مار کر
مقتول رانیوں کے گلے سے اُتار کر

---

[1] یعنی ہندوستان ۱۲

کرتا ہے قتل لڑکیوں کو وہ گھروں کے بیچ
اور بے گنہ پجاریوں کو مندروں کے بیچ

اگر چہ ان دونوں شاعروں نے محمود کے تشدد کو بہت مبالغہ کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے ان کے بعض بادشاہوں کی ظالمانہ کارروائیاں کو وہ کیسی ہی تاریکی اور وحشت کے زمانے میں کی گئی ہوں ہمیشہ باعث شرم وندامت رہیں گی۔

لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ آیا دُنیا میں کوئی ایسی قوم ہے جو اس دھبّے سے پاک ہو؟ یورپ کی تاریخ سے ظاہر ہے کہ وہاں کی شائستہ قومیں جو آج اپنے سوا تمام دُنیا کی قوموں کو وحشی یا نیم وحشی کا خطاب دیتی ہیں محمود کے زمانے میں بلکہ اُس کے بعد کئی صدیوں تک ایشیا سے بمراتب زیادہ وحشت وخون ریزی وبے رحمی میں مبتلا تھیں۔

اگر انصاف سے دیکھا جائے تو بنی نوع انسان کی دو خصلتیں نہ کبھی بدلی ہیں نہ آئندہ بدلنے کی اُمید ہے۔

(۱) طمع اور خود غرضی

(۲) زبردستوں کا زیردستوں کو دلنا اور پیسنا۔

جس طرح مگرمچھ، مچھلیوں اور مینڈکوں کو، یا شیر اور چیتا ہرن اور نیل گائے کو نوش جان کرتا ہے اسی طرح جو انسان قوی اور زبردست ہیں وہ ضعیف اور کمزور انسانوں کے شکار کرنے سے کبھی درگذر نہیں کرتے۔

سولھویں صدی کو (جس میں اہل یورپ امریکہ میں جا کر آباد ہوئے) کچھ بہت زمانہ نہیں گذرا۔ اس صدی میں یورپ کی بعض قوموں کے ہاتھ سے امریکہ کے اصلی باشندوں پر کونسا ظلم اور کونسی بے رحمی ہے جو روا نہیں رکھی گئی۔ میکسیکو اور پیرو جو کہ امریکہ کے دو شائستہ ملک تھے وہاں کے مفتوحین پر جو وحشیانہ ظلم ہسپانیہ والوں نے کئے اُن کی نظیر دُنیا کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ کورٹیز جو کہ ہسپانیہ کا رہنے والا اور میکسیکو کا فاتح تھا اُس نے اور اُس کے بعد نئے آنے والے جرنیلوں نے یہ ٹھان لی تھی کہ میکسیکو کو قاطبتہً ویران کر دیجیے اور وہاں ہسپانیہ کی ایک کالونی آباد کیجیے۔ چناں چہ جہاں تک اُن سے ہوسکا

وہاں کے قدیم باشندوں کے نیست و نابود کرنے میں کوئی دقیقہ فردگزاشت نہیں کیا۔ کورٹیز نے میکسیکو کے شہنشاہ مونٹی زوما کو گرفتار کر کے اُلٹا لٹکا دیا اور اُس کی رعایا کو اُس کی آنکھ کے سامنے جلایا اور قتل کرایا۔ بڑے بڑے الاؤ لگے ہوئے تھے جن میں ہزار ہا بنی آدم عام طور پر بے تکلف جلائے جاتے تھے۔ معصوم بچوں کے روبرو اُن کی مائیں اور باپ بہ ہزار عقوبت و سختی آگ میں جھونک دئے جاتے تھے۔ دیہات اور جنگلوں میں ہزاروں آدمی شکاری کتوں سے پھڑوا دئے جاتے تھے۔ یہ ہسپانیہ کے وہی مقدس اور بے عیب عیسائی تھے جنھوں نے کافروں (یعنی مسلمانوں) کو غرناطہ سے ایک ناپاک اور گنہگار قوم ہونے کا الزام لگا کر نکالا تھا اور جن کا قول تھا کہ ''ظالم اور بد دین مسلمان اس لائق نہیں ہیں کہ فرشتہ صفت عیسائیوں کے ہمسائے اور ہم وطن ہو کر رہیں۔'' اندازہ کیا گیا ہے کہ تقریباً ایک ملین (دس لاکھ) بنی آدم ان مقدس عیسائیوں کے ہاتھ سے طرح طرح کی عقوبت اور سختی کے ساتھ مارے اور جلائے گئے۔

یہی حال کچھ دنوں بعد پیرو کا ہوا۔ یہ ملک جنوبی امریکہ میں بحرالکاہل کے کنارے پر واقع۔ فرنیسسلو پزیرو کہ غالبًا اٹلی کا رہنے والا ایک مجہول النسب آدمی تھا اُس کو جنوبی امریکہ میں فتوحات کرنے اور وہاں سے سونا چاندی رولنے کا مدت سے خیال تھا۔ اُس نے پناما یا اُس کے قریب کسی مقام میں ایک جماعت کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ایک بیڑا جہازوں کا اور کچھ سپاہ اُس کے ماتحت ملک پیرو کو جس کے تمول کی بہت شہرت تھی روانہ کریں۔ چناں چہ اس سامان کے ساتھ وہ وہاں پہنچا اور ایک دو پھیرے کے بعد اُس ملک پر قابض ہو گیا۔ پھر تو کوئی ظلم اور تعدی ایسی نہ تھی جو پیرو کے اصلی باشندوں پر جائز نہ رکھی گئی ہو۔ اُن سے سونا اور چاندی چھین چھین کر اپنے ملک کو بھیجتا تھا۔ ہزاروں بندگانِ خدا اُس کے ظلم و ستم کے باعث ملک چھوڑ چھوڑ کر پہاڑوں پر چڑھ گئے تھے، جہاں وہ آخر کار فاقے کر کر کے مر جاتے تھے اور ہزاروں قتل کرائے جاتے تھے۔ تمام مورخوں کا اتفاق ہے کہ ایسی بے رحمی کبھی دُنیا میں نہیں ہوئی۔

انگریزوں کا بیان ہے کہ آسٹریلیا کے قدیم باشندوں پر بہت سختی نہیں کی گئی۔ اگر یہ

بیان صحیح ہے تو وہاں سختی کی کچھ ضرورت بھی نہ تھی۔ وہ بے چارے اس درجہ ناہموار، بیڈول اور ناشائستہ تھے کہ انگریز فاتحوں کی صورتیں، ٹیپ ٹاپ اور چمک دمک دیکھ کر شرم کے مارے زمین میں گڑے جاتے تھے اور کسی طرح ممکن نہ تھا کہ اُن کے پڑوس میں رہ سکیں۔

جس قدر انگریز مہاجروں کی تعدا آسٹریلیا میں بڑھتی گئی، وہ لوگ ملک کے اندرونی حصے میں غائب ہوتے گئے اور رفتہ رفتہ وہیں معدوم ہوگئے۔ اب شاذ و نادر کہیں کہیں اندرونی پہاڑوں کے سلسلے میں پائے جاتے ہیں۔

ٹسمانیہ[1] کے قدیم باشندے جو ایک خوش بشرہ مگر ان سویلائزڈ قوم (ناتربیت یافتہ) تھی۔ یورپ والوں کی ہمسائیگی کے باعث بالکل فنا ہوگئی۔ یہاں تک کہ اب ایک متنفس بھی اُن کی نسل کا باقی نہیں۔

پس آسٹریلیا کے قدیم باشندے جو انڈیمن والوں سے بھی زیادہ بدقوارہ اور ناشائستہ تھے، انگریز جیسی اعلیٰ درجہ کی شائستہ قوم کے پڑوس میں کیوں کر ٹھہرا سکتے تھے ؎

تو بہ جلوہ چوں در آئی، اجل از سرِ ترحم
ہمہ جا کند منادی پئے احتراز کردن

اگر فی الواقع انگریزوں نے آسٹریلیا والوں پر سختی نہیں کی تو یہ اُن کی عین دانائی تھی کہ انھوں نے مفت کی بدنامی نہیں لی اور تمام براعظم اُن کے لیے خود بخود خس و خاشاک سے پاک ہوگیا۔

بات یہ ہے کہ دُنیا کے ایک بہت بڑے حصے سے علم و ہنر میں اس قدر ترقی کی ہے اور وہ دوسرے حصہ کے ابنائے جنس سے اس قدر آگے بڑھ گیا ہے کہ اگلے زمانے کے فاتح اور کشور کشا جن ناجائز ذریعوں سے مفتوحین کی دولت و ثروت اور سلطنت کے مالک ہوتے تھے اُن ذریعوں کے کام میں لانے کی اب مطلق ضرورت نہیں رہی۔ جس قدر مال و دولت پہلے قتل و غارت اور لوٹ کھسوٹ سے حاصل کیا جاتا تھا اُس سے اضعاف مضاعفہ اب صنعت و تجارت کے ذریعہ سے خود بخود کھچا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب دو ایسی

---

[1] ٹسمانیہ: براعظم آسٹریلیا کے ایک صوبے کا نام ہے۔

گورنمنٹوں کے درمیان جن سے ایک شائستہ اور دوسری ناشائستہ ہو، تجارتی عہد نامہ تحریر ہو جاتا ہے تو یقیناً یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ شائستہ گورنمنٹ بغیر اس کے کہ ہلدی لگے نہ پھٹکری، دوسری گورنمنٹ کے تمام ملک و دولت ومنافع ومحاصل کی بالکل مالک ہوگئی، کسی شاعر نے خوب کہا ہے ؎

نہیں خالی ضرر سے وحشیوں کی لوٹ بھی لیکن
حذر! اُس لوٹ سے جو لوٹ ہے علمی و اخلاقی
نہ گل چھوڑے نہ برگ و بار چھوڑے تو نے گلشن میں
یہ گل چینی ہے یا لُٹس ہی گل چیں! کیا ہے قزاقی

شاید ان شعروں میں کچھ مبالغہ ہو، لیکن اس میں شک نہیں کہ جو نتیجہ اگلے زمانے کے غارت گروں کی لوٹ کھسوٹ سے مترتب ہوتا تھا اُسی نتیجے کے قریب قریب یہ شائستہ لوٹ بھی پہنچا دیتی ہے۔

کروڑوں اہل صنعت وحرفت جن کی دستکاری مکینکس (کلوں، مشینوں) کا کسی طرح مقابلہ نہیں کرسکتی، نان شبینہ کو محتاج ہو جاتے ہیں۔ فلاحت پیشہ لوگوں پر یہ بپتا پڑتی ہے کہ زمین کی پیداوار جس قدر کثرت کے ساتھ غیر ملکوں کو جاتی ہے اُسی قدر ملک میں زیادہ کاشت کا تردد کیا جاتا ہے اور اس سبب سے روز بروز زیادہ لاگت لگانی پڑتی ہے اور محنت کا کافی معاوضہ نہیں ملتا۔

پولیٹکل اکانوٹی (علم سیاست مدن) کا یہ مسلم مسئلہ ہے کہ قدرتی پیداوار کی جس قدر زیادہ مانگ ہوتی ہے اُسی قدر اس کے بہم پہنچانے میں زیادہ لاگت اور زیادہ محنت صرف ہوتی ہے اور مصنوعی چیزوں کی جس قدر زیادہ طلب ہوتی ہے اُسی قدر اُن پر کم لاگت آتی ہے اور کم محنت صرف ہوتی ہے۔

ملکی تاجروں کے لیے جو کہ شائستہ ملکوں کی مصنوعی چیزوں کی تجارت کرتے ہیں اوّل تو اوپر والے منافع کی کچھ گنجائش ہی نہیں چھوڑتے اور اگر قدرِ قلیل (جیسے آٹے میں نمک) کچھ فائدہ ہوتا بھی ہے تو اپنے ملک کی نہایت ضروری اور ناگزیر اشیا کا نرخ گراں

ہونے کے سبب اُن کی کمائی میں سے بہت کم پس انداز ہوتا ہے اور جس قدر ہوتا ہے وہ غیر ملکوں کی آرائشی اور غیر ضروری چیزوں کے خریدنے میں جو باوجود کمال نفاست اور لطافت کے نہایت ارزاں دستیاب ہوتی ہیں صرف ہو جاتا ہے۔ پس اُن کو بھی فارغ البالی اور آسودگی کبھی نصیب نہیں ہوتی اور اگر سو دو سو میں دو چار ایسے نکل بھی آتے ہیں جو اپنے ملک میں مرفہ الحال سمجھے جاتے ہیں اُن کا معاملہ اور لین دین اُن کروڑ پتیوں سے ہوتا ہے جن کے مقابلے میں وہ اپنے تئیں محض مفلس اور قلاش تصور کرتے ہیں اور جن کی مانگ کے خوف سے ہمیشہ دوالہ نکل جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ طمع، خود غرضی اور زبردستوں کا زیردستوں کو دلنا اور پیسنا تاریکی اور وحشت کے زمانے میں تھا اُسی کے قریب قریب اب بھی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ دولت گھسیٹنے کے لیے پہلے جبر و تعدی کی ضرورت تھی اب اُس کی کچھ ضرورت نہیں رہی، اَن سویلائزڈ (وحشی) دُنیا کی دولت سویلائزڈ (مہذب) دُنیا کی طرف خود بخود کھچی چلی جاتی ہے۔

ایک اژدہا شیر کو بہت بُرا بھلا کہہ رہا تھا کہ تو کیسا بے رحم ہے کہ ہمیشہ جانداروں کا خون پینے کی فکر میں رہتا ہے اور شکار کی دھن میں دور دور کے دھاوے کرتا ہے۔ تمام جنگلوں میں تیری دھاک ہے۔ آج اس ہرن کو پھاڑ ڈالا، کل اُس پاڑھے کے ٹکڑے اڑائے۔ ایسی خونخواری پر کمر باندھنی اچھی نہیں ہے۔ شیر نے کہا قبلہ! اگر میرے سانس میں بھی ایسی کشش ہوتی کہ دور دور سے جانور خود گھسٹے ہوئے منہ میں چلے آتے اور میری حرص کی آگ کو بجھا دیتے تو میں بھی ہرگز کسی بے گناہ کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین نہ کرتا۔

مع ذلک اگر کہیں آزادیٔ تجارت میں کوئی مزاحمت پیش آتی ہے اور بغیر جبر و تعدی کے کام نہیں چلتا تو اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی شائستہ قوم بھی سب کچھ کرنے کو موجود ہو جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ آزادیٔ تجارت کی مزاحمت رفع کرنی عین انصاف ہے، حالاں کہ آج تک پولیٹکل اکانومی نے اس بات کا تصفیہ نہیں کیا کہ فری ٹریڈ (Free Trade) کا قاعدہ مطلقاً قرین انصاف ہے یا خاص خاص صورتوں میں خلافِ انصاف بھی ہوسکتا ہے۔

انگلینڈ کا فائدہ فری ٹریڈ میں ہے اس لیے وہ اسی کو عین انصاف سمجھتا ہے، فرانس اور یونائیٹڈ اسٹیس (اضلاع متحدہ امریکہ) اس کو اپنے حق میں بالفعل مضر سمجھتے ہیں اس لیے وہ اُس کو جائز نہیں رکھتے۔

لیکن انصاف شرط ہے جن حکمتوں اور تدبیروں سے آج کل دُنیا کی دولت گھسیٹی جاتا ہے، اُن پر برخلاف اگلے زمانے کی جابرانہ لوٹ کھسوٹ کے کچھ اعتراض نہیں ہوسکتا۔ مشہور ہے کہ حکیم علوی[1] خاں جو کہ محمد شاہ کا معالج اور نہایت حاذق طبیب تھا، اس کے زمانے میں ایک عطار بھی اس کے نسخے دیکھتے دیکھتے علاج کرنے لگا تھا۔ لوگوں نے اس کا ذکر علوی خاں کے سامنے بھی کیا اور یہ کہا کہ ''جس قدر مریض آپ کے علاج سے اچھے ہوتے یا مرتے ہیں اُسی کے قریب اُس کے علاج سے اچھے بھی ہوتے ہیں اور مرتے بھی ہیں۔'' علوی خاں نے کہا: ''بلے! الاّ کن من بقاعدہ می کشم و آں قرم ساق بے قاعدہ می کُشد۔''

---

[1] حکیم علوی خاں دراصل خطاب ہے۔ اصلی نام محمد ہاشم تھا۔ ۱۰۸۰ھ (۱۶۶۹ء) میں بمقام شیراز پیدا ہوئے۔ بڑے ہونے پر ۱۱۱۱ھ میں ہندوستان آئے اور شہزادہ محمد اعظم (ابن حضرت عالمگیرؒ) کے ہاں ملازم ہوئے۔ محمد شاہ کے دربار میں منصب شش ہزاری پر فائز اور خطاب ''معتمد الملک'' سے سرفراز ہوئے اور بادشاہ نے ان کو چاندی میں تُلوا کر سب چاندی ان کو مرحمت فرمائی۔ سلطنت کی ابتری کی بدولت جب محمد شاہ کے زمانے میں نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا تو واپسی پر ان کو بھی اپنے ہمراہ لے گیا۔ وہاں سے حج کرتے ہوئے ۱۷۴۳ء میں واپس دہلی چلے آئے اور ۱۷۴۷ء میں انتقال فرمایا۔ نامی طبیب اور حاذق معالج تھے۔ ''جامع الجوامع'' طب میں ان کی ایک مشہور کتاب ہے۔

الدین یُسر

(از رسالہ ''تہذیب الاخلاق''۱۲۹۶ھ، (۱۸۷۹ء) صفحہ:۱۳)

دین برحق کی شان یہ ہے کہ اُس میں کوئی چیز انسان کو مجبور کرنے والی نہ ہو۔ نہ اعتقادات میں کوئی محال بات تسلیم کرائی جائے۔۔ نہ عبادات میں کوئی بوجھ ایسا ڈالا جائے کہ عاجز بندوں سے اُس کی برداشت نہ ہوسکے۔ کھانے پینے، پہننے اور برتنے کی چیزوں میں اُن کے لیے اُسی قدر روک ٹوک ہو جیسے طبیب کی طرف سے بیمار کے حق میں ہوتی ہے۔ اُس کا بڑا مقصد اخلاق کی تہذیب اور نفس انسانی کی تکمیل ہو۔ اُس میں عبادت کے طریقے ایسے عمدہ ہوں جن میں مشقت کم اور فائدہ بہت ہو۔ اُس کے اصول ایسے جامع ہوں کہ ایک نیکی میں بہت نیکیاں مندرج ہوں۔ اُس میں کوئی بندش ایسی نہ ہو جس سے انسان کو اپنی واجبی آزادی سے دست بردار ہونا پڑے۔ اس میں کوئی مزاحمت ایسی نہ ہو جس سے انسان پر ترقی کی راہیں مسدود ہو جائیں اور وہ خلافتِ رحمانی کا منصب حاصل کرنے سے محروم رہ جائے اور جس خوان یغما سے اُس کے بنی نوع بہرہ مند ہیں اُس میں اُن کا شریک نہ ہوسکے جیسے ایک کوتل گھوڑا جو اپنے ہم جنسوں کو جنگل میں آزاد اور بے قید چرتا اور کلول کرتا دیکھتا ہے مگر خود اپنے مالک کے بس میں ایسا مجبور و ناچار ہے کہ اُن کو حیرت بھری نگاہ سے دیکھتا ہے لیکن ہاتھ پاؤں نہیں ہلا سکتا اور بوجھ میں لدا ہوا چُپ چاپ چلا جاتا ہے۔

صرف دینِ اسلام ہی وہ دین ہے کہ جب اس کی اصل ماہیت پر نظر کی جاتی ہے تو وہ نہایت پاک اور سچا دین ثابت ہوتا ہے۔ یہ دین انسان کی آزادی کو قائم رکھتا ہے اور اُس

کوکسی دشوار بات کے کرنے یا ماننے پر مجبور نہیں کرتا۔ اس میں تثلیث اور کفارہ جیسی کوئی انوکھی بات تسلیم کرنی پڑتی ہے نہ رہبانیت جیسی کوئی سخت مشقت اُٹھانے کی ضرورت ہے۔

خدا تعالیٰ نے اس دین کے آسان ہونے کو اپنے کلام پاک میں طرح طرح سے جتایا ہے چناں چہ فرماتا ہے۔ (۱) یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَوَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ. (بقرہ)، (۲) لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا. (بقرہ)، (۳) مَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ. (الحج) یعنی

(۱) ''خدا تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے دشواری نہیں چاہتا۔

(۲) خدا کسی کو اُس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

(۳) خدا نے دین میں تم پر کسی طرح کی تنگی نہیں کی۔''

ہمارے ہادیؐ اور رہنماؐ نے بھی اس ضروری بات کو طرح طرح سے امت کے خاطر نشین کیا ہے چناں چہ فرمایا: اِنَّ الدِّیْنَ یُسْر ''وَلن یَّشَادُ الدِّیْنَ اَحَد'' اِلَّا غَلَبَهٗ. (بخاری) یعنی ''دین آسان ہے اور جو کوئی اس دین میں سختی اختیار کرے گا وہ آخر کو عاجز اور درماندہ ہوگا۔'' (یعنی اعمالِ شاقہ سے تھک کر ضروری فرائض بھی ترک کرنے لگے گا۔) یہ بھی فرمایا کہ بعثت بالحنیفة السمحة البیضاء. (بخاری) یعنی میں وہ شریعت لایا ہوں جو آسان اور روشن ہے۔ یہ بھی کہا کہ خُذُوْا مِنَ الاَعْمَالِ مَا تَطِیْقُوْنَ یعنی وہ اعمال اختیار کرو جن کے تم متحمل ہوسکو۔ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اِنَّمَا بُعِثْتُم مُیَسَّرِیْنَ وَلَمْ تُبْعَثُوا مُعَسَّرِیْنَ. یعنی ''(اے اسلام والو) تم سہل گیر بھیجے گئے ہو نہ سخت گیر۔'' اُس نے نجات کا مدار صرف ایک نیکی یعنی توحید پر رکھا جو تمام نیکیوں کا سرچشمہ ہے اور یہ کہا مَنْ شَھِدَ اَنْ لاَ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ صَادِقًا بِھَا دَخَلَ الْجَنَّۃَ. اُس نے استحقاق رحمت سے صرف ایک بدی یعنی شرک کو مستثنیٰ کیا جو تمام بدیوں کی جڑ ہے اور یہ کہا کہ مَنْ مَّاتَ لاَیُشْرِکَ بِااللّٰہِ شَیْئًا حَرَّمَهُ اللّٰہُ عَلَے النَّارِ[1].

تعصب جو کہ انسان کی ترقی کا سخت مانع ہے اُس کے ناگوار بوجھ سے اسلام کو

---

[1] یعنی ''جو شخص اس حال میں مرا کہ اللہ کے سوا کسی کو نہیں پوجتا تھا اُس پر اللہ نے دوزخ کو حرام کردیا۔''

طرح طرح سے سبکدوش کیا گیا۔ مسلمانوں کو اجازت دی گئی کہ فَاسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ یعنی اگر تم اُمم سابقہ کا علم نہیں رکھتے تو اہل کتاب سے پوچھ لو۔ زید بن ثابتؓ کو سُریانی زبان سیکھنے کے لیے ارشاد ہوا۔ بنی اسرائیل سے روایت کرنے کی صاف صاف اجازت دی گئی۔ ہر مسلمان کو آگاہ کیا گیا کہ ''دانش مندی کی بات مومن کی گم شدہ پونجی ہے۔ پس جہاں کہیں اُس کو ملے وہ اُس کا زیادہ حقدار ہے۔'' یہ بھی صاف صاف ارشاد ہوا کہ مَنْ دَعَا اِلٰی عَصَبِیَّۃٍ فَلَیسَ مِنَّا وَمَنْ مَاتَ عَلٰے عَصَبِیَّۃٍ فَلَیسَ مِنَّا وَمَنْ قَاتَلَ عَلٰی عَصَبِیَّۃٍ فَلَیسَ مِنَّا یعنی ''جس نے تعصب کی طرف بلایا۔ یا تعصب کی حالت میں مرا یا تعصب کی بنا پر لڑا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔'' اہل کتاب کا کھانا مسلمانوں کے لیے اور مسلمانوں کا کھانا اہل کتاب کے لیے حلال کیا گیا۔ یہ بھی بتایا گیا کہ کَانَ یُحِبُّ مُوَافِقَۃَ اَھْلِ الْکِتَابِ فِیْمَا لَمْ یُؤْمَرْ فِیْہِ بِشَیْءٍ. (شمائل ترمذی) یعنی ''جس بات میں کوئی نصِ صریح نہ ہو اس میں موافقت اہل کتاب کی پسندیدہ ہے۔''

لونڈی غلاموں کی اس قدر حمایت کی گئی کہ وہ حقیقتہً یا حکماً ہمیشہ کے لیے آزاد کیے گئے۔

رائے انسانی کو یہاں تک آزادی حاصل ہوئی کہ نبی کے حکم کی نسبت جو وہ اپنی رائے سے دے لوگوں کو ماننے یا نہ ماننے کا اختیار دیا گیا۔ خود نبی کریم صلعم کو یہ حکم ہوا کہ ''مسلمانوں سے مشورہ لیا کرو۔''

سفر، خوف یا مرض وغیرہ کی حالت میں عباداتِ مفروضہ میں طرح طرح کی آسانیاں کی گئیں۔ یہ بھی اجازت دی گئی کہ اگر کہیں قبلے کی سمت محقق نہ ہو تو اٹکل سے کوئی سی سمت مقرر کر کے اُسی طرف نماز پڑھ لو۔ اگر چاند نظر نہ آئے تو تیس (۳۰) روزے رکھ کر رمضان کو ختم کر دو۔ اگر پانی نہ ملے تو تیمم کر لو۔ اگر کپڑا نہ ہو تو ننگے بدن نماز پڑھ لو۔

الغرض اس پاک دین میں جب تک وہ اپنی اصلیت پر برقرار رہا کوئی چیز انسان کی واجبی اُمنگ اور خوشی اور آزادی کو روکنے والی نہ تھی مگر افسوس ہے کہ وقتاً بعد وقتٍ اور حیناً بعد حینٍ اُس پر حاشیئے چڑھنے شروع ہوئے اور رفتہ رفتہ اُن کی کثرت اس درجہ کو پہنچی کہ متن اور

حاشیوں میں تمیز کرنی دشوار ہوگئی بلکہ وہ متن بالکل نظروں سے غائب ہوگیا۔

پہلا حاشیہ جو اس ملت بیضا پر چڑھایا گیا وہ یہ تھا کہ جو باتیں رسولؐ خدا نے محض اصلاح معاش کے لیے تعلیم فرمائی تھیں اور جن کا مدار صرف مصالح دنیوی پر تھا وہ بھی شریعت میں داخل کی گئیں اور اُن کو بھی ضروریاتِ دین سے سمجھا گیا، حالاں کہ یہ ایک صریح مغالطہ تھا جس کو خود رسولِ کریمؐ نے اپنی زندگی میں حل کر دیا تھا۔

اصل یہ ہے کہ جس قوم میں رسولِ خدا صلعم مبعوث ہوئے تھے اُس کی اندرونی اور بیرونی دونوں حالتیں زمانۂ جاہلیت کے امتداد سے معالجہ اور اصلاح کی محتاج تھیں، جس طرح اُن کے عقائد اور اخلاق بگڑ گئے تھے اُسی طرح اُن کا طریقِ تمدن اور طرزِ معاشرت بُری حالت میں تھا۔ وہ جیسے مبدأ و معاد سے غافل تھے ویسے ہی کھانے پینے اور پہننے کے آداب سے ناواقف تھے، اُن کی مجلسیں تہذیب سے معرا تھیں۔ اُن کے معاملات وحشیانہ تھے، اُن کا طریق معاش بے ڈھنگا تھا۔

پس اُس دین کے ہادی اور دُنیا کے رہبر نے جیسا اپنے منصبی فرائض یعنی تبلیغِ احکامِ الٰہی کو ضروری سمجھا اور اُن کو مبداء و معاد کی حقیقت سے آگاہ کیا اور اُن کے عقائد باطلہ اور اخلاق رذیلہ کی اصلاح فرمائی اس طرح رقتِ نوعی اور قومی ہمدردی کے مقتضا سے اُن کے طریق معاش کو بھی درستی کیا۔ اُن کی مجلسوں میں تہذیب پھیلائی، لباس اور طعام کے آداب سکھائے۔ نشست و برخاست کے قاعدے بتائے، سلام، مصافحہ، معانقہ تہنیت، تعزیت، مہمانی، ضیافت، بیاہ، شادی، لین دین، سفر، اقامت، کھیتی، تجارت، حفظ صحت، دوا دارو غرض کہ جملہ امورِ دنیوی کے اصول تعلیم فرمائے مگر اسی قدر جتنے کہ اُس زمانے اور اُس ملک کے مناسب تھے۔

ان دونوں میں سے پہلی تعلیم آپ کا منصبی فرض تھا جس کے لیے آپ مبعوث ہوئے تھے اور جس کی نسبت کلام الٰہی میں آپ کو یہ ارشاد ہوا کہ **یَاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ**[1]. اور امت کو یہ حکم ہوا کہ **مَااٰتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا**

---

[1] یعنی ’’اے رسول! جو کچھ تجھ پر تیرے پرودگار کی جانب سے نازل ہوا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دے۔‘‘

نَهَاکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا[1]. اسی کا نام شریعت رکھا گیا اور اسی کی مخالفت پر ضلالت کا اطلاق کیا گیا۔

دوسری تعلیم جو کہ معاش سے علاقہ رکھتی تھی وہ آپ کے منصبی فرائض سے بالکل علیحدہ تھی، نہ اُس کی تعمیل امت پر فرض کی گئی اور نہ اُس کے خلاف علم درآمد کرنے کی ممانعت ہوئی اور اسی تعلیم کی نسبت آنحضرتؐ نے یہ ارشاد فرمایا کہ اِنَّما اَنَابَشَر اِذَاَمَرْتُکُمْ بِشَیٍٔ مِّنْ دِیْنِکُمْ فَخُذُوْابِه وَاِذَا اَمَرْتُکُمْ بِشَیْءٍ مِّنْ رَایٍٔ فَاِنَّمَا اَنَابَشَرٌ[2].

حضرت شاہ ولی اللہ[3] محدث دہلوی (قدس سرہٗ) نے اپنی کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ[4]'' کے ساتویں مبحث کے پہلے باب میں احادیث نبوی کو دو قسموں پر تقسیم کیا ہے۔

ایک وہ قسم ہے جو تبلیغ رسالتؐ سے متعلق ہے اور جس کی نسبت کتاب اللہ میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ مَااٰتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا یعنی ''جس بات کا رسولؐ تم کو حکم دے اُسے مان لو اور جس بات سے وہ تم کو روکے اُس سے باز رہو۔'' اس قسم کو علم آخرت اور علم عجائب ملکوت اور علم شرائع واحکام اور علم اخلاق وفضائل اعمال میں منحصر کیا ہے، پھر لکھا ہے کہ اسی قسم سے ہماری غرض متعلق ہے اور اسی کو ہم اس مبحث میں بیان کریں گے۔ (یعنی جو باتیں دنیوی تعلیم سے علاقہ رکھتی ہیں وہ اس کتاب کے مباحث

---

1. یعنی ''جو کچھ یہ رسول تم کو دے وہ لے لو، اور جس سے منع کرے پس اُس سے باز رہو۔''
2. یعنی ''یقیناً میں بھی (تم جیسا) ایک آدمی ہوں۔ جب دینی امور میں تمہیں کوئی حکم دوں تو اس کی تابعداری کرو۔ اور دنیوی امور میں اپنی رائے سے میں کچھ کہوں تو بے شک میں انسان ہوں۔'' (یعنی غلطی بھی کرسکتا ہوں)
3. حضرت شاہ ولی اللہ بارہویں صدی کے مجدد اعظم، زبردست عالم، بے نظیر فاضل اور اعلیٰ کے محدث تھے۔ ۴؍شوال ۱۱۱۴ھ (۱۷۰۲ء) کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ سات سال کی عمر میں قرآن مجید ختم کرلیا اور پندرہ سال کے تھے جو حدیث، تفسیر، فقہ، منطق، علم کلام، تصوف، طب، صرف ونحو، معانی وبیان اور علم ہندسہ وحساب وغیرہ تمام مروجہ وقت علوم میں کامل دست گاہ حاصل کرلی اور مدرسہ رحیمیہ میں بیٹھ کر درس دینے لگے۔ حضرت شاہ صاحب ہی وہ سب سے پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے قرآن پاک کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ ۶۳ سال کی عمر میں ۱۱۷۶ھ (۱۷۶۲ء) میں وفات پائی۔
4. ''حجۃ اللہ البالغہ'' حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تصنیف ہے جو بالاتفاق بڑے پایہ کی کتاب سمجھی جاتی ہے۔

سے خارج ہیں۔)

پھر وہ لکھتے ہیں کہ ''دوسری قسم وہ ہے جو تبلیغِ رسالتؐ سے تعلق نہیں رکھتی اور جس کی نسبت آپؐ نے فرمایا ہے کہ ''میں صرف ایک آدمی ہوں، جب میں تم کو تمہارے دین کی کوئی بات بتاؤں تو اُس کو مان لو اور جب اپنی رائے سے کوئی بات کہوں تو (یہ جان لو کہ) میں صرف ایک آدمی ہوں۔ اور نیز قصۂ بیرِ نخل[1] میں اسی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ ''میں نے ایک رائے لگائی تھی سو تم مجھ سے اُس رائے کی بابت مواخذہ نہ کرو، لیکن جب میں کوئی بات خدا کی طرف سے کہوں تو اُسے مان لو کیوں کہ میں خدا پر جھوٹ نہیں باندھتا'' اس کے بعد شاہ صاحب نے دوسری قسم میں بہت سے ابواب داخل کیے ہیں۔

از آنجملہ وہ بے شمار حدیثیں جو طب سے علاقہ رکھتی ہیں یا جو آپؐ نے اپنے ذاتی تجربہ کی رو سے ارشاد فرمائی ہیں جیسے حدیث عَلَیکم بِالْاَدْھَمِ الْاَ قْرَحِ یعنی ''جس مشکی گھوڑے کی پیشانی پر سفید دھبّا ہو اُسے ڈھونڈ لیا کرو۔'' از آنجملہ وہ افعال جو آپؐ نے عبادت کی نظر سے نہیں بلکہ عادت کی راہ سے یا قصداً نہیں بلکہ اتفاقاً کیے ہیں۔ از آنجملہ وہ امور جن کو ذکر آپؐ بھی اُسی طور پر کیا کرتے تھے جس طرح آپؐ کی قوم کرتی تھی جیسے ''حدیث امِّ ذرع'' اور ''حدیث خراف'' از آنجملہ وہ حدیثیں جو خاص کسی وقت کی مصلحت کے لحاظ سے ارشاد ہوئی ہیں نہ یہ کہ تمام امت کے لیے ہمیشہ کے واسطے ضروری ہیں اور اخیر باب کی نسبت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ اس پر بہت سے احکام محمول کیے گئے ہیں۔ انتہیٰ ملخصاً۔

---

[1] کھجوروں میں ایک درخت نر ہوتا ہے اور ایک مادہ۔ نر کے پھول مادہ پر جھاڑنے کو تابیر کہتے ہیں۔ مسلم نے یہ قصہ رافع بن خدیج سے اس طرح پر نقل کیا ہے کہ جب آنحضرتؐ مدینہ میں آئے تو اہل مدینہ کو تابیر کرتے ہوئے دیکھا پوچھا: ''کیا کرتے ہو۔'' لوگوں نے عرض کیا کہ ''ہم اسی طرح کرتے رہے ہیں۔'' آپؐ نے فرمایا۔ ''شاید اگر نہ کرو تو بہتر ہو۔'' انھوں نے چھوڑ دیا۔ ''اس سال پھل کم آیا۔'' لوگوں نے آپؐ سے ذکر کیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''اِنَّما اَنَابَشَر. (الخ)'' اور بعضی روایتوں میں یہ ہے کہ آپ نے یہ کہا: ''اِنَّما ظَنَنْتُ ظَنًّاولاَ تُواَخِذُ وُنِي بِالظَّنِ وَلٰکنُ اِذَاحَدَّ ثُتُکُم عَنِ اللّٰہِ شَیْئًا فَخُذُ وَابِه فَاِنّي لَم اَکْذَبُ عَلَی اللّٰہِ.''

صحابہ کرام بھی جیسا کہ صحیح روایتوں سے ثابت ہے احادیث نبوی کی نسبت ایسا ہی اعتقاد رکھتے تھے جیسا کہ شاہ صاحب نے بیان کیا ہے اور آپؐ کی تمام تعلیمات کو تبلیغ رسالتؐ سے متعلق نہیں جانتے تھے۔

ایک بار کچھ لوگ زیدؓ[1] بن ثابتؓ کے پاس حدیث سننے کو آئے۔ انھوں نے پہلے اس سے کُنان کے سامنے کچھ حدیثیں بیان کریں یہ کہا کہ ''میں آنحضرتؐ کے ہمسایہ میں رہتا تھا، سو جب آپؐ پر وحی نازل ہوتی تھی آپؐ مجھے بلا بھیجتے تھے۔ میں حاضر ہو کر وحی لکھتا تھا۔ پھر جب ہم دُنیا کی باتیں کرتے تھے تو آپؐ بھی ہمارے ساتھ ویسی ہی باتیں کرنے لگتے تھے اور جب آخرت کا ذکر کرتے تھے تو آپؐ بھی ہمارے ساتھ آخرت ہی کا ذکر کرنے لگتے تھے اور جب ہم کھانے کا ذکر کرتے تھے تو آپؐ بھی ویسا ہی ذکر کرنے لگتے تھے۔ سو میں ان سب باتوں کو بطور حدیث نبوی کے تمہارے سامنے بیان کروں۔'' (حجۃ اللہ البالغہ)

اس روایت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زید بن ثابتؓ اُن لوگوں کو یہ جتانا چاہتے تھے کہ میں بہت سی حدیثیں تمہارے سامنے ایسی بیان کروں گا جو امرِ دین سے علاقہ نہیں رکھتیں۔ ''مسلم''[2] اور ''ترمذی''[3] میں، ابن عمرؓ[4] اور جابرؓ[5] سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے

---

[1] زید بن ثابتؓ آنحضرت صلعم کے جلیل القدر صحابی اور کاتب وحی تھے۔ علم الفرائض اسلامی قانونِ وراثت کے نہایت ماہر تھے۔ ۴۵ھ (۶۶۶ء) میں بعمر ۵۶ سال مدینہ میں انتقال فرمایا۔

[2] ''صحیح مسلم'' حدیث کی مشہور کتابوں میں ''صحیح بخاری'' کے بعد اسی کا درجہ ہے۔ حضرت امام ابوالحسین مسلم بن الحجاج قشیری نیشا پوری کی تالیف ہے جو بڑے پایہ کے محدث اور علم حدیث کے ماہر گزرے ہیں حضرت امام بخاری کے شاگرد تھے اور بڑے بڑے محدث ان کے شاگرد ہیں۔ ۲۵/رجب ۲۶۱ھ کو انتقال فرمایا۔

[3] ''سننِ ترمذی'' احادیث کی مشہور کتاب اور صحاح ستہ میں داخل ہے۔ امام محمد بن عیسیٰ ترمذی کی تالیف ہے جو حضرت امام بخاریؒ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ ۲۷/رجب ۲۷۹ھ کو وفات پائی۔

[4] ابن عمرؓ۔ عبداللہ نام ہے۔ فاروق اعظم خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ بن خطاب کے فرزند گرامی اور بڑے پرہیزگار، عابد و زاہد اور صحابہ میں خاص علم و فضل کے مالک تھے۔ ۷۳ھ (۶۹۲ء) میں وفات پائی۔ آپ کی عمر ۸۶ یا ۸۴ برس کی ہوئی۔

[5] حضرت جابرؓ بن عبداللہ آنحضورؐ کے اکابر صحابہ میں سے ہیں۔ حضور کے ہمراہ، غزدات میں شرکت فرمائی۔ ۹۴ سال کی عمر میں ۷۴ھ (۶۹۳ء) میں انتقال فرمایا۔

طواف میں رمل[1] کا حکم دیا اور اب تک اُسی کے موافق علمدرآمد ہے مگر حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں جب حج کا موسم آیا تو انھوں نے طواف میں رمل کرنے سے منع کیا اور یہ کہا کہ مَالَنَا وَلِلرَّ مَلِ کُنَّا نَتْرایَابِہٖ قَومًا قَدْ اَھْلَکَھُمُ اللّٰہُ. یعنی ''جس قوم کے دکھانے کو ہم رمل کرتے تھے اس کو خدا نے ہلاک کر دیا۔'' (حجۃ اللہ)

''ابو داؤد[2]'' میں ابوالطفیل[3] سے روایت ہے کہ میں نے ابن عباس[4]ؓ سے پوچھا کہ لوگ کہتے ہیں کہ ''آنحضرتؐ نے رمل کیا اور یہ سنت ہے۔'' ابن عباسؓ نے جواب دیا کہ ''اس میں کچھ صحیح ہے کچھ غلط۔'' میں نے کہا: ''صحیح کیا ہے؟ اور غلط کیا ہے؟'' کہا: ''رمل کرنا آنحضرت کا تو صحیح ہے مگر اس کو سنت جاننا غلطی ہے۔''

ان دونوں روایتوں سے ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ رمل کے حکم کو مصالح دنیوی سے جانتے تھے اور عبداللہ ابن عباسؓ آنحضرتؐ کے ہر فعل کو سنت یا دین نہیں سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ اکثر حدیثیں اسی مطلب پر ولالت کرتی ہیں، طوالت کے خوف سے یہاں نقل نہیں کی گئیں۔

غرض اس میں شک نہیں کہ ایک بہت بڑا حصہ احادیث نبوی کا ایسا تھا جو تبلیغ رسالتؐ سے کچھ علاقہ نہ رکھتا تھا مگر غلطی سے وہ بھی اس میں داخل سمجھا گیا اور جو طریقہ تمدن اور معاشرت کا اب سے تیرہ سو برس پہلے خاص عرب کو اُس زمانے اور اُس ملک کی ضرورتوں کے موافق تعلیم کیا گیا تھا وہ ہر ملک اور ہر قوم کے لیے الیٰ یوم القیامہ واجب العمل اور واجب

---

[1] رمل بازو ہلا کر پہلوانوں کی طرح چلنے کو کہتے ہیں۔ مدینہ کے نجار سے کفار مکہ مہاجرین کی نسبت یہ خیال کرتے تھے کہ وہ ضعیف و کمزور یا ہلاک ہو جائیں گے، اُن کا گمان غلط کرنے کے لیے آپؐ نے رمل کا حکم دیا تھا۔

[2] ''سنن ابو داؤد'' حدیث کی مشہور کتاب ہے اور صحاح ستہ میں اس کا چوتھا درجہ ہے۔ امام ابو داؤد سلیمان بن الاشعب سجتانی اس کے مولف ہیں۔ ۷۳ سال کی عمر میں ۱۶ر شوال ۲۷۵ھ (۸۸۸ء) کو بصریٰ میں انتقال ہوا۔

[3] ابوالطفیل عامر بن واثلہ۔ آٹھ برس کے تھے کہ آنحضرتؐ نے انتقال فرمایا۔ یہ صحابہ میں دُنیا میں سب سے آخری شخص تھے جو باقی رہ گئے تھے، آخر ۱۰۲ھ میں آپ نے بھی مکہ میں وفات پائی۔

[4] عبداللہ بن عباسؓ آنحضرتؐ کے چچازاد بھائی اور بڑے پایہ کے صحابی تھے۔ ۶۱۹ء میں مکہ میں پیدا ہوئے حضرت علیؓ کے زمانۂ خلافت میں بصرہ کے حاکم بھی رہے ہیں۔ ۶۸ھ (۶۸۷ء) میں وفات پائی۔

الاذعان ٹھہرا گیا، یہاں تک کہ جس طرح نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے مسائل میں علماء کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت تھی اُسی طرح ان باتوں کے دریافت کرنے کی بھی حاجت ہوئی کہ کھانا کس وضع پر کھائیں؟ لباس کیسا پہنیں؟ جوتا مُنڈلہ پہنیں یا نوکدار؟ ٹوپی ہلکی پہنیں یا بھاری؟ برتن چینی کے برتیں یا تانبے کے، غیر قوموں کے علوم پڑھیں یا نہ پڑھیں، غیر زبانوں میں سے کونسی زبان سیکھیں اور کونسی نہ سیکھیں، غیر زبانوں کے الفاظ بہ حسبِ ضرورت اپنی زبان میں استعمال کریں یا نہ کریں، نئی وضع کا مکان جس میں ہر موسم کی آسائش ہو بنائیں یا نہ بنائیں، تمبا کو میں گڑ ڈال کر پئیں یا خشک، چائے میں کچا دودھ ملا کر پئیں یا اونٹا ہوا؟ غرض کہ انسان کے تمام قوائے جسمانی اور نفسانی اور اُس کی تمام حرکات وسکنات اور اس کے تمام اعضاء وجوارح پر قیدیں اور بندشیں لگائی گئیں اور اس کے لیے کوئی موقع ایسا نہ چھوڑ گیا جس میں وہ اپنی بدنصیب عقل سے بھی کچھ مشورہ یا کام لے سکے۔

دوسرا حاشیہ یہ چڑھا کہ اعمالِ بدنی اور احکام ظاہری جو کہ بمنزلہ قالب کے تھے اُن میں اس قدر تعمق اور تدقیق کی گئی اور اُن پر اس قدر زور دیا گیا کہ اخلاق فاضلہ اور ملکاتِ صالحہ جو بمنزلہ روح کے تھے اور جن کے تر وتازہ رکھنے کے لیے اعمال ظاہری شروع ہوئے تھے اُن کی طرف اصلا توجہ باقی نہ رہی اور دنیوی ترقیات جن کے بغیر دین کی شوکت قائم نہیں رہ سکتی مسدود ہوگئیں۔ خدا اور رسولؐ کی نہیں بلکہ فقہا کی تکلیفات نے عاجز بندوں کو ایسا شکنجے میں کھینچا کہ اُن میں دُنیا کے بڑے بڑے کام کرنے کا دم باقی نہیں رہا۔

انبیا کی بعثت کا خاص مقصد انسان کے نفس کی تکمیل اور اس کے اخلاق کی تہذیب تھی اور اگرچہ ہر نبی بہ حسبِ ظاہر ایک جداگانہ شریعت کے ساتھ بھیجا گیا مگر نتیجہ تمام شریعتوں کا واحد تھا۔ خدا تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے: شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ. یعنی ''مقرر کیا تمہارے لیے وہ دین جو تعلیم کیا تھا ہم نے نوح کو اور جس کی وحی بھیجی ہم نے تجھ اور تعلیم کیا ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو (اور وہ یہ ہے) کہ برپا رکھو دین کو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔ اس سے معلوم ہوا کہ امتِ محمدیہ کو وہی دین تعلیم

ہوا جو نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کو تعلیم ہوا تھا۔ اور آنحضرت نے فرمایا ہے کہ اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ. یعنی ''میں صرف اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاق کی خوبیوں کو کمال کے درجہ پر پہنچادوں۔ اس آیت اور اس حدیث کا مطلب ملانے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تمام ادیان کا خاص مقصد تہذیبِ اخلاقِ انسانی کے سوا اور کوئی شے نہ تھی۔

ایک شخص آنحضرتؐ کی خدمت میں آیا اور اُس نے چار بار آپؐ سے یہ پوچھا کہ ''دین کیا چیز ہے؟'' آپؐ نے ہر بار یہی فرمایا کہ ''حسنِ اخلاق'' (احیاء العلوم) فضیل[1] سے روایت ہے کہ ایک عورت کی نسبت آنحضرتؐ کی خدمت میں یہ عرض کیا گیا کہ ''وہ ہمیشہ روزے رکھتی ہے اور ہمیشہ شب بیدار رہتی ہے مگر بدخلق ہے۔ ہمسایوں کو اپنی بدزبانی سے آزار پہنچاتی ہے۔'' آپؐ نے فرمایا: ''اس میں کچھ خیر نہیں ہے، وہ اہل دوزخ میں سے ہے۔'' (احیاء العلوم) آپ فرماتے ہیں کہ ''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگ سلامت رہیں۔ اور مہاجر وہ ہے جو برائیوں کو چھوڑ دے۔'' (بخاری) ایک شخص نے آنحضرتؐ سے پوچھا کہ ''اسلام کی کونسی چیز سب سے بہتر ہے۔'' آپ نے فرمایا: ''کھانا کھلانا اور جان پہچان اور انجان دونوں سے صاحب سلامت کرنی۔'' (بخاری) آپؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ''تم میں سے کوئی صاحبِ ایمان نہ ہوگا جب تک اپنے بھائی کے لیے بھی وہی نہ چاہے جو اپنے لیے چاہتا ہے۔''

اس سے ظاہر ہے کہ وضو اور غسل، نماز اور روزہ، حج اور زکوٰۃ اور اسی طرح تمام ظاہری احکام مقصود بالذات نہ تھے بلکہ محض تصفیۂ باطن اور معالجۂ نفس اور تہذیبِ اخلاق کے لیے بمنزلۂ آلات کے تھے، چناں چہ نماز کی نسبت ارشاد ہوا کہ وہ ''فحشاء اور منکر سے باز رکھتی ہے۔'' اور روزہ کی نسبت یہ فرمایا کہ ''وہ اس لیے فرض کیے گئے ہیں کہ تم برائیوں سے بچو۔'' اسی طرح قرونِ اولیٰ اور خاص کر قرنِ اوّل میں طہارت اور نجاست اور عباداتِ بدنی اور اعمالِ ظاہری میں اس مبالغہ اور تشدد کا کہیں نام نہ تھا جو اس کے بعد عباد و زہاد و فقہا اور

---

[1] فضیل بن ایاز ایک نہایت دیندار اور زاہد و عابد بزرگ تھے۔ حضرت امام جعفر صادقؒ کے شاگرد اور سری سقطی کے اُستاد ہیں۔ حرم کعبہ میں نماز پڑھتے ہوئے ۱۸۷ھ (۸۰۳ء) میں انتقال فرمایا۔

صوفیہ میں پیدا ہوا۔

امام غزالی[1] ''احیاء العلوم'' میں لکھتے ہیں کہ صحابۂ کبار کسبِ معاش اور طلبِ علم اور اعلائے کلمۃ اللہ اور ضروری کاموں میں ایسے مصروف تھے کہ ان کو ان باتوں کی اصلا فرصت نہ تھی۔ وہ ننگے پاؤں چلتے تھے، زمین پر نماز پڑھتے تھے، خاک پر بیٹھتے تھے، گھوڑے اور اونٹ وغیرہ کے پسینے سے پرہیز نہ کرتے تھے، دل کی پاکیزگی میں بہت کوشش کرتے تھے، ظاہری پاکی پر چنداں التفات نہ کرتے تھے، غیر مذہب والوں کے برتن کا پانی برابر استعمال کرتے تھے۔ جس برتن میں عام لوگوں کے ہاتھ پڑیں اُس سے نفرت نہ کرتے تھے۔ انتہیٰ۔ آنحضرت صلعم بھی ظاہری احکام کی چنداں پابندی نہ فرماتے تھے، ''کبھی ایک ہی چلو سے **مَضْمَضَہ**[2] اور **اِستِنْشَاق**[3] دونوں کر لیتے تھے، کبھی دو چلو سے، کبھی تین چلو سے۔ جس زمین پر نماز پڑھتے اُسی پر تیمّم کر لیتے اور یہ فرماتے کہ ''جہاں نماز کا وقت آ جائے وہیں مسلمان کی مسجد ہے اور وہیں اُس کی طہارت ہے۔ ہمیشہ مقتدیوں کا خیال رکھتے تھے۔ اگر جماعت میں سے کسی بچے کے رونے کی آواز آتی تو نماز جلد ختم دیتے۔ اگر نماز میں کوئی بچہ آپ سے آن لپٹتا تو اُسے اٹھا کر کندھے پر بٹھا لیتے۔ بارہا امام حسینؓ سجدے کی حالت میں آپؐ کی پشت مبارک پر چڑھ گئے اور آپؐ نے اُن کے خیال سے سجدے کو طول دیا۔ کبھی آپؐ نماز میں ہوتے تھے اور حضرت عائشہؓ اپنے حجرہ کی کنڈی کھٹکھٹاتیں تو آپؐ نماز ہی میں جا کر باہر کی کنڈی کھول دیتے تھے۔ کبھی آپؐ سے نماز میں

---

[1] امام غزالہ: ابو حامد محمد بن محمد نام اور حجۃ الاسلام لقب ہے، عوام میں اپنے جائے پیدائش غزالہ (واقع طوس ملک خراسان) کی نسبت سے غزالی مشہور ہیں۔ بہت سی معرکتہ آلارا کتابوں مثل ''احیاء العلوم''، ''جواہر القرآن''، ''تفسیر یا قوت التاویل'' (چالیس جلدوں میں)، ''مشکوۃ الانوار'' اور ''کیمیائے سعادت'' وغیرہ کے مصنف ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ شہرت ''احیاء العلوم'' کو حاصل ہے۔ بہت بڑے صوفی، فقیہ، ادیب، محقق، فلسفی اور ادیب تھے۔ ۴۲۴ھ (۱۰۳۸ء) میں پیدا ہوئے اور ۵۲۰ھ (۱۱۲۶ء) میں وفات پائی۔ ۱۲

[2] ''مضمضہ'' کلی کرنے کو کہتے ہیں۔

[3] ''استنشاق'' کے معنی ناک میں پانی ڈالنا۔

کوئی سلام کرتا آپؐ نماز ہی میں اشارہ سے اس کو جواب دیتے۔ ایک بار بنی عبدالمطلب کی دو لڑکیاں لڑتی ہوئی جب آپؐ کے قریب آئیں تو نماز ہی میں آپؐ نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اُن کو چھڑا دیا۔ کبھی جوتیوں سمیت نماز پڑھتے تھے اور کبھی ننگے پاؤں۔'' (سفر السعادۃ)۔

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ''آپؐ نے ظہر کو عصر کے ساتھ اور مغرب کو عشا کے ساتھ اس حالت میں جمع کیا کہ نہ سفر تھا نہ کوئی خطرہ تھا اور نہ بارش تھی۔'' لوگوں نے ابن عباسؓ سے پوچھا کہ ''آپؐ نے ایسا کیوں کیا؟'' ''اس لیے کہ امت پر تنگی نہ رہے۔'' (ترمذی)

موسمِ حج میں ایک شخص نے آپؐ سے آ کر عرض کی کہ ''میں نے قربانی سے پہلے سر منڈوا لیا ہے۔'' فرمایا: ''کچھ حرج نہیں اب قربانی کر لے۔'' پھر ایک اور شخص نے آ کر کہا کہ ''میں نے کنکریاں پھینکنے سے پہلے قربانی کر لی ہے۔'' فرمایا: ''کچھ حرج نہیں اب کنکریاں پھینک لے۔'' اسی طرح جس کسی نے ایسی بے ترتیبی کی بابت پوچھا اُس سے آپؐ نے یہی فرمایا کہ اِفْعَل وَلَا حَرِجَ. (بخاری)۔ عمرو[1] بن عاصؓ ایک آیت سے یہ سمجھ گئے کہ جنب کی ضرورت کی حالت میں تیمّم کافی ہے۔ اور عمر بن خطابؓ ایک دوسری آیت سے یہ سمجھے کہ تیمّم لمسِ نساء کے لیے ہے نہ جنابت کے لیے۔ آنحضرتؐ نے دونوں پر کوئی اعتراض نہیں فرمایا۔ طارق[2]ؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے جنابت کی حالت میں تیمّم کر کے نماز پڑھ لی اور جب آپؐ سے ذکر کیا تو اُسے بھی آپؐ نے یہی فرمایا کہ ''تو ٹھیک سمجھا۔'' (عقد الجید)۔ غرض کہ تمام اعمالِ ظاہری اور عباداتِ بدنی میں آپؐ کے برتاؤ ایسے تھے جن میں امت کے لیے آسانی ہو۔

شاہ ولی اللہ صاحب ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں لکھتے ہیں کہ حضور صلعم کے زمانے میں احکام کی بحث ایسی نہ تھی جیسی فقہا کے وقت میں ہوئی کہ وہ کمال اہتمام سے ہر شے کے

---

[1] عمرو بن عاصؓ سہمی قریشی مشہور صحابی، زبردست بہادر اور فاتح مصر ہیں۔ ۵ھ یا ۸ھ میں حضرت خالد بن ولیدؓ کے ساتھ مکہ سے حاضر ہو کر اسلام لائے اور عمان کے حاکم مقرر کیے گئے۔ مصر اُنھوں نے حضرت عمرؓ کے زمانے میں فتح کیا تھا۔ حضرت معاویہؓ کے بڑے مشیروں میں سے تھے۔ ۹۰ برس کی عمر میں ۴۳ھ میں وفات پائی۔

[2] طارقؓ آنحضرتؐ کے صحابہ میں سے ہیں۔

ارکان اور شرائط اور آداب جدا جدا بیان کرتے ہیں اور فرضی صورتوں پر گفتگو کرتے ہیں۔ آنحضرتؐ کے زمانے میں تو یہ حال تھا کہ صحابہ نے جس طرح آپؐ کو وضو کرتے دیکھا اُسی طرح آپ بھی کرنے لگے، نہ آنحضرتؐ نے کسی چیز کو رکن ٹھہرایا اور نہ ادب ٹھہرایا۔ اسی طرح انھوں نے جیسے آنحضرتؐ کو نماز پڑھتے اور حج کرتے دیکھا ویسا ہی آپ بھی کرنے لگے۔ کبھی آپؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ وضو میں چھ فرض ہیں یا چار۔ اور کبھی آپؐ نے (فقہا کی طرح) کوئی صورت فرض کر کے اُس پر کوئی حکم نہیں لگایا الا ماشاء اللہ۔ اور صحابہ بھی ایسے امور میں آپؐ سے کچھ سوال نہ کرتے تھے۔ انتہیٰ۔

عمر بن اسحٰق[1] سے منقول ہے کہ اصحاب نبی میں سے جتنے صحابیوں کو میں دیکھا ہے وہ اُن کی نسبت زیادہ ہیں جو مجھ سے پہلے گذر گئے۔ میں نے کوئی گروہ دین میں آسانی کرنے والا اور سختی نہ کرنے والا اُن سے زیادہ نہیں دیکھا۔ (دارمی) عبادہ بن یسر کندی[2] سے لوگوں نے سوال کیا کہ ''اُس عورت کی بابت کیا حکم ہے جو کسی ایسے قافلہ میں مر جائے جس میں اُس کا کوئی ولی نہ ہو۔'' عبادہ نے کہا: ''جن لوگوں کو میں نے دیکھا ہے نہ وہ تمہاری سی نکتہ چینیاں کرتے تھے اور نہ ایسے مسائل پوچھتے تھے۔'' (دارمی)

ہندوستان کے ایک پرہیزگار اور ذی علم امیر[3] نے شیخ العلما عبداللہ سراج کی سے حقے کی اباحت اور حرمت کی بابت سوال کیا۔ شیخ نے مسکرا کر یہ آیت پڑھی کہ **وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُکُمُ الْکَذِبَ ھٰذَا حَلالٌ وَّھٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ**.

یعنی ''نہ کہو تم اپنی زبانوں کی بے اصل باتوں کو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے خدا پر جھوٹ باندھنے کے لیے۔''

افسوس ہے کہ ہمارے علما نے احکامِ ظاہری میں تعمق اور تدقیق کو اس قدر کام فرمایا کہ شریعت کا موضوع بالکل بدل گیا اور جس دین کی نسبت الدِّیْنُ لِسُر کہا گیا تھا وہ الدِّیْنُ عُسُر

---

[1] و [2] عمر بن اسحٰقؒ اور عبادہ بن یسر کندیؒ دونوں مشہور تابعی ہیں۔

[3] یہ سوال نواب مصطفیٰ خاں مرحوم (شیفتہؔ و حسرتیؔ) آف جہانگیر آباد نے کیا تھا اور راقم نے خود اُن کی زبان سے یہ روایت سنی ہے۔ (حالیؔ)

کہنے کا مستحق ہو گیا۔ طہارت اور نجاست کی تحقیق میں اتنا کچھ لکھا گیا کہ انسان کی تمام عمر اس کے دیکھنے اور پڑھنے اور سمجھنے کے لیے کفایت نہیں کر سکتی۔ اگر فقط آمین اور رفع یدین اور قراتِ فاتحہ کی تحقیقات میں کوئی شخص اپنا تمام وقت صرف کرے تو اس کی عمر کا ایک بڑا حصہ اس میں تمام ہو جائے گا۔ اگر کوئی شخص ایک سجدۂ سہو کی تمام جزئیات کو ازبر کرنا چاہے اور اس نالائق دُنیا کی ضروریات بھی سرانجام دیتا رہے تو نہایت دشوار معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام جزئیات کو احاطہ کر سکے۔ ان کلمات کا جن کے زبان سے نکلتے ہی ایمان باقی نہیں رہتا۔ ایک غیر محدود باب ہے جس کو کوئی حد و حصر نہیں کر سکتا۔ اسی طرح معاملات میں وہ تدقیقیں کی گئیں کہ کوئی بیع اور کوئی عقد فقہا کے اصول کے موافق صحیح نہیں ٹھہر سکتا۔ علمائے دین کے سوا جن کی نسبت بدگمانی نہیں کی جا سکتی شاید ہی کسی امتی کا وضو، غسل، نماز، روزہ، حج، زکوۃ، بیع، شرا، نکاح، طلاق وغیرہ صحیح ہوتا ہوگا۔ امام شعرانی[1] نے ''میزان'' میں لکھا ہے کہ ''دین میں جتنی آسانیاں ہیں وہ خدا کی اور رسولؐ کی طرف سے ہیں اور جتنی دشواریاں ہیں وہ علما کی طرف سے ہیں۔'' واقعی یہ قول نہایت صحیح ہے کیوں کہ ہم اپنے عہد کے علما کا حال ایسا ہی دیکھتے ہیں۔ انہی دنوں میں ایک مولوی صاحب نے جو کہ عامل بالحدیث ہیں دس مسئلوں کی نسبت یہ اشتہار دیا تھا کہ اگر ان کے ثبوت میں کوئی صاحب آیاتِ قرآنی یا احادیث صحیحہ جن کی صحت میں کسی کو کلام نہ ہو اور جس مدعا کے لیے وہ پیش کی جائیں اس واسطے نصِ صریح قطعی الدلالہ ہوں پیش کریں گے تو فی حدیث اور فی آیت دس روپیہ انعام دوں گا۔ اس کے جواب میں ایک دوسرے مولوی صاحب نے نہایت تعجب سے یہ لکھا ہے کہ اگر احتجاج کا مدار صرف آیت اور اُس حدیث صحیح پر ہو جس کی صحت میں کسی کو کلام نہ ہو اور اثبات دعویٰ کے لیے نص صریح قطعی الدلالہ ہو تو دین اسلام کے بتیس حصوں میں سے اکتیس (۳۱) حصے باطل ہو جائیں گے اور صرف ایک بتیسواں حصہ باقی رہ جائے گا۔ اور اس بات کو بہت عمدہ طور سے ثابت کیا ہے۔

مجیب صاحب کی اس تقریر سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ہمارے علما کے نزدیک دین

---

[1] عبدالوہاب بن محمد بن رفیع الدین احمد شعرانی بڑے محدث اور مصنف تھے۔ ۹۳۲ھ میں انتقال کیا۔

کی عظمت اور بڑائی اس میں ہے کہ وہ ایک ایسا دفترِ طویل الذیل ہو جو ''داستانِ امیر حمزہ'' اور ''بوستانِ خیال'' کی طرح سمیٹا نہ سمٹے۔ نیز اُن کے نزدیک ایسی تقریر کے بطلاق میں کچھ شبہ نہیں ہے جس سے دین کا اختصار لازم آئے۔ مگر اس تعمق اور تشدد میں علما کے ساتھ حضراتِ صوفیہ کو بھی شامل کرنا ضرور ہے جنھوں نے عبادات شاقہ اور بے انتہا اذکار و اشغال اور دائمی روزے اور سخت سخت ریاضتیں اختیار کر کے اوروں کو ریس دلائی اور امت کو اور بھی زیادہ بوجھل اور گرانبار کر دیا اور تحریفِ دین کی ایک دوسری بنیاد ڈالی۔

صحابہ نماز بھی پڑھتے تھے، روزہ بھی رکھتے تھے اور دُنیا کے سارے کام بھی سرانجام کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کا قول تھا کہ اَحسُبُ جَزْیَۃُ الجُرَیْنِ وَاَنَافِی الصَّلوٰۃ وَاُجَھِّزُ الجَیشُ وَاَنَافِی الصَّلوٰۃ. یعنی ''میں بحرین کے خراج کا حساب لگاتا ہوں اور نماز میں بھی ہوتا ہوں اور لشکر کی تیاری کرتا ہوں اور نماز میں بھی ہوتا ہوں۔'' وہ نکاح کرتے تھے، بال بچوں کے لیے کمائی کر کے لاتے تھے، مہماتِ خلافت کو سرانجام کرتے تھے، خلیفۂ وقت کی اعانت میں مصروف رہتے تھے، لوگوں کے جھگڑے فیصلہ کرتے تھے۔ غرض کہ دُنیا کے تمام کام جن کے بغیر دین کی شوکت ہرگز نہیں رہ سکتی سرانجام کرتے تھے۔ اگر وہ بھی حضراتِ صوفیہ کی طرح خانقاہوں میں ہو بیٹھے اور نماز، روزہ اور ذکر و شغل کے سوا سارے کام چھوڑ دیتے تو آج بغداد میں پیرانؔ[1] پیر کی درگاہ اور اجمیر میں خواجۂ[2] خواجگانِ کا مزار کا کہیں نام و نشان نہ ہوتا۔ شاید وہاں کوئی عظیم الشان آتش کدہ اور یہاں کوئی عالی شان

---

1. پیران پیر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کو کہتے ہیں۔ بغداد کی قریب قصبہ جیلان میں ۲۹ر شعبان ۴۷۰ھ (۱۰۷۸ء) کو پیدا ہوئے۔ بغداد میں تحصیل علم کی۔ اپنے زمانے کے مجدد۔ اعلیٰ درجہ کے صوفی، بے نظیر عالم علم دین۔ آپ نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں جن میں سے ''غنیۃ الطالبین'' فقہ میں اور ''بہجۃ الاسرار'' تصوف میں مشہور ہیں۔ بغداد میں بعمر ۹۰ سال ۵۶۱ھ (۱۱۶۵ء) میں آپ کی وفات ہوئی۔
2. خواجۂ جواجگان حضرت معین الدین سنجری چشتی اجمیری بہت بڑے صوفی۔ عالم اور ایک باکمال بزرگ تھے۔ ۵۳۷ھ (۱۱۴۲ء) میں اصفہان میں پیدا ہوئے۔ ۵۲ سال کی عمر میں ہندوستان تشریف لائے اور ۴۵ سال اجمیر میں قیام فرما کر تبلیغ اسلام میں مصروف رہے۔ ۶۳۳ھ (۱۲۳۵ء) میں وفات پائی۔ آپ کا مزار اجمیر میں زیارت گاہ عام و خاص ہے۔

بت خانہ نظر آتا جہاں مسلمانوں کی ہوا تک نہ پہنچ سکتی۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں لکھتے ہیں کہ عبادت میں سب سے زیادہ مضر چیز انسان کا عبادت سے اکتا جانا ہے کیوں کہ پھر اُس عبادت میں خشوع کی صفت باقی نہیں رہتی اور اس کی تمام مشقتیں جو وہ عبادت میں کرتا ہے، عبادت کی روحانیت سے محروم رہ جاتی ہیں۔ چناں چہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ ''ہر چیز کی حرص ہوتی ہے اور ہر حرص کے بعد سستی اور ماندگی ضرور ہے۔'' اسی واسطے شارع نے عبادات کی مقدار ایسے طور پر معین کی ہے جیسے دوا کی مقدار مریض کے لیے کہ نہ اُس سے زیادہ ہونی چاہیے نہ کم۔ نیز اصل مقصود تہذیبِ نفس ہے ایسے طور پر کہ تدابیر حسنِ معیشت اور حقوقِ عباد فروگزاشت نہ ہونے پائیں آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ ''میں روزہ بھی رکھتا ہوں، افطار بھی کرتا ہوں، تہجد بھی پڑھتا ہوں، سوتا بھی ہوں، نکاح بھی کرتا ہوں، سو جس نے میرے طریقے کو چھوڑا اس کو مجھ سے علاقہ نہیں۔'' نیز شریعت کا بڑا مقصد یہ ہے کہ دین کی باتوں میں دقتیں پیدا کرنے کا رستہ بند کیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ لوگ اس کو لازم پکڑ لیں اور جو اُن کے بعد پیدا ہوں وہ اُن کو عبادات مفروضہ خیال کرنے لگیں اور جو اُن کے بعد پیدا ہوں اُن کو اُن عبادات کی فرضیت کا یقین ہو جائے اور رفتہ رفتہ دین محرف ہو جائے۔'' انھیں مصلحتوں سے آنحضرتؐ نے چاہا کہ لوگ اعمال میں میانہ روی اختیار کریں اور یہ فرمایا کہ خُذُوْا مِنَ الْاَعْمَالِ مَاتُطِیْقُوْنَ. انتہیٰ ملخصاً۔

الغرض یہ دوسرا حاشیہ جو فقہا کے تعمق اور صوفیہ کے تشدد سے دین اسلام پر چڑھا اُس نے بھی اہلِ اسلام کو سخت نقصان پہنچایا اور اس کے بُرے نتائج اس وقت ہم آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

مسلمانوں کی دینوی ترقیات اس سے بالکل مسدود ہی نہیں ہو گئیں بلکہ تنزل کے ساتھ مبدل ہو گئیں اور دین اسلام جو ایک صاف اور ہموار اور نہایت نزدیک رستہ تھا وہ اُن کو ایسا پیچ دار، اونچا نیچا اور دور دراز نظر آیا جس کے طے کرنے میں انسان کو اِدھر اُدھر دیکھنے کی مہلت نہیں مل سکتی۔

دوسرے اُن کی تمام ہمت اور توجہ طہارتِ ظاہری اور احکامِ جسمانی کی طرف

مصروف ہوگئی اور طہارت باطنی اور تہذیب روحانی جو کہ اصل مقصود تھی بالکل فراموش ہوگئی اور وہ سراسر عیسیٰ علیہ السلام کے اُس قول کے مصداق ہوگئے جو انھوں نے یہودیوں کی طرف مخاطب ہوکر کہا تھا کہ ''تم اپنے برتنوں کو باہر سے دھوتے ہو لیکن اندر کی ناپاکی کو دور نہیں کرتے۔'' یہی سبب ہے کہ جس قدر بداخلاقیاں علما اور عباد وزہاد وحجاج میں دیکھی جاتی ہیں وہ عام مسلمانوں میں بہت کم پائی جاتی ہیں۔

تیسرا حاشیہ واعظوں کی نادانی اور صوفیوں کی سادہ لوحی یا خودغرضوں کی بددیانتی سے اس پاک دین پر چڑھا۔ انھوں نے

اعمال ظاہری کی ترغیب یا کسی مذہب کی تائید یا تعصب کے جوش میں

کسی دنیوی غرض کے پورا کرنے کے لیے سینکڑوں اور ہزاروں حدیثیں وضع کیں اور رفتہ رفتہ یہ سراسر جعلی اور بناوٹی احادیث بھی دین کا ایک اصلی جزو قرار پا گئیں۔ اگرچہ محققین نے اُن کی تحقیقات اور چھان بین کرنے میں کوتاہی نہیں کی اور اُن کی موضوعات اور مفتریات کو احادیث صحیحہ سے جہاں تک ہوسکا جدا کیا مگر اُن کی جرح وقدح صرف کتابوں ہی تک محدود رہی اور واعظوں کے رنگین فقرے جو کم سے کم ہزار برس تک وعظ کی بھری مجلسوں میں وقتاً فوقتاً مسلمانوں پر چلتے رہے وہ مشرق سے مغرب تک اور جنوب سے شمال تک وبا کی طرح پھیل گئے۔

علما کی ایک بڑی جماعت (جیسا کہ ''جامع الاصول'' اور ''شرح نخبۃ الفکر'' وغیرہ میں تصریح کی گئی ہے۔) اس بات پر متفق ہوگئی تھی کہ ترغیب اور ترہیب کے لیے حدیثیں وضع کرنی یا ضعیف اور منکر حدیثوں کی روایت کرنی جائز ہے۔

اسی بنا پر بے شمار حدیثیں ترغیب کے لیے وضع کی گئیں مثلاً مؤذنوں کے فضائل میں ایسا مبالغہ کیا گیا کہ اُن کے مراتب سے بڑھ کر انسان کے لیے وَلَو کَانَ بَیتاً وَ اِمَاماً کوئی درجہ قصور میں نہیں آ سکتا۔ مثلاً یہ حدیث کہ ''مؤذن کے لیے ہر شے جس کو اُس کی اذان کی آواز پہنچی ہے پتھر ہو یا درخت یا ڈھیلا یا خشک یا تر قیامت کے دن سب گواہی دیں گے اور اس مسجد کے تمام نمازیوں کے برابر اُس کو ثواب ملے۔'' یا یہ حدیث کہ ''قیامت کے

دن سونے کی کرسیاں لائی جائیں گی جن میں یاقوت اور موتی جڑے ہوئے ہوں گے اور سندس واستبرق کے فرش پر بچھائی جائیں گی۔ پھر اُن پر نور کے سائبان لگائے جائیں گے اور پکارا جائے گا کہ کہاں ہیں مؤذن تا کہ اُن پر آ کر بیٹھیں۔'' یا مثلاً مسجد کی خدمت کرنے والوں کے فضائل میں جیسے:-

''جس نے مسجد میں چراغ روشن کیا جب تک وہ چراغ روشن ہے اس کے لیے فرشتے اور حاملانِ عرش برابر استغفار کرتے رہتے ہیں۔''

''جس مسجد میں قندیل لٹکائی یا بوریا بچھایا اُس پر ستر فرشتے برابر درود بھیجتے ہیں۔ جب تک وہ قندیل نہیں بجھتی یا وہ بوریا نہیں ٹوٹتا۔''

''جس نے خدا کے کسی گھر میں جھاڑو دی اُس نے گویا چار سو حج کیے اور چار سو بردے آزاد کیے اور چار سو روزے رکھے اور چار سو جہاد کیے۔''

یا مثلاً حفظۃ القرآن کے فضائل میں جیسے یہ حدیث کہ ''حافظِ قرآن کی فضیلت غیر حافظ پر ایسی ہے جیسے خالق کی فضیلت مخلوق پر۔'' اسی طرح سینکڑوں روزے اور ہزاروں نمازیں اور بے انتہا طواف اور بے شمار صدقے وضع کیے گئے اور اُن کے اجر اور ثواب کے بیان کرنے میں حد سے زیادہ مبالغہ کیا گیا۔

ترہیب وتخویف کے لیے بھی ایسے ہی مبالغہ کے ساتھ حدیثیں وضع کی گئیں مثلاً:-

''جس نے دو نمازوں کے بغیر عذر کے جمع کیا وہ گناہِ کبیر کا مرتکب ہوا۔''

''مسجد کے ہمسایہ کی نماز مسجد کے سوا کہیں نہیں ہوتی۔''

''جو شخص مسجد میں دُنیا کی باتیں کرتا ہے خدا اس کے تمام اعمال حسنہ کو ضائع کر دیتا ہے۔''

''جس نے بے نماز کی مدد ایک لقمہ سے کی اُس نے گویا تمام نبیوں کے قتل میں اعانت کی۔''

بہت سی حدیثیں اپنے اپنے مذہب کی تائید اور نصرت کے لیے بنائی گئیں مثلاً:-

''جس نے نماز میں رفع یدین کیا اُس کی نماز باطل ہے۔''

''جس نے رکوع میں رفع کیا اُس کی نماز باطل ہے۔''

''جب سورۂ کوثر نازل ہوئی تو آنحضرتؐ نے جبرئیل سے پوچھا کہ ''نحر'' سے کیا مراد ہے۔ کہا: ''یہ مراد ہے کہ جب نماز کی نیت باندھو تو پہلی تکبیر پر اور رکوع کرتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع یدین کرو۔''

بہت سی حدیثیں تعصب یا تنفر کی وجہ سے بنائی گئیں جیسے امام شافعیؒ[1] اور امام اعظمؒ[2] کی مدح یا ذم میں یا جیسے حضرت معاویہ[3] بن ابی سفیانؓ کی مدح یا ذم میں مثلاً یہ حدیثیں:-

''خدا کے نزدیک تین امین ہیں۔(۱) میں، (۲) جبرئیل، اور (۳) معاویہ۔''

''ہر امت کے لیے ایک فرعون ہے اور اس امت کا فرعون معاویہ ہے۔''

''ایک بار آنحضرتؐ نے جبرئیل سے ہاتھ ملانا چاہا۔ جبرئیل نے ہاتھ ملانے سے انکار کیا۔ آپؐ نے سبب پوچھا۔ کہا: ''تم نے ایک یہودی کا ہاتھ پکڑا تھا۔ اور جو ہاتھ کافر کے ہاتھ سے مس کرے میں اُس سے ہاتھ ملانا پسند نہیں کرتا۔''

''جو شخص یہودی یا نصرانی سے مصافحہ کرے اس کو اپنا ہاتھ دھونا اور وضو کر لینا چاہیے۔''

---

[1] امام شافعی: اصل نام محمد بن ادریس، کنیت ابوعبداللہ، ناصر الحدیث لقب اور شافعی اپنے جد اعلیٰ شافع بن سائب کی نسبت سے مشہور ہیں۔ ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ فرقہ شافعیہ کے امام۔ بڑے مجتہد اور محدث تھے۔ آپ کے پیرو عرب، مصر اور ہندوستان میں بکثرت ہیں۔ ۲۰۴ھ میں وفات پائی۔

[2] نعمان بن ثابت نام: ابوحنیفہ کنیت اور امام اعظم لقب ہے۔ کوفہ کے رہنے والے تھے اور ۸۰ھ (۷۰۰ء) میں پیدا ہوئے۔ اہل سنت والجماعت کے امام ہیں اور بہت بڑے فقیہ اور محقق شریعت تھے۔ رجب ۱۵۰ھ (۷۶۰ء) میں آپ کا انتقال ہوا۔

[3] معاویہ: خاندانِ بنوامیہ کے بانی اور آنحضرتؐ کے مشہور صحابی ہیں۔ ۸ھ (۶۳۰ء) میں بموقعہ فتح مکہ مسلمان ہوئے سیاست اور تدابیر ملکی میں اعلیٰ درجہ کا دماغ پایا تھا۔ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے زمانے میں علاقہ شام کے گورنر رہے۔ مگر حضرت علیؑ کے بعد تمام ممالک اسلامیہ انھیں کے زیر نگیں تھے۔ شمالی افریقہ کے اکثر علاقے، یونان کا کچھ حصہ افغانستان اور سندھ آپ کے زمانے میں فتح ہوئے۔ آپ نے دمشق کو اپنا دارالخلافہ بنایا جو بعد میں تمام خلفائے بنی امیہ کے زمانے میں اسلامی سلطنت کا پایہ تخت رہا۔ ۶۰ھ میں وفات پائی۔

امام ابن جوزیؒ[1] نے لکھا ہے کہ حدیثیں وضع کرنے والوں کا ایک بہت بڑا گروہ ہے جن کے راس و رئیس وہب بن وہب اور قاضی بختری وغیرہ تیرہ آدمی ہیں انتہیٰ۔

انھیں تیرہ آدمیوں میں سے ایک محمد ابن عکاسہ کرمانی ہے جس نے محمد بن تمیم فاریابی کی شرکت میں دس ہزار حدیثوں سے زیادہ وضع کی ہیں۔

ابن جوزیؒ کہتے ہیں کہ ''جن حدیثوں میں وضع اور کذب وغیرہ کے آثار پائے جاتے ہیں وہ کئی قسم کے لوگ ہیں۔''

پہلا گروہ: -بعضے تارکِ دُنیا ہیں جنھوں نے حدیث کی نگہداشت سے غفلت کی۔

دوسرا گروہ: -بعضوں کی تحریریں ضائع ہوگئیں اور انھوں نے اپنی یاد کے بھروسے پر غلط روایتیں کردیں۔

تیسرا گروہ: -بعضے ثقات بھی ہیں جو بڑھاپے میں آکر خرف ہوگئے۔

چوتھا گروہ: - بعضوں نے سہو سے غلط روایت کی اور جب اپنی غلطی سے خبردار ہوئے تو اُن صحیح روایت کرنے شرم آئی۔

پانچواں گروہ: - بعضے زندیق اور ملحد ہیں جنھوں نے شریعت میں رخنہ اور خرابی ڈالنے کے لیے عمداً اور جان بوجھ کر حدیثیں وضع کیں۔ حماد بن زید نے کہا ہے کہ ''زنادقہ نے چار ہزار حدیثیں وضع کی ہیں۔'' جس وقت ابن ابی العوجاء کو وضعِ حدیث کے جرم میں قتل کرنے لگے تو اُس نے اقرار کیا کہ ''میں نے تمہارے دین میں چار ہزار حدیثیں بنائی ہیں جن میں حرام کو حلال اور حلال کو حرام ٹھہرا ہے۔''

چھٹا گروہ: - بعضے ایسے بھی تھے جو ثواب واجر کی امید پر ترغیب وترہیب کے لیے حدیثیں وضع کرتے تھے۔ گویا اُن کے نزدیک شریعت ناقص تھی جس کی تکمیل کی ضرورت تھی۔

ساتواں گروہ: - بعضوں نے اپنے مذہب کی تائید میں جعلی احادیث بنائیں چناں

---

[1] ابن جوزی: بغداد کے بہت بڑے محدث۔ فرقہ حنبلیہ کے زبردست عالم۔ نہایت مشہور واعظ سینکڑوں کتابوں کے مصنف اور اعلیٰ درجہ کے مقرر تھے۔ عبدالرحمٰن نام تھا۔ ۵۰۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۶/جون ۱۲۰۱ء مطابق ۱۲/رمضان ۵۹۷ھ شب جمعہ کو وفات پائی۔ شیخ سعدیؔ کے استاد تھے۔

چہ اہل بدعت میں سے ایک شخص تائب ہوا تو اُس نے کہا کہ ''حدیث کے لینے میں احتیاط کیا کرو اور دیکھا کرو کہ کس شخص سے حدیث لیتے ہو۔ ہمارا مدت تک یہ حال رہا کہ جس بات کو چاہا حدیث نبویؐ کے پیرایہ میں بیان کر دیا۔''

آٹھواں گروہ:۔ بعضوں نے یہ ٹھہرالیا تھا کہ جس کسی کا کوئی عمدہ قبول ہاتھ لگے اس میں اسناد اپنی طرف سے شامل کر دیجیے اور نبیؐ تک اسناد کو پہنچا دیجیے۔

نواں گروہ:۔ بعضوں نے سلاطین وملوک کے خوش کرنے اور اُن کا تقرب حاصل کرنے کے لیے یہ شیوہ اختیار کیا تھا۔

دسواں گروہ:۔ بعضے قصہ گو اور واعظ تھے جو لوگوں کو حسنِ بیان پر فریفتہ کرنے کے لیے حدیثیں وضع کرتے تھے اور کتبِ صحاح میں اس قسم کی حدیثیں نقل کی گئی ہیں۔ انتہیٰ

اس کے سوا اور بھی اسباب وضع وافترا کے بیان کیے ہیں۔ ''مَنْ شَاءَ فَلْيَرْ جَعَ اِلَى الْمَجْمُوْعَةِ لمُحَمّد بن الشوّكَانِىُ.''

چوتھا حاشیہ یہ چڑھا کہ مفسرین نے اپنی تفسیروں میں ہزاروں موضوع اور ضعیف و منکر حدیثیں بھر دیں اور یہ قابلِ نفریں کام انھوں نے مختلف طریقوں سے کیا۔

صحابہ، تابعین، تبع تابعین ومن بعد ہم کے اقوال بلا ذکر اسناد بہ حسبِ ضرورت اپنی اپنی تفسیروں کی تقویت کے لیے حدیث نبویؐ کے پیرایہ نقل کر دئے گئے۔

یہودیوں سے سنے سنائے لاانتہا جھوٹے اور بے بنیاد قصے تفسیروں میں بھروئے گئے۔

بہت سے مسائل اصول وفروع کے قرآن شریف کی عبارات واشارات سے محض اپنی رائے اور قیاس کے موافق استنباط کیے گئے۔ نہ اُس کی تائید کے لیے کوئی حدیث صحیح نقل کی اور نہ کسی صحابی یا تابعی کا قول لکھا۔

جن موجوداتِ علوی وسفلی کا ذکر قرآن شریف میں آیا ہے اُن کے حقائق کی تشریح ارسطو اور بطلیموس اور دیگر فلاسفۂ یونان کے موافق کی گئی۔

متکلمین نے مخالف فرقوں کو الزام دینے اور اپنا مدعا ثابت کرنے کے لیے صدہا آیتوں کی تفسیریں اپنی مرضی کے موافق کیں اور آیات قرآنی کو کھینچ تان کر کہیں سے کہیں

لے گئے اور یہ تمام کوڑا کرکٹ اصل دین میں داخل سمجھا گیا اور وحی سماوی کی طرح واجب التسلیم خیال کیا گیا۔

''شرح جامع صغیر'' میں علامہ ابن کمال سے نقل کیا گیا ہے کہ ''تفسیر کی کتابیں موضوع حدیثوں سے بھری پڑی ہیں۔''

اسی طرح مفسرین کے قصص و اخبار کی نسبت ابوالامداد ابراہیم نے ''قضاء الوطر حاشیۂ'' و ''نخبۃ الفکر'' میں اور ملاعلی[1] قاری نے ''شرح الشرح نخبۃ الفکر'' میں علامہ سیوطی[2] نے اتقان میں اور علامہ ذہبی[3] نے میزان الاعتدال میں تصریح کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً یہ تمام قصے اہل کتاب کے ہاں سے لیے گئے۔ اصل یہ ہے کہ فتح شام میں عبداللہ[4] بن عمرو بن عاص کو اہل کتاب کی بہت سی کتابیں بہ قدر ایک بار شتر کے ہاتھ لگی تھیں۔ سو جو باتیں اُن سے بکثرت منقول ہیں وہ صرف اخبار اور قصے بنی اسرائیل کے اور روایات اہل کتاب کی ہیں اسی طرح بہت سی روایتیں عبداللہ[5] بن سلام سے بھی اسی قسم مروی

---

[1] ملاعلی قاری: ملاعلی بن سلطان محمد ہروی مکی ایک نہایت مشہور محدیث، فقیہ اور متکلم گزرے ہیں، فقہ حنفیہ کے زبردست عالم تھے، بہت سی کتابوں کے مصنف اور ابن حجر مکی اور شیخ عبداللہ سندھی کے شاگرد ہیں۔ ''شرح فقہ اکبر''، ''مرقاۃ شرح مشکوٰۃ''، ''موضوعات''، ''نور القاری شرح صحیح بخاری''، ''شرح مسلم''، ''جالین شرح جلالین''، ''شرح موطا امام محمد'' وغیرہ بیسیوں کتابوں کے مصنف ہیں۔ ۱۰۱۴ھ میں وفات ہوئی۔

[2] جلال الدین سیوطی: شافعیہ کے اما، اعلیٰ درجہ کے مفسر، زبردست نحوی اور مصر کے رہنے والے تھے۔ قریباً چار سو کتابیں آپ نے لکھی ہیں۔ ''تفسیر اتقان''، ''دار المنشو ر نصف اول تفسیر جلالین''، ''تاریخ انخلفا جمع الجوامع جامع الصغیر''، ''حسن المحاضرہ اور طبقات المفسرین'' وغیرہ ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ ۸۴۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۹۱۱ھ (۱۵۰۵ء) میں وفات پائی۔

[3] ذہبی: ابوعبداللہ شمس الدین بن محمد نہایت مورخ، اسماء الرجال کے ماہر اور محدث تھے۔ ۲۰ جلدوں میں ''تاریخ اسلام'' لکھی۔ ''دول الاسلام''، ''میزان الاعتدال''، ''تذکرۃ الحفاظ'' وغیرہ کے مصنف ہیں۔

[4] عبداللہ: حضرت عمروؓ بن عاص کے صاحبزادے اور نہایت متقی اور پرہیزگار صحابی ہیں۔ اُن کی وفات میں سخت اختلاف ہے۔ ۶۳ھ، ۳۷ھ، ۶۷ھ، ۵۵ھ، ۹۵ھ کا سند وفات لکھا ہے۔

[5] عبداللہ بن سلام: مدینہ کے سر برآوردہ رئیس اور یہودیوں کے زبردست فاضل اور عالم تھے۔ ۲ھ میں اسلام لائے۔ ۴۳ھ میں مدینہ ہی میں انتقال فرمایا۔

ہیں۔ پھر مفسرین کے دوسرے طبقے میں مجاہد[1] اور تیسرے طبقے میں مقاتل بن سلمان[2] اور ان کے سوا لوگوں نے صدہا قصے اہل کتاب سے اخذ کیے ہیں۔

اس مطلب کو اگر تفصیل سے دیکھنا چاہو تو ''تہذیب الاخلاق[3]'' کے ایک مضمون میں جو مولوی مہدی[4] علی صاحب نے لکھا ہے دیکھو۔

متکلمین کے تفلسف اور حکیمانہ تدقیقات سے اس پاک دین پر پانچواں حاشیہ چڑھا اور وہ بھی دین کا ایک اصلی جزو قرار دیا گیا۔

خلفائے عباسیہ کے عہد میں جب مصر، شام، یونان اور قبرس[5] وغیرہ سے فلسفے کی کتابیں مسلمانوں کے ہاتھ لگیں اور اُن کے ترجمے عربی زبان میں ہونے شروع ہوئے اور فلاسفہ کے مختلف خیالات اور اُن کی مختلف رائیں جو باری تعالیٰ کی ذات اور صفات اور عالم کی حقیقت سے علاقہ رکھتی تھیں علمائے اسلام میں شائع ہوئیں تو فلسفہ کی چکنی چپڑی اور دلفریب دلیلوں کے آگے مذہب کی عظمت آہستہ آہستہ دلوں میں کم ہونے لگی کیوں کہ حکما کے مقالات بظاہر موجہ اور مدلل دکھائی دیتے تھے اور مذہبی تعلیمات محض حسنِ عقیدت یا

---

1. مجاہد بن جبیر: تابعی اور مکہ کے فقہا اور قاریوں میں سے ہیں۔ مشہور و معروف بزرگ اور قراءۃ و تفسیر کے امام تھے۔ ۱۰۲ھ میں وفات پائی۔
2. مقاتل: ابوالحسن مقاتل بن سلیمان بن بشیر خراسانی مشہور محدث اور مفسر ہیں۔ ۱۵۰ھ میں بصرہ میں وفات پائی۔
3. ''تہذیب الاخلاق'' ایک ماہوار رسالہ کا نام ہے جو سرسید مختلف اوقات میں نکالتے رہے، اعلیٰ درجہ کا علمی اور مذہبی رسالہ تھا۔ اور سرسید کے تمام بڑے بڑے رفیق اس میں نہایت اعلیٰ پایہ کے مضامین لکھا کرتے تھے۔ اُن تمام مضامین کا مجموعہ تین جلدوں میں اب کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے اور عام طور سے ملتا ہے۔
4. مہدی علی: نواب محسن الملک کا نام ہے جو سرسید کے بڑے گہرے اور اولین رفیقوں میں سے تھے۔ سرسید کے بعد علی گڑھ کالج کے سکریٹری رہے۔ ۹/دسمبر ۱۸۳۷ء کو اٹاوہ میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۶/اکتوبر ۱۹۰۷ء کو شملہ میں انتقال فرمایا۔
5. قبرس بحیرہ روم کا مشہور تاریخی جزیرہ ہے۔ حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں حضرت معاویہ نے ۲۰ھ میں فتح کیا۔

وجدانی شہادت سے تسلیم کی گئی تھیں۔

دوسرے اہل نفاق کے شبہے آنحضرت صلعم کے زمانے میں پیدا ہو چکے تھے اور اسلام میں شک اور تردد کا بیج بو چکے تھے۔

تیسرے آپ کے مرض موت میں اور آپ کی وفات کے بعد کاغذ و دوات، جیش اسامہ، خلافت، فدک، شہادت حضرت عثمانؓ، صفین، جمل وغیرہ کے جھگڑے دین میں اختلاف ڈال چکے تھے۔

پس دین کے ہوا خواہوں نے اس بات کی ضرورت دیکھی کہ فلسفۂ یونانیہ کے مقابلہ میں ایک دوسرا فلسفہ مرتب کیا جائے جس میں مذہبی تعلیمات کی تائید فلسفی دلیلوں سے کی جائے چناں چہ ایسا ہی کیا گیا۔ مگر رفتہ رفتہ جیسا کہ انسان کی طبیعت کا مقتضا ہے اس جدید فلسفہ میں صدہا مباحث ضرورت سے زیادہ بڑھا دئے گئے اور خوب دل کھول کر معرکہ آرائیاں کی گئیں۔ چوں کہ یہ کام کسی جماعت یا کمیٹی نے مل کر نہیں کیا تھا بلکہ جدا جدا طبع آزمائیاں ہوئی تھیں اس لیے ضرور تھا کہ اُن کی رایوں میں بے شمار اختلافات واقع ہوں۔ پس اس طرح دینِ اسلام میں بے شمار فرقے بن گئے مگر علما نے کھینچ تان کر اُن لاانتہا جماعتوں کو تہتّر فوقوں میں محدود کر دیا تاکہ حدیث **ستفترق اُمتی ثلثة و سبعین فرقة کلهم فی النار الاواحدة**[1] کی سچائی میں کچھ فرق نہ آئے۔ اگرچہ ان تہتّر فرقوں میں سے معدود فرقوں کے سوا (جیسے اشاعرہ یا شیعہ یا اُن کی چند شاخیں) کوئی فرقہ اب دُنیا میں نہیں پایا جاتا مگر صدہا بلکہ ہزار ہا کتابیں اُن کے مناظروں اور مباحثوں سے بھری ہوئی اب تک موجود ہیں اور وہ تمام علمِ کلام کے نام سے مشہور ہیں۔

علمِ کلام کی ان کتابوں میں جن مطالب کی تفصیل درج ہے اُن کا جاننا اور سمجھنا اور یقین کرنا ایسا ضروری سمجھا گیا ہے کہ اُن کے بغیر اسلام معتبر اور صحیح نہیں ہو سکتا۔ مثلاً اشاعرہ

---

[1] یعنی ''میری امت تہتّر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی وہ سب دوزخی ہوں گے سوائے ایک کے، لیکن علامہ مجدالدین فیروز آبادی نے ''سفر السعادة'' کے خاتمہ پر لکھا ہے کہ اس باب میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہوئی۔

کے ہاں و آج کل ''اہل سنت والجماعت'' کے نام سے مشہور ہیں ان باتوں کا انکار کرنا کہ صفاتِ باری تعالیٰ نہ عین ذات ہیں، نہ غیر ذات، نہ لاعین، نہ لاغیر، یا کہ خدا تعالیٰ اگر تمام نیک بندوں کو ہمیشہ کے لیے دوزخ میں ڈال دے اور تمام شریروں کو ہمیشہ کے لیے جنت میں بھیج دے تو اس کی طرف حیف ومیل کی نسبت نہیں ہوسکتی یا یہ کہ خلفا کی فضیلت ایک دوسرے پر خلافت ترتیب کے موافق ہے یعنی ہر خلیفۂ سابق خلیفۂ لاحق سے افضل ہے بالکل ایسا ہی ہے جیسے نبوت یا معاد کا انکار کرنا۔ اگر کوئی شخص مثلاً رویت بصری کو محال قرار دے اور حدیث نبویؐ جو رویت بصری پر دلالت کرتی ہے۔ اُس کی تاویل کرے یا علی مرتضیٰؓ کو شیخین کے برابر یا اُن سے افضل سمجھے وہ فوراً جماعتِ اہل سنت سے باہر ہو جاتا ہے اور اُن فرقوں میں شمار کیا جاتا ہے جن کی نسبت کُلھُمْ فِی النَّارِ کہا گیا ہے۔ ''شرح مواقف'' اور ''شرح مقاصد'' اور امام رازی[1] کی اکثر مسبوط کتابیں جو علمِ کلام میں ہیں اور ''صواعق محرقہ'' اور ''صواقع کابلی'' اور ''تحفہ اور منتہی الکلام'' اور ''ازالۃ الغین'' اور اس قسم کی ہر کتاب اور ہر رسالہ جو علم کلام میں اشاعرہ کی تائید کے لیے لکھا گیا ہو یا لکھا جائے، سب اوّل سے آخر تک واجب التسلیم سمجھے گئے ہیں اور جو شخص اُن کے خلاف ایک لفظ بھی کہتا ہے وہ مبتدی سمجھا جاتا ہے۔

چھٹا حاشیہ تقلید اور بدعات اور رسوم کا ایک طویل الذیل حاشیہ ہے جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا ہے۔ یہ حاشیہ اصل دین سے بھی زیادہ عزیز ہوگیا ہے۔

تقلید نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کتبِ سابقہ کی طرح منسوخ کر دیا ہے۔

کتاب اللہ سوائے اس کے کسی کام کی چیز نہیں رہی:-

ذرا ذرا سے بچے اُسے مکتبوں میں طوطے کی طرح پڑھیں یا

---

[1] امام رازی: ''تفسیر کبیر'' کے مصنف اور تاریخ اسلام میں زبردست عالم اور اعلیٰ پایہ کے مصنف شمار ہوتے ہیں۔ بہت سے علوم وفنون میں کامل دست گاہ رکھتے تھے۔ ۵۴۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۶۰۶ھ میں انتقال فرمایا۔

بڑے ہوکر اُس کی تلاوت محض لفظی طور پر کریں یا
ختموں اور عرسوں میں اُس کی چند آیتیں یا سورتیں مناقب کے ساتھ پڑھی جائیں یا
نئے مردوں کی قبروں پر اس کا ایک آدھ ختم کرایا جائے یا
رمضان کی تراویح میں اکتا اکتا کر اور پچھتا پچھتا کر اُس کا ایک ختم وہ لوگ سنیں جو
اُس کا ایک حرف نہیں سمجھتے۔

سنت رسول اللہؐ کا بھی یہی حال ہے کہ اوّل تو اس کے پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے سمجھانے والے روز بروز صفحہ ہستی سے محو ہوتے جاتے ہیں اور اگر چند نفوس متبرکہ باقی ہیں اُن کا لے دے کر یہ کام ہے کہ صحاح کے اوّل و آخر کے چند صفحے تبرکاً و تیمناً شاگرد کو سرسری طور پر پڑھا دئے اور اس کو علمِ حدیث کی سند لکھ دی۔ شاگرد اور استاد دونوں کو اس بات کا خیال بھی نہیں آتا کہ کبھی ضرورت کے وقت ہم کو ان حدیثوں سے کچھ کام پڑے گا۔ کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ کوئی فتویٰ اور کسی مسئلہ کا جواب اُس وقت تک مقبول نہیں ہوسکتا جب تک قاضی خاں اور عالمگیری یا بحرالرائق وغیرہ کی عبارت اُس میں درج نہ کی جائے۔ گویا قرآن اور حدیث کے مخاطبِ صحیح تمام امت میں چند آدمی تھے جو اُن کا لبِّ لباب نکال کر کتبِ فقیہ میں درج کر گئے۔ اب کتاب وسنت معاذ اللہ بالکل اس شعر کے مصداق ہیں ؎

من ز قرآں مغز را برداشتم
استخواں پیشِ سگاں انداختم

رسوم و بدعات کا بھی یہی حال ہے کہ وہ بھی اسلام کی رگ و پے میں بیٹھ گئی ہیں اُن کا دین سے جدا کرنا اور گوشت کا ناخن سے جدا کرنا برابر ہے۔ دو پلڑی ٹوپی، پردہ دار انگرکھا، ڈھیلا یا تنگ مہری کا پائجامہ، نوک دار جوتی، زمین پر بیٹھ کر کھانا اور اسی قسم کی سینکڑوں باتیں مسلمانوں نے قطعاً غیر قوموں سے سیکھی ہیں۔ بیاہ شادی کی اکثر رسوم ہندوستان میں آکر انھوں نے تعلیم پائی ہیں مگر وہ اس قدر عزیز اور ضروری ہوگئی ہیں کہ اگر کوئی شخص اُن کے خلاف کرتا یا کہتا ہے تو وہ کرسٹان کا خطاب پاتا ہے۔

یہاں ہم کو رسوم و بدعات کا مفصل بیان کرنا منظور نہیں ہے بلکہ مجمل طور پر صرف یہ

جتانا ہے کہ دینِ اسلام پر جو فضول اور لغو حواشی چڑھے ہوئے ہیں اُن میں سب سے بڑا حاشیہ تقلید اور رسول و بدعات کا ہے۔ موقع اور فرصت ہوئی تو کسی دوسرے وقت یہ بحث کسی قدر تفصیل سے لکھی جائے گی۔

یہ تمام حواشی جو ہم نے اوپر بیان کیے ان کے سوا اور بھی بہت سے حاشیئے اس سیدھے سادھے دین پر چڑھے ہوئے ہیں جو تھوڑا غور کرنے سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ پس نہایت افسوس کی بات ہے کہ ہمارے علمائے دین دوش اسلام کو اس ناگوار بوجھ سے ہلکا کرنے میں کوشش نہیں کرتے بلکہ اس کی عظمت اور بزرگی اسی میں جانتے ہیں کہ وہ روز بروز اور بھی زیادہ بوجھل اور گرانبار ہوتا چلا جائے۔ شاید پچھلی صدیوں میں کوئی زمانہ ایسا بھی گذرا ہو جس میں امت کے لیے شریعت کا دائرہ تنگ کرنا قرین مصلحت سمجھا گیا ہو اور انسان کے حق میں خدا اور رسولؐ کی تکلیفیں ناکافی خیال کی گئی ہوں اور اُس کی بہبودی اسی میں تصور کی گئی ہو کہ وہ کسی حالت میں اپنے آپ کو آزاد نہ سمجھے مگر ہم سچ کہتے ہیں کہ یہ زمانہ ہرگز ایسا نہیں ہے۔

آج ہم کو نہ صرف دنیوی عزت حاصل کرنے کے لیے بلکہ زیادہ تر اس لیے کہ دینِ محمدیؐ کی شان و شوکت دُنیا میں قائم رہے اور امتِ محمدیہؐ اپنے ہمعصروں کی نظر میں حد سے زیادہ حقیر و ذلیل نہ ہو جائے۔ اس قدر کام درپیش ہیں کہ خالص دین کے سوا دیگر تکلّفات کا تحمل ہم میں باقی نہیں ہے۔ اسلام پر حاشیئے چڑھتے چڑھتے جو صورت اُس کی اب ہوگئی ہے اگر اُسی کو اسلام سمجھا جائے تو عنقریب کسی مسلمان کو ضروریات دین سے اس قدر مہلت نہ ملے گی کہ وہ نہایت ذلت و خواری سے دونوں وقت قوتِ لایموت بہم پہنچا کر بُری بھلی طرح اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ بھر لے چہ جائیکہ وہ دُنیا میں عزت سے رہ سکے یا دین کی کچھ شان و شوکت بڑھا سکے۔ جس عالم میں ہم کو اب اور آئندہ رہنا ہے اُس میں ادنیٰ درجہ کی عزت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لیے وہ تدبیریں درکار ہیں جو پہلے شاید ملک اور سلطنت ہی کے درکار تھیں کیوں کہ ترقیِ انسانی کا زمانہ اُس قوم کے حق میں سخت مصیبت کا زمانہ ہوتا ہے جو اُس زمانہ کا ساتھ نہ دے بلکہ اس کے برخلاف اپنے لیے ایک

دوسرا راستہ اختیار کرے۔

ہم کو دین کی شان و شوکت قائم رکھنے کے لیے بھی ضرور ہے کہ صرف خالص اسلام کی حمایت کریں اور اس کو حشو و زاید سے پاک کر کے تمام عالم کو دکھا دیں کہ صرف اسلام ہی دُنیا میں ایسا دین ہے جو انسان کی خوشی اور آزادی کو ترقی دینے والا ہے۔

یورپ کے بڑے بڑے محققوں نے جو اسلام کی نسبت نہایت عمدہ عمدہ رائیں لکھی ہیں اُس سے اُن کی کمال تحقیق اور تنقیح معلوم ہوتی ہے کیوں کہ انھوں نے جیسا کہ اُن کی تصنیفات سے ظاہر ہے اُس سے سارے مجموعہ کو اسلام نہیں سمجھا جس پر اب اسلام کا اطلاق کیا جاتا ہے بلکہ انھوں نے اپنی نہایت گہری نگاہ سے اُس تمام کوڑے کرکٹ کو دور کر کے ٹھیٹ اسلام کا کھوج لگایا ہے اور صرف اسی پر اپنی اپنی رائیں لکھی ہیں۔ اگر وہ اُس تمام مجموعہ کو جس کو ہمارے بھائی مسلمان اسلام سمجھتے ہیں ٹھیٹ اسلام جان کر اُسی پر رائے لکھ بیٹھتے تو اُن کی راستی اور انصاف ہرگز ایسی رائیں لکھنے کی اجازت نہ دیتا۔ جو مسلمان اس زمانے کے موافق تعلیم پا رہے ہیں یا آئندہ پائیں گے وہ جب ہی تک اسلام پر ثابت قدم رہ سکتے ہیں کہ اس تمام مجموعہ کو اسلام نہ سمجھیں۔ اگر بدنصیبی سے انھوں نے بھی اسی کو دین اسلام سمجھا تو عیاذاً باللہ اُن غریبوں کی نوبت الحاد اور ارتداد تک پہنچ جائے گی اور اُس کا مظلمہ اُن مولویوں اور عالموں کی گردن پر ہوگا جو اسی مہیب اور ڈراونی اور وحشت انگیز صورت پر اسلام کا رہنا پسند کرتے ہیں۔

ہم جو دُنیا کے تمام ادیان و ملل میں سے صرف دینِ اسلام ہی کو واجب التسلیم سمجھتے ہیں اور اس کے سوا اور دینوں کو ایسا نہیں جانتے اُس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ صرف اسلام ہی خدا کا بھیجا ہوا دین ہے اور باقی ایسے نہیں ہیں، کیوں کہ کلام الٰہی میں وارد ہوا ہے کہ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلاَ فِیْهَا نَذِیْر یعنی ''کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں کوئی نبی نہ گذرا ہو۔'' اور یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ مِنْهُمْ مَنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَیْکَ یعنی ''ہم نے بعض انبیاء کا حال تجھ پر (اے نبی آخرالزماںؐ) ظاہر نہیں کیا۔''

پس معلوم ہوا کہ ہم اسلام کو اس وجہ سے جو اوپر مذکور ہوئے اور دینوں پر ترجیح نہیں

دیتے بلکہ اس سبب سے دیتے ہیں کہ جس وقت دینِ اسلام کا ظہور ہوا اس وقت ادیانِ سابقہ میں سے کوئی دین اپنی اصلیت پر باقی نہیں رہا تھا۔ انسان کی افراط وتفریط سے حق اور باطل مل جُل کر ایک ہوگئے تھے، شرک و بدعت نے توحید اور سننِ راشدہ کو دبالیا تھا اور خود غرض عالموں کی تحریفات اور مقلد جاہلوں کی جہالت اور متعصب دین داروں کے غلو سے تمام شریعتوں کے موضوع بدل گئے تھے۔

نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو حق کو باطل سے جدا کیا اور جو کھوٹ اور ملاوٗ اگلی شریعتوں میں مل گیا تھا اُس کو دور کر کے ایک خالص کندن نکالا اور اُسی کا نام اسلام رکھا۔

اب اگر اسلام بھی شرائعِ سابقہ کی طرح اپنی اصلیت پر باقی نہ رہے تو ہم کسی منہ سے کہہ سکتے ہیں کہ ''ہمارا دین حق ہے اور باقی ادیان ایسے نہیں ہیں۔'' فقط

بدگمانی

(از: رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' بابت ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) صفحہ:۳۱)

بدگمانی انسان کی ایک ایسی بدخصلت ہے جس سے اکثر خود بدگمانی کرنے والے کو نیز اُس شخص کو جس پر وہ بدگمانی کرتا ہے تھوڑا یا بہت نقصان ضرور پہنچتا ہے۔ اسی واسطے کلام الٰہی میں ارشاد ہوتا کہ یَآاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اِجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ. یعنی ''اے دیندارو بہت بدگمانوں سے بچو بے شک بعضے گمان گناہ ہیں۔''

بدگمانی کرنے کی عادت اکثر نکمّی تعلیم اور ناقص سوسائٹی سے انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً ایک سچا مسلمان محض انصاف کی رو سے عیسائی پادریوں کے اخلاق کی تعریف تمہارے سامنے کرتا ہے۔ اب اگر تم سدا سے ایسی صحبتوں میں رہے ہو جہاں غیر مذہب کے آدمیوں کا نام ہمیشہ حقارت سے لیا جاتا ہے تو تم کو غالباً یہ گمان ہوگا کہ یہ شخص عیسائی مذہب کی طرف میلان رکھتا ہے یا درپردہ عیسائی ہے۔

یا مثلاً ایک شخص شیعی اپنے ہم مذہبوں سے کہتا ہے کہ ائمہ علیہم السلام نے تبرّا کرنے سے منع کیا ہے۔ اب اگر وہ لوگ ہمیشہ سے خود بھی تبرا کرتے رہے ہیں اور اپنے مجتہدوں سے بھی سنتے رہے ہیں تو ضرور اُس کو شیعوں کا مخالف اور سنیوں کا طرف دار خیال کریں گے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی دوسرے شخص کو اپنے نفس پر قیاس کر کے اُس سے بدگمان ہوجاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص اپنے ملک یا قوم کی بھلائی میں بے غرضانہ کوشش کرتا ہے مگر اُس ملک یا اُس قوم کے وہ آدمی جو خودغرضی میں ڈوبے ہوئے ہیں اُس کی کوشش کو بھی خودغرضی ہی پر محمول کرتے ہیں۔

یا مثلاً ایک شخص اہل یورپ کو جو کہ حاکم وقت ہیں سچا اور راست باز اور خوش معاملہ سمجھ کر اُن سے زیادہ میل جول رکھتا ہے مگر وہ لوگ اُن سے اس حیثیت سے نہیں ملتے تو وہ اُس کو بھی اپنی طرح ایک خوشامدی اور گوں گیرا گھاتیا سمجھتے ہیں۔

بعض اوقات ناواقفیت اور بے علمی سے بھی سخت بدگمانی پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً ایک شخص انگریزی طریقے پر کھانے پینے کو اس لیے پسند کرتا ہے کہ اُس کے تجربے میں وہ طریقہ صحت کے واسطے نہایت مفید ثابت ہوا ہے مگر جن لوگوں کو اس طریقہ کا تجربہ نہیں ہوا وہ اُس شخص کی نسبت طرح طرح کی بدگمانیاں کرتے ہیں۔

یا مثلاً ایک دانا گورنمنٹ جو مختلف قوم و مذہب کی رعایا پر حکمراں ہے اپنے مدارس میں کسی خاص مذہب کی تعلیم کو جاری نہیں رکھتی مگر جو لوگ اُس گورنمنٹ کے دانش مندانہ اصول سے ناواقف ہیں وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ گورنمنٹ ہمارے مذہب کو نیست و نابود کرنا چاہتی ہے۔

کبھی بدگمانی کا سبب یہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے اخلاق و عادات قوم کے عام اخلاق و عادات کے برخلاف ہوتے ہیں اُن کی نسبت سوئظن پیدا ہوتا ہے مثلاً ایک قوم میں حد سے زیادہ بناوٹ، تکلف، ساختگی اور ظاہر داری کا دستور ہے۔ اب اگر کوئی شخص اُس قوم میں روکھا پھیکا، بے تکلف، سادہ مزاج اور کھرا پایا جائے گا وہ ضرور ایک متکبر، مغرور، بدمزاج اور اکل کھرا تصور کیا جائے گا۔

یا مثلاً ایک خاندان کے آدمی اکثر مُسرف، فضول خرچ، لہو ولعب میں زندگی بسر کرنے والے اور نمایش پر مرنے والے ہیں۔ اب اگر ان میں کوئی شخص اُس روش کے خلاف پایا جائے گا تو گو وہ کیسا ہی فیاض، جواں مرد، بامروت اور کنبہ پرور مگر کفایت شعار اور منتظر ہو، خاندان کے تمام آدمی اس کو خسیس، دنی الطبع، کنٹک اور مکھی چوس خیال کریں گے۔

بعضے لوگ اس دھوکہ میں کہ ہمارا ذہن دور دور پہنچتا ہے اور ہم لوگوں کے دل کی بات سمجھ لیتے ہیں اکثر بدگمانیاں کیا کرتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص گورنمنٹ کے کسی قانون یا کسی پالیسی کو رعایا کے حق میں مضر سمجھ کر اُس پر آزادانہ اعتراض یا نکتہ چینی کرتا ہے مگر وہ

''دل کی بات سمجھنے والے لوگ'' یہ کہتے ہیں کہ چوں کہ یہ شخص گورنمنٹ کو آزادی پسند جانتا ہے لہٰذا اس پردہ میں گورنمنٹ پر اپنی لیاقت اور دانش مندی ظاہر کرنی چاہتا ہے۔

یا مثلاً ایک شخص مذہب اور حکمت میں اس لیے تطبیق کرتا ہے کہ جب قوم میں حکمت شائع ہو جائے تو قوم کے تعلیم یافتہ نوجوان مذہب کو عقل کے خلاف سمجھ کر اُس سے تجاوز نہ کریں۔ مگر وہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ شخص گورنمنٹ کے ایما سے یا گورنمنٹ کے خوش کرنے کے لیے لوگوں کو لامذہب اور ملحد بنانا چاہتا ہے تا کہ سلطنت کو مذہبی مخالفت اور تعصّبات کا کھٹکا نہ رہے۔

اکثر بدگمانی کا سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی ایک برائی یا ایک غلطی کی وجہ سے جو کہ بشریت کا خاصہ ہے انسان کی تمام خوبیوں پر خاک ڈال دی جاتی ہے اور اُس کی کسی بات پر نیک گمان نہیں کیا جاتا۔ مثلاً ایک سچا، راست باز اور دیانتدار آدمی کسی معاملے میں غلطی سے کوئی ایسی بات کر بیٹھا جو راستی کے خلاف معلوم ہوتی ہے تو اس کے بعد اب وہ کسی معاملے میں راست باز نہیں سمجھا جاتا۔

یا مثلاً ایک لائق اور دانش مند آدمی سے کوئی ایسی لغزش ہو گئی جو عقل کے خلاف معلوم ہوتی ہے تو پھر اُس کی رائے پر اعتماد نہیں کیا جاتا۔

بعضے لوگ بات کا محل اور موقع نہ سمجھنے سے بھی بدگمان ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص سچی محبت اور بے ریا عشق کے جوش میں حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی صرف محمد کبھی صرف ابوالقاسم کبھی آمنہ کا اکلوتا بیٹا اور کبھی بنی سعد کی بکریاں چرانے والا اپنی بے ساختہ تحریروں میں لکھ جاتا ہے اور تعظیم کے رسمی اور عرفی الفاظ نہیں لکھتا تو وہ لوگ جو حسنِ بیان اور لطفِ تحریر کی گھاتوں سے واقف نہیں ہیں اور تعظیم کو انھیں رسمی اور عرفی الفاظ میں منحصر جانتے ہیں ضرور خیال کریں گے کہ اس شخص کے دل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ عظمت نہیں ہے۔

یا مثلاً اسلام کا ایک ظریف رفارمر دوسرے رفارمر کو اپنی پرائیویٹ تحریر لکھتا ہے کہ ''میں نے یہاں بہتیرے جال ڈالے مگر کوئی پنچھی دام میں نہ آیا۔'' تو سادہ لوح مسلمان یا

زاہد خشک اگر وہ خط دیکھ پائیں گے تو اُن کو اِس بات کا پختہ یقین ہو جائے گا کہ ان لوگوں نے اسلام کے برخلاف سازش کر رکھی ہے اور یہ مسلمانوں کو مرتد کرنا چاہتے ہیں مگر ایک سمجھ دار آدمی صرف یہ کہہ کر خاموش ہو جائے گا کہ ایسی ظرافت رفارمر کی شان سے بعید ہے۔

ابلہانہ حزم واحتیاط بھی اکثر بدگمانی کا باعث ہوتی ہے۔ مثلاً ایک خوش معاملہ اور دانا گورنمنٹ ملکی معاملات کی صفائی کے لیے ہمسایہ ملک میں اپنا مشن بھیجنا چاہتی ہے مگر اُس ملک کے ارکانِ سلطنت یہ سمجھ کر کہ مبادا اس مشن کے آنے سے ہماری حکومت یا اقتدار میں کچھ فرق آ جائے مشن کو اپنے ملک میں نہیں آنے دیتے۔

یا مثلاً ایک ہائی اسکول یا کالج سے اکثر طالب علم لائق، نیک چلن اور صاحبِ علم ہو کر نکلتے ہیں مگر ایک وہمی مزاج رئیس اس خیال سے کہ مبادا میری اولاد وہاں جا کر غیر جنس لڑکوں کی صحبت میں آوارہ ہو جائے اپنی اولاد کو وہاں نہیں بھیجتا۔

یہ تمام اسباب بدگمانی کے جو لکھے گئے سرسری نظر میں سب ایک دوسرے سے جدا معلوم ہوتے ہیں مگر غور کرنے کے بعد ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سب ایک عام سبب سے پیدا ہوتے ہیں جس کو بدگمانی کا اصل اصول سمجھنا چاہیے۔ جس بدبخت قوم کا اخلاق قوام بگڑ جاتا ہے اور اس کے تمام فرقوں میں ناراستی اور بے دیانتی شائع ہو جاتی ہے تو اس قوم کے خاص و عام کو مجبوراً نہ صرف اپنی قوم سے بلکہ ساری دُنیا سے بدگمان ہونا پڑتا ہے۔

جب لوگ متواتر دوستوں سے بے وفائی اور بھائی بندوں سے دغا اور بے مہری دیکھتے ہیں اور خود بھی اُن کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ برتتے ہیں تو اُن کو تمام جہان میں کوئی صادق دوست نظر نہیں آتا۔ جب وہ علما کی بددیانتی اور مشائخوں کا مکر وفریب اور زاہدوں کی ریاکاری اور عابدوں کی جوفروشی اور گندم نمائی دیکھتے ہیں تو اُن کو ساری دُنیا مکر وزور سے بھری ہوئی معلوم ہوتی ہے اور فرشتہ پر بھی اُن کو نیک گمان نہیں ہوتا۔ وہ نہ صرف غیروں سے بلکہ خود اپنے سے بھی بدگمان ہو جاتے ہیں۔ جس طرح وہ سب کو جھوٹا اور مکار اور خود غرض سمجھتے ہیں اسی طرح وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ لوگ ہم کو جھوٹا اور مکار اور خودغرض سمجھتے ہیں اور اسی لیے وہ کوئی وعدہ بغیر تاکید شدید کے زبان سے نہیں نکالتے اور کوئی روایت بغیر سوگند

اور قسم کے نہیں بیان کرتے اور کوئی بات بغیر سند اور شہادت کے نہیں کہتے ، خواہ مخاطب کی طرف سے درخواست ہو یا نہ ہو۔ گویا وہ یہ جتاتے ہیں کہ ہماری کوئی بات اعتبار کے قابل نہیں ہے۔ اُن کو جا بجا خوشامد اور تملق کرنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ ہماری خیر خواہی اور دوستی پر بغیر ایسی باتوں کے یقین نہیں آ سکتا۔ تم نے اکثر نمود اور شیخی کرنے والوں کو دیکھا ہوگا کہ ایک آدھ جھوٹا سچا گواہ اُن کے ساتھ ہر وقت لگا رہتا ہے جب وہ کوئی واقعہ بیان کرتے ہیں تو بات بات پر اُس گواہ کا حوالہ دیتے جاتے ہیں کہ ''یہ بھی وہاں موجود تھے ان سے پوچھیے۔'' گویا وہ اپنے کو ایسا جھوٹا سمجھتے ہیں کہ اُن کی کوئی بات بغیر شہادت کے قابلِ تسلیم نہیں۔ تم نے بعضے مصنفوں کو دیکھا ہوگا کہ وہ حد سے زیادہ بدیہی اور مسلم الثبوت دعوے پر بھی جب کسی کا قول سنداً نقل کرتے ہیں تو اس مصنف کا نام کتاب نام، باب اور فصل کا پتہ، صفحہ اور سطر کا شمار، سنہ طباعت، مقام طبع، مطبع کا نام اور سوائے اس کے اور بھی پتے مفصل لکھتے ہیں حالاں کہ اُن دعوؤں کے تسلیم کرنے میں جن کی تائید میں وہ یہ مفصل سندیں لکھتے ہیں کسی کو بھی کلام نہیں ہوتا۔ مگر اُن کو اپنی بے اعتباری کا ایسا پختہ یقین ہوتا ہے کہ اگر اُن کی کتاب ضروری مقدار سے دس گنی زیادہ ہو جائے تو بھی وہ اس تفصیل سے باز نہیں آ سکتے۔

یہ اور ایسی ہی بے شمار مثالیں اس بات کی ہیں کہ جب کسی قوم کے عام اخلاق بگڑ جاتے ہیں تو اُس قوم کے لوگ نہ صرف اوروں سے بلکہ اپنے نفس سے بھی بدگمان ہو جاتے ہیں۔

ہم اپنے ملک میں اور خاص کر اپنی قوم میں بدگمانی کا حال ایسا ہی دیکھتے ہیں۔ گاہک سچے دوکانداروں کو بھی سچا نہیں جانتے کیوں کہ انھوں نے بڑے بڑے یک سخنوں سے دھوکے کھائے ہیں۔ دُنیادار آپس میں ایک دوسرے کو خائن اور بددیانت سمجھتے ہیں کیوں کہ انھوں نے بڑے بڑے دینداروں کو ایسا ہی پایا ہے۔ اگر کوئی دیانتدار کمیٹی قوم کی بہبودی اور اصلاح کے لیے کھڑی ہوتی ہے تو قوم کی طرف سے بجائے اعانت و امداد کے اُس کی مخالفت اور مزاحمت ہوتی ہے کیوں کہ قوم کے سرگروہوں کی متواتر خیانتوں نے کسی کو اعتبار اور اعتماد کے لائق نہیں چھوڑا۔

ایک شخص کی بدگمانی سے جو مضر نتیجے پیدا ہوتے ہیں وہ اکثر ایک یا چند آدمیوں سے زیادہ کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ لیکن جب کسی ملک یا قوم کی عام طبیعتوں میں بدگمانی کا بیج بویا جاتا ہے تو اُس سے تمام ملک یا تمام قوم کو مضرت پہنچتی ہے۔ عام بدگمانی سے اکثر ایسا ہوا ہے کہ فوج اپنے بادشاہ سے منحرف اور رعایا باغی ہوگئی ہے اور اس کے برے ثمرے فوج اور رعایا دونوں کو سالہا سال تک بھگتنے پڑے ہیں۔

افسوس ہے اور نہایت افسوس ہے کہ ہماری قوم میں بھی یہی عام بدگمانی پھیلی ہوئی ہے جس کے سبب سے اس کو طرح طرح کے نقصان اُٹھانے پڑے ہیں، اور اُٹھانے پڑیں گے۔

ابتدا میں وہ گورنمنٹ سے بدگمان تھے اور اُن کو یہ خیال تھا کہ ''سرکار ہم کو عیسائی بنانا چاہتی ہے۔ پادری لوگ جو جابجا تبلیغ عیسائیت کرتے پھرتے ہیں یہ سرکار ہی کی طرف سے اس کام پر مامور ہیں اور انگریزی مدارس بھی اسی لیے قائم کیے گئے ہیں کہ ہم لوگ رفتہ رفتہ اپنے دین سے بے خبر ہو کر آخر کو دین عیسوی اختیار کرلیں۔'' اس بے ہودہ اور باطل خیال سے جو بے شمار نقصان انھوں نے اُٹھائے ہیں اُن کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ اگر یہ پوچھا جائے کہ

کیوں سرکاری دفتر مسلمانوں سے خالی ہیں؟
کیوں تجارت اور صنعت کی فہرست میں مسلمانوں کا نام نہیں پایا جاتا؟
کیوں اُن کی ناداری اور افلاس روز بروز بڑھتا جاتا ہے؟
کیوں اُن کے خاندان برابر مٹتے چلے جارہے ہیں؟
کیوں اُن کی اولاد میں بدخصلتیں سب سے زیادہ پائی جاتی ہیں؟
کیوں اُن کے رئیس اور امیر نالائق اور کندۂ ناتراش ہوتے ہیں؟

تو شاید ان سب سوالات کا جواب یہی ہوگا کہ ''**اُن کی بدگمانی سے۔**''

اب چند سال سے قوم کی ایک خیر خواہ جماعت نے قوم کی تعلیم و تربیت کا سامان مہیا کرنے پر کمر باندھی ہے اور علی گڑھ میں ایک ایسا قومی مدرسہ قائم کیا ہے جس کی نظیر ایشیا کی تاریخ میں نہیں پائی جاتی۔ اُس نے قوم کی بدگمانی رفع کرنے میں بھی حتی الامکان کوشش

کی ہے اور کوئی عقدہ اُن کی دلجمعی اور اطمینان کا فروگزاشت نہیں کیا مگر قوم کی بدگمانی بدستور چلی جاتی ہے وہ برابر آنکھوں سے دیکھتے اور کانوں سے سنتے ہیں کہ

ہر سال اس مدرسہ میں طالب علوم کی ایک معتد بہ مقدار توقع سے زیادہ کامیاب ہوتی ہے۔ (حالاں کہ اُس کے قیام کو کچھ بھی زمانہ نہیں گذرا)

وہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت میں بھی بہت زیادہ اہتمام کیا جاتا ہے۔ جس سے مسلمانوں کی اولاد کے واسطے ہمیشہ کے لیے اخلاق کی جڑ قائم ہوتی ہے۔

وہاں طالب علموں کی حفظ صحت کا خیال بھی جو کہ نہایت ضروری چیز ہے حد سے زیادہ کیا جاتا ہے۔

اُن کو مذہبی قواعد کا بھی کمال قدغن کے ساتھ پابند کیا جاتا ہے۔

اُن کو دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ غرض تعلیم و تربیت کا سامان وہاں اس قدر مہیا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اولاد کے لیے اس سے بڑھ کر ہرگز نہیں ہوسکتا۔ لیکن باوجود ان سب باتوں کے بہت سے بے پروائی سے، بہت سے عناد سے اور سب سے زیادہ بدگمانی سے اس چشمۂ فیض سے محروم ہیں اور اس سے قوم کی ترقی کی طرف سے ایسی سخت مایوسی ہوتی ہے جس کا تدارک ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ بھوکے کو کھانا اور پیاسے کو پانی میسر نہ آنے سے بھی سخت مایوسی ہوتی ہے لیکن یہ اُس مایوسی سے بہت کم ہے کہ کھانا اور پانی موجود ہو لیکن بیمار نہ کھانا کھا سکے نہ پانی پی سکے۔ ایسا بیمار کوئی دم کا مہمان ہوتا ہے۔ نہ طبیب اُس کے کام آسکتا ہے نہ تیماردار اُس کی مدد کرسکتا ہے۔

ہم نہیں کہتے کہ ہمارے مسلمان بھائی اس باب میں کسی کے کہنے سننے پر التفات کریں بلکہ اُن کو چاہیے کہ انصاف اور بے تعصبی سے مدرسۃ العلوم کا حال دیکھیں اور سمجھیں کہ جو کچھ ہم اُس کی نسبت کہتے ہیں وہ صحیح ہے یا غلط؂

آفتاب آمد دلیل آفتاب
گر دلیلی بایدت زد رو متاب

تدبیر

(از رسالہ ''تہذیب الاخلاق''۱۲۹۶ھ(۱۸۷۹ء)صفحہ:۱۶۹)

بہت سے خیالات ہیں جو حقیقت میں مذہب سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے بلکہ مذہب کے سوا اور مختلف اسباب سے انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔

مثلاً یہ خیال کہ زمین ساکن ہے اور آسمان اس کے گرد پھرتے ہیں۔حقیقت میں مذہب اسلام سے علاقہ نہیں رکھتا بلکہ یونانی فلسفہ سے جو علمائے اسلام کے خیالات پر چھا گیا تھا۔ پیدا ہوا ہے لیکن غلطی سے وہ ایک ایسی ضروری بات سمجھی گئی ہے کہ اس کے انکار سے گویا قرآن اور حدیث کا انکار لازم آتا ہے۔

اسی طرح یہ خیال کہ ''آدمی کی تدبیر سے کچھ نہیں ہوسکتا۔'' ایک ایسا خیال ہے جو مذہب کے سوا اور مختلف اسباب سے انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے مگر غلطی سے ایک مذہبی خیال سمجھا جاتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ جو خیالات ملکی یا تمدنی یا تعلیمی خاصیتوں سے انسان کے دل پر مستولی ہو جاتے ہیں وہ اُن کو کسی ایسی زبردست دستاویز سے تقویت دینی چاہتا ہے جس کے آگے چون و چرا کی گنجائش نہ ہو اور وہ دستاویز مذہب کی گہری سیاہی سے لکھی جائے، جبھی اس پر اعتقاد کی نظریں پڑسکتی ہیں۔

ہم اس آرٹیکل میں یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ حصول مقاصد کے لیے تدبیر اور سعی اور کوشش کرنی انسان کا ایک ضروری فرض ہے۔

اسلام نے تدبیر کا ضروری اور مفید ہونا بتایا ہے نہ غیر ضروری اور غیر مفید ہونا۔

وہ کیا اسباب ہیں جن سے تدبیر کی وقعت انسان کے دل سے جاتی رہتی ہے؟

کوئی شخص اس بات کا انکار نہیں کر سکتا کہ خدا تعالیٰ نے ہر ذی روح کی جبلت میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ وہ نفع حاصل کرنے یا ضرر کے دفع کرنے کا بالطبع ارادہ کرتا ہے اور جہاں تک اُس کی دسترس ہوتی ہے اس غرض کے لیے کوشش کرتا ہے بھوک میں کھانے کی اور پیاس میں پانی کی جستجو کرتا ہے۔ گھوڑے کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ شیر سے بھاگتا ہے چوہے کی خلقت میں یہ بات رکھی گئی ہے کہ وہ بلی سے ڈرتا ہے۔ یہی کوشش جب انسان میں پائی جاتی ہے تو اُس کا نام ''تدبیر'' رکھا جاتا ہے۔

تدبیر کے معنی لغت میں ''انجام کار پر نظر کرنا'' ہیں، عرفِ عام میں ''مطلوب کے لیے قدرتی اسباب کی جستجو کرنے اور اُن کے ذریعے سے اُس مطلوب کو بہم پہنچانے میں کوشش کرنے کو'' تدبیر کہتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ایسی کوشش تمام حیوانات میں سے صرف انسان ہی میں جو کہ ذی روح ہونے کے علاوہ عقل بھی رکھتا ہے پائی جا سکتی ہے۔ پس جس طرح دفعِ مضرت اور جلبِ منفعت کے لیے کوشش کرنا اور حیوانات کا قدرتی خاصہ ہے اسی طرح تدبیر کرنا انسان کا قدرتی خاصہ ہے۔

جو لوگ تدبیر کو زبان سے محض بے کار اور لاحاصل بتاتے ہیں اور دل سے بھی ایسا ہی یقین کرتے ہیں وہ بھی تدبیر کرنے سے باز نہیں رہ سکتے۔ روزمرہ کے خرچ کے لیے اکٹھی جنس خرید کر رکھتے ہیں تاکہ ہر روز فکر کرنی نہ پڑے۔ پرانی جڑاول کو گرمی اور برسات میں حفاظت اور احتیاط سے رکھتی ہیں تاکہ آئندہ موسم میں کام آئے۔ مکانوں کی مرمت کرتے ہیں تاکہ وہ گرنے سے محفوظ رہیں۔ چھتوں پر مٹی ڈالتے ہیں تاکہ برسات میں چھتیں نہ ٹپکیں۔ روپیہ پیسہ بغیر حفاظت کے نہیں رکھتے۔ اکیلے مکان کو کھلا نہیں چھوڑتے، مویشی کو مقید رکھتے ہیں۔ اولاد کو تابمقدور بُری صحبت سے روکتے ہیں غرض کہ اُن تمام مقاصد کے لیے جن کے اسباب نہایت ظاہر اور بدیہی ہیں ہمیشہ تدبیر کرتے ہیں اور اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ''تدبیر کرنا انسانی فطرت کا مقتضا ہے۔'' اور یہ سبق اس کو

قدرت ہی نے سکھایا ہے۔

ظاہر ہے کہ قدرت کا کوئی عطیہ بے کار نہیں ہوتا۔ پس ضرور ہے کہ تدبیر بھی انسان کے حق میں بے کار اور غیر مفید نہ ہو۔ جیسا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے پرندوں کے حق میں ارشاد فرمایا ہے کہ **تغدو خما صاً و نزوح بطاناً** یعنی ''جانور صبح کو بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو سیر ہو کر آتے ہیں۔'' مطلب یہ ہے کہ ''اپنی کوشش ہی سے کامیاب ہوتے ہیں۔'' اور فرمایا کہ **الاسواق موائداللّٰہ فمن اتھا فقد اصاب منھا**۔ یعنی ''بازار خدا کی نعمتوں کے خوان ہیں جو وہاں آئے گا اُن سے بہرہ مند ہوگا'' مطلب یہ ہے کہ ''تجارت میں دوڑ دھوپ کرنے سے ضرور کامیابی ہوتی ہے۔''

ان دونوں حدیثوں سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ قدرتی خاصیت جس کا نام تدبیر ہے انسان کی طبیعت میں بے کار نہیں پیدا کی گئی اور انسان کی کامیابی کا سیدھا راستہ تدبیر کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

ہماری قوم میں یہ خیال کثرت سے پھیلا ہوا ہے کہ آدمی کی تدبیر سے کچھ نہیں ہو سکتا بلکہ نفع یا ضرر جو کچھ پہنچنے والا ہوتا ہے وہ ضرور پہنچتا ہے، خواہ تدبیر کی جائے اور خواہ نہ کی جائے اور وہ اس کو دینِ اسلام کا ایک ضروری عقیدہ خیال کرتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا اگر چہ وہ سرسری اور معمولی اغراض کے لیے ہمیشہ تدبیریں کرتے ہیں مگر جب کوئی ایسا کام پیش آتا ہے جو آسانی سے حل نہیں ہو سکتا یا جس کے وسائل اور اسباب کسی قدر دقیق ہوتے ہیں تو وہ تقدیر اور توکل کا حرف زبان پر لاتے ہیں۔

جو بے علم ہیں وہ پیشانی پر انگلی ٹیک کر یہ مصرعہ پڑھ دیتے ہیں ع

جو کہ پیشانی پہ لکھی ہے وہ پیش آنی ہے

اور پڑھے لکھے آیتوں اور حدیثوں سے استدلال کر کے کبھی اپنی مجبوری اور کبھی اپنے توکل کا اظہار کرتے ہیں۔

کوئی یہ آیت پڑھتا ہے: **ومن یتوکل علی اللّٰہ فھوحسبہ**۔ یعنی ''خدا پر بھروسا کرنا کافی ہے۔

کوئی یہ حدیث پڑھتا ہے: **جف القلم بماھؤ کائن** یعنی ''جو کچھ ہونے والا تھا وہ قلم تقدیر لکھ چکا۔''

کہیں یہ آیت پیش کی جاتی ہے: **تعزمن تشاء وتذل من تشاء** یعنی ''جس کو تو چاہے عزت دے اور جس کو تو چاہے ذلت دے۔

اور کہیں یہ حدیث کہ **ماشاء اللّٰہ کان ومالم یشاء لویکن** یعنی ''جو خدا نے چاہا وہ ہو گیا اور جو اس نے نہ چاہا وہ نہ ہوا۔''

اور کہیں یہ آیت پڑھی جاتی ہے کہ **ومامن دابةٍ فی الارض الاعلیٰ اللّٰہ رزقھا** یعنی ''کوئی جاندار زمین پر ایسا نہیں جس کا رزق خدا کے ذمہ نہ ہو۔''

غرض اسی قسم کی اور بہت سی آیتیں اور حدیثیں پیش کی جاتی ہیں جو تین باتوں میں سے کسی ایک نہ ایک بات پر دلالت کرتی ہیں۔

ایک یہ کہ خدا پر توکل کرنا کافی اور ضرور ہے اور ہر ذی حیات کا رزق اس کے ذمہ ہے۔

دوسرے یہ کہ ازل سے ابد تک جو کچھ ہونے والا تھا سو ہو چکا۔

تیسرے یہ کہ جو خدا چاہتا ہے وہ ہوتا ہے اور جو بندہ چاہتا ہے وہ نہیں ہوتا۔

ان متذکرۂ بالا تینوں باتوں سے تدبیر کا لاحاصل اور بے کار ہونا لازم نہیں آتا۔

خدا پر توکل کرنا (جیسا کہ ہم آگے مفصل بیان کریں گے) اس لیے کافی اور ضروری ہے کہ بغیر توکل کے کسی تدبیر پر اقدام کرنے کی جرأت انسان سے نہیں ہو سکتی، اور خدا تعالیٰ جو ذی روح کے رزق کا متکفل ہوا ہے اُس کے یہ معنی ہیں کہ تمام عالم کی پرورش کے لیے جو چیزیں ضروری اور لابدی ہیں اُن کا روئے زمین پر پیدا کرنا اس کے ذمہ ہے نہ یہ کہ بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے حلق میں اُتار دینا اُس کے ذمہ ہے۔

دوسری بات بھی تدبیر کے منافی نہیں بلکہ موید ہے کیوں کہ ازل سے ابد تک جو کچھ ہونے والا تھا وہ یہی تھا کہ ہر شے اپنے اسباب وعلل کے ساتھ وابستہ ہو۔ جب مینہ برسے تو سماں ہو اور جب مینہ نہ برسے تو کال پڑے۔ جب تخم ریزی کی جائے تو غلہ پیدا ہو اور جب غذا کھائی جائے تو جسم میں خون کی مقدار بڑھے۔

تیسری بات سے بھی تدبیر کا بیکار ہونا نہیں سمجھا جاتا، کیوں کہ خداتعالیٰ نے اپنے پاک کلام میں جابجا اپنے مدبر عالم اور مسبب الاسباب اور علۃ العلل ہونے کی وجہ سے اسباب کی تاثیرات اور افعال کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ جیسے وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی. یعنی ''جب تو نے پھینکا تھا تو تو نے نہیں پھینکا بلکہ خدا نے پھینکا تھا اور ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَہٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ یعنی'' آیا تم بوتے ہو اس کو یا ہم بوتے ہیں۔''

جس قدر ہم کو اس بات کا یقین ہے کہ عالم موجود ہے اُسی قدر ہم کو اس بات کا بھی یقین ہے کہ ہم سب کام اپنے اختیار سے کرتے ہیں اور جیسا ہم کو پہلے یقین میں ایک نہایت ضعیف احتمال اس بات کا رہتا ہے کہ شاید یہ تمام نمایش عالم خواب کیسی نمایش ہو ویسا ہی ایک نہایت ضعیف احتمال اس بات کا رہتا ہے کہ شاید ہمارے یہ سب افعال وحرکات ایسے ہوں جیسے قطب نما کی سوئی کی حرکت۔ لیکن ایسے ضعیف احتمالات سے یقین زائل نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے آنحضرتؐ نے فرمایا ہے دع مایریبک الیٰ مایریبک یعنی شک میں ڈالنے والی بات کو اُس بات کے مقابل میں چھوڑ دو جو شک میں نہ ڈالے۔ پس اس میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ جس طرح عالم کا موجود ہونا یقینی ہے اسی طرح ہمارے افعال کا اختیاری ہونا یقینی ہے۔ اگر ہم اپنے افعال میں ایسے ہی مجبور ہوں جیسے اور جمادات مجبور ہیں تو تمام تکلیفاتِ شرعیہ اور سزا و جزا باطل ہو جائے اور جن معنوں میں نیکی، بدی، مدح، ذم، لیاقت، نالائقی، انصاف، بے انصافی، دانائی، نادانی، فرضِ جوابدہی، قصور اور بے قصوری وغیرہ الفاظ مذہب اور اخلاق اور قانون میں استعمال کیے جاتے ہیں وہ سب غلط ٹھہر جائیں۔ پس جہاں کہیں قرآن و حدیث میں ایسے الفاظ وارد ہوئے ہیں جن میں بندوں کے کام خدا کی طرف نسبت کیے گئے ہیں وہاں اُن الفاظ کی اسناد اپنی حقیقت پر نہیں ہے اور یہ بات اُن آیات و احادیث پر نظر کرنے سے بالکل صاف ہو جاتی ہے جن میں بندوں کے اقبال و ادبار اور راحت و تکلیف وغیرہ کو انھیں کے افعال کا ثمرہ بتایا ہے جیسا کہ آگے چل کر ذکر کیا جائے گا۔

ہمارے نزدیک یہ خیال کہ انسان کی تدبیر سے کچھ نہیں ہوسکتا اور اس کو ایک مذہبی

عقیدہ جاننا تدبیراورتوکل کے غلط معنی سمجھنے سے پیدا ہوا ہے۔ تقدیر کے ایسے معنی سمجھے گئے ہیں جن سے انسان کا مجبور ہونا اور اسباب کا معطل اور بے کار ہونا لازم آتا ہے مگر شارعؑ نے تقدیر کے ایسے معنی نہیں بتائے جن سے نہ انسان کا مجبور ہونا اور نہ اسباب کا معطل ہونا لازم آتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں لکھتے ہیں کہ تقدیر اور اسباب کی سببیت میں کچھ منافات نہیں ہے کیوں کہ جب آنحضرت صلعم سے پوچھا گیا کہ کیا دوا اور رقیہ تقدیر الٰہی کو ہٹا دیتے ہیں تو آپؐ نے فرمایا کہ وہ خود تقدیر الٰہی سے باہر نہیں ہیں۔ (یعنی دوا وغیرہ میں جو تاثیر ہے وہ بھی خدا ہی کی پیدا کی ہوئی ہے۔)

پھر شاہ صاحب نے اسی مطلب پر حضرت عمرؓ کے اس اقوال سے استدلال کیا جو سرغ کے قصے میں اُن سے منقول ہے۔ سرغ وادیٔ تبوک میں ایک بستی کا نام تھا۔ وبائے شام کے قصے میں عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ جب عمر فاروقؓ سرغ میں پہنچے اور وبائے شام کا حال سنا تو وہاں سے اُلٹے پھر جانے کا حکم دیا۔ عبیداللہ الجراحؓ نے کہا: ''کیا تقدیر الٰہی سے بھاگتے ہو؟'' عمر فاروقؓ نے کہا: **نعم نفر من قدر اللّٰہ الیٰ قدر اللّٰہ.** یعنی ''ہاں ہم تقدیر الٰہی سے تقدیر الٰہی کی طرف بھاگتے ہیں۔'' اور پھر تمثیل بیان کی کہ ''دیکھو اگر تمہارے پاس اونٹ ہوں اور تم ایک ایسی وادی میں پہنچو جس کی ایک جانب سرسبز ہو اور دوسری جانب پٹ پڑ ہو اتو چاہو تم سرسبز زمین میں اپنے اونٹ چراؤ اور چاہو پٹ پڑ زمین میں۔ دونوں صورتوں میں تقدیر الٰہی سے باہر نہیں ہو سکتے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ مسبب الاسباب نے جو مختلف اسباب میں مختلف تاثیریں رکھی ہیں اُسی کا نام تقدیر الٰہی ہے۔ مرض کی حالت میں پرہیز اور دوا نہ کرنے سے مرض کا طول پکڑنا بھی تقدیر الٰہی ہے اور پرہیز اور دوا کرنے سے اُس کا زائل ہو جانا یہ بھی تقدیر الٰہی ہے۔ وبا کے مقامات سے بھاگ کر موت سے بچنا بھی تقدیر الٰہی ہے اور وبا کے مقامات میں جا کر مر جانا یہ تقدیر الٰہی ہے۔ گلہ کو سرسبز زمین میں چھوڑ کر اُس کو چارے سے سیراب کرنا بھی تقدیر الٰہی ہے اور پٹ پڑ زمین میں چھوڑ کر اس کو بھوکا مارنا یہ بھی تقدیر الٰہی ہے۔

اس مطلب کی تائید کے لیے چند آیتیں قرآن مجید کی بھی یہاں نقل کرنی مناسب معلوم ہوتی ہے۔

(۱) اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ. (رعد) یعنی ''خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ آپ اپنی حالت نہ بدلیں۔''

(۲) ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ. (انفال) یعنی ''یہ اس سبب سے ہے کہ خدا تعالیٰ جو نعمت کسی قوم کو دیتا ہے اس کو نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنی حالت نہیں بدلتی۔

(۳) مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (شوریٰ) یعنی ''جو مصیبت تم کو پہنچتی ہے وہ تمہاری ہی کرتوت کا نتیجہ ہوتی ہے۔''

(۴) فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْن. (روم) یعنی ''خدا کی شان سے نہ تھا کہ اُن پر ظلم کرے بلکہ وہ آپ اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔''

(۵) ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ. (انفال) یعنی ''یہ تمہارے ہی کرتوت کی سزا ہے اور خدا بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔''

(۶) فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ. (کہف) یعنی ''جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے ایمان نہ لائے۔''

(۷) لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ. (بقرہ) یعنی ''اس کے لیے مفید ہے جو وہ نیکی کرے اور اس کے لیے مضر ہے جو وہ برائی کرے۔''

اسی مضمون کی اور بہت سی آیتیں اور حدیثیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسے کام جن کا نتیجہ اچھا ہے اور ایسے کام جن کا نتیجہ بُرا ہے دونوں طرح کے کام کرنے کا اختیار انسان کو دیا گیا ہے اور جو تکلیف یا راحت یا اقبال یا ادبار اُس کو پہنچتا ہے وہ سب اُسی کے کام کے نتیجے ہوتے ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ شارعؑ نے تقدیر کے وہ معنی نہیں بتائے جو ہماری قوم کے عام خیالات میں سمائے ہوئے ہیں یعنی یہ کہ جس کو نفع یا ضرر پہنچنے والا ہے وہ ضرور پہنچے گا۔ خواہ

تدبیر کی جائے خواہ نہ کی جائے۔

دوسری غلطی توکل کے معنی سمجھنے میں ہوئی ہے۔ توکل کے صحیح معنی ''اپنے کو عاجز سمجھنے۔'' اور ''خدا پر بھروسہ کرنے۔'' کے ہیں۔

مگر غلطی سے توکل ایسا بھروسا کرنے کا نام رکھا گیا ہے کہ جس میں تدبیر اور کوشش کا بالکل لگاؤ نہ ہو اور انسان مثل جمادات کے بے حس وحرکت ہو کر بیٹھ رہے۔ گویا تدبیر اور توکل میں منافات سمجھی گئی ہے۔

لیکن شریعت سے توکل کے ایسے معنی معلوم ہوتے ہیں جو ہرگز تدبیر کے منافی نہیں اور تدبیر کے ایسے معنی معلوم ہوتے ہیں جو ہرگز توکل کے منافی نہیں۔ جس طرح توکل کرنے کی تاکید کی گئی ہے اُسی طرح تدبیر کی تاکید کی گئی ہے اور جس طرح توکل کرنے والوں کی تعریف کی گئی ہے اُسی طرح تدبیر کرنے والوں کی تعریف کی گئی ہے۔

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند آیتیں اور حدیثیں اور اقوال سلف جن میں کوشش اور تدبیر کرنے کی اجازت یا تاکید یا تعریف کی گئی ہو نقل کیے جائیں۔

(۱) لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُناحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلاً مِّنْ رَّبِّكُمْ. (بقرۃ) یعنی ''پر (اے حاجیو) کچھ الزام نہیں ہے اگر تم سفر حج میں خدا کے رزق کی تلاش کرو (یعنی تجارت وغیرہ کے ذریعہ سے معاش بھی پیدا کرو اور حج بھی کر آؤ تو کچھ مضائقہ نہیں ہے۔)''

(۲) وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا. (انباء) یعنی ''ہم نے (تمہارے لیے) دن کو کمائی کرنے کا وقت بنایا۔''

(۳) وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِش. (الحجر) یعنی ''ہم نے تمہارے لیے زمین پر معاش حاصل کرنے کے اسباب پیدا کیے۔''

(۴) فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ. (الجمعہ) یعنی ''پھیل جاؤ زمین اور خدا کا رزق تلاش کرو۔''

(۵) عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ

مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ. (مزمل) یعنی ''خدا نے جان لیا ہے کہ بعضے ہوں گے تم میں سے بیمار اور لوگ ہوں گے جو سفر کریں گے زمین پر خدا کے رزق کی تلاش میں (یعنی وہ بھی بیماروں کی طرح رعایت کے قابل ہوں گے)۔''

اسی طرح اور بہت سی آیتیں ہیں جن سے طلب معاش کے لیے کوشش اور تدبیر کرنے کی اجازت اور ترغیب پائی جاتی ہے۔

اخبار و آثار جو اس باب میں وارد ہیں ان میں سے چند اس مقام پر ''احیاء العلوم'' سے نقل کرتے ہیں:-

(۱) **قال رسول اللّٰہ صلی اللہ (صلعم) من الذنوب ذنوب لایکفرھا الا انھم فی طلب المعیشۃ** یعنی ''بعضے گناہ ایسے ہیں کہ طلبِ معاش میں کوشش کرنے ہی سے پاک ہوتے ہیں۔''

(۲) **التاجرالصدوق یحشر یوم القیمۃ مع الصدیقین و الشھداء** یعنی ''سچا سوداگر قیامت کے دن صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ محشور ہوگا۔

(۳) **من طلب الدنیا حلالاتعففا عن المسئلۃ و سعیا علی عیالہ و تعطفا علی جارہ لقی اللّٰہ وجھہ کا لقمر لیلۃ البدر.** یعنی ''جو شخص دُنیا کو وجہ حلال سے اس لیے ڈھونڈتا ہے کہ سوال کرنے سے بچے اور اپنے بچوں کی خبر لے اور ہمسایہ کے ساتھ ہمدردی کرے وہ خدا سے ایسی حالت میں ملے گا کہ اس کا منھ چودھویں رات کے چاند کی مانند چمکتا ہوگا۔

(۴) **کان رسول اللّٰہ (صلعم) جالسامع اصحابہ ذات یوم فنظروا الی شابِ ذی جلدٍ وقوۃٍ وقد بکر یسعی فقالر اویح ھذا لوکان شبابہ وجلدہ فی سبیل اللّٰہ فقال (صلعم) لاتقولوا ھذافانہ ان کان یسعی علی نفسہ لیکف عن المسئلۃ ویعینھاعن الناس فھوفی سبیل اللّٰہ وان کان یسعیٰ علی ابو بن ضعیفین اوذریۃٍ ضعاب لبعید نھم ویکفیھم فھوفی سبیل اللّٰہ** (ط)۔ یعنی ''ایک روز آنحضرت صلعم صحابہ کے

ساتھ بیٹھے تھے۔ انھوں نے ایک چست اور قوی جوان کو دیکھا کہ علی الصباح معاش کی تلاش میں نکلا تھا۔ بولے کیا: ''خوب ہوتا اگر اس کی قوت اور چستی خدا کی راہ میں صرف ہوتی۔'' اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''ایسا نہ کہو، کیوں کہ اگر وہ اپنے لیے سعی کرتا ہے تا کہ مانگنے سے بچے اور لوگوں کا محتاج نہ ہو تو وہ خدا ہی کی راہ میں ہے۔ اور اگر وہ اپنے ضعیف ماں باپ یا بال بچوں کے لیے کوشش کرتا ہے تا کہ اُن کو مستغنی کرے اور اُن کے کام آئے تو وہ بھی خدا ہی کی راہ میں ہے۔''

(۵) ان اللّٰہ یحب العبد تیخذالمھنة یستغنی بھا عن الناس. یعنی ''خدا تعالیٰ اُسی بندہ کو دوست رکھتا ہے جو نوکری اس لیے اختیار کرے کہ لوگوں کا محتاج نہ ہو۔''

(٦) ان اللّٰہ یحب المومن المحترف. یعنی ''خدا تعالیٰ پیشہ ور مسلمانوں کو دوست رکھتا ہے۔''

(۷) روی ان عیسی رای رجلا قال ما تصنع قال التعبد قال من یعولک قال اخی قال اخوک اعبد منک. یعنی ''روایت ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے ایک شخص کو دیکھا، کہا: ''تو کیا کرتا ہے؟'' کہا: ''عبادت!'' کہا: ''تیری خبر گیری کون کرتا ہے؟'' کہا: ''میرا بھائی۔'' کہا: ''تیرا بھائی تجھ سے بڑا عبادت کرنے والا ہے۔''

(ا) کان زید بن سلمة یفرس فی ارضه فقال له عمر رضی اللّٰہ اصبت استغن عن الناس یکن اصون لدنیک و اکرم لک علیھم کما قال صاحبکم احیحة (ع) ان الکریم علی الا خوان ذوالمال. یعنی ''زید بن سلمہ اپنی زمین میں پیڑ لگا رہے تھے حضرت عمر نے کہا: ''ایسا ہی چاہیے۔ اگر تو لوگوں سے بے غرض رہے گا تو تیرا دین زیادہ محفوظ رہے گا اور تیری عزت اُن میں زیادہ ہوگی جیسا کہ تمہارے دوست احیحہ شاعرہ کا قول ہے کہ ''بھائیوں میں دولت مند ہی معزز ہوتا ہے۔''

(۲) قال عمرؓ مامن موضبع یاتی الموت فیه احب الی من موضعٍ اتسوق نیه لاهلی ابیع واشتری یعنی ''عمر فاروقؓ کہا کرتے تھے کہ ''میں موت کے آنے کی جگہ اُس جگہ سے بہتر نہیں سمجھتا جہاں اپنے کنبے کے لیے بازار میں لین دین کرر ہا ہوں۔

ان تمام آیتوں اور حدیثوں اور اقوال سلف سے صاف ظاہر ہے کہ طلبِ معاش میں کوشش اور تدبیر کرنی انسان کا ایک ضروری فرض ہے۔ پس اگر تدبیر اور توکل میں منافات ہوتی ہے تو طلب معاش میں کوشش کرنے کی اجازت اور ترغیب اور تعریف نہ ہوتی۔ امام غزالی ''احیاء العلوم'' میں لکھتے ہیں کہ ''اوقات ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ ہاتھ پاؤں سے کسب کرنے اور دل سے تدبیر کرنے کو ترک کرنا اس کا نام توکل ہے، یہ جاہلوں کا خیال ہے کیوں کہ کسب اور تدبیر کو ترک کرنا شریعت میں حرام ہے اور جب کہ شریعت نے توکل کرنے والوں کی تعریف کی ہے تو یہ کیوں کہ ہوسکتا ہے کہ دینی فضیلت (یعنی توکل ممنوعات شرعیہ) یعنی ترک کسب و ترک تدبیر اسے حاصل ہوسکے۔'' اس کے سوا بیماری کی حالت میں دوا اور پرہیز وغیرہ سے اُس کے دفعیہ کی تدبیر کرنی بھی بے شمار روایتوں سے ثابت ہے چناں چہ بعض محدثین نے خاص اسی قسم کی حدیثیں جمع کی ہیں اور اس مجموعہ کا نام ''طب نبوی'' رکھا ہے۔

''احیاء العلوم'' میں لکھا ہے کہ آپؐ نے اکثر صحابہ کو دوا اور پرہیز کی تاکید فرمائی ہے۔ سعد بن معاذؓ[1] کی فصد خود آنحضرت نے لی اور سعد بن زارہؓ[2] کے بدن پر داغ دیا۔ علی مرتضیٰؓ کی آنکھیں دُکھتی تھیں آپؐ نے کھجوریں کھانے کو منع کیا۔ اور صہیبؓ[3] کو آنکھیں دُکھنے

---

۱ سعد بن معاذ جلیل القدر صحابی اور مدینہ کے رؤسا میں سے تھے۔ آنحضورؐ نے ان کو سید الانصار کا خطاب دیا تھا۔ بدر اور احد کی جنگوں میں شریک رہے۔ غزوۂ خندق میں ایسا زخم لگا کہ اُس سے جانبر نہ ہوسکے اور ایک مہینہ بعد ذی قعدہ ۵ ھ میں صرف ۳۷ برس کی عمر میں وفات پائی۔

۲ سعد بن زراہ بن عدس عبید: انصار مدینہ میں سے حضورؐ کے صحابی ہیں۔ قبیلۂ خزرج سے تعلق رکھتے تھے۔

۳ صہیب بن سنان رومی: عبداللہ بن جدعان کے آزاد کردہ غلام اور اولین صحابیوں میں سے ہیں۔ ۹۰ سال کی عمر میں ۸۰ ھ میں بمقام مدینہ انتقال فرمایا۔

میں خرما کھانے کا پرہیز بتایا۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ رات کو سرمہ اور ہر مہینے میں ایک بار پچھنے لگاتے تھے اور ہر سال سُنا کا مسہل لیتے تھے۔ بچھو وغیرہ کے کاٹنے کا بارہا آپ نے علاج کیا۔ دردِ سر اور پھنسی پھوڑے کے لیے حنا کا استعمال فرماتے تھے۔ اسی طرح کی اور بہت سی روایتیں لکھی اور اُن لوگوں کا قول رد کیا ہے جو علاج معالجہ ترک کرنے کو افضل بتاتے ہیں اور آخر میں یہ لکھا ہے کہ "جو لوگ ترکِ تداوی کو شرعاً توکل قرار دیتے ہیں اُن کو چاہیے کہ بھوک میں کھانا نہ کھانے اور پیاس پانی نہ پینے اور سردی میں کپڑا نہ پہننے کو بھی شرطِ توکل قرار دیں حالاں کہ وہ ایسا ہرگز نہیں کہہ سکتے۔

توکل کی حقیقت جو ہمارے خیالِ ناقص میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ انسان کی کامیابی کا سیدھا رستہ جو فطرت الٰہی نے اس کو بتایا ہے تدبیر کے سوا اور کوئی نہیں ہے لیکن تدبیر کا کامیاب ہونا ایسے ذریعوں پر موقوف ہے جو قطعاً انسان کی طاقت سے باہر ہیں۔

اوّل تو انسان کی تدبیر میں بعض اوقات غلطی بھی ہو جاتی ہے۔ یعنی حصول مقاصد کے لیے جو واقعی اسباب اور علل ہیں وہاں تک اُس کا ذہن نہیں پہنچتا۔ اور اس سبب سے ناکام رہتا ہے۔ مثلاً طبیب نے مرض کے اسباب و علامات سمجھنے میں غلطی کی اور اس سبب سے اس کا علاج مرض کے موافق نہ پڑا۔

بعض اوقات تدبیر کے ناقص رہ جانے سے بھی مطلب حاصل نہیں ہوتا مثلاً طبیب نے اسباب و علامات تو صحیح سمجھے مگر جو دوا اُس مرض کے لیے نافع تھی وہ بہم نہ پہنچی۔

اگر بالفرض تدبیر میں کوئی غلطی یا نقصان واقع نہیں ہوا اور مطلب بھی حسبِ دلخواہ حاصل ہو گیا تو بھی غور کرنا چاہیے کہ جن وسائل سے مطلب حاصل ہوا ہے اُن میں کتنے ایسے ہیں جو انسان کی قدرت سے باہر ہیں۔

مثلاً جو تدبیر کہ انسان اپنی بقائے حیات کے لیے ہر روز دو وقت کرتا ہے یعنی روٹی، دال، سالن وغیرہ جو دونوں وقت پکا کر کھاتا ہے اگر اُس میں سے صرف روٹی کے لیے اناج پیدا ہونے اور آٹا پیس کر تیار کرنے کے وسائل پر نظر کی جائے تو بے انتہا وسیلوں کے ایسے مختلف سلسلے معلوم ہوں گے جن میں سے ہر ایک کا مرتب کرنا اُس کی طاقت سے باہر ہے۔

مثلاً اگر کسان کی اُن تمام ترتیب دار کوششوں سے جو اُس نے فصل کی تیار کرنے میں کی ہیں اور مینھ کے پانی اور دن کی حرارت اور رات کی برودت اور مختلف ہواؤں تموج اور دیگر قدرتی اسباب سے جن کے سبب سے غلہ تیار ہوا قطع نظر کی جائے اور اُن آلات سے بھی قطع نظر کی جائے جو کھیتی کے کام آئے ہیں اور جن کے بننے میں بڑھئی اور لوہار اور کاری گروں کی ضرورت پڑی ہے اور جن کے لیے بہت سے مزدوروں نے لوہا کانوں سے اور لکڑی جنگل سے بہم پہنچائی ہے اگر صرف یہ دیکھا جائے کہ غلہ تیار ہوکر اور اُس کا آٹا پس کر انسان تک کیوں کہ پہنچتا ہے تو بھی ایک بڑا لمبا سلسلہ نظر آئے گا جو اس کے احاطۂ قدرت سے باہر ہے۔ کیوں کہ غلہ سب جگہ پیدا نہیں ہوتا بلکہ ایک جگہ سے دوسری جگہ بھر کر لے جایا جاتا ہے۔ اور اس غرض کے لیے بیوپاری دریا اور جنگل قطع کرتے ہیں اور باوجودیکہ کبھی ڈوب جانے کی وجہ سے اور کبھی لٹ جانے کے سبب سے اور کبھی بعض دیگر اسباب سے ان کو سخت سخت نقصان پہنچتے ہیں تو بھی مسبب الاسباب نے اُن کے دل پر منفعت کی امید کو ایسا مسلط کیا ہے کہ وہ اپنی کوشش سے باز نہیں آتے اور انسان کے مدنی الطبع ہونے کی وجہ سے خاص خاص ملکوں کی پیداوار تمام دُنیا کی پرورش کرتی ہے۔ پھر جن جہازوں میں جن چھکڑوں میں غلہ لد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا ہے وہ بھی خود بخود تیار نہیں ہوتے بلکہ بے شمار آدمیوں کی صنعت سے تیار ہوتے ہیں، پھر اُن بیوپاریوں سے دوکاندار لوگ خرید کر ہر ایک شہر کے کوچے کوچے میں پھیل جاتے ہیں اور اس کو پسنہاریوں سے پسواتے ہیں اور جن آلات سے غلہ پستا ہے یا جابجا متفرق ہوتا ہے اُن کی تیاری بھی ایک جم غفیر کی محنت پر موقوف ہے۔

غرض کہ ادنیٰ سے ادنیٰ مقصد کے لیے انسان کو وہ اسباب درکار ہیں جو اُس کی قدرت کے احاطہ سے باہر ہیں مگر مدبر السمٰوات والارض نے نظام عالم کا مدار ایسے محکم اور مضبوط قانون پر رکھا ہے جو اُس کی عاجز مخلوق کی تمام ضرورتوں کو حاوی ہے اور کبھی اپنے دائمی اقتضا سے تجاوز نہیں کرتا۔

اسی واسطے انبیاء علیہم السلام نے جو کہ دُنیا میں خاص خدائے واحد کی پرستش اور

توحید اور عظمت وجلال پھیلانے کے لیے بھیجے گئے تھے بندوں کو ایسے قاعدے تعلیم فرمائے ہیں کہ وہ کسی حالت میں اُس بڑے بازی گر کو جو پردہ میں بیٹھا اس بڑی پتلی کو نچا رہا ہے پر کبھی سامنے نہیں آتا بھولنے نہ پائیں۔

صبر وشکر، رضا وتسلیم، خوف ورضا، توبہ واستغفار، عبادت وصدقہ، ذکر اور دعا اور ان کے سوا دیگر مقاماتِ یقین جو انبیا نے تعلیم کیے ہیں وہ سب اپنے اپنے موقع پر اسی غرض کے لیے تعلیم کیے ہیں۔

اسی طرح توکل کی بھی جا بجا تاکید کی گئی ہے یعنی یہ سکھایا گیا ہے کہ انسان کو اپنی تدبیر پر مغرور نہ ہونا چاہیے بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ اگر قدرتی تائیدیں نہ ہوں گی اور وہ تمام اسباب جو مسبب الاسباب نے ہماری کامیابی کے لیے مقدر کیے ہیں مساعدت نہ کریں گے تو ہماری کامیابی غیر ممکن ہے۔ لیکن یہ سمجھنا کہ محض خدا پر توکل کر کے بے حس وحرکت بیٹھ جانے سے مطلب حاصل ہو سکتا ہے سخت غلطی ہے۔

چناں چہ حضرت عمر فاروقؓ نے اس غلطی کو صاف ظاہر کر دیا ہے۔ اور یہ کہا ہے کہ **لایقعد احد کم عن طلب الرزق و یقول اللھم ارزقنی فقد علمتم ان آلسماء لا تمطر ذھبا ولا نضة.** (احیاء العلوم) یعنی ''تم میں سے کسی کو نہیں چاہیے کہ تلاش معاش سے بیٹھ رہے اور یہ پڑھا کرے کہ **اللھم ارزقنی** (بارِ خدا مجھ کو رزق دے) کیوں کہ تم جانتے ہو کہ آسمان سے سونا اور چاندی نہیں برستا۔

قبل لاحمدما تقول فیمن جلس فی بیته او مسجد و قال لا اعمل شیئاً حتی یا تینی رزقی فقال احمد ھذا ارجل جھل العلم اما سمع قول النبی صلعم ان اللّٰه جعل رزقی تحت ظل رمحی و قوله ص حین ذکر الطیر فقال نغدوا خماصاً و تروح بطا نافذ کر انھا تغد وانی الطلب الرزق. (احیاء العلوم) یعنی ''امام احمدؒ[1] بن حنبل سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ اُس شخص کے حق میں کیا

---

[1] امام احمد بن حنبلؒ: حنبلی فرق کے امام اور حدیث وفقہ کے بڑے عالم تھے۔ ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۴۱ھ میں وفات پائی۔

کہتے ہیں جو اپنے گھر یا مسجد میں بیٹھا رہے اور کہے کہ میں کچھ نہ کروں گا جب تک کہ رزق میرے پاس آپ سے نہ آئے تو انھوں نے یہ جواب دیا کہ ایسا شخص علم دین سے جاہل ہے۔ کیا اُس نے نبی صلعم سے نہیں سُنا کہ خدا نے میرا رزق میرے نیزہ کے سایہ تلے مقرر کیا ہے اور یہ قول بھی نہیں سنا کہ پرندے صبح کو بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو سیر ہو کر آتے ہیں یعنی وہ رزق کی تلاش میں نکلتے ہیں۔''

توکل کی تعلیم میں اُس روحانی تلقین کے علاوہ جو اوپر کی گئی ایک دنیوی مصلحت بھی مضمر ہے یعنی آدمی اپنی عاجزی اور درماندگی پر اور کامیابی کی بے انتہا مشکلات پر نظر کر کے اکثر اوقات تدبیر کرنے سے جی چھوڑ دیتا ہے اور اپنی کوشش کو اُن بے انتہا مشکلات کے مقابلے میں ناچیز سمجھ کر ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتا۔ اسی واسطے خدا پر بھروسا کرنے کی تاکید کی گئی ہے تاکہ انسان پر مایوسی اور جبن طاری نہ ہونے پائے اور وہ اپنے اڑے وقتوں میں مسبب الاسباب اور رب الارباب پر بھروسا کر کے کوشش کے لیے فوراً کھڑا ہو جائے اسی لیے کلام الٰہی میں ارشاد ہوا ہے کہ ومن تیوکل علی اللّٰہ فھو حسبہ یعنی ''خدا پر بھروسا کر لینا ہی کامیابی کے لیے کافی ہے۔ کیوں کہ اُس پر بھروسا کرنے کے بعد کوئی مشکل، مشکل نہیں رہتی اور کوشش و تدبیر کرنے کا حوصلہ جو کہ کامیابی کا اصلی سبب ہے خود بخود پیدا ہو جاتا ہے اور اسی لیے یہ بھی ارشاد ہوا کہ فاذاعزمت فتوکل علی اللّٰہ یعنی ''جب تو کسی کام کا ارادہ کرے تو خدا پر بھروسا کر۔'' اس سے معلوم ہوا کہ توکل کرنے کا حکم اس لیے نہیں دیا گیا کہ تدبیر و کوشش کرنی نہ پڑے بلکہ اس لیے دیا گیا ہے کہ تدبیر اور کوشش کرنے کی جرأت اور حوصلہ زیادہ ہو۔

غالباً ہمارا اوپر کا بیان اس مطلب کے لیے کافی ثبوت ہوگا کہ عقل اور شرع دونوں کی رو سے کامیابی کا اصل ذریعہ تدبیر کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

ابھی ہم کو یہ بیان کرنا باقی ہے کہ جب عقل اور تدبیر دونوں سے تدبیر کی ضرورت معلوم ہوتی ہے تو کیا سبب ہے کہ ہماری قوم میں یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ انسان کی تدبیر سے کچھ نہیں ہوتا؟

کبھی وہ بعض اشخاص کو بغیر سعی و تدبیر کے کامیاب ہوتے دیکھتا ہے۔ مثلاً ایک نہایت مفلس آدمی تھا اس کو اتفاق سے کوئی ایسا دفینہ مل گیا جس سے اُس کا افلاس جاتا رہا۔ یا ایک شخص مدت سے کسی مرض مزمن میں گرفتار تھا اور علاج معالجہ نہ کرتا تھا، دفعتہً اُس کا مرض خود بخود زائل ہو گیا۔

کبھی وہ بعض لوگوں کو باوجود تدبیر اور کوشش کے ناکام پاتا ہے۔ مثلاً ایک دائم المرض ہمیشہ علاج معالجہ کرتا ہے مگر کبھی تندرست نہیں رہتا۔ یا ایک شخص نے بارہا کھیتی کی اور ہمیشہ نقصان اُٹھایا۔ پس دونوں صورتوں سے وہ یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ تدبیر کچھ چیز نہیں لیکن حقیقت میں ان دونوں صورتوں سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا بلکہ یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بعضی کامیابی بغیر تدبیر کے بھی ہوتی ہے اور بعضی تدبیریں غلط یا بے محل بھی ہوتی ہیں۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک رستہ قزاقوں اور درندوں سے بے خطر ہے اور دوسرے رستہ میں قزاقوں یا درندوں کا خطرہ ہے لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ اُس بے خطر رستہ میں بعض مسافروں کو گزند پہنچی ہے اور اس خطرناک رستہ سے بعض مسافر بہ امن و امان گذر گئے ہیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ پہلا رستہ خطرناک اور دوسرا بے خطر ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ لوگ بعضے شخصوں کو (جیسے واعظ، مولوی، زاہد اور صوفی وغیرہم) دیکھتے ہیں کہ وہ نوکری، حرفہ، تجارت، زراعت اور ظاہری حیلوں میں سے کوئی حیلہ معاش کا نہیں رکھتے مگر اُن کے سب کام نہایت عمدہ طور سے چلتے ہیں اور ان کی حالت اکثر دوڑ دھوپ کرنے والوں سے بہتر ہے۔ پس اُن کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اگر معاش کا مدار حیلہ و تدبیر پر ہوتا تو یہ لوگ جو محض توکل کے سہارے پر بیٹھے ہیں اور کوئی حیلہ نہیں کرتے کس طرح فارغ البال رہ سکتے تھے۔ لیکن ایسا سمجھنا بڑی موٹی غلطی ہے۔ یہ بزرگوار محض توکل کے سہارے پر نہیں بیٹھے بلکہ انھوں نے وقائقِ حِیل میں سے ایک ایسا حیلہ اختیار کیا ہے جو ظاہر بینوں کی نگاہ میں توکل معلوم ہوتا ہے۔ محنت کا حق و فائدہ دو طرح ہوتا ہے۔ (۱) معین اور (۲) غیر معین۔ معین ایسا ہے جیسے ڈاکٹر کی فیس جو اس کے ہر پھیرے میں بیمار کو دینی پڑتی ہے یا جیسے پادری کی تنخواہ جو مشن سے اس کے لیے مقرر ہے

اور غیر معین ایسا ہے جیسے ہندوستانی طبیب کا نذرانہ کہ کسی بیمار سے ایک روپیہ کسی سے دو روپئے۔ کسی سے اور زیادہ وصول ہوتا ہے اور کسی سے کچھ نہیں ملتا۔ پس جو لوگ اپنی قوم میں وعظ یا درس یا تلقین وغیرہ کرتے ہیں اور اس خدمت کی کوئی اجرت مقرر نہیں کرتے وہ گو طبیبوں کی طرح قوم میں غیر معین نذرانہ کے مستحق بنتے ہیں اور حق یہ ہے کہ اگر وہ راستی، دیانت اور آزادی سے یہ کام کریں تو اُن کا یہ استحقاق تسلیم کے قابل ہے لیکن افسوس ہے کہ جس قوم میں نہ دولت ہو، نہ علم ہو، نہ اہل علم اور اہل اللہ کی کچھ عظمت ہو وہاں معاش کا مدار ایسی غیر معین آمدنی پر رکھنے میں راست بازی قائم نہیں رہ سکتی۔ ''احیاء العلوم'' میں کسی بزرگ کا یہ قول لکھا ہے کہ ''سب بندے خدا کے رزق سے متمتع ہوتے ہیں مگر بعضے ذلت کے ساتھ جیسے سائل اور بعضے مشقت اور انتظار کے بعد جیسے تاجر اور بعضے بے وقعتی کے ساتھ جیسے پیشہ ور اور بعضے عزت کے ساتھ جیسے صوفی ''یعنی اُن لوگوں کے سوا جو خدا پر تکیہ کیے خانقاہوں اور مسجدوں میں بیٹھے ہیں اور کوئی عزت سے روٹی نہیں کھاتا۔ شاید مسلمانوں کے عروج کے زمانے میں ایسا ہی ہو مگر زمانۂ حال میں ہم بالکل اس کے برخلاف دیکھتے ہیں۔ اب اُن لوگوں کے سوا جو مشقت سے معاش حاصل کر سکتے ہیں اور کوئی عزت سے روٹی نہیں کھاتا۔ اور اگر انصاف سے دیکھو تو ہر زمانے میں یہی لوگ اصل عزت کے مستحق ہونے چاہئیں کیوں کہ اگر دُنیا سے یہ گروہ بالکل مفقود ہو جائے اور سب لوگ خدا پر توکل کر کے خانقاہوں اور مسجدوں میں بیٹھ رہیں چند روز میں ساری دُنیا کا خاتمہ ہو جائے۔

ایک اور سبب تدبیر کے بے کار اور لا حاصل سمجھنے کا یہ ہوتا ہے کہ جس قوم میں زمانے کے موافق علوم و فنون کی تعلیم نہیں ہوتی اور اُن کا تجربہ اور واقفیت محدود ہوتی ہے اُن کی تدبیریں اکثر غلط یا غیر مفید ہوتی ہیں اور اس سبب سے جب کہ وہ پے در پے ناکامیاں دیکھتے ہیں تو لاچار ہو کر تدبیر کو محض ہیچ و پوچ جاننے لگتے ہیں مثلاً جو شخص نوکری کی لیاقت نہیں رکھتا وہ نوکری تلاش کرتا ہے یا جو تجارت کے اصول سے واقف نہیں وہ تجارت کر بیٹھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگ شاذ و نادر ہی کامیاب ہو سکتے ہیں۔ پس جب وہ متواتر ناکامیاں دیکھتے ہیں تو تدبیر سے اُن کا جی چھوٹ جاتا ہے۔

کامیابی کے ذرائع:- اصل یہ ہے کہ کامیابی کے لیے تین شرطیں نہایت ضروری ہیں۔

ا۔محنت ۲۔علم ۳۔ہنر

اگر ان میں سے ایک شرط بھی نہ پائی جائے گی تو کام حسب دل خواہ سرانجام نہ ہوگا۔مثلاً

ایک شخص نہ تو پیائش کے اصول سے واقف ہے اور نہ پیائش میں مشاق ہے۔
دوسرا شخص پیائش کے اصول تو جانتا ہے مگر اُس نے کبھی پیائش نہیں کی۔
تیسرا شخص پیائش کے اصول بھی جانتا ہے اور اُس میں مشاق بھی ہے۔
اب ان تینوں شخصوں نے تین مختلف رقبوں کی پیائش شروع کی۔
پہلا شخص کسی طرح صحیح پیائش نہیں کرسکتا۔
دوسرا شخص بہت دیر میں نہایت وقت سے تھوڑے سے رقبہ کی پیائش کرسکتا ہے۔
تیسرا شخص نہایت آسانی سے تھوڑے عرصے میں دوسرے شخص سے دس گنے رقبے کی صحیح پیائش کرسکتا ہے۔پھر جس قدر علم اور ہنر زیادہ ہوگا اسی قد کامیابی زیادہ ہوگی۔مثلاً
چوتھا شخص اگر پلین ٹیبل یا پریز مٹک کے ذریعہ سے پیائش کرے گا تو تیسرے شخص سے بھی زیادہ صحیح اور جلد پیائش ہوگی۔

ہماری قوم چوں کہ معاش کے اُن علوم وفنون سے بالکل بے بہرہ ہے جو اس زمانے میں درکار ہیں۔اس لیے جب وہ کسی کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں تو اُن کا ہاتھ ہمیشہ اوچھا پڑتا ہے اور آخر کو تھک کر وہ یہ کہہ اُٹھتے ہیں کہ ''تدبیر سے کچھ نہیں ہوسکتا۔''

یہ تمام اسباب جواد پر بیان کیے گئے سب بمنزلہ فردعات کے ہیں اور اُن سب کا اصل اصول ایشیا کی تعلیم اور اُس کی سوسائٹی ہے جس کا ذاتی خاصہ یہ ہے کہ وہم کو غالب اور عقل کو مغلوب کرتی ہے۔ایشیا کا ہر متنفس ہوش سنبھالتے ہی چاروں طرف ایسی آوازیں سنتا ہے جو اُس کی ہمت کو پست اور حوصلہ کو تنگ کرنا چاہتی ہیں اور رفتہ رفتہ وہم کو اُس کی طبیعت پر ایسا مسلط کر دیتی ہیں کہ جن قویٰ کی بدولت وہ اشرف المخلوقات قرار پایا ہے وہ بالکل مضمحل ہوجاتی ہیں۔

اگر چہ ایشیا کی تمام قوموں میں اوہام کا غلبہ اور عقل کی مغلوبیت برابر پائی جاتی ہے لیکن چوں کہ مجھ کو خاص مسلمانوں کی حالت سے بحث ہے اس لیے میں خاص کر اُنھیں کا ذکر کرتا ہوں۔ مثلاً اولاد جو ماں باپ کی بے پروائی یا نالیاقتی یا فرطِ محبت کے سبب نالائق ہو جاتی ہے تو اُس کا الزام ہمیشہ تقدیر کے ذمہ لگایا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ تقدیر کے بگڑے کو کوئی سنوار نہیں سکتا۔ جنون، خفقان، نجار، سرسام اور اکثر بیماریوں کے علاج سیانوں اور عاملوں سے کرائے جاتے ہیں۔

اگر کسی کو کوئی ناگہانی صدمہ پہنچ جائے تو اکثر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اُس کو کسی بُرے کام کی سزا ملی ہے۔ گو اُس بُرے کام کو اُس صدمہ سے کچھ علاقہ ہو یا نہ ہو۔ مثلاً گھوڑے سے اس لیے گر پڑا کہ سادات کی بے ادبی کی تھی۔ مجنوں اس سبب سے ہو گیا کہ خلفا پر تبّرا کیا کرتا تھا۔ فالج اس سبب سے گرا کہ مسجد میں ناپاک چلا گیا تھا۔ لنگڑا اس وجہ سے ہو گیا کہ شہید صاحب کی قبر پر جوتیوں سمیت چڑھ گیا تھا۔

جس شخص نے اپنی محنت سے دولت کمائی ہے یا باپ دادا کی میراث اس کو پہنچی ہے یا جو شخص صاحب اولاد ہے یا جس کی اولاد سعادت مند ہے اُس پر خدا کی ایک خاص اور غیر معتاد عنایت سمجھتے ہیں جس کا نام **اقبال** ہے اور جو شخص ایسا نہیں ہوتا اُس کو خدا کے ایک خاص اور غیر معتاد غصہ میں گرفتار جانتے ہیں جس کا نام **ادبار** ہے۔

مکان اور مویشی اور عورتیں مبارک یا نحس سمجھی جاتی ہیں۔ ''دیوان حافظؔ'' اور دیگر کتابوں میں فالیں دیکھی جاتی ہیں۔ جانوروں اور چیزوں سے اچھے یا بُرے شگون لیے جاتے ہیں۔ جن، بھوت اور پریاں وغیرہ مانی جاتی ہیں۔ مزاروں سے مرادیں مانگی جاتی ہیں اور نذریں چڑھائی جاتی ہیں۔

عربی، فارسی اور اُردو جو کہ مسلمانوں کی زبانیں ہیں ان تینوں زبانوں کا لٹریچر اسی قسم کے ادہام اور خیالات سے بھرا ہوا ہے جس وقت سے بچہ مکتب میں بیٹھتا ہے برابر یہی تعلیم پاتا ہے۔ گھر میں چھوٹے بڑے سے یہی سبق پڑھتا ہے، باہر ہمجولیوں سے یہی آوازیں سنتا ہے اِسی طرح بے شمار اور ہزار در ہزار ادہام باطلہ ہیں جنھوں نے چاروں

طرف سے اُن کو جکڑ بند کر رکھا ہے۔

شاید یہاں یہ خیال پیدا ہو کہ یہ خیالات مسلمانوں میں مذہب کے سبب سے پھیلے ہیں مگر ادنیٰ غور کے بعد یہ شبہ رفع ہوسکتا ہے۔ سوپر نیچرل (خلاف عقل و قیاس) باتیں جن سے یہ خیالات اور اداہام ترقی کر سکتے ہیں جس قدر بائبل سے مفہوم ہوتی ہیں اُن کا عشر عشیر بھی قرآن مجید میں بھی پایا جاتا۔ بلکہ بعضوں کو اس بات کا یقین ہے کہ

''قرآن مجید میں ایک بات بھی فطرتِ الٰہی کے خلاف نہیں ہے۔''

حالاں کہ بائبل کی ماننے والی قومیں یعنی اہل یورپ میں ان خیالات واداہام کا کہیں نام بھی نہیں۔ یورپ کے کروڑوں آدمی جو بائبل کے ایک ایک حرف کو الہامی مانتے ہیں ان میں سے ایک بھی ایسا نہ ہوگا جو اہل ایشیا یا اہل اسلام کی مانند اداہام میں گرفتار ہوا اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایشیا میں یا خاص کر اہل اسلام میں اداہام کا غلبہ اور عقل کی مغلوبیت مذہب سے ہرگز پیدا نہیں ہوئی بلکہ ایسے اسباب سے پیدا ہوئی ہے جو ایشیا میں پائے جاتے ہیں اور یورپ میں نہیں پائے جاتے۔

ہنری ٹامس[1] بکل نے اپنی ''تاریخ تمدن'' میں نہایت عمدگی سے یہ بات ثابت کی ہے کہ جن ملکوں میں نیچرل فنا منا یعنی قدرتی ظہور نہایت تعجب خیز اور دہشت انگیز ہوتے ہیں وہاں خواہ مخواہ وہم غالب اور عقل مغلوب ہو جاتی ہے اور جب تک بذریعہ تعلیم دیگر اسباب کے وہم کو مغلوب اور عقل کو غالب نہیں کیا جاتا وہ ممالک اسی حالت میں گرفتار رہتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے:-

''ایشیا، افریقہ اور امریکا میں بہ نسبت یورپ کے بیرونی دُنیا نہایت عظیم

---

[1] ہنری ٹامس بکل: ۲۴رنومبر ۱۸۲۲ء کو بمقام کی واقع کنٹ (انگلستان) ایک دولت مند تاجر کے ہاں پیدا ہوا۔ اُس نے ساری عمر تحصیل علم اور خدمت میں گذار دی۔ انتہا یہ کہ اس شوق میں ساری عمر شادی بھی نہیں کی۔ بکل کو دُنیائے علم میں خاص شہرت اس کی تصنیف ''ہسٹری آف سویلیزیشن'' کی وجہ سے حاصل ہے اس کتاب کا اُردو ترجمہ ''تاریخ تمدن'' کے نام سے عرصہ ہوا کہ انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد دکن کی جانب سے دو جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ بکل نے ۱۸۶۲ء میں بمقام دمشق میں انتقال کیا جہاں وہ بیماری کی وجہ سے بغرض تبدیل آب و ہوا گیا ہوا تھا۔

الشان ہے۔صرف پہاڑ اور قدرتی سرحدوں کا جو ہمیشہ قائم اور ثابت رہتی ہیں یہ ذکر نہیں ہے بلکہ اتفاقی فنامنا کا بھی یہی حال ہے۔ مثلاً زلزلہ، طوفان، وبا وغیرہ جو کہ ان ملکوں میں بہ نسبت یورپ کے بہت زیادہ ہوتے ہیں اور بہت نقصان پہنچاتے ہیں۔ وہ خطرے جو بار بار ظہور کرتے ہیں اُن سے بھی وہی نتیجے پیدا ہوتے ہیں جو قدرت کے دائمی مظاہر سے ظاہر ہوتے ہیں۔ کیوں کہ دونوں حالتوں میں وہم اور تصورات زیادہ ہوتے ہیں، گرم ملکوں میں بہ نسبت اور جگہ کے اس قسم کے واقعات بہت ہوتے ہیں اور اسی سبب سے گرم ملکوں میں وہم غالب رہتا ہے مثلاً زلزلہ جو کہ اور عجیب واقعہ ہے اور جس کا ظہور ہمیشہ دفعتاً ہوتا ہے اور جس میں جانیں بھی بہت ہلاک ہوتی ہیں، ملک پیرو میں اکثر واقع ہوتا ہے اور ہر مرتبہ کے زلزلہ میں عموماً دہشت اور خوف بڑھ جاتا ہے۔ پس جب کہ دل ہمیشہ خائف و ترساں رہتا ہے اور انسان ایسے ایسے حوادث دیکھتا ہے کہ جن سے بچ سکتا ہے نہ جن کو سمجھ سکتا ہے تو اس کو اپنی مجبوری اور عاجزی کا یقین ہو جاتا ہے اور وہم حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے اور عقل پر غالب ہو کر انسان کے دل میں بے اصل خیالات پیدا کر دیتا ہے۔ ایشیا کی شائستگی کا مرکز یعنی ہندوستان بھی نیچرل فنامنا سے خوف زدہ ہے۔ علاوہ اُن خطروں کے جو گرم آب و ہوا میں وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے ہیں۔ ایشیا میں ایسے بڑے بڑے پہاڑ ہیں جو آسمان کو چھوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور جن کے اطراف سے ایسے بڑے بڑے دریا نکلتے ہیں جن کی دھار کسی ہنر سے پھر نہیں سکتی اور جن پر آج تک کوئی پُل نہیں بندھا۔ علاوہ ازیں ناقابل گذر جنگل بھی ہیں اور ایسے جن کی حد نہیں پھر اُن کے بعد غیر متناہی ویرانے ہیں جن سے انسان کو یہ نصیحت ہوتی ہے کہ ہم نہایت کمزور ہیں اور نیچر کے زور کا مقابلہ کرنے کے قابل

نہیں۔ خشکی دونوں طرف بڑے بڑے سمندر ہیں جن میں ہمیشہ طوفان
آتے رہتے ہیں اور اُن سے ایسا نقصان ہوتا ہے کہ ویسا یورپ میں
جانتے بھی نہیں اور ایسا دفعتاً زور سے شور سے ہوتا ہے کہ اُس کی گزند سے
بچنا غیر ممکن ہے۔ ایشیا کے وہ حصے جہاں اعلیٰ درجے کی شائستگی ہوئی
(جیسے ہندوستان) یورپ کے نہایت شائستہ حصوں کی نسبت متعدد طبعی
اسباب کی وجہ سے زیادہ تر نا تندرست ہیں۔ بڑی بڑی وبائیں جو مختلف
اوقات میں یورپ میں آئیں وہ سب مشرق سے آئیں جو گویا اُن کی
قدرتی پیدائش کی جگہ ہے اور جہاں وہ نہایت مہلک ہوتی ہیں۔ جتنی سخت
بیماریاں اب تک یورپ میں موجود ہیں منجملہ اُن کے شاذ و نادر ہی کوئی
بیماری وہاں کی ہوگی اور سب سے بڑی بیماریاں سنہ عیسوی کی پہلی صدی
میں (اور اس کے بعد) گرم ملکوں سے آئیں۔ برخلاف اس کے یورپ
میں نیچرل فنامنا نے وہم کو محدود اور سمجھ کو دلیر کیا اور انسان کو اپنی قوتوں پر
بھروسا ہوا، علم کی ترقی میں آسانی اور دلیری ہوئی، تحقیقات کے شوق نے
ترقی پائی اور علم کی طرف رغبت پیدا ہوئی جس پر تمام آئندہ ترقیاں
موقوف ہیں۔ یورپ کی شائستگی کا مرکز یعنی یونان جو کہ مثل ہندوستان
کے جزیرہ نما ہے۔ اُس کی بالکل ہندوستان کے برخلاف ہے۔ جیسے ہند
میں ہر شے بڑی اور خوفناک ہے ویسے ہی یونان میں ہر شے چھوٹی اور
کمزور ہے۔ خود یونان ایک بہت چھوٹا سا ملک ہے اور ایک سکڑے سمندر
میں واقع ہے جہاں سے بہ کمال آسانی گذر ہوسکتا ہے۔ آب و ہوا یہاں
کی نہایت صحت بخش تھی۔ زمین پر زلزلے بہت کم آتے تھے، طوفان اور
بگولے سے کم ضرر پہنچتا تھا، وحشی اور موذی جانور بھی شمار میں کم تھے۔
یونان کے اونچے سے اونچے پہاڑ ہمالہ کے ایک تہائی سے بھی کم بلند
ہیں۔ دریاؤں کا یہ حال ہے کہ شمالی اور جنوبی یونان میں چند چشموں کے

سوا کچھ نہیں ملتا اور وہ بھی پایاب ہیں اور گرمی میں خشک ہو جاتے ہیں۔
پس ان دونوں ملکوں کی موجودات کے اختلاف کے سبب خیالات میں بھی اختلاف پیدا ہوا۔ کیوں کہ جس قدر خیالات ہوتے ہیں وہ کچھ تو خود دل ہی کی پیداوار ہوتے ہیں اور کچھ دُنیا کی بیرونی صورت کو دیکھنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہندوستان جن چیزوں سے گھرا ہوا ہے اُن سے خوف اور دہشت پیدا ہوتی اور یونان میں انھیں سے اطمینان حاصل ہوا۔ وہاں انسان کا دل خائف ہوا اور یہاں انھیں باتوں سے ہمت اور دلیری پیدا ہوئی۔ ہندوستان میں ہر قسم کی دقتیں ایسی بے شمار اور ایس خوفناک اور بظاہر اس قدر سمجھ سے باہر درپیش آئیں کہ زندگی کی ہر ایک مشکل بات کا سبب بہ مجبوری ایسا قرار دینا پڑا کہ انسان کی قدرت سے باہر۔ جب کسی بات کا سبب سمجھ میں نہ آیا۔ فوراً وہم اور تصور نے اپنا عمل کیا اور آخر وہم کا غلبہ ایسا خطرناک ہوگیا کہ سمجھ مغلوب ہوگئی اور اعتدال جاتا رہا۔ یونان میں چوں کہ خوفناک اور بہت چھپی ہوئی نہ تھی اس سبب سے وہاں انسان کے دل پر خوف کم غالب ہوا اور لوگ خیال پرست کم ہوئے۔ طبیعی اسباب کے دریافت کرنے پر توجہ ہوئی اور علم طبیعی ایک چیز قرار پایا اور انسان کو رفتہ رفتہ اور اپنی قوت اور اقتدار کا علم ہوتا گیا اور وہ ایسی دلیری سے واقعات کی تحقیقات کرنے لگا کہ اس قسم کی جرأت اُن ملکوں میں ہرگز نہیں ہوسکتی جہاں آزادی نیچر کے دباؤ سے مظلوم ہورہی ہے اور جہاں ایسے واقعات پیدا ہوتے رہتے ہیں جو سمجھ میں نہیں آسکتے۔'' انتہیٰ ملخصاً

اس کے بعد ٹامس بکل نے ہندوستان اور یونان کا مقابلہ لٹریچر اور مصوری وغیرہ میں کیا ہے۔ جس سے نہایت واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ ایشیا میں اوہام کا غلبہ مذہب کے سبب سے نہیں بلکہ قدرت کے خوفناک ظہوروں کے سبب سے انسان کے دل میں پیدا ہوا ہے۔ اور خاص کر ان دو ملکوں کا مقابلہ اس لیے کیا ہے کہ ایشیا اور یورپ کے مرکز یہی دونوں

ملک قرار دئے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جیسے خیالات مرکز میں پیدا ہوں گے وہی محیط تک پھیلیں گے، اور یہی سبب ہے کہ ایشیا کے تمام ملکوں میں جہاں ۸۷ کروڑ ۵ لاکھ آدمی آباد ہیں۔تقریباً ایک ہی سے خیالات اور ایک ہی سے ادہام طبیعتوں پر چھائے ہوئے ہیں۔

ان تمام اسباب کے سوا جو اوپر ذکر کیے گئے اور بھی اسباب ہیں جو انسان کے دل میں اپنی مجبوری کا خیال پیدا کرتے ہیں اور اس کو بڑے بڑے کاموں میں اقدام نہیں کرنے دیتے۔ لیکن ہم خیال کرتے ہیں کہ اس قدر بیان بھی اصل مدعا کے ذہن نشین کرنے کے لیے کافی ہوگا۔ جن قوموں نے تدبیر اور کوشش کی ہے وہ جلدی یا دیر میں ضرور کامیاب ہوتی ہیں اور ایسی ایسی مشکلوں پر غالب آئی ہیں جن کے حل ہونے سے یہ قول اُن کے ہاں ضرب المثل ہوگیا کہ Nothing is impossible (یعنی کوئی چیز ناممکن نہیں ہے) پس جب تک ہماری قوم کے دل میں بھی ایسے خیالات پیدا نہ ہوں گے تب تک اُمید نہیں ہوسکتی کہ ترقی اور تمدن کی فہرست میں ہمارا نام درج ہوسکے اور **خلافت رحمانی** کا ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ بھی ہمارے ہاتھ آئے۔فقط

مزاح

(از رسالہ ''تہذیب الاخلاق''۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) صفحہ:۲۵۸)

مزاح جس کو غلطی سے مذاق کہنے لگے ہیں انسان کی ایک جبلّی خاصیت ہے جو وکم بیش تمام افراد پائی جاتی ہے۔

مزاح کو عربی، فارسی اور اُردو میں تین مختلف القاب دئے گئے ہیں، یعنی

۱۔ مطائبہ
۲۔ خوش منشی
۳۔ خوش طبعی

یہ تینوں لقب اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ مزاح کا موضوع لہ ''خوشی'' کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔ روزانہ محنت و مشقت جو ہر انسان کا فرض ہے اس کے بعد ہر شخص ایسے مشغلے ڈھونڈتا ہے جن سے تھوڑی دیر دل بہلے اور دن بھر کی کوفت رفع ہو اور ایسے اوقات میں کوئی مشغلہ مزاح سے بہتر نہیں ہے۔

ہم اپنی زبان میں مزاح کا ترجمہ ہنسی، چہل، دل لگی، ٹھٹھول وغیرہ کر سکتے تھے۔ مگر افسوس ہے کہ اب ہماری زبان میں یہ الفاظ صرف مزاح کے مترادف نہیں رہے بلکہ لُچ پن، شُہد پن، مسخرگی، فحش، دشنام، بے حیائی، دھول دھپّا، جوتی پیزار بھی شامل ہیں۔

مزاح جب تک مجلس کا دل خوش کرنے کے لیے (نہ کہ کسی کا دل دُکھانے کے لیے) کیا جائے ایک ٹھنڈی ہوا کا جھوکا ایک سہانی خوشبو کی لپٹ ہے جس سے تمام پژمردہ دل میں باغ باغ ہو جاتے ہیں۔ ایسا مزاح فلاسفہ و حکما بلکہ اولیا و انبیا نے بھی کیا ہے۔ اس

سے مرے ہوئے دل زندہ ہوتے ہیں اور تھوڑی دیر کے لیے تمام پژمردہ کرنے والے غم غلط ہو جاتے ہیں۔ اس سے جووت اور ذہن کو تیزی ہوتی ہے اور مزاح کرنے والا سب کی نظروں میں محبوب اور مقبول ہوتا ہے۔

برخلاف اس کے جب وہ اس حد سے بڑھنے لگتا ہے تو دمبدم ہولناک ہوتا جاتا ہے اور آخر کو اُس سے بجائے محبت کے دشمنی اور بجائے خوشی کے غم پیدا ہوتا ہے۔ وہ اخلاق کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے لوہے کو زنگ یا لکڑی کو گھن۔ مزاح کرنے والا ایسا بے دید ہو جاتا ہے کہ غیروں کو ہنسانے کے لیے اپنے عزیز دوست کا خاکہ اُڑانے لگتا ہے وہ ایسا بے باک ہو جاتا ہے کہ خدا اور رسولؐ پر بھی اُس کی ایک آدھی پھبتی ہوئے بغیر نہیں رہتی وہ ایسا کذاب ہو جاتا ہے کہ بُری خبریں جن کو سن کر خاص یا عام لوگوں کو رنج ہو نہایت خوشی سے اُڑاتا ہے۔ وہ ایسا بے غیرت ہو جاتا ہے کہ اُس کو سخت گالی بھی ناگوار نہیں گذرتی۔ وہ ایسا مفسد ہو جاتا ہے کہ باتوں باتوں میں لڑائی کرا دینی اُس کے نزدیک ایک کھیل اور معمولی بات ہوتی ہے۔ غرض تمام دُنیا کے عیب مزاح کی زیادتی سے انسان میں پیدا ہو جاتے ہیں۔

مزاح کے بڑھنے کے مختلف اسباب ہوتے ہیں مگر ہم یہاں وہ خاص سبب بیان کرنا چاہتے ہیں جس کی وجہ سے مزاح کسی خاص قوم میں رفتہ رفتہ تمسخر اور استہزار بلکہ فحش و دشنام کے درجہ کو پہنچ کر انسانی خصلت سے ایک قومی خصلت بن جاتا ہے اور اس قدر عام ہو جاتا ہے کہ اُس کی بُرائی اور عیب نظروں سے ساقط ہو جاتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل ہنسی اور چُہل میں جو امتیاز ہماری قوم کو حاصل ہے وہ تمام ہندوستان میں کسی قوم کو حاصل نہیں ہے۔

جتنے ضلع پھکڑ بولنے اور پھبتیاں کہنے والے پیدا ہوتے ہیں اسی قوم میں پیدا ہوتے ہیں۔

جتنی گالیاں ایک مسلمان شریف زادہ کو یاد ہوتی ہیں کسی کو نہیں ہوتیں۔

تمام ہندوستان جتنے پنچ اخبار ہیں اُن کے اڈیٹر۔ پروپرائٹر (مالک) اور کار سپانڈنٹ (نامہ نگار) اسی قوم کے زندہ دل ہیں۔

ہندوستانی امیروں اور امیر زادوں کی مجلس میں جتنے مسخرے اور رونقِ محفل پاؤ گے اسی قوم کے پاؤ گے۔

واعظوں میں جتنے لطیفہ گو اور بذلہ سنج دیکھو گے اسی قوم کے پاؤ گے۔

فحش اور بے حیائی کی کتابوں میں ایک بھی ایسی نہ ہوگی جس کا مصنف مسلمان نہ ہوگا۔

مناظرہ کی کتابیں اسی قوم کے عالموں کی ایسی نکلیں گی جن میں ستم ظریفی کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہو۔

شاعروں میں کوئی ہاجی، ہزل گو، ریختی گو اور گندہ دہن ایسا نہ ہوگا جو قوم کا مسلمان نہ ہو۔

داستان کہنے والوں میں صرف ایک شخص ایسا سنا گیا ہے جو اصل میں قوم کا مسلمان نہ تھا لیکن آخر اس کو بھی مسلمان ہونا پڑا۔

الغرض اس قوم کی فصاحت، ذہانت اور فضیلت جس قدر مزاح میں صرف ہوتی ہے ویسی کسی اور کام میں نہیں ہوتی۔

یہاں نہایت تعجب کے ساتھ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کمینہ خصلت اسی قوم کے حصہ میں کیوں آئی ہے؟ شاید اس کا یہ جواب دیا جائے کہ تنزل کے زمانے میں ہر ایک قوم کے فضائل رذائل کے ساتھ بدل جاتے ہیں اور تمام کمینہ خصلتیں اور سفلہ عادتیں خاص و عام میں خواہ مخواہ پیدا ہو جاتی ہیں۔ لیکن غور کرنے کے بعد یہ جواب ناکافی معلوم ہوتا ہے کیوں کہ ابھی یہ بات غیر منفصل ہے کہ قومی تنزل اخلاق کے بگڑنے کا باعث ہوتا ہے یا اخلاق کا بگڑنا قومی تنزل کا باعث ہوتا ہے۔ پس وہی سوال اب بھی باقی رہتا ہے۔

البتہ ایک اور جواب ہمارے خیال میں آتا ہے جو غور کے قابل ہے۔ ادنیٰ توجہ یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مزاح کو جس قدر تعلق زبان اور الفاظ سے ہے ایسا اور کسی چیز سے نہیں۔ خاص خاص صورتوں کے سوا ہمیشہ ہنسی اور چہل الفاظ ہی کے پیرائے میں کی جاتی ہے۔

اُس زمانے میں جب کہ انسان کی اخلاقی تعلیم طفولیت کی حالت میں تھی اور اُس

کی منھ زوری اور بدلگامی کا چنداں انسداد نہ ہوا تھا، ضرور ہے کہ مزاح اور ظرافت نے اُن قوموں میں زیادہ رواج پایا ہوگا جن کی زبان میں اُس کی زیادہ قابلیت تھی۔

جہاں تک ہم کو معلوم ہے کہہ سکتے ہیں کہ جاہلیت کے زمانے میں عرب کی زبان اُس وقت کی تمام زبانوں کی نسبت اس بات کی زیادہ قابلیت رکھتی تھی، اُس میں ایسے الفاظ کثرت سے تھے جو دو معنی رکھتے ہوں اور دونوں ایک دوسرے کی ضد ہو جیسے **مولیٰ** کہ آقا اور غلام دونوں کو کہتے ہیں۔

اُس میں ایسے الفاظ بھی بکثرت تھے جو بہت سے مختلف معنوں کے لیے وضع کیے گئے ہوں جیسے **عین** کہ آنکھ، چشمہ، ذات اور سونے کو کہتے ہیں۔

اُس میں مترادف الفاظ بھی بے شمار تھے۔ یعنی ایک ایک معنی کے لیے کئی کئی لفظ مستعمل ہوتے تھے جیسے **اسد، لیث، غضنفر** وغیرہ۔

اس وقت عرب میں شاعری کا زور بھی اس قدر تھا کہ دُنیا کی کسی زبان میں نہ تھا اور اس سبب سے مجاز، کنایہ اور استعارہ کا وہاں سب جگہ سے زیادہ برتاؤ تھا۔

یہ تمام باتیں جو اوپر بیان کی گئیں ایسی ہیں جو اہل زبان کو مزاح کی طرف بخود مائل کرتی ہیں کیوں کہ مزاح میں زیادہ تر ایسے ہی لفظوں کا استعمال ہوتا ہے۔

مزاح میں جو خوشی متکلم اور مخاطب کو حاصل ہوتی ہے وہ ایک طبعی بات ہے۔ پس اگر اُس کی مزاحمت نہ کی جائے تو ضرور رفتہ رفتہ وہ حد اعتدال سے متجاوز ہو جاتا ہے اور تمسخر واستہزا بلکہ فحش و دشنام تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔

عرب کا بھی ایسا ہی حال ہوا۔ جس وقت خدا تعالیٰ نے خاتم النبین ؐ کو مبعوث فرمایا اُس وقت یہ ذمیم خصلت اُن میں حد سے زیادہ پھیلی ہوئی تھی۔ اُن کے ہاں سب وشتم و قذف کا کچھ عیب نہ تھا۔ اُن کے مرد مردوں سے اور عورتیں عورتوں سے تمسخر واستہزا کرتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو بُرے ناموں اور بُرے القاب سے یاد کرتے تھے، اُن کے اشعار میں ہجو اور فحش کثرت سے ہوتا تھا۔ چناں چہ بہت سی آیتیں قرآن میں اور بہت سی حدیثیں صحاح میں ایسی موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مزاح، مخریت، استہزا، سب، لعن

قذف، فحش، ہذأت، لمز اور تنابز بالالقاب اُن کے ہاں شدت سے رائج تھا۔

آنحضرتؐ کی پاک تعلیم سے جیسا کہ آگے ذکر کیا جائے گا چند روز میں یہ تمام برائیاں نیست و نابود ہو گئیں اور صرف اس قدر مزاح باقی رہ گیا جو سوسائٹی کے لیے باعث زینت ہے۔

خلافت راشدہ کے زمانے میں بھی یہی حال رہا بلکہ جو لوگ صاحب ہیبت و وقار تھے وہ اس پسندیدہ مزاح کو بھی پسند نہ کرتے تھے چناں چہ ایک بار حضرت عمر فاروقؓ کے سامنے چند صحابہؓ کے نام لیے گئے جو اُس وقت خلافت کے لائق سمجھے جاتے تھے۔ انھوں نے ہر ایک کی نسبت کچھ کچھ اعتراض کیے اور حضرت علیؓ کے نام پر صرف یہ کہا کہ هو رجل کثیر الدعابة یعنی ''اُن کے مزاج میں مزاح بہت ہے۔''

خلافت راشدہ کا زمانہ گذر گیا اور اسلام میں شخصی سلطنت کی بنیاد پڑی اور وہ وقت آیا جس کی نسبت مخبر صادقؐ نے ثم یصیر ملکا عضوضاً کہا تھا تو تمام طبقات انام کو ایک خاص شخص کی مرضی اور رائے کا تابع ہونا پڑا۔ فقیہوں نے خلفا کے جذباتِ نفسانی پورے کرنے کے لیے شرعی حیلے تراشنے شروع کیے۔ شعرا کو فاسق و فاجر بادشاہوں کی مدح میں قصائد غرّا انشا کرنے پڑے۔ مشیر اور ندیم بجائے مشورہ اور صلاحِ نیک کے لطائف و مضحکات سے اُن کے دل لبھانے لگے۔ چوں کہ مزاح اور ظرافت عرب کے خمیر میں تھی، گو وہ نبی برحقؐ کی تعلیم سے ایک مدت تک اس کو بھولے رہے لیکن جب زمانے کی حالت خود اُس کی محرک ہوئی تو پھر اپنی اصل خاصیت پر آ گئے تاہم بنی امیہ کے عہد میں یہ سبب قربِ عہدِ رسالتؐ کے مزاح اور ظرافت محدود رہی۔

بنی عباسیہ کے زمانے میں مزاح نے خوب رونق پائی۔ بذلہ سنج مصاحبوں کی جماعت بھی سامانِ عیش و نشاط کا ایک جزوِ اعظم قرار پائی۔ بغیر اُن کے شبستانِ خلافت سونا سمجھا جاتا تھا۔ سفر اور حضر میں مصاحب اور ندیم خلیفہ کے ہمراہ رہتے تھے۔ پھر جس قدر اُن کی فتوحات بڑھتی گئیں یہ رنگ بھی اُن کے ساتھ پھیلتا گیا۔ مگر امویہ اور عباسیہ کے اخیر زمانے تک ظاہر الفحش اور ہزل نے مسلمانوں میں چنداں رواج نہ پایا تھا۔

البتہ ایران میں جا کر بعض اسباب ایسے جمع ہوئے کہ مزاح حدِ اعتدال سے بہت بڑھ گیا۔ چناں چہ سعدیؔ[1] شیرازی کے مطائبات اور انوریؔ و شفائیؔ[2] کے اہاجی و ہزلیات اور سب سے زیادہ فارسی مصطلحات کی کتابیں اس کی گواہ ہیں۔ وہاں ہنسی اور چہل اس درجہ کو پہنچ گئی تھی کہ اصحابِ فضلیت اس کی مشق بہم پہنچاتے تھے۔ تا کہ اس کے ذریعہ سے تقربِ سلطانی حاصل کریں۔ وہاں فحش اور ہزل کا نام ''مطائبہ'' رکھا گیا تھا۔ چناں چہ ''مطائباتِ سعدیؔ''، مشہور ہیں۔ وہاں لفظ ظرافت جس کے معنی عربی میں زیرکی اور دانائی کے ہیں۔ ہنسی اور چہل کے معنوں میں مستعمل ہونے لگا تھا (جیسا کہ آج کل ہندوستان میں بھی مستعمل ہے۔) یعنی وہی لوگ بڑے لائق و فائق سمجھے جاتے تھے جو ہنسی اور چہل میں کمال رکھتے تھے۔ یہی رنگ ''چغتائیہ'' کے عہد میں فارسی زبان کے ساتھ ایران سے ہندوستان میں آیا۔

اگر چہ اسلام کی سلطنت شخصیہ میں بھی بہت سے بادشاہ جن کو مہمات سے فرصت کم ملی یا جن کے مزاج میں قدرتی ہیبت اور وقار تھا نہایت سنجیدہ گزرے ہیں جن کے دربار میں کسی کو بے ہودہ گوئی کی مجال نہ تھی، مگر اکثر اُن کے برخلاف تھے۔ خصوصاً وہ جن کا ملک کئی کئی پشت سے خارجی حملوں سے محفوظ تھا اور نہایت اطمینان کے ساتھ عیش و عشرت میں

---

1. شیخ مصلح الدین سعدیؔ شیرازی: اعلیٰ پایہ کے شاعر، مدرسہ نظامیہ بغداد کے طالب علم ابن جوزی کے شاگرد اور شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید تھے۔ اپنی آنکھوں سے بڑے بڑے انقلابات دیکھے اور اُن سے بے انتہا متاثر ہوئے۔ بغداد انھیں کے سامنے تباہ ہوا۔ عمر کا بڑا حصہ ایشیا اور افریقہ کی سیاحت میں گذار۔ پا پیادہ ۱۴ مرتبہ حج کیے۔ فارسی غزل کے پیغمبر اور یورپ میں مشرق کے شیکسپیئر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ''گلستان بوستاں'' کی تصنیف نے اُن کے نام کو غیر فانی بنا دیا ہے۔ جن کے سینکڑوں ترجمے دُنیا کی مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ ۵۷۱ھ (۱۱۷۵ء) میں پیدا ہوئے اور ۶۹۱ء (۱۲۹۲ء) میں وفات پائی۔
2. شفائی شمس الدین حسین ابن حکیم ملا شفائیؔ اصفہان کا رہنے والا تھا۔ تھوڑی سی عمر میں بہت سے علوم حاصل کر لیے اور فلسفے میں خاص دست گاہ رکھتا تھا۔ مدت تک طبابت کرتا رہا۔ چناں چہ اُس کی قرابا دین اب تک مشہور ہے۔ شاہ عباس اس کی بہت تعظیم کرتا تھا۔ ہجو گوئی اس کی طبیعت پر زیادہ غالب تھی لیکن آخر عمر میں اس لغو گوئی سے توبہ کر لی تھی۔ اُس کی وفات ماہ رمضان ۱۰۳۰ھ میں واقع ہوئی۔ تصنیفات میں سے مثنوی ''دیدۂ بیدار''، ''نمک دان حقیقت''، ''مہر و محبت'' اور ایک دیوان موجود ہے۔

زندگی بسر کرتے تھے۔

انسانی نسلوں کی قدیم سے یہ خاصیت رہی ہے کہ جن کو دولت یا سلطنت وراثتاً بغیر سعی وکوشس کے ہاتھ لگی ہے اور بغیر کسی مزاحمت کے وہ اپنی حالت پر چھوڑ دئے گئے ہیں انھوں نے کبھی اُس عطیۂ غیبی کی کچھ قدر نہیں کی۔ وہ اُس کی نگہداشت اور محافظت سے غافل ہوکر عیش وعشرت میں ایسے منہمک ہوئے کہ دُنیا و مافیہا کو فراموش کر دیا۔ جب وہ عیش کرتے کرتے تھک جاتے ہیں تو اس میں کوئی نئ اختراع کرنی چاہتے ہیں اور جب اُس نئ اختراع سے بھی طبیعت سیر ہو جاتی ہے تو اُسے اور آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔اب اُن کی حالت چوپاؤں اور جانوروں سے بھی بدتر ہو جاتی ہے اور اُن کے تمام فضائل مبدل بہ رذائل ہو جاتے ہیں۔

اُن کی جرأت بے حیائی ہو جاتی ہے، ان کی سخاوت اسراف ہو جاتی ہے، اُن کی شجاعت بے رحمی ہو جاتی ہے، اُن کی الوالعزامی بوالہوسی ہو جاتی ہے اُن کے مذاق ایسے فاسد ہو جاتے ہیں کہ جو لذت روح کو پند وحکمت سے ہونی چاہیے وہی لذت اُن کو فحش اور ہزل سے حاصل ہوتی ہے۔

جب خود مختار بادشاہوں کی ایسی حالت ہو جاتی ہے تو ملک کے خاص و عام کو وہی روپ بھرنا پڑتا ہے جو اُن کے درخورِ مزاج ہو۔خصوصاً وہ فرقہ جو مذہب وملت کی رو سے بادشاہ کا ہم قوم ہوتا ہے اور جس کی بہ نسبت اور قوموں کے تقرب اور حضوری کا زیادہ موقع ملتا ہے یا زیادہ اُمید ہوتی ہے اُس کو دربارداری اور مصاحبت کی وہ تمام لیاقتیں پورے اور اکمل طور پر حاصل کرنی پڑتی ہیں جو بادشاہ کے نزدیک لیاقتیں سمجھی جاتی ہیں۔

اگر بادشاہ کو گانے بجانے کا شوق ہے تو ہزاروں بھلے مانس گانا بجانا سیکھتے ہیں۔

اگر اُس کی طبیعت حسن پرستی اور ہواؤ ہوس کی طرف مائل ہے تو ہزاروں اہلِ علم غزل، واسوخت اور مثنوی لکھنے میں کمال بہم پہنچاتے ہیں۔

اگر وہ خود پسند اور خوشامد پسند ہے تو شعرا کو بھاٹ بننا پڑتا ہے اور قصیدہ گوئی میں یدطولیٰ حاصل کرتے ہیں۔

اگر اُس کو ہنسی اور چہل سے رغبت ہے تو ہزاروں سنجیدہ اور متین آدمی مسخرہ پن اختیار کرتے ہیں۔

یہی حال ''خاندانِ چغتائیہ[1]'' کے آخری دور میں ہوا۔

ہنسی اور ٹھٹھول کی چشم بددور اوپر ہی سے بنیاد جمتی چلی آتی تھی یہاں تک کہ عالمگیر[2] جیسے روکھے اور متشرع بادشاہ کے دربار میں بھی نعمت[3] خاں جیسا ظریف اور بذلہ سنج موجود تھا۔

محمد[4] شاہ کے عہد میں ظرافت یہاں تک بڑھی کہ منجر بہ تمسخر و استہزا ہوگئی۔ بادشاہ ملک کا انتظام اوروں پر چھوڑ کر آپ ہمہ تن عیش و عشرت میں مشغول ہوگیا اور اُس کو ناچ رنگ اور شراب و کباب کے سوا کوئی شغل نہ رہا۔ تمام اعیانِ سلطنت بادشاہ عہد کی طبیعت کا میلان دیکھ کر اُسی رنگ میں رنگے گئے۔ امیروں میں باہم نوک جھوک ہونے لگی۔ مردوں میں نواب امیر[5] خاں اور عورتوں میں نور[6] بائی ایک ایک پر پھبتیاں کہتے تھے۔ یہاں تک کہ

---

[1] خاندانِ چغتائیہ: اس خاندان نے ماوراالنہر، کاشغر، بلخ بدخشاں وغزنی وغیرہ پر ۶۲۴ھ (۱۲۲۷ء) سے ۷۷۱ھ (۱۳۷۰ء) تک ۱۴۷ سال حکومت کی۔ ان خاندان کا بانی چنگیز خاں کا بیٹا چغتائی تھی۔

[2] محی الدین اورنگ زیب عالمگیر ہندوستان کے زبردست شہنشاہوں میں سے تھا۔ سلطنت مغلیہ کو جتنا عروج اُس کے وقت میں ہوا، اتنا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا اور اُس کے بعد تو انحطاط شروع ہوگیا۔ نہایت دیندار، متشرع، سخت محنتی، جفاکش، منتظم، منصف مزاج، عادل اور بارعب شہنشاہ تھا۔ ۱۰۶۸ھ (۱۶۵۷ء) میں تختِ دہلی پر متمکن ہوا اور ۱۱۱۸ھ (۱۷۰۶ء) میں انتقال کیا۔

[3] نعمت خاں: مرزا محمد نام، عالی تخلص اور نعمت خاں خطاب تھا۔ شیراز سے آکر عالمگیر کا داروغۂ مطبخ اور صرفِ خاص کا دیوان مقرر ہوا۔ ۱۱۲۰ھ (۱۷۰۸ء) میں وفات پائی۔ ''وقائعِ نعمت خانِ عالی'' اس کی مشہور کتاب ہے۔

[4] محمد شاہ: خاندانِ مغلیہ کے دورِ انحطاط کے بدقسمت بادشاہوں میں سے تھا۔ اسی کے عہد میں نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا۔ ۱۷۱۵ء میں تخت پر بیٹھا اور ۱۷۴۸ء میں مر گیا۔

[5] امیر خاں: عمدۃ الملک خطاب تھا اور محمد شاہ کے خاص الخاص مقربین میں سے تھا۔ الہ آباد کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ مگر تھوڑے عرصے کے بعد واپس بلا لیا گیا۔ کیوں کہ بادشاہ اس کو اپنے سے جدا کرنا پسند نہ کرتا تھا۔ نہایت حاضر جواب اور بے باک تھا۔ اس کی بے باکی کی آخر رنگ لائی جب بادشاہ کے حضور میں بھی بے باکی اور گستاخی سے پیش آنے لگا تو ایک روز ناخوش ہوکر بادشاہ نے ایک شخص کو اشارہ کیا اور اُس نے ۲۶/ دسمبر ۱۷۴۷ء کو ایک خنجر سے اس کا کام تمام کر دیا۔

[6] نور بائی: دربار محمد شاہ کی مشہور طوائف تھی۔ اور شاہ اُس کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا، مگر قسمت تھی کہ بچ گئی۔

برہان الملک[1] اور آصف[2] جاہ جیسے سنجیدہ آدمیوں پر بھی اُن کے وار چلتے تھے اور اُن کو بھی کبھی کبھی اپنی وضع کے خلاف جواب دینا پڑتا تھا۔

یہ رنگ رفتہ رفتہ خاص و عام میں پھیل گیا اور تمام امرا کی مجلسوں میں مسخرہ پن ہونے لگا اور اس طرح محمد شاہ رنگیلے کی بدولت تمسخر اور استہزا اعلیٰ سے ادنیٰ تک تمام طبقوں میں پھیل گیا۔

پھر جب نواب سعادت علی خاں کے ساتھ دہلی کی زبان لکھنؤ میں گئی تو زبان کے ساتھ ہی ساتھ یہ رنگ بھی وہاں پہنچا اور لکھنؤ میں اُس نے اور بھی ترقی پائی۔ وہاں کے اکثر کارفرما ایسے ہوئے جو تعیش و کامرانی میں محمد شاہ پر بھی سبقت لے گئے۔ اُن کے ہاں بھی مسخرہ پن کا بازار خوب گرم رہا۔ یہاں تک کہ نواب سعادت[3] علی خاں ثانی جیسے مدبر اور ہوش مند کو بھی سید انشاء[4] اللہ خاں بغیر چین نہ آتا تھا۔

چوں کہ مزاح اور زبان جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے لازم و ملزوم ہیں اور ظاہر ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کو زبان اُردو کے لحاظ سے تمام ہندوستان پر ترجیح ہے اس لیے یہ دونوں شہر ہنسی اور چہل کے لحاظ سے بھی اور شہروں سے بالاتر رہے۔

ان تمام خرابیوں پر بھی جب تک مسلمانوں میں تھوڑی بہت تعلیم و تربیت رہی تب

---

[1] برہان الملک: اصلی نام محمد امین عرف سعادت خاں تھا۔ خراسان کے تاجروں میں سے تھا۔ محمد شاہ کے زمانے میں ہندوستان آیا اور اودھ کی صوبیداری پر فائز ہوا۔ ۱۷۳۹ھ (۱۱۵۲ء) میں وفات پائی۔ اودھ کے نواب اسی کی اولا میں سے تھے۔

[2] آصف جاہ: فرمانروایانِ حیدرآباد کے مورث اعلیٰ اور دربار مغلیہ کے زبردست امرا میں سے تھے محمد شاہ کے وقت میں حیدرآباد کے صوبیدار مقرر ہوئے اور ۳۰ برس تک نہایت کامیابی کے ساتھ صوبہ دکن میں حکومت کی۔ ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) میں وفات پائی۔

[3] سعادت علی خاں ثانی: وزیر علی بن آصف الدولہ کے بعد ۲۱/جنوری ۱۷۹۸ء کو اودھ کے تخت پر بیٹھا۔ ۱۷ برس حکومت کرنے کے بعد ۱۱/جنوری ۱۸۱۴ء کو فوت ہو گیا۔

[4] سید انشاء اللہ خاں: میر ماشاء اللہ خاں کے بیٹے اعلیٰ درجہ کے ظریف الطبع شاعر تھے۔ ''دریائے لطافت'' ان کی مشہور کتاب ہے۔ بمقام لکھنؤ ۱۲۳۲ھ (۱۸۱۷ء) میں وفات پائی۔

تک تمسخر واستہزا نے ایک حد معین سے تجاوز نہیں کیا اور شرفا اور خواص کی مجالس میں زیادہ تر بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی ہی پر قناعت رہی مگر جب نکبت اور ادبار کی گھٹا چاروں طرف چھا گئی اور بے علمی و جہالت کا بازار گرم ہوا تو شریف زادوں کو وہ صحبتیں ملنے لگیں جہاں گالی گلوج، دھول دھپّا اور جوتی پیزار ہی کا نام دل لگی تھا، رفتہ رفتہ یہ لچپن اور بے حیائی ادنیٰ سے اعلیٰ تک تمام خاندانوں میں وبائے عام کی طرح پھیل گئی اور اُس برائی کا خیال کم ہوتے ہوتے تقریباً قوم کے دل سے بالکل جاتا رہا۔ پہلے ساری مجلس میں ایک آدھ آدمی بذلہ سنج ہوتا تھا۔ کیوں کہ اُس وقت بذلہ سنجی کے لیے ذہانت اور جودت طبع کے علاوہ کسی قدر علم و فضل بھی درکار تھا۔ چناں چہ محمد شاہ کے دربار میں صرف نواب امیر خاں ہی ایک شخص تھا جو اس خدمت سے عہدہ برآ ہوتا تھا۔

آج کل ہر مجلس میں ایک کثیر مجمع ظریفوں کا ہوتا ہے کیوں کہ اب بات بات میں محل بے محل فحش اور ہزل بکنا ہی داخل ظرافت سمجھا جاتا ہے اور اعلیٰ درجہ کی ظرافت چند باتوں پر منحصر ہے۔ مثلاً کوئی ایسا فحش بکنا جو حضارِ مجلس نے پہلے کم سنا ہو، فحش کی بھری ہوئی واہی تباہی نقلیں بیان کرنی، کوئی ایسا لفظ بولنا جس کے سننے سے شرم آئے، کوئی ایسی حرکت کرنی جسے دیکھ کر ہنسی آئے، کسی دوست کے جھوٹے سچے عیب ظاہر کرنے، کوئی ایسی بات کہنی جس سے مجلس میں بیٹھے ہوئے آدمیوں میں سے کسی ایک کا دل دُکھے اور باقی سب لوگ ہنسیں۔

کسی نئے آدمی پر، جس سے شناسائی نہ ہو کوئی پھبتی کہنی، کسی صورت دیکھ کر خواہی نخواہی قہقہہ لگانا، کسی مقدس آدمی کو جس کا نام ہمیشہ تعظیم سے لیا جاتا ہو گالی سے یاد کرنا، کوئی ایسی خبر اُڑانی جسے سن کر سب کو رنج ہو، کوئی ایسی عجیب روایت کرنی جو عادتاً محال ہو۔

غرض ہنسنے ہنسانے، دل دُکھانے یا بے حیائی کا نام ''ظرافت'' رکھا گیا ہے، چوں کہ غریب اور محنتی آدمیوں کو دو چار گھڑی ہنسنے بولنے کی مہلت بہت کم ملتی ہے اس سبب سے فحش ودشنام اور بے ہودہ باتیں زیادہ تر آسودہ اور مرفہ الحال لوگوں میں سنی اور دیکھی جاتی ہیں۔

اس ذمیم خصلت کی بدولت اُردو زبان نے جو کہ خاص مسلمانوں کی زبان کہلاتی

جاتی ہے بہت کچھ وسعت پیدا کر لی ہے۔ غالباً دُنیا میں کوئی زبان ایسی نہ ہوگی جس میں ہماری زبان کی برابر گالیاں اور فحش اور بے شرمی کے الفاظ اور محاورات بھرے ہوئے ہوں۔

ایک فاضل انگریز نے انھیں دنوں میں اُردو زبان کی ایک ڈکشنری انگریزی میں لکھی ہے۔ جس پر انگریزی اخبار نویسوں نے یہ اعتراض کیا تھا کہ اس ڈکشنری کو فوربس اور شیکسپیئر پر اس کے سوا کوئی ترجیح نہیں ہے کہ اس میں ہزاروں گالیاں اور فحش محاورے ایسے ہیں جو اُن میں نہیں ہیں لیکن مصنف نے ایک مختصر جواب دے کر سب کو ساکت کر دیا۔ اس نے کہا:

''فوربس اور شیکسپیئر صرف لغاتِ اُردو کی ڈکشنریاں ہیں اور ہماری کتاب لغات اُردو کے سوا ہندوستانیوں کی طبیعت کا بھی آئینہ ہے جس میں اُن کے اخلاق اور خصائل و جذبات نہایت عمدہ طور سے نظر آتے ہیں۔''

اگر چہ مصنف نے اس مقام پر ''ہندوستانیوں'' کا عام لفظ لکھا ہے مگر حقیقت میں اُس کتاب سے زیادہ تر مسلمانوں ہی کے اخلاق ظاہر ہوتے ہیں۔ کیوں کہ جہاں تک ہم کو معلوم ہے اُس میں فحش اور بے حیائی کے وہی الفاظ ہیں جو مسلمانوں کی بول چال سے مخصوص ہیں اور خاص انھیں کی سوسائٹی میں وضع ہوئے۔

افسوس ہے کہ یہ ذمیم خصلت اب اس درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ واعظ جو اپنی مجلس وعظ کو گرم کرنا چاہے اس کو ضرور ہے کہ آیتوں اور حدیثوں کے ضمن میں کچھ تمسخر کی چاشنی بھی دیتا رہے۔

اخبار کا مالک جو اپنے پرچہ کو رونق دینی چاہے اُس کو اس کے سوا کچھ چارہ کار نہیں کہ اپنے اخبار کو ''پنچ'' بنائے۔

مصنف جو کوئی کتاب لکھ کر اُس کے حق تصنیف سے فائدہ اُٹھانا چاہے اُس کا فرض ہے کہ اپنی کتاب کی بنیاد ہنسی اور ٹھٹھول پر رکھے۔

شاعر جو مشاعرہ کو گرم کرنا چاہے اُس کی تدبیر یہی ہے کہ فحش اور ہزل سے اُس کی غزل کا کوئی مصرع خالی نہ ہو۔

اہل مناظرہ کی بڑی فتح یابی یہ ہے کہ اُن کی تحریر میں اعتراض اور جواب کی جگہ فریق

مخالف پر نری پھبتیاں اور آوازے ہوں۔

دُنیا کی تمام قوموں کی تفریق مذہب و ملت کے لحاظ سے کی گئی ہے جیسے ہندو، مسلمان، پارسی، یہودی اور عیسائی وغیرہ۔ پس جو اچھی یا بُری خصلت کسی خاص قوم کے ساتھ مخصوص ہو جاتی ہے اُس سے یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ اُس قوم کی مذہبی تعلیم کا مقتضا یہی ہوگا اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو قوم خوش نصیبی سے کسی نیک خصلت میں ضرب المثل ہو جاتی ہے وہ نہ صرف اپنی قوم کو بلکہ اپنے مذہب کو بھی نیک نام کرتی ہے۔ اور جو قوم بدنصیبی سے کسی بُری خصلت میں انگشت نما ہو جاتی ہے وہ نہ صرف اپنی قوم کو بلکہ اپنے مذہب کو بھی بدنام کرتی ہے۔

اسلام نے انسان کی تہذیب اور اصلاح میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا اس نے مزاح کو صرف وہیں تک جائز رکھا ہے جس سے خوشی حاصل ہوتی ہو اور اخلاق پر بُرا اثر نہ پڑتا ہو۔

آنحضرتؐ فرماتے ہیں کہ ''میں بھی مزاح کرتا ہوں مگر کوئی بات بے جا نہیں کہتا۔'' آپؐ خود بھی کبھی کبھی مزاح فرماتے تھے اور اگر کوئی دوسرا شخص کوئی لطیف مزاح کرتا تھا تو مسکرا کر خاموش ہو جاتے تھے۔ لیکن ہر وقت یا بہت مزاح کرنے کو ناپسند کرتے تھے اور سخریت و استہزا کی سخت ممانعت کرتے تھے۔ یعنی کسی کی حقارت یا پردہ دری کرنی جس پر لوگ ہنسیں یا کسی کی نقل اتارنی یا کوئی اور ایسی بات کرنی جس سے دوسرا شخص ذلیل ہو۔ اور فحش اور سب ولعن کو نہایت مبغوض سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ بتوں کو بھی سب کرنے سے منع فرماتے تھے۔ ایک بار چند آدمی کفار کے اُن مقتولوں کو جو بدر میں مارے گئے تھے برائی سے یاد کر رہے تھے، آپؐ سن کر ناراض ہوئے اور اُن کو سخت ممانعت کی۔ آپؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ''طعن کرنے والا، لعنت کرنے والا، فحش بکنے والا اور بے ہودہ گو مومن نہیں ہے۔''

آپؐ کی ممانعت کا طریقہ ایسا موثر تھا کہ جس کو ایک مرتبہ نصیحت کی وہ ساری عمر کے لیے اُس برائی سے باز آ گیا۔ کتبِ احادیث میں اکثر مثالیں ایسے لوگوں کی موجود ہیں جنھوں نے صرف آپؐ کی ایک بار کی ممانعت پر تمام عمر فحش وغیرہ زبان سے نہیں نکالا۔ مثلاً

ایک مرتبہ آپؐ نے فرمایا کہ ''اپنے ماں باپ کو گالی دینا گناہ عظیم ہے۔'' لوگوں نے عرض کیا کہ ''حضرتؐ ایسا کون ہوگا جو اپنے ماں باپ کو گالیاں دیتا ہوگا۔'' فرمایا: ''جو شخص کسی کو ماں باپ کی گالی دے کر اُس سے اپنے ماں باپ کو گالیاں دلواتا ہے حقیقت میں وہی اُن کا گالیاں دینے والا ہے۔''

اسلام کی یہ تعلیم عرب میں اس قدر پھیلی کہ فحش اور بے شرمی کی باتیں وہاں سے گویا بالکل مفقود ہو گئیں۔ قرآن میں ایسی چیزوں کے بیان میں جن کے نام لینے سے نفرت یا شرم آتی ہے۔ مجاز اور کنایہ برتا گیا۔ مثلاً جائے ضرور کے لیے غائط کا لفظ بولا گیا ہے جس کے معنی گڑھے یا نشیب کی زمین کے ہیں جہاں عرب حاجت ضروری کے لیے جایا کرتے تھے یا مثلاً ہم بستری کے لیے ملامست، مس اور اتیان وغیرہ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن کے معنی چھونے یا آنے وغیرہ کے ہیں۔

عرب کے لیے جو کہ لطفِ زبان اور استعارہ و کنایہ پر جان دیتے تھے یہ ایک نہایت عمدہ تعلیم تھی، چناں چہ اسی بنا پر اُن کے ہاں صدہا استعارے ایسے لفظوں کی جگہ مستعمل ہونے لگے۔ جیسے وقاع کے لیے لمس، مسیس، مس، دخول، صحبت وغیرہ اور بول و براز کے لیے قضائے حاجت، تغوط، تبرز وغیرہ۔ اور عورتوں کے لیے فی الحجر، من وراء الستر، ام الاولاد وغیرہ۔ اس قسم کی تہذیب عرب میں ایسی پھیلی تھی کہ جتنا بدن کپڑوں سے اکثر ڈھکا رہتا ہے اس کا نام لینا خلاف شرم و حیا سمجھا جاتا تھا۔

ایک بار خلیفہ عمرؒ بن عبدالعزیز کی بغل میں کچھ نکلا، لوگ عیادت کو گئے اور پوچھا: ''**من این خرج**'' خلیفہ نے جواب میں صاف طور پر بغل کا نام نہ لیا بلکہ یہ کہا: ''**خرج من باطن البدن**''۔

مزاح وظرافت بھی عرب میں خلفائے امویہ کے عہد تک بہت کم رہی۔ لوگ اس وقت اپنی اولاد کو مزاح سے بھی ایسا ہی منع کرتے تھے جیسے اور برائیوں سے۔

بہر حال اسلام نے اس بات میں ہدایت وارشاد کا پورا پورا حق ادا کر دیا تھا اور ایک ایسی قوم سے جن کی سرشت میں ظرافت اور مزاح پیدا کیا گیا تھا اس کو گویا بالکل نیست و نابود کر دیا

تھا۔لیکن بدنصیبی سے وقتاً فوقتاً ایسے اسباب جمع ہوئے کہ یہ خصلت مسلمانوں میں بڑھتے بڑھتے انتہا کے درجے کو پہنچ گئی اور جس قوم کو نبیؐ برحق نے اُس سے ہمیشہ کے لیے پاک کرنا چاہا تھا وہ داغِ بدنامی بن کر ہمیشہ کے لیے اُن کی پیشانی پر لکھی گئی اور پورا ہوا وہ جو کلام الٰہی میں ارشاد ہوا تھا کہ اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ یعنی ''اے نبیؐ تو اپنے پیاروں کو ہدایت نہیں کر سکتا، بلکہ خدا جس کو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔''

یورپ کی قوموں نے جس طرح اور تمام اخلاقی برائیوں کی اصلاح کی ہے اسی طرح انھوں نے اس برائی کو بھی مٹایا ہے۔اُن کے ہاں فحش اور ہزل اس طرح مفقود ہوا ہے کہ لعنت کی کتابوں میں اُس کا پتہ نہیں لگتا۔انھوں نے مشرقی کتابوں کے ترجمے جو اپنی زبانوں میں کیے ہیں اُن میں جہاں فحش و ہزل کا موقع آ گیا ہے وہاں اُس مطلب کو ایسے لطیف پیرایہ میں ڈھال کر لکھا ہے جس میں فحش باقی نہ رہے اور مدعا بخوبی ادا ہو جائے۔اُن کی مجلسوں میں یا اُن کی تحریروں میں اگر مزاح کی باتیں ہوتی ہیں تو اس قدر لطیف اور دقیق ہوتی ہیں کہ ہم لوگ اُس کو مشکل سے مزاح کہہ سکتے ہیں۔جنگ روم و روس کے آغاز میں ایک نہایت لطیف مطائبہ وزیر ہند اور اُن کی لیڈی کا کسی اخبار میں نقل کیا گیا تھا اُس کو سن کر ہمارے ایک مسلمان دوست سخت متعجب ہوئے اور فرمانے لگے کہ اس میں کونسی بات ظرافت کی۔

اُن کی ہنسی اور چہل کا سب سے بڑا نمونہ ''پنچ'' اخبار ہوتے ہیں جن میں وہ حد سے زیادہ ظرافت خرچ کرتے ہیں۔مگر اُن کی ظرافت ہمیشہ کسی نہ کسی غرض پر مبنی ہوتی ہے۔نِری ظرافت ہی نہیں ہوتی۔مثلاً کسی قانون کی اصلاح ہو، گورنمنٹ کی کوئی غلط پالیسی بدل جائے، کسی باب میں قوم کو غیرت دلائی جائے۔

ایسی ظرافت ہمارے نزدیک عین حکمت ہے اور ہماری قوم کے بعض رفارمر جو کبھی کبھی مزاح کے پیرایہ میں کوئی مضمون لکھتے ہیں گو وہ بالفعل ناعاقبت اندیشوں کو ناگوار گذرتے ہیں لیکن بہت جلد وہ زمانہ آنے والا ہے کہ اُن کی نہایت تعظیم کی جائے گی اور اُن کے دل دوز فقرے اور دل شکن طعنے شفیق استاد کی زدوکوب سے زیادہ قدر کے لائق سمجھے جائیں گے۔

مَدرَسۃُ العلوم مسلمانانِ علی گڑھ

(از ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' بابت ۱۸۷۹ء، صفحہ: ۱۲۳۶)

ان دنوں حسنِ اتفاق سے ہم کو علی گڑھ جانے کا موقع ملا۔ ہم خوش قسمتی سے وہاں ایسی جگہ ٹھہرے تھے جہاں سے ''مدرسۃ العلوم'' کا احاطہ بہت قریب تھا اور یہ پہلا ہی موقع ''مدرسۃ العلوم'' کو دیکھنے کا ملا تھا۔

اگرچہ تعطیل کے سبب مدرسہ بند تھا اور بیماری کی وجہ سے طلبہ کی حاضری میں کمی تھی مگر جس قدر مدرسہ کی حالت ہماری آنکھوں کے سامنے تھی، اُس سے بھی جو اثر ہمارے دل پر پیدا ہوا ہے اس کو ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ ہم بڑے بڑے مقدس واعظوں کی مجالسِ وعظ میں حاضر ہوئے ہیں۔ ہم نے اونچے اونچے ممبروں پر نہایت فصیح و بلیغ خطبے بھی سنے ہیں۔ ہم حال و قال کی مجلسوں میں بھی شریک ہوئے ہیں۔ ہم نے پیرانِ طریقت کے گرد مریدوں اور طالبوں کے حلقے بھی دیکھے ہیں اور اُن کے دل ہلا دینے والے نعرے بھی سنے ہیں۔ مگر ہم سچ کہتے ہیں کہ قومی مسرت اور اسلامی حمیت اس مدرسہ کو دیکھ کر خود بخود جوش میں آتی ہے وہ کسی دوسری جگہ اب تک نہیں دیکھی گئی۔ بلاتشبیہ جو شعر نظیریؔ[1] نیشاپوری نے بیت اللہ کی زیارت کے وقت پڑھا تھا وہ اس مدرسہ کو دیکھ کر ہمیں یاد آیا اور بہت دیر تک ہم اُس کو اپنے دل ہی دل میں پڑھ کر گنگناتے رہے ؎

این کعبہ را نبانہ بباطل نہادہ اند — صد معنی و جمال دریں گلِ نہادہ اند

---

[1] نظیریؔ کا نام محمد حسین تھا۔ فارسی کا مسلم الثبوت شاعر گذرا ہے۔ اکبر کے زمانے میں نیشاپور سے ہندوستان آیا اور عبدالرحیم خانخاناں کے ہاں ملازم ہوا۔ بمقام احمد آباد ۱۰۲۲ھ (۱۶۱۳ء) میں انتقال ہوا۔

اس کالج کی اُدھوری نیویں۔ اس کے اسکول کے نامرتب کمرے، اُس کے بورڈنگ ہاؤس کی ناتمام لین، اس کے احاطہ کی چند سنگین جالیاں جوقوم کی بے پروائی کی وجہ سے اب تک نامکمل نظر آتی ہیں ہمارے دل میں تاج گنج کے روضہ اور اکبر کے مقبرے[1] سے زیادہ عظمت وشوکت رکھتی ہیں، کیوں کہ ان سے قوم کو نہ کچھ اس وقت فائدہ پہنچنے کی اُمید تھی اور نہ اب ہے۔ اور نہ اُن سب کی بنیاد محض قوم کی بہبودی اور عزت کی اُمید پر رکھی گئی تھی۔

اُس کے چمن اور کیاریوں کے خاکے اور اُن کی روشوں کی حد بندی، اُس کی سڑکوں کی داغ بیل، اس کے گرد چھوٹے چھوٹے پودوں کی باڑ، اُس کی اونچی نیچی زمین اور گھانس اور اُس کی مٹی ہم کو لاہور کے شالامار[2] باغ اور لکھنؤ کے قیصر[3] باغ سے زیادہ دلکش اور دلکشا معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ وہ باغات صرف ایک ایک شخص کے دل کا ارمان نکالنے کے لیے بنائے گئے تھے اور یہ مدرسہ اس لیے بنایا جارہا ہے کہ تمام قوم کے ارمان اُس سے نکلیں۔ اگر چہ اُس کے مکانات کی تعمیر میں ابھی بہت کچھ باقی ہے لیکن جس قدر کام ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے اُس سے ہم کو کامیابی کا نہایت پختہ یقین ہوتا ہے۔

جس طرح ذوالجلال نے بنی نوع انسان پر نئی دُنیا ظاہر کرنے کے لیے اور اپنی قدرت کے بے انتہا خزانے کھولنے کے لیے جنیوا[4] میں کلمبس[5] کو پیدا کیا تھا اور وہ اپنی پرزور

---

[1] مقبرۂ اکبر: یہ مقبرہ آگرہ سے چار پانچ میل موضع سکندرہ میں بنا ہوا ہے۔ مقبرہ کی دومنزلہ عمارت سنگ سرخ کی بنی ہوئی ہے۔ جس میں جابجا سنگ مرمر اور سنگ موسیٰ بھی استعمال کیا گیا ہے۔

[2] شالامار باغ: لاہور سے مشرق کی طرف تین میل پر موضع باغبان پورہ کے قریب ہے دور دور سے اسے لوگ دیکھنے آتے ہیں اور لطف اٹھاتے ہیں۔ باغ میں نہر کی موجودگی نے اس کی خوب صورتی اور دل فریبی کو دوبالا کر دیا ہے۔ ۱۸۰/۱ ایکڑ زمین پر شاہجہاں نے ۱۰۴۷ھ (۱۶۳۷ء) میں تعمیر کرایا تھا۔ خوب صورتی، نفاست اور دلکشی کے لحاظ سے قابل دید ہے۔

[3] قیصر باغ: لکھنؤ کا قدیم عالی شان اور خوب صورت باغ ہے۔ اگر چہ شاہی زمانے میں نہایت عروج پر تھا مگر اب بھی خاصا پر رونق ہے، وسط میں عالی شان سفید بارہ دری اور فصیل کے ساتھ ساتھ تین طرف بڑی بڑی دومنزل عمارتیں بنی ہوئی ہیں۔

[4] جنیوا (Geneva) اٹلی کا مشہور معروف بندرگاہ ہے۔

[5] کلمبس (Columbus) امریکہ کا دریافت کنندہ اور یورپ کا مشہور سیاح ہے۔ ۱۴۳۶ء میں پیدا ہوا اور ۱۵۰۶ء انتقال کیا۔

دلیلوں اور زبردست حجتوں سے ملکۂ ہسپانیہ کے تمام دربار پر غالب آیا تھا اسی طرح اُس نے ہماری بہبودی کے لیے ہندوستان میں ایک الوالعزم اور عالی ہمت آدمی پیدا کیا ہے جو باوجود قوم کی سخت مخالفتوں اور مزاحمتوں کے آج تک اپنے ارادہ پر ثابت قدم ہے۔

ہم ''مدرستہ العلوم'' کے اُس وسیع میدان میں عین دھوپ کے وقت ایک پیر مرد سفید ریش، نورانی صورت اور عالی دماغ آدمی کو باوجود کبرسن اور فربہیٔ مفرط کے نہایت ذوق وشوق اور اُمنگ کے ساتھ دو دو گھنٹے پیادہ پھرتے دیکھ آئے ہیں اور اس کے سوا ہم نے رات اور دن اُس کو اسی دھن میں سرگرم پایا ہے اور اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کو اس شخص سے یہ عظیم الشان کام لینا ہے، نہ رئیسوں اور تعلق داروں کی بے پروائی اس کے ارادوں کو روک سکتی ہے اور نہ زید وعمر کی مخالفت اُس کی ہمت کو توڑ سکتی ہے۔

خدا نے اپنا کام لینے کے لیے اُس کو کچھ یار و مددگار بھی دئے ہیں جن میں سے بعض نے اپنا گھر بار چھوڑ کر علی گڑھ ہی میں بود و باش اختیار کر لی[1] ہے اور اکثر اپنے اپنے مقام پر دل و جان سے اعانت و امداد میں سرگرم ہیں۔

اگر چہ قوم کی پست ہمتی کے سبب ابھی تک کوئی مسجد اصل نقشے کے مطابق تیار نہیں ہوئی لیکن عارضی طور پر چند روز کے لیے ایک خوب صورت پختہ چبوترہ نماز پڑھنے کے لیے بنا لیا گیا ہے۔ ہم نے بھی طالب علموں اور مدرسوں کے ساتھ ایک جماعت کی نماز وہاں پڑھی۔ اتفاق اور ہمدردی اور قومی محبت کے انوار و برکات جو کہ جمعہ و جماعت کے خاص مقاصد ہیں اگر سچ پوچھئے تو ہم نے اسی چبوترہ اور اسی نماز میں دیکھے ہیں اور اسلام کی آئندہ شوکت کا اگر چہ پتہ لگتا ہے تو ایسے ہی اجتماع سے لگتا ہے۔

ہم نے حیدرآباد اور مدراس تک کے صغیر سن لڑکے بھی یہاں پائے اور ان کو اس قدر خوش وخرم، مطمئن اور فارغ البال دیکھا کہ شاید اپنے گھر پر اپنے پیارے ماں باپ کے پہلو میں بھی اس قدر خوش حال نہ ہوں گے۔

---

[1] یہ اشارہ نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین کی طرف ہے جو اُس زمانے میں محض طلبہ کی نگرانی کے لیے بورڈنگ ہوس (ہاؤس) میں سکونت رکھتے تھے۔ (حالؔی)

وہی الوالعزم پیر مرد جس وقت اُن کے سر پر ماں باپ سے بھی زیادہ شفقت بھرا ہاتھ پھیرتا ہے اور اُن کو چمکارتا ہے تو اُن کے دل باغ باغ ہو جاتے ہیں اور وہ اپنے کنبے اور اپنے دیس کو بالکل بھول جاتے ہیں۔

ہم نے جس نفاست اور صفائی اور تمیز کے ساتھ یہاں کے طالب علموں کو بورڈنگ ہاؤس میں رہتے دیکھا اور جس لطافت کے ساتھ اُن کا دستر خوان چنا ہوا پایا اور جس خاموشی، وقار اور متانت کے ساتھ اُن کے کھانا کھانے کا طریقہ سنا ہے ہم کو اُمید نہیں ہے کہ ہندوستانی امرا اور رؤسا اور علما کی اولاد کو اس طرح رہنا اور کھانا پینا نصیب ہو سکے۔

یہاں کے طالب علموں نے کرکٹ میں بھی نہایت ترقی کی ہے۔ علی گڑھ کے تمام جلیل القدر انگریز اور اُن کی مغزز لیڈیاں کرکٹ میں اُن کے ساتھ شریک ہوتی ہیں اور سب اُن کے ساتھ مربیانہ اور دوستانہ برتاؤ برتتے ہیں۔

طالب علموں کے چال چلن اور ضبطِ اوقات اور لباس و طعام اور نماز پنج گانہ و دیگر امور کی نگرانی کے لیے نہایت دیانتدار، مدبر اور ذی علم لوگ مقرر ہیں اور تعلیم سے زیادہ اُن کی تربیت میں کوشش اور اہتمام کیا جاتا ہے۔

الغرض ہندوستان میں جہاں تک ہم کو معلوم ہے کوئی عام تدبیر مسلمانوں کی دینی اور دنیوی بہبودی کی اُس وقت سے جب کہ مہلب[1] اور محمد ابن[2] قاسم نے اس ملک میں قدم

---

[1] مہلب: حضرت معاویہؓ کے زمانے میں عبدالرحمٰن بن سمرہ والی سیستان کی فوج کا ایک نامور سردار تھا۔ یہ پہلا شخص ہے جس نے ۴۴ھ میں افغانستان کے مہیب پہاڑوں اور دشوار گزار اور سخت پیچیدہ گھاٹیوں کو عبور کر کے ہندوستان پر حملہ کیا اور ایک ہی تاخت میں کابل اور ملتان تک کے علاقہ کو آن کی آن میں فتح کر لیا۔ بعد ازاں لاہور پر فوج کشی کر کے جملہ حملہ آوران کو شکست دی۔

[2] محمد بن قاسم ثقفی: اموی خلیفہ عبدالملک بن مردان کے زمانے میں ولایت فارس کا گورنر اور حجاج بن یوسف ثقفی گورنر عراق کا ابن عم نیز داماد تھا۔ بہت بڑا شجاع اور اعلیٰ درجہ کا سپہ سالار تھا۔ خلیفہ کی اجازت اور حجاج کے حکم سے ۹۳ھ میں جب کہ اس کی عمر صرف پندرہ سال کی تھی سندھ پر حملہ کیا اور اپنی عدیم النظیر شجاعت سے تھوڑے ہی عرصہ میں تمام سندھ کو فتح کر کے مسلمانوں کی حکومت کی بنیاد ڈال دی۔ ابھی اس کی فتوحات کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ خلیفہ نے وفات پائی اور اُس کا بیٹا سلیمان بقیہ اگلے صفحے پر

رکھا آج تک نہیں کی گئی۔

افسوس ہے کہ اس اندھی اور بے تمیز دُنیا میں ایسے عجیب وغریب کاموں کی قدر کبھی وقت پر نہیں ہوئی بلکہ ہمیشہ اُس وقت ہوئی ہے جب جواں مرد لوگ زمانے کی سختیاں جھیلتے جھیلتے اور یگانوں اور بیگانوں کے طعنے سنتے سنتے آخر ہو گئے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ باغ دُنیا کی پود کبھی سرسبز نہ ہوتی اگر شہیدوں کے خون سے اُس میں آبپاشی نہ کی جاتی اور اگر ہر شخص اپنی محنت کا ثمرہ اور اپنی کوشش کی قدردانی اپنی زندگی میں چاہتا تو یہ کھیتی کبھی پروان نہ چڑھتی۔

اے خدا تو نے جن لوگوں کو بنی نوع کی بھلائی کے لیے پیدا کیا ہے اُن کی عمر میں برکت دے اور اُن کی سعی کو مشکور کر اور اُن کی ہمت اور استقلال کو آخر دم تک قائم رکھ۔ آمین۔

بقیہ پچھلے صفحے سے مسند آرائے خلافت ہوا جس کو حجاج اور اُس کے خاندان سے سخت دشمنی تھی۔ اُس نے عنان سلطنت ہاتھ میں لیتے ہی سب سے پہلے محمد بن قاسم پر جو حجاج کا داماد تھا ہاتھ صاف کیا اور محض بلاقصور ایک سپہ سالار بھیج کر سندھ سے اُسے گرفتار کر کے امنگایا اور شہر واسط میں قید کر دیا۔ جہاں سخت تکالیف سہتے سہتے ۹۶ھ میں اس بے نظیر بہادر نے عین عالم شباب میں نہایت حسرت کے ساتھ جان دے دی۔

کیا مسلمان ترقی کر سکتے ہیں

(از رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' بابت ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء)، صفحہ: ۱۱۸)

جو قوم ترقی کے بعد تنزل کے درجے پر پہنچ جاتی ہے وہ ایک ایسی ابتر حالت میں ہوتی ہے کہ اس کے دوبارہ ترقی کرنے سے اکثر لوگ مایوس ہو جاتے ہیں، یا یوں کہو کہ اُس کی قابلیت کا جوہر نظروں سے چھپ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر وہ ترقی کرنے کا ارادہ کرتی ہے تو اُس کی سعی ایک حرکتِ مذبوحی سمجھی جاتی ہے اور اگر وہ سنبھلنا چاہتی ہے تو اُس پر سنبھالے کا گمان کیا جاتا ہے۔ یہی حال آج کل ہماری قوم کا ہے۔

اگر چہ بعضے مومن مسلمان جو کبھی اپنی نسبت بُرا گمان نہیں کرتے مسلمانوں کی قوم کو اب بھی اعلیٰ درجے کی ترقی کے قابل سمجھتے ہیں، لیکن اُمید ہے کہ وہ جس قدر زمانے کے حالات سے واقف ہو کر دُنیا کی ترقیات کا اندازہ کریں گے اور جس قدر اپنی ترقی کے مواقع پر غور فرمائیں گے اُسی قدر اُن کی رائے کی غلطی ان پر ظاہر ہوتی جائے گی۔

البتہ جو لوگ مسلمانوں کی بہبودی سے بالکل مایوس ہیں اور اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ ''اُن میں کسی قسم کی ترقی کا مادہ باقی نہیں رہا اور اُن کی اصلاح میں کوشش کرنے والے ایک محال بات کے پیچھے پڑے ہیں۔'' اُن کی رائے نہایت غور اور توجہ کے لائق ہے کیوں کہ جن لوگوں کی یہ رائے ہے وہ ہماری قوم میں اعلیٰ درجہ کے لائق آدمی ہیں اور ہماری موجودہ حالت جس سے بدتر کوئی حالت نہیں ہو سکتی۔ سراسر اُنھیں کی رائے کی تائید کرتی ہے۔ یعنی وہ ایک ایسا دعویٰ کرتے ہیں جس کا ثبوت خود اُن کے دعوے ہی میں موجود ہے۔ ایک ایسے بیمار کی نسبت جس کی طاقت روز بروز

زائل ہوتی جا رہی ہو، جس کی غذا بالکل مفقود ہو، جو علاج معالجے سے سو سو کوس بھاگتا ہو، یہ کہنا کہ ''وہ چند روز کا مہمان ہے۔'' ایک ایسا دعویٰ ہے کہ آپ ہی اپنی دلیل ہوسکتا ہے۔

وہ خیالات جو مسلمانوں کے ترقی نہ کرسکنے کے متعلق عام طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔

ا۔ پہلا خیال:۔

مذہب مانع ترقی ہے

وہ لوگ (جن کی رائے اوپر بیان کی گئی) مسلمانوں کی موجودہ حالت کی شہادت کے سوا اور بھی دلیلیں پیش کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ:۔

''مسلمانوں کی مذہبی تعلیم ہی دنیوی ترقی کے لیے مانع ہے۔ پس تاوقتیکہ مسلمان مذہب سے دست بردار نہ ہوں دنیوی ترقی نہیں کر سکتے، لیکن اس صورت میں وہ مسلمانوں کی ترقی نہ ہوگی بلکہ ایک ایسی قوم کی ترقی ہوگی جس سے اسلام کا کچھ تعلق نہ ہو۔''

ہمارے نزدیک یہ ایک دلچسپ فقرہ ہے جو مسلمانوں کی ترقی وتنزل کے بحث کے وقت ہمیشہ استعمال کیا جاتا ہے۔

دُنیا میں کوئی قوم شائستہ یا ناشائستہ ایسی نہیں ہے جس کی مذہبی تعلیم اب یا کسی وقت دنیوی ترقیات کی مانع نہ خیال کی گئی ہو۔

اور سب قوموں کو جانے دو۔ عیسائی قومیں جو اس وقت دنیوی ترقیات میں تمام دُنیا سے فائق ہیں اور جو علم ودولت کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب کو بھی ترقی دے رہی ہیں اُن کا مذہب ہمارے مروجہ مذہب سے بھی زیادہ دنیوی ترقی کا منافی سمجھا جاتا تھا۔ جس وقت یورپ میں علم وحکمت کا ستارہ چمکا اور مذہبی خیالات اس کی روشنی میں مضمحل ہونے لگے اُس وقت مذہبی پیشواؤں اور خود گورنمنٹ کی طرف سے کونسی مزاحمت تھی جو نہیں ہوئی۔ جن

لوگوں نے مذہب کوحشو وزواید سے پاک کرنا چاہا اور آزادانہ تحریر وتقریر کرنی شروع کی اُس وقت ان کو کیسے کیسے سخت عذاب دئے گئے ۔ ہزاروں آدمی جلائے گئے اور ہزاروں نہایت سخت تکلیفیں اوراذیتیں پہنچا کر ہلاک کیے گئے ۔

۱۳۹۴ء میں وکلف جو عیسائی مذہب کا مصلح تھا اور جس نے کتب مقدسہ کو انگلستان کی زبان مروجہ میں ترجمہ کیا تھا۔ اُس کے معتقدوں پر سخت عذاب کیا گیا۔

۱۴۱۳ء میں آزادی مذہب کی بیخ کنی کے واسطے قانون جاری کیے گئے ۔

۱۵۳۹ء میں اسکاٹ لینڈ میں مصلحان مذہب پر انواع واقسام کے ظلم کیے گئے اور ساٹھ آدمی بدعت کے الزام پر جلتی آگ میں جلائے گئے ۔

۱۵۵۵ء میں کئی رفارمر بدعتی ہونے کے الزام میں جلائے گئے اور تمام قید خانے اس قسم کے بدعتیوں سے بھر گئے ۔

۱۶۴۱ء میں جب کہ آئرلینڈ میں بغاوت ہوئی تو چالیس ہزار پروٹسٹنٹ قتل کیے گئے ۔

سترھویں صدی عیسوی کے اخیر تک ارسطو کی حجتوں نے تمام یورپ کے مدارس کو ایسا جکڑ بند کر رکھا تھا کہ وہ مذہب کی رکن رکین سمجھی جاتی تھیں ۔ اور یہ تمام بندشیں اُس وقت تک نہ ٹوٹیں جب تک کہ لارڈ بیکن[1] نے نہایت زور آور تحریروں سے اُن کو نہ توڑا۔

کوپرنکیس[2] نے جس وقت سیّارات کی نسبت اپنی تحقیقات ظاہر کی تو تمام کلیسا نے یک زبان ہو کر اس کو مردود ٹھہرایا۔

---

[1] فرانسس بیکن (Francis Bacon)۔ انگلستان کا نامور ادیب اور زبردست فلسفی تھا۔ ۲۲ر جنوری ۱۵۶۱ء کو پیدا ہوا۔ اس کا باپ نکولس بیکن ملکہ ایلزبیتھ کا مہر بردار اور وزیر تھا۔ بڑے ہو کر اپنے باپ کے بعد ۱۶۱۷ء میں یہ عہدہ اس کو ملا۔ مرغی کے گوشت کے نہ سڑنے کا تجربہ کرتے ہوئے سردی لگ کر ۹ر اپریل ۱۶۲۶ء کو ۶۶ برس کی عمر میں انتقال کیا۔

[2] کوپرنیکس (Copernicus) یورپ کا نہایت مشہور سائنسداں ہے۔ ۱۴۷۳ء میں پولینڈ میں پیدا ہوا۔ اس نے یورپ میں سب سے پہلے اس مسئلہ کی اشاعت کی کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے اور نظام شمسی کا مرکز آفتاب ہے نہ کہ زمین۔ ۱۵۴۳ء میں وفات پائی۔

گلیلیو[1] ۱۶۰۹ء میں دوربینیں بنائے اور سیارات کے متعلق بہت سے حالات مشاہدہ کیے مگر اُن کا انعام یہ ملا کہ قید کیا گیا۔ اگرچہ ہر چند اُس نے بہت زبردست اور صاف دلیلوں سے سمجھایا کہ یہ باتیں دین یا کتابِ مقدس سے کچھ منافات نہیں رکھتیں مگر کسی نے التفات نہ کیا۔

غلامی کے موقوف کرنے میں یورپ کو بے شمار مزاحمتیں پیش آئیں۔

لوتھر[2] کی کتاب جو پوپ[3] لیودھم کے برخلاف لکھی گئی تھی۔ ۱۵۲۰ء میں جلائی گئی۔ اسی طرح کے اور بے شمار واقعات پیش آئے جن کے بیان کرنے کا یہ محل نہیں ہے۔

آخر تعلیم نے تمام اِلف و عاوت اور تعصّبات کو دبالیا اور عیسائی مذہب بہ قدرِ ضرورت وقتاً فوقتاً حشو و زواید سے پاک ہوتا رہا۔ اب وہی عیسائی قومیں ہیں کہ جس طرح دنیوی ترقیات میں تمام دُنیا سے سبقت لے گئی ہیں اسی طرح اپنے مذہب کی اشاعت اور حمایت میں تمام عالم کی قوموں سے زیادہ سرگرم ہیں۔

پس یہ خیال کہ مسلمان جب تک اپنے مذہب سے دست بردار نہ ہوں دنیوی ترقی نہیں کر سکتے، صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

---

[1] گلیلیو (Galileo) یورپ کے بڑے اور مشہور سائنسدانوں میں سے ہے۔ دوربین کو اسی نے درجہ تکمیل کو پہنچایا۔ ۸رفروری ۱۵۶۴ء کو اٹلی کے شہر فلارنس میں پیدا ہوا۔ اُس کا عقیدہ تھا کہ زمین گول ہے اور آفتاب کے گرد گھومتی ہے۔ اس جرم میں پوپ کے دربار سے اُس پر کفر کا فتویٰ صادر ہوا اور گرفتار کر کے روما طلب کیا گیا۔ جہاں اُس پر ایسی سختیاں ہوئیں کہ مجبور ہو کر اُس نے اس سے توبہ کی اور زمین کے گول اور متحرک ہونے سے انکار کیا۔ اُس کی تمام کتابیں جن میں اس قسم کی کفریات درج تھیں چوراہے پر رکھ کر نذرِ آتش کر دی گئیں۔ آخر عمر میں اندھا ہو گیا تھا۔ گلیلیو کا سال وفات ۱۶۴۲ء ہے۔

[2] لوتھر (Luther) عیسائی مذہب کا بہت بڑا مصلح اور فرقہ پروٹسٹنٹ کا بانی تھا۔ جرمنی میں ۱۴۸۳ء میں پیدا ہوا۔ ۱۵۱۰ء میں روما گیا۔ وہاں پوپ کی بداطواریاں دیکھیں تو اس کا سخت مخالف ہو گیا اور اُس کے خلاف ملک میں لکچر دینے شروع کیے۔ پوپ نے ۱۵۲۰ء میں اُسے کافر اور مسیحیت سے خارج کرنے کا اعلان کیا مگر اُس نے کوئی پرواہ نہیں کی اور پوپ کا اعلان جلا دیا۔ ۱۵۴۶ء میں وفات پائی۔

[3] لیودھم (Leox) اٹلی کا پوپ اور دُنیائے مسیحیت کا پیشوائے اعظم تھا۔ ۱۴۷۵ء میں پیدا ہوا اور ۱۵۲۱ء میں مر گیا۔

اصل یہ ہے کہ ہر مذہب ایک مدت کے بعد اپنی اصلیت سے متجاوز ہوتے ہوتے ایک طومار طویل الذیل ہو جاتا ہے اور جب تک کوئی سخت ضرورت داعی نہیں ہوتی وہ برابر بڑھتا چلا جاتا ہے۔ لیکن جب زمانے کی ضرورتیں اہل مذہب کو شکنجے میں کھینچتی ہیں تو وہ مذہب کی اصلیت دریافت کرنے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور بہت سے ملکی قوانین اور بہت سے قصے کہانیاں، بہت سے رسم و رواج، بہت سے بے جا تعصّبات اور بہت سے ظنون و اوہام جو امتدادِ ایام کے سبب مذہب کے عناصر دار کان بن جاتے ہیں اُن سے دست بردار ہو کر اصل مذہب پر قناعت کرتے ہیں۔ وہ خود ایسا نہیں کرتے بلکہ زمانے کی ضرورتیں اُن کو ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ مثلاً ہندوستان کا ایک شریف مسلمان جو عورت کے گھر سے باہر نکلنے کو خلاف شرافت ہی نہیں بلکہ خلافِ شریعت بھی جانتا ہے جب اہل و عیال کے ساتھ سفر حج کرتا ہے تو اس کو مجبوراً پردہ نشینی کے وہ قاعدے توڑنے پڑتے ہیں جن کو وطن میں لازمۂ اسلام خیال کرتا تھا۔ ایک شیعی مسلمان جو مشرکین کے دودھ وہی اور مٹھائی وغیرہ سے پرہیز کرتا ہے جب کوئی لمبا سفر کرتا ہے تو اس لاچار سب کچھ گوارا کرنا پڑتا ہے۔

انیسویں صدی کے آغاز میں جب محمودؔ[1] ثانی سلطان روم نے فوج کو فرنگستانی قواعد سکھانے کی نہایت سخت ضرورت سمجھی اور ینگچری فرقے نے جن کی فوج شجاعت اور استقلال میں بے مثل اور شمار میں ایک لاکھ سے زیادہ تھی کافروں کو قواعد سمجھ کر اُس کے سیکھنے سے انکار کیا اور کسی طرح وہ اپنی سرکشی سے باز نہ آئی تو آخر مجبور ہو کر اُس فرقے کے ایک ایک متنفس کو قتل کرنا پڑا۔ اگرچہ اُس فوج کے قتل ہونے سے سلطنت کو سخت صدمہ پہنچا لیکن زمانے کی ضرورتوں نے سلطان کو ایسے قتل عام پر مجبور کر دیا۔ اور اُس دن سے فرنگستانی

---

[1] محمود ثانی: خاندان عثمانیہ کا تیسواں تاجدار اور بہادر، عالی حوصلہ، خوش مزاج اور منتظم سلطان تھا۔ اس کا عہد ترکی میں بہت سی اصلاحات کا موجب ہوا۔ سب سے پہلے اُسی کے زمانے میں ترکی سے اخبار جاری ہوئے۔ ۱۲۲۳ھ (۱۸۰۸ء) میں تخت پر بیٹھا اور ساڑھے پچپن سال کی عمر پا کر ۱۲۵۵ھ (۱۸۳۹ء) میں وفات پائی۔

قواعد روم میں جاری ہوگئی۔ بے شک نیگچری[1] فرقے کی یہ بغاوت و سرکشی مذہبی خیالات کا نتیجہ تھی، لیکن چوں کہ حقیقت میں اُس کی بنیاد محض تعصب پر تھی نہ کہ اصولِ مذہب پر اور زمانے کی ضرورتیں بھی مجبور کر رہی تھیں کہ بغیر نئے آلاتِ جنگ سے مسلح ہوئے اور موجودہ طرزِ نبرد آزمائی سے واقف ہوئے بغیر چارہ نہیں، اس لیے تمام علماء نے متفق اللفظ ہو کر ایک لاکھ بہادر اور کار آزمودہ فوج کے قتل کا فتویٰ دے دیا۔

الغرض مذہبی توہمات جب ہی تک مانع ترقی رہتے ہیں جب تک زمانے کی ضرورتیں اہل مذہب کو مجبور نہیں کرتیں۔

آج سے تیس برس پہلے ہندوستان میں ایک مسلمان بھی ایسا نہ ہوگا جو انگریزی زبان سیکھنے کو معصیت نہ جانتا ہو۔ لیکن اب برخلاف اس کے ایک مسلمان بھی ایسا نہ ہوگا جو انگریزی سیکھنے کو ضروری نہ سمجھتا ہو[2]۔

کیا وہ پہلا خیال ایک مذہبی خیال نہ تھا؟ اور کیا اس خیال کے بدل جانے سے مسلمان اسلام سے دست بردار ہوگئے؟ حاشا ثم حاشا۔

پس یہ خیال بالکل غلط ہے کہ جب تک مسلمان اسلام سے دست بردار نہ ہوں دنیوی ترقی ہرگز نہیں کرسکتے۔ البتہ جب تک کوئی ہم کو یہ نہ جتائے کہ کیا ضرورتیں درپیش ہیں تب تک نہ مذہبی توہمات ہمارے دل سے دور ہوسکتے اور نہ ترقی کا خیال ہمارے دل میں پیدا ہوسکتا ہے اور وہ شے تعلیم ہے جس کے پھیلانے میں چند باہمت لوگ کوشش

---

[1] نیگچری: یہ ٹرکی کی ایک خاص اور بڑی زبردست قواعد داں فوج تھی جس کی بنیاد سلطان ارخاں کے بھائی اور وزیر علاؤالدین نے اُن عیسائی اسیرانِ جنگ سے ڈالی تھی جو مسلمان ہو جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس فوج نے بہت بڑی طاقت حاصل کر لی اور معاملاتِ سلطنت میں دخل دینے لگی اور اُس کے اشاروں پر ٹرکی سلطان معزول اور قتل ہونے لگے۔ بڑھتے بڑھتے اس قاہرہ فوج کی تعداد ۵ لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ یہ فوج اس قدر زبردست تھی کہ تمام یورپ اس کی وجہ سے ٹرکی سلطنت سے کانپتا تھا۔ بالآخر جب اس کی سرکشی حد سے بڑھ گئی تو رمضان ۱۲۴۱ھ (۱۸۲۶ء) میں سلطان محمود ثانی نے چن چن کر اس کا ایک ایک فرد قتل کر ڈالا۔

[2] قبلہ اب بھی ڈھیروں اور غول کے غول ہیں (حاشیہ از: سرسید در تہذیب الاخلاق)

کررہے ہیں۔ اگرچہ قوم اُن کی چیخ پکار سے بیدار نہیں ہوتی لیکن افصح المؤدبین (یعنی زمانہ) اُن کو جلد ہوشیار کردے گا۔

۲۔ دوسرا خیال:-

ایک بار تنزل کے بعد دوبارہ ترقی نہیں ہوسکتی۔

دوسری دلیل وہ یہ پیش کرتے ہیں کہ دُنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں سنی گئی جس نے ایک بار تنزل کے درجہ کو پہنچ کر دوبارہ ترقی کی ہو۔

لیکن ہم اُن سے پوچھتے ہیں کہ دوبارہ ترقی کرنے سے کیا مطلب ہے؟ اگر دوبارہ سلطنت حاصل کرنا مراد ہے تو ہم تسلیم کرتے ہیں (بلکہ ہمارے نزدیک اگر دُنیا واقعی عالم اسباب ہے تو ممکن نہیں) کہ جو قومیں زمانۂ موجودہ کے فنون جہانبانی وکشور کشائی میں اپنے بنی نوع سے پیچھے رہ گئی ہیں ان کو کبھی سلطنت اور حکومت میں استقلال کا درجہ حاصل ہوسکے۔ یا جو مستقل نظر آتی ہیں اُن کا استقلال قائم رہ سکے۔

زمانۂ قدیم اور دورِ متوسط میں جب کہ جنگی طاقتیں تمام قوموں کی قریباً یکساں تھیں اُس وقت ہر قوم سلطنت اور حکومت حاصل کرنے کی قابلیت رکھتی تھی اور خاص خاص اسباب سے کبھی یہ قوم اُس قوم پر اور کبھی وہ قوم اس قوم پر غالب آجاتی تھی۔

لیکن زمانۂ حال میں قواعدِ جنگ وآلاتِ حرب کے لحاظ سے دُنیا کی حالت دگرگوں ہے ایک قوم آسمان پر ہے تو دوسری قوم تحت الثریٰ میں ہے، اور جو قومیں ترقی کر چکی ہیں اُن کا فرض ہے کہ مغلوب قوموں کو کبھی ان وسائل میں اپنے برابر نہ ہونے دیں جن کے سبب سے اُن کو غلبہ حاصل ہوا ہے۔ پس ضرور ہے کہ ترقی یافتہ قوموں کا غلبہ اور رعب دواب روز بروز بڑھتا جائے۔ اور جن قوموں نے اپنی حد سے آگے قدم نہیں بڑھایا وہ نوبت بہ نوبت مضمحل ہوتی جائیں، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ مسلمانوں کی ترقی کے لیے کوشش کرنا محض فضول ہے صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

ہر قوم بلکہ ہر شخص کی ترقی کی ایک جداگانہ حد ہے اور اُس حد تک پہنچنا اُس کا

ضروری فرض ہے۔ ایک شخص جس کے تمام اعضائے جسمانی درست اور مضبوط اور ذہن و حافظہ بھی عمدہ ہے بے شک ہر علم و ہنر میں ترقی کرسکتا ہے۔ وہ جس طرح ایک اعلیٰ درجے کا فاضل ہوسکتا ہے ویسا ہی ایک اعلیٰ درجے کا سپاہی بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن ایک دوسرا شخص جس کا فہم، ذہن اور حافظہ عمدہ ہے مگر ایک ہاتھ سے بالکل اپاہج ہے وہ اگرچہ ایک عمدہ سپاہی نہیں بن سکتا لیکن ایک اعلیٰ درجے کا فاضل ضرور ہوسکتا ہے اور اس لیے اُس کا نہایت ضروری فرض ہے کہ علمی ترقیات میں جہاں تک ہوسکے کوکوشش کرے۔

اگر دوبارہ ترقی کرنے سے ہی مراد نہیں ہے جو اوپر ذکر کی گئی تو ہم تسلیم نہیں کرتے کہ کسی قوم نے تنزل کے بعد ترقی نہیں کی۔

اور ملکوں کو جانے دو۔ ہندوستان ہی میں ایسی قومیں موجود ہیں جو نہایت پست ہوکر دوبارہ بلند ہوئی ہیں۔ مثلاً گجرات میں پارسی یا بنگالہ میں ہندو۔ ان دونوں قوموں کا حال جو دوسو برس پہلے تھا اور اُن کی موجودہ حالت۔ دونوں کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے کس قدر ترقی کی ہے۔

اس کے سوا کوئی روشن اور صاف دلیل اس بات کی نہیں ہے کہ جو گورنمنٹ کی طرف سے ہماری تعلیم، ہماری تجارت اور ہماری صنعت و حرفت میں کوئی صریح مزاحمت نہ ہو تو بھی ہم ان شاخوں میں ترقی نہیں کرسکتے۔

یہودیوں پر جب تک یورپ میں ظلم و ستم ہوتا رہا اور وہ غلامی کی حالت میں رہے تب تک اُن کی ترقیات جس قدر کی وہ رعیت ہونے کی حالت میں کرسکتے تھے رُکی رہیں لیکن جب سے یورپ میں آزادی پھیلی اور اُن کو رعیت کے پورے پورے حق دئے گئے تب سے اُن کی حالت پہلے کی نسبت نہایت بہتر ہے۔ بعض ملکوں میں تو اُنھوں نے حکمراں قوموں کے برابر حقوق حاصل کیے ہیں۔ عموماً ہر ملک میں اُن کی حالت اچھی ہے۔ اُن کی تجارت تمام دُنیا میں پھیلی ہوئی ہے اور ان کی دولت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ بعض دولت منداُن میں ایسے ایسے ہیں کہ یورپ کی بڑی بڑی سلطنتیں اُن کی قرض دار ہیں۔

۳۔تیسرا خیال:-

موجودہ تعلیمی کوششوں کا نتیجہ کچھ نہ نکلے گا لہٰذا کوشش بے سود ہے۔

جولوگ مسلمانوں کی ترقی سے بالکل مایوس ہیں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ:-

''اس کوشش کا نتیجہ جو کہ مسلمانوں کے بعض خیر خواہ کر رہے ہیں اس کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا کہ چند آدمی کسی قدر امتیاز حاصل کر لیں۔ کیوں کہ آج تک جتنے آدمیوں کو ترقی کا خیال ہوا ہے وہ اس قدر تھوڑے ہیں کہ اُنگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ پس اگر سو دو سو برس میں ہزار دو ہزار مسلمان ممتاز ہو گئے تو اس کو قومی ترقی نہیں کہہ سکتے۔''

لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ مسلمانوں کو کیے دن سے ترقی کا خیال پیدا ہوا ہے؟ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو اس خیال کی عمر اور پرچۂ ''تہذیب الاخلاق'' کی عمر برابر نکلے گی۔ پس جو کچھ اس قلیل عرصے میں ہوا وہ ترقی کی معمولی چال سے بہت زیادہ ہے۔ اس کے سوا ترقی کی رفتار ابتدا میں ہمیشہ سست ہوتی ہے لیکن وہ جس قدر بڑھتی جاتی ہے اسی قدر تیز ہوتی جاتی ہے۔ جو بیمار روز بروز بگڑتا جاتا ہے اُس کا ادنیٰ افاقہ بھی نہایت تسلی بخش ہوتا ہے اور اگر پھر کوئی غلطی نہیں ہوتی تو اس کی صحت اور طاقت روز بروز ترقی کرتی ہے اور یہ ترقی بھی یوماً فیوماً بڑھتی جاتی ہے۔

جو ترقی یورپ نے اٹھارویں صدی کے شروع سے آج تک یعنی ڈیڑھ سو برس میں کی ہے، گزشتہ تین صدیوں میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہوا اور جو کچھ ان تین صدیوں میں ہوا، اس کے مقابلے میں وہ تمام ترقیات ہیچ تھیں جو پندرھویں صدی سے پہلے سالہا سال تک وقتاً فوقتاً ہوتی رہیں۔

۴۔ چوتھا خیال:۔

پہلے سے ترقی کُن قوموں کے برابر چوں کہ ہم نہیں ہو سکتے لہٰذا ترقی بے فائدہ ہے۔

بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ''جو قومیں پہلے سے ترقی کر رہی ہیں اُن کے برابر ایک ایسی قوم ہرگز نہیں ہو سکتی جس کو سب سے پیچھے ترقی کا خیال پیدا ہوا ہو۔ پس اگر بالغرض مسلمانوں نے اب ترقی کرنے کا پختہ ارادہ بھی کیا تو کچھ فائدہ نہیں ہے کیوں کہ ایسی حالت میں ہم اُن ترقی یافتہ قوموں سے ہمیشہ پیچھے ہی رہیں گے۔''

بے شک یہ بات صحیح ہے لیکن ہماری کوشش صرف اس بات میں ہونی چاہیے کہ ہم اپنی ہم وطن قوموں سے جنھوں نے ہم سے بہت پہلے قدم آگے بڑھایا ہے کسی چیز میں کم نہ رہیں اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ہم اس کوشش میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ محکوم قوموں کی ترقی ہمیشہ ایک خاص حد پر جا کر پھیکی ہو جاتی ہے جس سے آگے بڑھنے کا محل ان کے لیے باقی نہیں رہتا۔ پس اگر ان میں سے ایک قوم آگے بڑھ گئی ہے اور دوسری قوم پیچھے رہ گئی ہے تو پس ماندہ قوم کو مایوس نہ ہونا چاہیے کیوں کہ اگر راہ میں نہیں تو آخیر منزل پر جا کر دونوں مل جائیں گی۔ اور یہ بھی ناممکن نہیں ہے کہ راہ ہی میں پچھلا قافلہ اگلے قافلہ سے جا ملے کیوں کہ بعض اوقات ایسی اضطراری حالتیں پیش آتی ہیں کہ پچھلوں کو معمولی رفتار سے کسی قدر زیادہ جلد اُٹھانا پڑتا ہے یہاں تک کہ وہ راہ ہی میں اُگلوں سے جا ملتے ہیں۔

اصل مانع ترقی مایوسی اور نا اُمیدی ہے

بہرحال یہ تمام موانع جو اوپر ذکر کیے گئے ہم کو ترقی سے مایوس کرنے والے نہیں ہیں البتہ صرف ایک بات ایسی ہے جو تمام منصوبوں اور ارادوں کو خاک میں ملا دیتی ہے اور وہ ترقی کی طرف سے مایوسی اور نا اُمیدی ہے۔

جو قوم عام تعصب اور جہالت میں مبتلا ہوتی ہے وہ ہمیشہ چند ایسے روشن ضمیر آدمیوں

کی ہمت اور کوشش سے روبراہ ہوتی ہے جو تعلیم کی بدولت تعصب اور جہالت کی اندھیری کوٹھری سے باہر نکل آتے ہیں اور قوم کی ابتر حالت دیکھ کر اُن کے دل میں بے اختیار ایک ولولہ اٹھتا ہے اور قومی اصلاح و ترقی کی طرف دل و جان سے متوجہ ہو جاتے ہیں۔

اسی بنا پر ہم کو یہ اُمید تھی کہ جو نوجوان ہماری قوم میں اعلیٰ درجے کی تعلیم پائیں گے وہ اس کام کے ذمہ دار ہوں گے۔ مگر برخلاف اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ جس قدر ایجوکیشن اور سویلزیشن (تعلیم و تہذیب) میں اعلیٰ درجہ حاصل کرتے ہیں اسی قدر قوم کی ترقی سے مایوس نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ جن نفوسِ مقدسہ کو قومی ترقی کے خیال میں سرگرم پاتے ہیں اُن پر تعجب کرتے ہیں کہ یہ کیوں کوشش کر رہے ہیں؟ اور کیوں کر کر رہے ہیں؟

ہائی ایجوکیشن (اعلیٰ تعلیم) کی بدولت ان کی مثال ایسے شخص کی مانند ہے جو اندھیری رات میں ایک نہایت روشن کمرے سے باہر نکلتا ہے اور باہر آ کر اس کو در و دیوار کچھ نظر نہیں آتا وہ باہر چلنے پھرنے والوں کے پاؤں کی آہٹ سُن کر تعجب کرتا ہے کہ یہ لوگ کیوں کر اس اندھیرے میں چل پھر رہے ہیں اور آخر گھبرا کر پھر اُسی روشن کمرے میں گھس جاتا ہے۔ وہ اتنا توقف نہیں کرتا کہ روشنی کی چکا چوند جس نے اُس کی آنکھوں کو خیرہ کر رکھا ہے کم ہو جائے اور تاریکی میں اُس کو بھی روشنی محسوس ہونے لگے اور وہ بھی اوروں کی طرح چل پھر سکے۔

اسی طرح ہماری قوم کے نوجوان ایجوکیٹڈ (تعلیم یافتہ) جنھوں نے یورپ کی سویلزیشن (تہذیب) کو اپنی آنکھ سے دیکھا ہے یا تعلیم کے ذریعے سے اُس کا اندازہ کیا ہے، وہ جب مغربی قوموں کی حالت کو اپنی قوم کی موجودہ حالت سے مقابلہ کرتے ہیں تو دونوں حالتوں میں وہ نسبت پاتے ہیں جو محض نور اور محض ظلمت میں ہے اور بے شک بادی النظر میں ایسی ہی نسبت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسا حال نہیں بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اندھیرے میں کچھ اجالا بھی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ دو چار شخصوں کی کوشش سے چند روز میں وہ نتائج پیدا ہوئے ہیں جن کی کسی طرح توقع نہ تھی۔ پس اگر دس بیس بالیاقت آدمی توجہ اور کوشش کریں تو بہت کچھ کر سکتے ہیں۔

صرف دو چیزیں ہیں جن پر دُنیا کی کامیابی اور ناکامی کا مدار رکھا گیا ہے۔

(۱) اُمید

(۲) نااُمیدی

ہزاروں دشوار کام جو بالیقین محال بلکہ ناممکن سمجھے گئے تھے امید کی بدولت اور کوشش کے ذریعے نہ صرف ممکن بلکہ سرانجام پائے ہیں۔ اور ہزاروں سہل اور آسان کام ناامیدی اور ہمت ہار دینے کی وجہ سے ناتمام اور ادھورے رہے ہیں۔ دیکھو کلمبس نے صرف امید ہی کے بھروسے پر ایک ایسا کام سرانجام کیا جس کو تمام عالم محال سمجھتا تھا اور کلائیو نے صرف امید ہی کے سہارے پلاسی میں وہ فتح حاصل کی جس کے نتائج کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھے۔

بجز امید کہ ایمانِ عشق کیشاں است
کسے نداد تسلی دل زلیخا را

ایامِ تعطیل میں ایک سفر کی کیفیت

(از ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ''، بابت ۱۸۸۰ء، صفحہ: ۱۰۸۳)

(یہ مضمون اُس زمانے کا لکھا ہوا ہے جب مولانا حالؔی اینگلو عربک ہائی اسکول دہلی میں مدرس عربی تھے۔ موسم گرم کی تعطیلات میں بجائے وطن کے قیام کے آپ نے ایک مختصر سا سفر کیا تھا۔ سطور ذیل اسی دورہ کے حالات ہیں جن کو مولانا خود علی گڑھ گزٹ میں چھپوایا تھا۔)

ایامِ تعطیل میں دوستوں اور عزیزوں سے ملنے کی غرض سے ہم کو چند مقامات میں دورہ کرنے کا اتفاق ہوا، اوّل ہم دہلی سے علی گڑھ پہنچے اور جناب آنریبل سید احمد خاں بہادر کی کوٹھی پر ٹھہرے۔

اب کی دفعہ ہم نے مدرستہ العلوم کو تیسری بار دیکھا اور اُس کی روز افزوں ترقی دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا۔ مدرسہ کو دیکھ کر ہم کو اس بات کا پورا یقین ہوگیا کہ الوالعزم اور مستقل مزاج آدمی اپنے ارادوں کی مزاحمت سے اور زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔

اُن لوگوں کے سوا جو عناد اور دشمنی سے اس مدرسہ کے مخالف ہیں باقی سب مسلمان رفتہ رفتہ اس کی قدر کرتے جاتے ہیں اور جن عمدہ اصول پر اس مدرسہ کی بنیاد قائم کی گئی ہے اب اُن کی خوبی و عمدگی سب پر ظاہر ہو رہی ہے اور اسی وجہ سے طلبہ کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ بہت سے بے خبر اور ناواقف لوگ جو اپنی اولاد کو یہاں بھیجتے ہوئے جھجکتے تھے اور اُن کے مذہب و عقائد کے بدل جانے سے ڈرتے تھے وہ اب نہایت اطمینان اور دلجمعی

سے اپنی اولاد کو بھیجنے لگے ہیں۔

یہ بات تحقیق ہوگئی ہے کہ بانی مدرستہ العلوم کے مذہبی اعتقادات اور رایوں کو مدرستہ العلوم کی تعلیم میں کچھ بھی دخل نہیں ہے۔

اس امر کا یہاں تک خیال رکھا جاتا ہے کہ رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جو مطبع علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ سے چھپ کر شائع ہوتا ہے، اُس کی کوئی کاپی مفت یا بہ قیمت کسی طالب علم کو نہیں دی جاتی۔

طلبائے مدرسہ کے افعال و اخلاق کی نگرانی پر یہاں وہ لوگ مامور ہیں جو جمہور اہلِ اسلام کے طریقے سے سرِ موتجاوز کرنے کو بھی کفر جانتے ہیں۔

علی گڑھ میں ہم بعض ایسے دوستوں سے بھی ملے جو چند سال پہلے اس مدرسہ کو ''دارالکفر'' سمجھتے تھے لیکن اب حد سے زیادہ اُس کے مداح اور ثنا خواں ہیں اور اپنے بچوں کو وہاں تعلیم کے لیے بھیجتے ہیں۔

مدرسہ میں دو چار کے سوا جو کہ مریض تھے ہم نے سب مسلمان طالب علموں کو روزہ دار پایا۔ افطار کے وقت نماز کے چبوترہ پر جو بالفعل عارضی طور پر بنالیا گیا ہے۔ سب جمع ہوتے تھے۔ اور نہایت لطف کے ساتھ روزہ افطار ہوتا تھا۔ نمازِ عشا کے بعد جناب مولوی محمد امیر صاحب قرآن سناتے تھے اور اکثر طالب علم ان کا قرآن سنتے تھے۔ ایک روز جناب مولوی سید فریدالدین احمد خان بہادر نے اور دوسرے روز ہمارے جلیل القدر میزبان (یعنی سید احمد خاں صاحب) نے بھی روزہ افطار کی تقریب میں اپنے دوستوں کو بلایا تھا اور ان دونوں صحبتوں میں ہم بھی شریک تھے۔

مدرستہ العلوم کی تعمیر نہایت شد و مد سے جاری ہے اور جس قدر کام اس میں ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے اُس کو دیکھ کر بے انتہا تعجب ہوتا ہے۔

مدرستہ العلوم کے حامیوں اور کارپردازوں کی سرگرمی اور کوشش دیکھ کر اُن لوگوں کے دل میں بھی جو مسلمانوں کی ترقی سے مایوس ہیں ایک جوش اور ولولہ پیدا ہوتا ہے اور یہ امید ہوتی ہے کہ اس قوم کی ترقی کا اگر ذمہ دار ہو سکتا ہے تو یہی مدرسہ ہو سکتا ہے۔

علی گڑھ میں پانچ روز ٹھہر کر ہم فیروز آباد، اٹاوہ، مین پوری اور کان پور ہوتے ہوئے ہمیر پور میں پہنچے۔

فیروز آباد ضلع آگرہ کا ایک مشہور قصبہ ہے جس میں سرکاری تھانہ اور تحصیل بھی ہے۔ یہ قصبہ جیسا کہ مشہور ہے فیروز خواجہ سرا کا آباد کیا ہوا ہے۔لیکن یہ ایک غیر محقق بات ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ فیروز شاہ کا آباد کیا ہوا ہو، جیسے فیروز پور یا حصار فیروزہ وغیرہ۔

یہاں کھجور کے پٹھے کی پنکھیاں ایسی عمدہ بنتی ہیں کہ ہندوستان میں شاید ہی کہیں بنتی ہوں۔ سادی پنکھیاں جن میں کسی قدر ریشم کا کام ہوتا ہے ایک روپیہ قیمت کی ہم نے بھی یہاں دیکھیں۔ اس کے سوا یہاں کی کوئی بات ذکر کے قابل نہیں ہے۔

یہاں کے مسلمان جو پہلے بہت آسودہ اور مرفہ الحال تھے اب اس قدر پست حالت میں ہیں کہ وہاں کے ذی اعتبار باشندوں میں اُن کا ذکر نہیں آتا۔

اٹاوہ میں ہم کو زیادہ ٹھہرنے کی مہلت نہیں ملی اور نہ اپنے شفیق میزبان کے مکان کے سوا کہیں جانے کا اتفاق ہوا۔

مین پوری میں ہم دو روز ٹھہرے، خوش قسمتی سے ہم کو ایک دن اور ایک رات جناب مرزا عابد علی بیگ صاحب سب آرڈنیٹ جج کی خدمت میں رہنے کا موقع ملا۔ یہاں بھی طریقۂ معاشرت میں ہم نے وہی انوار و برکات مشاہدہ کیے جو علی گڑھ میں کیے تھے۔ جناب مرزا صاحب بھی اُسی مردود گروہ میں سے ہیں جو قومی ہمدردی کو راس الحنات اور مُخ العبادات جانتے ہیں۔ جب ہم اُن کے دولت خانے سے رخصت ہو کر ڈاک گاڑی پر پہنچے تو اُن کے دو آدمی ہمارے ساتھ تھے جن سے کوچبان کو معلوم ہوا کہ وہ صدر اعلیٰ کے ہاں سے آئے ہیں اس بات نے ہم کو بہت تکلیف میں ڈالا۔ کیوں کہ گاڑی کا کوچبان اتفاق سے مسلمان ہونے کے ساتھ ہی نہایت متقی بھی تھا اس نے یہ بات معلوم ہونے پر راستے میں ہم کو پانی پینے کے لیے اپنا کٹورہ تک نہیں دیا اور ہم سے برابر ایسا پرہیز کرتا رہا جیسے بعض ہندو مسلمانوں سے کرتے ہیں۔ اول اول تو ہم کو اس سے بہت تعجب ہوا لیکن پھر یاد آیا کہ ہم نے اپنے عالی قدر میزبان کے ہاں برابر دو وقت میز پر کھانا کھایا تھا اور اسی لیے ہم سے

پرہیز کرنا ضروری تھا۔

جب ہم کان پور میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہاں سے ہمیر پور تک اونٹ گاڑی کے سوا کوئی سواری نہیں جاتی اس لیے لاچار اسی میں جانا پڑا اور اتفاقاً ہم کو اوپر کے درجے میں جگہ ملی۔ ہم کو یاد نہیں کہ ہم نے کبھی کسی سواری یا پیدل چلنے میں ایسی تکلیف اُٹھائی ہو جیسی اس اونٹ گاڑی میں ہمیں پہنچی۔

ریل کے زمانے سے پہلے یہی سواریاں نہایت غنیمت سمجھی جاتی تھیں مگر اب اُن کے نام سے ہول آتی ہے۔ افسوس کہ یورپ کی صنعتیں روز بروز ہم کو پرلے درجے کا آرام طلب اور راحت پسند بناتی جاتی ہیں اور اب وہ تمام اسباب اور ذریعہ مفقود ہیں جن کے باعث سے کبھی کبھی ہم کو جفاکشی اور محنت کرنے کا بھی موقع ملتا رہے۔

ہمیر پور کو جاتے ہوئے پچھم کی طرف سڑک سے کسی قدر فاصلہ پر ہم نے ایک مندر دیکھا جو بیربر کا بنا ہوا مشہور ہے۔ گو یہ مندر کچھ زیادہ شاندار نہیں ہے مگر اس سنسان جنگل میں ایک ایسے زمانے کو یاد دلاتا ہے جو ہندوستان کی تاریخ میں ''طلائی زمانہ'' کہلانے کا مستحق ہے۔

اب ہم جمنا سے اتر کر ہمیر پور میں پہنچے۔ ہمیر پور راجہ ہمیر سنگھ کا آباد کیا ہوا مشہور ہے، جس کے خاندان کی عمارتوں کے کھنڈر اب تک وہاں موجود ہیں۔ یہ قصبہ کان پور سے چالیس میل جانب جنوب بہت بلندی پر واقع ہے۔

اس کے شمال میں جمنا اور جنوب میں بیدونتی ندی بہتی ہے اور مشرق میں ایک میل پر جا کر دونوں مل گئی ہیں۔ مغرب میں ایک نالہ ہے جو بیدونتی میں جا کر گرتا ہے۔ یہ نالہ برسات میں جاری ہو جاتا ہے اور ویسے ایام میں خشک رہتا ہے اور اس لحاظ سے ہمیر پور کو کبھی جزیزہ اور کبھی جزیرہ نما کہا جا سکتا ہے۔

قدیم باشندے یہاں کے زیادہ تر ہندو ہیں۔ شریف مسلمانوں میں صرف ایک سیدوں کا خاندان ہے جو اکثر خانہ نشین اور بزرگوں کے متروکہ پر قائع ہیں۔ اس خاندان کے جتنے آدمی میں نے دیکھے ہیں سب پرانی روش کے بھولے بھالے سیدھے سادھے سید

ہیں، جن پر زمانۂ حال کی چھینٹ بھی نہیں پڑی۔

اس مقام کی رونق زیادہ تر سرکاری ملازموں سے ہے اور یہ نہایت خوشی کی بات ہے کہ یہاں سرکاری ملازموں میں جس قدر پردیسی مسلمان ہیں وہ برخلاف عام مسلمانوں کے باہم برادرانہ محبت اور برتاؤ رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کے درد اور دُکھ میں شریک ہوتے ہیں مگر باوجود اس کے تعصّبات بے جا میں سب گرفتار ہیں۔ حقیقت میں ہمیر پور ایک ایسے گوشے میں واقع ہے جہاں زمانے کے شور و شغب کی آواز بہت کم پہنچتی ہے۔ مدرستہ العلوم کا نام وہاں کے اکثر مسلمانوں نے کبھی کان سے بھی نہیں سنا اور جنھوں نے سنا ہے اُن کے ذہن میں اُس کی ایسی ہولناک صورت سمائی ہوئی ہے کہ اُس کے نام سے پناہ مانگتے ہیں۔

دلّی سے ہمیر پور تک ہم کو شریف مسلمانوں کی اکثر صحبتوں میں بیٹھنے اور ان کی بات چیت سننے کا اتفاق ہوا۔ تقریباً تمام مجلسوں کا رنگ ہم نے ایک ہی اصل پر دیکھا۔ وہی بے جا شیخی اور تعلّی اور ہر ایک پہلو سے اپنی تعریف نکالنی، لوگوں کے عیب ڈھونڈنے اور اُن کو برائی سے یاد کرنا، حاضرین کی خوشامد اور غائبین کی بدگوئی، بات بات میں فحش اور دشنام سے زبان کو آلودہ کرنا اور سب سے زیادہ خود غرضی اور تعصب کا بازار ہر جگہ گرم پایا۔

مراجعت کے وقت ہم ایک دن آگرہ میں ٹھہر کر الور پہنچے۔ یہاں ہم کو ''راجپوتانہ سٹیٹ ریلوے'' میں بیٹھنا پڑا۔ چوں کہ یہ سرکاری ریل ہے اس وجہ سے ہم کو اُمید تھی کہ اس میں زیادہ آرام ملے گا مگر برخلاف اس کے سب سے زیادہ اسی میں تکلف اٹھانی پڑی۔ اول تو اس میں انٹرمیڈیٹ کلاس کے نہ ہونے سے بڑا نقص ہے، کیوں کہ متوسط الحال آدمیوں کے لیے یہ درجہ فرسٹ کلاس کا حکم رکھتا ہے۔ دوسرے گاڑیاں اس قدر چھوٹی ہیں کہ ایک کمرے میں صرف چار آدمی آرام سے بیٹھ سکتے ہیں۔ باوجود اس کے ایک ایک کمرے میں آٹھ آٹھ آدمی بٹھائے جانے کا حکم ہے اور اس پر غضب یہ ہے کہ جب تک ایک کمرے میں پورے آٹھ آدمی نہیں بیٹھ لیتے تب تک دوسرا کمرہ نہیں کھولا جاتا۔ حالاں کہ اکثر اسی کلاس کی پانچ پانچ سات سات گاڑیاں ٹرین میں بالکل خالی جاتی ہیں۔

ہم رات کی ٹرین میں سوار ہوئے تھے اور ہماری گاڑی کے کسی کمرے میں آٹھ

آدمی سے کم نہ تھے۔ نیند کے مارے ایک دوسرے پر گرا پڑتا تھا اور تمام راستے مسافروں میں باہم تکرار ہوتی رہی۔ علاوہ ان خوبیوں کے یہ ریل اور ریلوں کی نسبت سست رفتار بھی بہت ہے۔ صبح کے سات بجے ہم باندی کوئی (Bandikui) میں پہنچے اور دس بجے تک یہاں ٹھہرے رہے۔ یہاں تقریباً ڈیڑھ میل طول اور اسی قدر عرض کے میدان میں بالکل سنگین عمارتیں اس قدر بنائی گئی ہیں کہ بجائے خود ایک شہر آباد ہوگیا ہے۔ سنا جاتا ہے کہ یہاں کسی قدر سرکاری فوج رکھی جائے گی۔

وہاں سے چل کر ساڑھے بارہ بجے ہم الور پہنچے اور دوپہر تک نئی سرائے میں جو کیڈل صاحب پولیٹکل ایجنٹ کے عہد میں تیار ہوئی ہے ٹھہرے۔ اس سرائے کی عمارت بالکل سنگین ہے۔ ظاہرا ہندوستان میں یہ پہلی سرائے ہے جس کے نقشہ میں ہر ایک مسافر کی آسائش اور تمام ضروریات کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ رات کو ہمارے ایک معزز دوست نے ہم کو اپنے مکان پر بلا لیا اور پانچ روز تک ہم انھیں کے مکان پر ٹھہرے رہے۔

الور کو ہم نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شہر کی آبادی عین دامن کوہ میں واقع ہوئی ہے اور اسی وجہ سے شہر کا شمالی حصہ جنوبی حصے سے کسی قدر بلند ہے۔ یہاں کے بازار اگرچہ بہت وسیع نہیں مگر پررونق ضرور ہیں اور عمارتیں اکثر سنگین ہیں۔

شہر کی عام عمارتیں کچھ زیادہ امتیاز نہیں رکھتیں لیکن سرکاری محلوں سے راج کی پوری پوری شان وشوکت ظاہر ہوتی ہے۔

خصوصاً وہ محل جو موتی ڈونگری کے باغ میں مہاراجہ بنے سنگھ نے بنوایا ہے، عمارت کی خوبی کے علاوہ وہ ایک ایسے موقع پر واقع ہوا ہے جس سے اُس کی شان اور عظمت دس گنی ہوگئی ہے۔ محل کے اوپر کے درجہ پر چڑھ کر جس طرف نظر ڈالیے زمین اور پہاڑ اور فرش زمردیں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اگرچہ اب تک وہاں بارش نہایت کم ہوئی تھی مگر پھر بھی وہاں کی قدرتی فضا دیکھنے کے قابل تھی۔

یہاں ایک اور مقام بھی بکمال دلکش اور روح افزا ہے جو سیلی سیڑھ کے نام سے مشہور ہے۔ شہر سے تقریباً چھ میل کے فاصلہ پر ایک سیتلا کا مندر ہے جس کو وہاں کے لوگ سیلی

سیٹرہ کہتے ہیں۔(سیلی سیٹرہ کے لفظی معنی ٹھنڈی سیتلا کے ہیں)

یہاں دوطرف سے پہاڑ آکرمل گیا اور ایک مثلث کی سی شکل پیدا ہوگئی ہے۔اس مثلث کے گوشے میں ایک بڑا اور نہایت مستحکم بند باندھا گیا ہے جس میں وقتاً فوقتاً بارش کا پانی دونوں پہاڑوں سے جھِر جھِر کر اکٹھا ہوتا رہتا ہے اور یہاں سے الور تک ایک پختہ نہر بنی ہوئی ہے جس کے ذریعے سے بند کا پانی رستے کے تمام کھیتوں کو سیراب کرتا ہوا شہر تک پہنچتا ہے اور وہاں جا کر الور کے تمام باغات اور اُس کے تمام سواد کو سال بھر تک سرسبز و شاداب رکھتا ہے۔ بند کے ایک جانب پہاڑ پر ایک نہایت پختہ گئو گھاٹ تقریباً پاؤ میل اونچا بنا ہوا ہے جو پہاڑ کی چوٹی پر جا کر ختم ہوتا ہے اور وہاں سرکاری محل بنے ہوئے ہیں۔ یہ مہاراجہ بنے سنگھ کی ایک نمودار یادگار ہے جو ہمیشہ اُن کے عہد حکومت کو یاد دلائے گی۔

الور کا سواد نہایت دلکش اور دلربا ہے اور تمام باغات سے گھرا ہوا ہے۔موتی ڈونگری کے باغ کے سوا جو کہ مشہور ہے ایک کمپنی باغ بھی ہے جو مہاراجہ شیو دھیان سنگھ نے حضور ڈیوک آف ایڈنبرا کی تشریف آوری کے زمانے میں تیار کروایا تھا۔ یہ بھی ایک عمدہ پارک ہے۔

اس کے سوا کیڈل گنج، شفاخانہ اور اسکول وغیرہ عمارتیں جو کیڈل صاحب کے عہد میں بنی ہیں نہایت عمدہ اور شہر کے لیے باعث زینت ہیں۔

ریاست الور کے پولیٹکلِ حالات جس قدر ہم کو معلوم ہوئے ہیں اُن سے ریاست کی آئندہ بہبودی اور ترقی کی بہت کچھ امید ہوتی ہے۔

مہاراجہ منگل سنگھ جو تقریباً دو ڈھائی برس سے بااختیار ہوئے ہیں اُن کی تعریف صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ نواب گورنر جنرل بہادر سابق جب سال گذشتہ کے ختم پر اجمیر تشریف لے گئے تھے تو انھوں نے میوٗ کالج کے طالب علموں سے خطاب کر کے ایک لمبی اسپیچ کی تھی جس میں مہاراجہ منگل سنگھ کی شہسواری، گولہ اندازی، بہادری، جفاکشی، شائستگی اور عالی دماغی کی نہایت تعریف کر کے مخاطبین کو اُن کی پیروی کرنے کی ہدایت فرمائی تھی۔

مہاراجہ صاحب نے اس نہایت قلیل زمانے میں جو دو ڈھائی برس سے زیادہ نہ ہوگا کئی ایسے کام کے ہیں جن کا ایک نوجوان ہندوستانی رئیس سے وقوع میں آنا نہایت عجیب

معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے پہلے جنوبی ہندوستان کا ایک سفر اختیار کیا جس میں کسی قدر بحری سفر اور جزیرہ سیلون کی سیاحت بھی شامل تھی اور بہت شوق سے اپنا سفر نامہ بھی تیار کرایا پھر بااختیار ہونے کے وقت خزانہ بالکل خالی تھا بلکہ ریاست کسی قدر مقروض تھی مگر اب سنا جاتا ہے کہ خزانے میں تقریباً سات آٹھ لاکھ روپیہ جمع ہے۔ ہر جمعرات کے دن ایک عام دربار مقرر کیا جس میں تمام ریاست کے مستغیثوں کو اجازت دی گئی کہ خود مہاراجہ کے روبرو حاضر ہو کر عرض معروض کریں۔ اور معمولی دربار جو ہر روز تین گھنٹے سے چار گھنٹے تک رہتا ہے۔ جس میں کونسل کی تجویزات اور فیصلے پیش ہوتے ہیں یہ اُس عام دربار کے علاوہ ہے۔ پولیس اور مال کا از سر نو انتظام کیا جس کی وجہ سے تقریباً پانچ سو روپیہ ماہوار کا اضافہ عملۂ پولیس اور عملۂ مال کی تنخواہوں میں کیا گیا۔ سررشتہ تعلیم میں بھی روز بروز ترقی ہوتی جاتی ہے۔

ایک بڑا اسکول شہر میں عام رعایا کی تعلیم کے لیے ہے جس میں انٹرنس تک پڑھائی ہوتی ہے۔ اور جو لڑکے یہاں سے انٹرنس پاس کرتے ہیں اُن کو وظیفہ دے کر کالج میں بھیج دیا جاتا ہے، اگلے برس دو لڑکوں نے انٹرنس پاس کیا تھا وہ دونوں لڑکے اجمیر کے گورنمنٹ کالج میں ترقی تعلیم کے لیے بھیج دیے گئے اور آٹھ روپیہ ماہوار اُن کا وظیفہ مقرر کیا گیا۔

اس کے سوا ایک اور اسکول شہر ہی میں ہے جو خاص ٹھاکروں اور سرداروں کی اولاد کے لیے مخصوص ہے۔ اس مدرسہ کی حالت ابھی تک کچھ اچھی نہیں ہے۔

علاقہ الور کے دیہاتی مدارس کی ٹھیک تعداد ہم کو یاد نہیں رہی۔ لیکن غالباً سو سے زیادہ اور ڈیڑھ سو سے کم ہے۔

چودہ مدرسے زنانے بھی ہیں جن میں ہندو مسلمان دونوں قوموں کی لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آرام طلبی اور سستی اور کاہلی جو ہندوستانی رئیسوں کی شرافت میں داخل ہے وہ مہاراجہ کے مزاج میں بالکل نہیں ہے اور سادگی اور بے تکلفی ایسی ہے کہ اہل یورپ میں بھی اس قدر نہیں دیکھی گئی۔ البتہ شکار کا شوق جس قدر ہونا چاہیے اُس سے کسی قدر زیادہ ہے باقی تعیش، لہو ولعب اور مسکرات سے جہاں تک ہم نے سنا ہے بکلّی

نفرت ہے اور یہ تمام باتیں بشرطیکہ استقلال کے ساتھ ہمیشہ قائم رہیں ایسی جو انسانی ترقی کی اصل اصول ہیں۔

ہم جناب ماسٹر سری رام صاحب کے جو مہاراجہ کے پرائیویٹ سکریٹری ہیں اور جناب ماسٹر گنج بہاری لال صاحب ہیڈ ماسٹر ہائی اسکول الور کے دل سے شکر گذار ہیں جن کی عنایت سے ہم نے الور کی خاطر خواہ سیر کی۔

پانچ روز الو میں ٹھہر کر ہم رمضان کی انتیسویں تاریخ دن کی ریل میں الور سے روانہ ہوئے اور شام کو دلّی میں پہنچ گئے۔

اخبار نویسی اور اُس کے فرائض

(از اخبار ''رفیق ہند'' بابت اکتوبر ۱۸۹۲ء)

ایک شخص نے گدھوں کے سوداگر سے جا کر کہا کہ

''مجھ کو ایک ایسا گدھا مطلوب ہے جو نہ زیادہ چھوٹے قد کا ہو نہ بہت بڑے قد کا جب رستہ صاف ہو تو اُچھلتا کودتا چلے اور جب راستے میں بھیڑ ہو تو آہستہ قدم اٹھائے نہ دیوار و در سے اُڑتا چلے نہ گنجان درختوں میں سوار کو لے کر گھس جائے۔ اگر چارہ کم دیا جائے تو صبر کرے اور پیٹ بھراؤ دیا جائے تو شکر کرے۔ جب اس پر سوار ہوں تو چالاک بن جائے اور جب تھان پر باندھ دیں تو کان نہ ہلائے۔''

سوداگر نے جواب دیا: ''چند روز صبر کر۔ اگر خدا تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے قاضی شہر کو گدھا بنا دیا تو تیرا سوال پورا کر سکوں گا۔''

اگر آج کل کوئی کسی سے ایسا سوال کرے تو اُس کو قاضی کی جگہ اخبار نویس کا نام چاہیے۔ کیوں کہ قاضی میں صرف دو صفتیں ہونی ضرور ہیں۔

ا۔ اُس قانون کی واقفیت جس کی رو سے وہ فیصلے کرتا ہے۔

ب۔ انصاف

بخلاف اخبار نویس کے کہ اس میں اپنے فرائض کی بجا آوری کے لیے بے شمار لیاقتوں کی ضرورت ہے۔ ہمارے نزدیک کسی شخص کی نسبت یہ کہنا کہ ''وہ اخبار نویسی کی پوری لیاقت رکھتا ہے۔'' اس امر کو تسلیم کر لینا ہے کہ ''اس کی ذات میں ہر قسم کی لیاقت اور

فضیلت موجود ہے۔"

اخبار نویس قطع نظر اس کے کہ قوم کا ناصح، ملک کا وکیل اور گورنمنٹ کا مشیر ہوتا ہے۔ وہ ایک قسم کا تاجر بھی ہے جس کو کم از کم مصارف اخبار اور اپنے حوائج ضروریہ کے لیے اپنی محنت کا معاوضہ ملک سے وصول کرنا پڑتا ہے پس جس طرح آزادی، انصاف اور دیانت اُس کی ذات میں ہونی ضروری ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اُس کے اندازِ بیان اور طرزِ تحریر میں ایک قوتِ مقناطیسی ہونا بھی ضرور ہے جس سے وہ پبلک کے دلوں پر فتح حاصل کر سکے۔

مگر جہاں پبلک کے عام مذاق صحیح نہ ہوں، جہاں ظرافت اور مسخرگی اور استہزا واقعات اور حقائق سے زیادہ مرغوب ہوں، جہاں معزز اور شریف لوگوں پر پھبتیاں کہنا داخلِ حسنِ بیان سمجھا جائے، جہاں گورنمنٹ پر بے جا اور اندھا دھند نکتہ چینی کرنے کا نام "آزادی" رکھا جائے۔ وہاں باوجود آزادی و انصاف و دیانت کے پبلک کے دلوں کو مسخر کرنا قریب ناممکن کے معلوم ہوتا ہے۔

ہندوستان کے دیسی اخباروں کی عام حالت گورنمنٹ کے نزدیک اور کیا ملک کے لائق آدمیوں کے نزدیک اب تک بہت بُری سمجھی جاتی ہے۔

لیکن جس طرح کسی بستی میں زیادہ تر بوسیدہ اور شکستہ مکانوں اور کھنڈروں کا ہونا اُس بستی کے افلاس پر دلالت کرتا ہے یا کسی ملک کی شاعری میں زیادہ تر ہزل اور جھوٹ اور بے تہذیبی کا پایا جانا اُس ملک کے مذاق فاسد پر گواہی دیتا ہے اسی طرح اخباروں کا بُری حالت میں ہونا اخبار نویسوں کی بے سلیقگی کی نسبت زیادہ تر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ پبلک کا مذاق صحیح نہیں ہے۔

بااینہمہ اخبار نویسوں کو معذور نہیں سمجھا جا سکتا۔ کیوں کہ اُن کا پہلا فرض یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنی جادو بیانی سے پبلک کے مذاق کو اگر وہ فاسد ہے تو صحیح اور اگر صحیح ہے تو اعلیٰ درجے کا صحیح بنا دیں۔

اخبار کے پست حالت میں رہنے کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں یا تو یہ کہ اڈیٹر میں

اخبار چلانے کی لیاقت نہیں ہے بلکہ اُس نے صرف یہ دیکھ کر کہ بہت سے لوگ اخبار کے ذریعے سے آسودگی کے ساتھ بسر کرتے ہیں، اخبار کو محض ایک حیلۂ معاش سمجھ کر جاری کرلیا ہے۔

یا یہ کہ اڈیٹر میں کافی لیاقت موجود ہے مگر چوں کہ پبلک کا مذاق صحیح نہیں ہے اس لیے وہ اپنی اصلی لیاقت کو کام میں نہیں لاتا بلکہ زمانے کے تیور دیکھتا رہتا ہے کہ لوگ کس بات کو پسند کرتے ہیں اور کس بات کو ناپسند اور جو طریقہ اُن کے مذاق کے موافق ہوتا ہے اس کو اختیار کرلیتا ہے

پہلی صورت میں سوا اس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح ایک بدآواز موذن کو کچھ دے کر کے اذان سے روکا گیا تھا، اسی طرح ایسے اڈیٹروں کے لیے لوگ چندہ کرکے کچھ تنخواہ اس شرط پر مقرر کردیں کہ وہ مہربانی کرکے کبھی اخبار نہ نکالیں۔ کیوں کہ انھوں نے اپنی طاقت کے اندازہ کرنے میں دھوکہ کھایا ہے اور اپنے لیے پیشہ انتخاب کرنے میں ویسی ہی غلطی کی ہے جیسے کوّے نے ہنس کی چال چلنے میں کی تھی۔

لیکن دوسری ضرورت میں اڈیٹر سخت الزام کے قابل ہیں وہ باوجودیکہ قوم کے ناصح ہیں مگر اس کو گمراہ کرتے ہیں اور طبیب ہوکر لوگوں کو مہلک دوا دیتے ہیں۔ اُن کی مثال اُس طبیب کی سی ہے جو بیماروں کو دوا اور پرہیز اُن کی مرضی کے موافق بتاتا ہے اور اُن کو خوش رکھنا چاہتا ہے نہ کہ تندرست کرنا۔

اس قسم کے اڈیٹروں کو (جن کی تعداد ملک میں بہ کثرت ہے خوب یاد رکھنا چاہیے کہ معزز کاموں کا صلہ روپیہ اور دولت نہیں ہے۔ دیکھو ایک گویّا جو اچھی طرح گاتا ہے، ایک تماشا گر جو عمدہ تماشا دکھاتا ہے، ایک خدمت گار جو ہوشیاری اور سلیقہ سے کام کرتا ہے، ایک طوائف جو دل فریب طریقے سے گاتی ناچتی ہے، ایک مسخرہ جو اپنے مسخرے پن سے امیروں کو خوش کرتا ہے یہ اور اس قسم کے تمام لوگ روپیہ کمانے میں علما، حکما اور اہل کمال سے بالعموم اچھے رہتے ہیں۔ پس اڈیٹر جو ملک کا وکیل اور گورنمنٹ کا مشیر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اگر وہ بھی صرف روپیہ کمانے کے لیے اپنے اخبار کو پبلک کے مذاق فاسد کا تابع رکھنا چاہتا

ہے تو وہ بھی مذکورہ بالا اشخاص سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

یہ سچ ہے کہ ہمارے ملک میں جو اشخاص اخبار نویسی کے فرائض پورے پورے ادا کرنے چاہے اس کو اول اول کسی قدر مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن یاد رہے کہ سچی عزت جڑ کی طرح اندر ہی اندر پھیلتی ہے اور جھوٹی عزت پھولوں کی طرح جلد مرجھا کر خاک میں مل جاتی ہے۔ سچی عزت نیکی کا سایہ ہے جب تک نیکی باقی ہے عزت اُس کے ساتھ ہے۔ جو لوگ اول قدم پر مقبول اور ہر دلعزیز ہونا چاہتے ہیں وہ کبھی مقبول اور ہر دلعزیز نہ ہوں گے۔ جن کاموں سے جلد فائدہ حاصل کرنے کی آرزو کی جاتی ہے اُن کے فائدے قلیل اور ناپائدار ہوتے ہیں مگر جو کام صبر اور استقلال کے ساتھ کیے جاتے ہیں اُن سے آخر کار وہ نتائج حاصل ہوتے ہیں جو کبھی وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ کسی حکیم کا قول ہے کہ ''قسمت جلد بازوں سے چیزوں کی قیمت ٹھوک بجا کر لیتی ہے مگر صبر کرنے والوں کو مفت دیتی ہے۔''

جو لوگ اخبار نویسی کی عمدہ لیاقت رکھتے ہیں وہ ہندوستان کے دیسی اخباروں میں بہت آسانی سے فوقیت اور امتیاز حاصل کر سکتے ہیں۔ بخلاف انگلستان کے کہ وہاں سب سے اعلیٰ افضل اخبار نکالنا بظاہر ہر امکان سے خارج معلوم ہوتا ہے۔ ایک ایسے شخص کے لیے جو اڈیٹر کی عمدہ لیاقت رکھتا ہو ہندوستان کے عام اخباروں کا پست حالت میں ہونا بہت نیک فال ہے۔ مثل مشہور ہے کہ ''جہاں کوئی برا نہ ہو وہاں اچھا کوئی نہیں ہوسکتا۔'' بخلاف اس کے جہاں بُرے ہی بُرے ہوں یا بُرے اچھوں سے زیادہ ہوں وہاں اچھا بن جانا بہت آسان ہے۔ اسپارٹا والے سب بہادر تھے اس لیے وہاں کسی کی بہادری کی تعریف نہ ہوتی تھی لیکن اگر بنگالی شخص سپہ گری کے فن میں کمال بہم پہنچائے تو وہ تمام قوم میں سر برآوردہ ہوسکتا ہے۔

ایک لائق اخبار نویس کے فرائض

اگر ہندوستان میں کوئی شخص اخبار نویسی کے فن میں اصلی اور حقیقی ترقی کرنی چاہے تو:-

اپنی جنرل انفورمیشن (معلوماتِ عامہ) کو وسعت دے۔

اپنی طرزِ تحریر میں اعتدال پیدا کرے۔
مدح وستائش میں مبالغہ کو کام نہ فرمائے۔
نکتہ چینی میں خیر خواہی اور سنجیدگی کو ہاتھ سے نہ دے۔
جب تک کسی معاملے کے تمام پہلو اُس کی نظر میں نہ ہوں تب تک اُس پر رائے دینے میں جرأت اور جلدی نہ کرے۔
جب تب خبر کسی معتبر ذریعے سے نہ پہنچے اُس وقت تک اُسے شائع نہ کرے۔
ظرافت قدرِ ضرورت سے زیادہ کام میں نہ لائے۔
مُلّایانہ اور طالب علمانہ بحثوں میں نہ پڑے۔
مذہبی مباحث میں نہایت ضرورت کے بغیر دخل نہ دے۔
ملک میں جو اچھے کام کرتے ہیں ان کو چمکائے اور جن سے کوئی بُرا کام سرزد ہو اُن سے تابہ مقدور چشم پوشی کرے۔
جن کی برائیوں سے ملک یا سوسائٹی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو اُن پر آزادانہ گرفت کرے۔
تحریر میں سادگی، متانت اور جامعیت اختیار کرے۔
کارسپانڈنٹوں (نامہ نگاروں) کی دل آزار تحریروں سے جو اُن کی ذاتی اغراض بنی ہوں اپنے اخبار کو پاک رکھے۔
اخبار کی کتابت، چھپائی اور صحت کا نہایت کوشش اور توجہ سے خیال رکھے۔
اس امر کا خاص اہتمام رکھے کہ اخبار بالکل تاریخ معین اور وقت مقرر پر شائع ہوا کرے۔
گورنمنٹ اور حکام کی نسبت جو کچھ لکھے اس میں ادب اور تعظیم کو نصب العین رکھے۔ غرض کہ کوئی فرض اپنے فرائض میں سے تابہ مقدور فروگزاشتہ نہ کرے اور کوئی بات اپنے کانشنس (ضمیر) اور انصاف ودیانت اور آزادی کے برخلاف نہ لکھے۔
ایسا شخص جو ان تمام باتوں پر جو بیان ہوئیں پورے طور پر عمل پیرا ہو اُس کی نسبت

اُمید کی جاسکتی ہے کہ وہ کبھی نہ کبھی اپنے ہمعصروں اور ہم پیشہ اشخاص میں ممتاز ہوگا۔

جو مختصر فرائض ہم نے اخبار نویسی کے اوپر بیان کیے شاید کوئی یہ سمجھے کہ اتنے فرائض ایک اکیلے آدمی سے کیوں کر ادا ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان سب کا اصل اصول راستی اور سچائی ہے اور یہ ایسا صاف، سیدھا، پُرامن اور بے خطر رستہ ہے جو نہایت آسانی سے بے زحمت و مشقت طے ہوتا ہے اور کبھی منزلِ مقصود پر پہنچانے میں خطا نہیں کرتا۔ جس طرح ایک جھوٹ کے ترک کرنے سے تمام گناہ خود بخود ترک ہو جاتے ہیں اسی طرح کسی پیشہ میں راست بازی اور سچائی اختیار کرنے سے اُس پیشہ کے تمام فرائض خود بخود ادا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ راستی ایک سیدھی راہ ہے جس پر راہ گیر آنکھ بند کرکے چل سکتا اور منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔ لیکن جہاں اس سے بہکا پھر جتنا آگے بڑھتا جائے گا اتنا ہی منزل سے دور ہوتا جائے گا۔

موت کے یقین سے ہم کو کیا سبق لینا چاہیے

(از ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' بابت ۱۸۹۳ء، صفحہ: ۹۲۲)

بے شک ہر شخص کو جس طرح اپنے ہونے کا یقین ہے اسی طرح اس بات کا بھی یقین ہے کہ ایک دن ہم نہ ہوں گے۔

مگر سوال یہ ہے کہ اس پچھلے یقین سے ہم کو کیا سبق لینا چاہیے؟

کیا یہ سبق کہ تمام دُنیا کو مع اپنی ہستی کے ناپائدار سمجھ کر جیتے جی مر جائیں اور خاک ہونے پہلے خاک ہو جائیں۔

یا یہ نصیحت کہ اس ناگزیر وقت کے آنے سے پہلے جس قدر مہلت ملے اس کو غنیمت سمجھ کر کچھ ہاتھ پاؤں ہلائیں اور خدا کی اس نعمت عظمیٰ سے جہاں تک ہو سکے آپ بھی فائدہ اٹھائیں اپنے ہم جنسوں کو بھی فائدہ پہنچائیں۔

ا۔ صوفیاء اور صوفی منش شعراء کا بیان

''دُنیا گذشتنی اور گزاشتنی ہے''

صوفیا اور شعرائے متصوفین نے پہلی بات پر حد سے زیادہ زور دیا ہے اور درحقیقت ایک ایسی شق اختیار کی ہے جس کو خواہی نخواہی ماننا پڑتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:-

''دُنیا اور دُنیا کے سب کام ہیچ ہیں۔ بادشاہ اور فقیر، محل اور جھونپڑے سب گزشتنی اور گزاشتنی ہیں۔ دُنیا ایک رہ گذر ہے اور ہم سب اُس کے رہ گذری ہیں۔ مسافر کو چاہیے کہ ہر وقت منزل سے لو لگائے رکھے اور رستہ کی

دل فریب فضا کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے۔ جب سرے سے دُنیا ہی ہیچ ور ہیچ ہے تو دُنیا سے دل لگانا کیسا؟ اور دنیوی ترقیات کے لیے دوڑ دھوپ کرنی کیسی؟ ایک بلند نظر سوداگر اپنے دل میں طرح طرح کے منصوبے باندھتا ہے کہ ہندوستان سے نیل اور روئی بھر کر یورپ کو لے جاؤں گا اور وہاں سے کپڑا اور شیشہ کی چیزیں لے کر پھر ایشیا میں آؤں گا۔ ایران سے قالین خریدوں گا اور چین میں جا کر بیچوں گا۔ چین سے چاء بھروں گا اور عرب میں جا کر فروخت کروں گا۔ پھر وہاں سے مغرب میں جاؤں گا اور مغرب سے پھر مشرق چلا آؤں گا لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ ابھی ایک سفر بھی پورا نہیں کر چکتا کہ موت کا پیغام آن پہنچتا ہے اور اس کے تمام منصوبوں کو خاک میں ملا دیتا ہے۔ جب کہ دُنیا اور دُنیا کی ہر ایک چیز ناپائدار ہے تو انسان کو چاہیے کہ ہر دم مرنے کے لیے تیار رہے اور اس تمام نمودِ بے بود کو ایک خواب کی سی نمائش یا سراب کا سا دھوکہ سمجھے۔ مال و دولت، زن و فرزند، باغ اور زمین سب چیزوں سے دست بردار ہو کر زادِ آخرت کی فکر کرے اور بہ قدرِ سدِّ رمق کھانے اور پہننے کے سوا دُنیا کی کسی چیز کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔''

بڑے بڑے حکیموں اور عارفوں نے اس امر پر اس قدر دلائل اور براہین قائم کی ہیں کہ حصر اور شمار سے باہر ہیں اور صوفی منش شاعروں کو یہ ایک ایسا دلچسپ مضمون ہاتھ لگا ہے کہ انھوں نے ایسی شاعری کی بنیاد زیادہ تر اسی پر قائم کی ہے۔

مگر افسوس ہے کہ یہ نصیحت جیسی دلکش اور دل فریب ہے ویسی قابل عمل نہیں۔

اگر بفرضِ محال تمام انسان اس نصیحت پر کار بند ہوں تو دُنیا بالکل اُجڑ جائے اور دُنیا کے سارے کاروبار درہم برہم ہو جائیں۔ شجاعت اور ہمت، عقل اور تدبیر اور جفاکشی، عدالت اور سیاست غرض کہ وہ سب صفتیں جو انسان کو انتظام معاش کے لیے عطا ہوئی ہیں یک قلم معطل اور بے کار ہو جائیں اور انسان کے لیے کوئی استحقاق خلیفۃ

اللہ بننے کا باقی نہ رہے۔

۲۔ حکما اور فلاسفروں کے خیالات

موت کا یقین ہمیں کیوں دیا گیا؟

پس ظاہر ہے کہ موت کا یقین ہم کو اس لیے نہیں دیا گیا کہ ہر وقت دُنیا کی بے ثباتی اور ناپائداری کے خیال میں مستغرق رہ کر زندگی سے دل سرد کر لیں اور تمام تعلقات سے بالکل دست بردار ہو جائیں۔ موت کے انتظار میں دولتِ حیات کے فائدوں سے محروم رہیں اور جو انسانیت سے جو خدا کا بے بہا عطیہ ہے جیتے جی ہاتھ دھو کر بیٹھ رہیں۔ بلکہ اس لیے دیا گیا ہے کہ اس فانی زندگی کو غنیمت جانیں اور دُنیا کو مزرعۂ آخرت سمجھ کر وہاں کے لیے جو کچھ بن آئے سو کریں اور یہ سمجھیں کہ شہر پر غنیم کی فوج دھاوا کرنے والی ہے۔ تھوڑی سی دیر میں بیٹا باپ اور باپ بیٹے سے اور بھائی بھائی سے جدا ہوا چاہتا ہے۔ گھر میں اسباب نقد و جنس جو کچھ ہے کوئی دم میں تاخت و تاراج ہونے والا ہے۔ لوگ اونٹ اور چھکڑوں پر اثاث البیت لاد لاد کر جہاں کہیں محفوظ جگہ سنتے ہیں چلے جاتے ہیں کوئی قرض داروں سے اپنا قرضہ وصول کر رہا ہے تا کہ بھاگڑ کے وقت رستہ کا سہارا ہو جائے کوئی زیور اور روپیہ زمین میں دفن کر رہا ہے تا کہ شاید غارت گروں کی دست بُرد سے بچ جائے۔ اسی طرح ہر شخص اپنے اپنے کام میں مصروف ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ ایسے نازک وقت میں ذرا بھی غفلت ہوئی تو بچاؤ کی کوئی صورت باقی نہ رہے گی، جان اور مال دونوں خطرے میں پڑ جائیں گے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ ''ہم نے موت اور زندگی کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ دیکھیں کون اچھے کام کرتا ہے؟'' اگر موت اس لیے پیدا ہوتی کہ سب کے دل دُنیا اور مافیہا سے سرد ہو جائیں تو یوں ارشاد نہ ہوتا بلکہ یوں ہوتا کہ ''دیکھیں کون دُنیا کے کاروبار چھوڑ کر الگ ہو جاتا ہے۔''

آنحضرت صلعم فرماتے ہیں کہ ''دُنیا میں ایسے ہو جیسے غریب الوطن یا راہ رو۔'' اس

سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہر وقت ہوشیار اور اپنے کام میں سرگرم رہنا چاہیے کیوں کہ مقیم کی نسبت پردیسی یا راہ گیر زیادہ خبردار اور چوکنا رہتا ہے۔

اچھے کاموں سے جن کی تحریک کے لیے موت کا کھٹا لگایا گیا ہے صرف حقوق الٰہی مثلاً نماز، روزہ، حج، عمرہ اور طواف وغیرہ ہی مراد نہیں ہیں بلکہ حقوقِ عباد اُن سے زیادہ ضروری اور اہم ہیں۔

ہر درجہ کے آدمیوں کے فرائض مختلف ہوتے ہیں۔

ہر فرقہ اور ہر گروہ کو اُس کے مرتبے اور درجے کے موافق تکلیف دی گئی ہے جس پر اُن سے باز پرس کی جائے گی۔

انبیاء پر نماز اور روزہ کی ایسی تاکید نہیں کی گئی جیسی تبلیغ رسالتؐ کے باب میں کی گئی ہے۔

بادشاہوں اور حاکموں کے لیے عدل اور مخلوق کی فریادرسی کو سب عبادتوں سے افضل قرار دیا گیا ہے۔

دولت مندوں کو سب سے زیادہ اس بات کی تاکید ہے کہ اپنے تہیدست اور بے سرمایہ ہم جنسوں کی مدد کریں۔

علماء کا بڑا فرض یہ ہے کہ بنی نوع میں سے جہالت کو دور کریں اور جاہلوں کو راست راہ دکھائیں۔

اطبا کا بڑا فرض یہ ہے کہ بیماروں کی خبر لیں۔

عیال داروں کا سب سے زیادہ ضروری کام یہ ہے کہ وجہ حلال سے کمائی کر کے اپنے عیال کی ضروریات کو رفع کریں۔

پس دُنیا میں جو کام ہو رہے ہیں صنعت ہو یا تجارت، نوکری ہو یا حرفہ، جہاز رانی ہو یا قلبہ رانی، غرض تمام کام بشرطیکہ قانونِ عقل اور قانونِ شریعت سے متجاوز نہ ہوں گو بظاہر دُنیا کے حقیر اور فانی کام سمجھیں جائیں مگر درحقیقت وہ ایسے ضروری فرائض ہیں کہ جب تک

انسان انسان ہے کسی طرح اُن سے سبکدوش نہیں ہوسکتا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ موت کا کھٹکا اس لیے لگایا گیا ہے کہ ہر فرقہ اور ہر جماعت اپنے اپنے فرائض مستعدی اور سرگرمی سے سرانجام کرنے میں مصروف رہی۔

رباعی

دم لینے کی فرصت کوئی کب پاتا ہے
آتا ہے اگر آج تو کل جاتا ہے
جو کرنے ہیں کام اُن کو جلدی بھگتاؤ
طلبی کا پیام وہ چلا آتا ہے

دُنیا کی کَل علم سے چلتی ہے یا عمل سے؟

(از رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جلد:۱، نمبر:۱، بابت یکم شوال ۱۳۱۱ھ صفحہ: ۵ تا ۸)

یہاں علم سے ہماری مراد مجرد علم ہے جو عمل سے بالکل خالی ہو۔ اور عمل سے مراد محض عمل ہے جس میں علم کو کچھ دخل نہ ہو۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ دُنیا کی کل علم سے چلتی ہے یا عمل سے؟

اگر ہم کو یہ بات دریافت کرنا ہو کہ چراغ کی بتی کا اشتعال اوکسیجن سے قائم رہتا ہے یا ہائیڈروجن سے یا دونوں سے، تو ہم کو چاہیے کہ ایک دفعہ بتی کو محض اوکسیجن میں اور دوسری دفعہ ہائیڈروجن میں رکھ کر دیکھیں۔ اگر دونوں میں بُجھ جائے تو سمجھنا چاہیے کہ ہوا کے دونوں جزوں کو اُس کے اشتعال میں دخل ہے اور اگر ہائیڈروجن میں بجھ جائے اور اوکسیجن میں نہ بجھے تو جاننا چاہیے کہ اس کے اشتعال کا باعث محض اوکسیجن ہے نہ ہائیڈروجن۔

اسی طرح اگر ہم یہ دیکھنا چاہیں کہ دُنیا کی کل علم سے چلتی ہے یا عمل سے تو ہم کو چاہیے کہ اول ایک ایسا ملک فرض کریں جس میں اہل علم و اہل نظر کے سوا کوئی کام کرنے والا اور ہاتھ پاؤں ہلانے والا نہ ہو اور پھر دیکھیں کہ وہ ملک کتنے دن آباد رہتا ہے۔ پھر ایک دوسرا ملک فرض کریں جس میں اَن پڑھ محنتی مزدوروں کے سوا اہل علم کا نام و نشان نہ ہو اور پھر دیکھیں کہ وہ ملک آباد رہتا ہے یا نہیں۔

ہم اول ایک ایسا خطہ فرض کرتے ہیں جس کے باشندے جھڑاں عالم، فلسفی، ریاضی اول مصنف اور ریٹر (Orator) شاعر اور بڑے بڑے فاضل ہیں مگر اُن میں کوئی

خدا کا بندہ ایسا نظر نہیں آتا جو ان واجب التعظیم اپاہجوں کے کھانے پہننے اوڑھنے، رہنے سہنے اور لکھنے پڑھنے وغیرہ کا سامان مہیا کرے۔ اول تو کسی ملک میں بغیر کارکن جماعتوں کے ایسی آبادی کا وجود میں آنا ہی ناممکن ہے۔ لیکن اگر بغرض محال کسی خطہ میں ایسی ناشدنی کالونی چندروز کے لیے آباد ہو جائے تو اس کا انجام کیا ہوگا؟ ممکن ہے کہ بعض کو مطالعہ کے ذوق وشوق میں ایک آدھ روز بھوک پیاس نہ لگے۔ بعض کو کسی مشکل مسئلے کے حل ہو جانے کی خوشی میں ایک دو وقت کھانے کی کچھ پرواہ نہ رہے یا بعض کو کسی مضمون کی دھن میں کچھ دیر تک خورونوش کا خیال نہ آئے مگر بہت جلد وہ آپ کو ایک ایسی مخلوق پائیں گے جو بھوکی ہے مگر کوئی اُس کا رازق نہیں۔ ننگی ہے مگر کوئی اُس کا ستار نہیں۔ حاجت مند ہے مگر کوئی اُس کا قاضی الحاجات نہیں۔ اب یا تو انھیں خود اپنے اعلیٰ اور اشرف ہاتھوں سے وہ تمام حقیر اور ذلیل کام سرانجام کرنے پڑیں گے جو عوام کالانعام کو کرنے چاہئیں اور یا فوراً اُس ملک سے ہجرت کر کے کسی ایسے خطہ میں جا کر رہنا پڑے گا جہاں اُن کے لیے فرمانبردار بندے یا بندہ پرور خدا موجود ہو۔ دونوں حالتوں میں نتیجہ یہ نکلے گا کہ ''دُنیا کی کل محض علم سے نہیں چل سکتی۔''

اس کے بعد ہم ایک دوسرا ملک فرض کرتے ہیں جس کے تمام باشندے اَن پڑھ اور بے علم ہیں مگر محنتی، جفاکش اور اپنی ضروریات زندگی کے مہیا کرنے میں نہایت سرگرم ہیں۔ گو انھوں نے زراعت یا تجارت یا صنعت و دست کاری کے اصول کتابوں میں نہیں پڑھے مگر وہ اپنی تمام ضروریات جن پر انسان کی زندگی موقوف ہے خود مہیا کرتے ہیں۔ قدرتی خواہشیں اور نیچرل ضرورتیں اُن کو جس طرح سکھاتی گئیں اور متواتر تجربوں سے جس قدر اُن کی سمجھ بوجھ بڑھتی گئی وہ اپنے تمام کام برابر انجام کرتے رہے۔ بونا، جوتنا، بیج، بیوہار، صنعت اور دست کاری غرض کہ تمام اہم اور ضروری کام رفتہ رفتہ بقدر ضرورت انجام دینے لگے۔ اب اُن کی کوئی ضرورت بند نہیں رہتی اور کوئی کام ان کا نہیں رہتا۔ ایک اناج پیدا کر کے لاتا ہے، دوسرا پیستا ہے، تیسرا پکاتا ہے اور تینوں مل کر کھاتے ہیں۔ ایک کپاس بوتا ہے، دوسرا اُسے کاٹتا ہے، تیسرا بنتا ہے، چوتھا سیتا ہے اور چاروں مل کر پہنتے ہیں۔ اُن کو

چوری یا ڈکیتی کا مطلق خوف نہیں کیوں کہ اُن کے پاس اپنے ہاتھ پاؤں کی محنت کے سوا کوئی دولت نہیں۔ اُن کو غنیم کے حملہ کا کچھ ڈر نہیں کیوں کہ وہ اپنے ہاتھ پاؤں سے چوکس اور غنیم کے مقابلے کے لیے مستعد اور تیار ہیں۔ اُن میں کوئی بدکار اور بدچلن نہیں کیوں کہ اُن کو اپنے کام دھندوں میں بدکاری اور بدچلنی کی فرصت ہی نہیں۔ ان میں کوئی ردگی اور بیمار نہیں کیوں کہ ان میں کوئی طبیب اور ڈاکٹر نہیں۔ ان میں کوئی مذہبی تکرار نہیں کیوں کہ اُن میں کوئی واعظ یا ملا نہیں۔ ان میں کوئی پولیٹکل اختلاف نہیں کیوں کہ وہ سب کنسرویٹو (Conservative) ہیں۔ اُن میں کوئی عدالتی جھگڑا نہیں کیوں کہ اُن میں کوئی اور بیرسٹر نہیں۔ اُن میں اس کے سوا کوئی عیب نہیں کہ وہ سویلائزڈ (مہذب و تعلیم یافتہ) نہیں۔ اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ دُنیا کی کل عمل سے چلتی ہے نہ علم ہے۔

اب فرض کرو کہ اس ملک کے باشندوں کا میل جول کسی ایسے ملک والوں سے ہوگیا جن کے تمام کام علمی اصولوں پر مبنی ہیں۔ انھوں نے زراعت، تجارت، صنعت و دست کاری اور تمام جنگی اور ملکی مہمات میں علم ہی کو اپنا رہبر بنایا ہے۔ کیا معمار اور کیا بڑھئی، کیا لوہار اور کیا کمہار، کیا درزی اور کیا کفش دوز غرض کہ تمام پیشہ ور محض علم کی ہدایت سے اپنے تمام کام سرانجام کرتے ہیں۔

اس قسم کی باعلم و عمل قوم کے میل جول اور لین دین نے اس آباد ملک کے اَن پڑھ باشندوں کو سخت نقصان پہنچایا۔ اُن کی تجارت نے ان کے اخراجات زندگی حد سے زیادہ بڑھا دئے اُن کی صنعت کے مقابلے میں اِن کی صنعت ماند ہوگئی۔ اُن کی دست کاری نے اُن کی دست کاری کو اینڈ کر دیا۔ مگر ایک مدت تک ان کو اس بات کی مطلق خبر نہ ہوئی کہ ہمارے پیشہ ور کیوں بے کار ہوگئے؟ ہماری کمائیوں میں کیوں برکت نہ رہی؟ ہمارے اخراجات روز بروز کیوں بڑھتے جاتے ہیں؟ اور ہماری آمدنی ہمارے اخراجات کو کیوں مکتفی نہیں ہوتی؟

لیکن اُس غیر قوم سے جوں جوں میل جول بڑھتا گیا اُن کو اِن کی اور اِن کو اُن کی زبان سیکھنے کی ضرورت زیادہ ہوتی گئی۔ انھوں نے اول اُن کی زبان سیکھی پھر رفتہ رفتہ اُن

کے علم بھی سیکھنے لگے۔ جن علموں کے ذریعے سے انھوں نے ہر فن میں ترقی کی تھی وہ علم بھی انھوں نے حاصل کیے مگر سوائے رُٹ لینے کے کوئی عملی فائدہ اُن کے علموں سے نہ اٹھایا۔ وہ علم کو عمل کی غرض سے سیکھتے تھے، انھوں نے علم کو محض علم کے واسطے سیکھا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ علم آدمی کے لیے بنا ہے مگر یہ بمشکل ابھی یہیں تک پہنچے تھے کہ آدمی علم کے لیے بنا ہے۔ وہ علم سے خود بھی لذت اور فائدہ اُٹھاتے تھے اور اپنے ملک اور قوم کو بھی اُس کے فوائد پہنچاتے تھے۔ اِنھوں نے گونگے کی طرح گڑ کھایا اور کسی نے جانا کہ کھٹّا ہے یا میٹھا۔ وہ دُنیا کی مختلف زبانیں اس لیے سیکھتے تھے کہ تمام عالم میں پھرتے تھے، غیر ملکوں کے آدمیوں سے ملتے تھے، مختلف قوموں کے علوم وفنون سے آگاہی حاصل کرتے تھے اور اُن کو اپنی زبان میں نقل کرتے تھے۔ اِنھوں نے بھی اُن کی دیکھا دیکھی غیر ملکوں کی زبانیں اور غیر قوموں کی بولیاں سیکھیں، مگر نہ اس لیے کہ غیر ملکوں میں سفر کریں اور غیر قوموں کے علوم و فنون اپنی زبان میں منتقل کریں بلکہ اس لیے کہ طوطے کی طرح کہیں "حق اللہ پاک ذات اللہ" اور کہیں "ست گوردت داتا" بول اٹھیں۔ وہ لیمپ روشن کرنے کے لیے میز لکھنے کے لیے کرسی بیٹھنے کے لیے گھنٹہ وقت دیکھنے کے لیے اور فرش بچھانے کے لیے خریدتے تھے۔ انھوں نے اُن کی ریس سے یہ سب چیزیں فراہم تو کیں مگر نہ لیمپ کو جلایا۔ نہ میز پر لکھا، نہ کرسی پر بیٹھے، نہ گھنٹے میں وقت دیکھا اور نہ فرش کو بچھایا بلکہ کباڑی کی طرح سارا گھر اسباب سے بھر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ علم کے ذوق وشوق میں انھوں نے ہاتھ پاؤں ہلانے بالکل چھوڑ دئے اور علم کا ادب ان کو دُنیا کے ذلیل کاموں میں ہاتھ ڈالنے سے مانع ہوا۔ اب تاوقتیکہ وہ علم کو عمل کی غرض سے نہ پڑھیں اور اس سے عملی فائدے نہ اٹھائیں تب تک ممکن نہیں کہ اُن کی حالت درست ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ دُنیا کی کُل علم سے نہیں چلتی بلکہ عمل سے چلتی ہے۔

اس تمثیل سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ہم کو علم کی ضرورت نہیں۔ نہیں بلکہ ہم کو اس وقت علم کی نہایت ضرورت ہے اور ایسی ضرورت ہے جیسے پیاسے کو ٹھنڈے پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔

لیکن جس طرح ٹھنڈے پانی کی کلّیاں کرنے سے پیاس نہیں بجھتی بلکہ اور زیادہ بھڑک اُٹھتی ہے اسی طرح سطحیوں کی مانند کتابوں کے الفاظ اور علوم کی اصطلاحات یاد کرنے سے اور طوطے کی طرح علمی مسائل اور قواعد از بر کرنے سے کوئی شخص نہ آپ کو اور نہ ملک کو کوئی اصلی فائدہ نہیں پہنچا سکتا بلکہ اندیشہ ہے ایسے لوگ ملک کے حق میں مضر ثابت نہ ہوں۔

جس علم کی ہم کو ضرورت ہے۔ ''وہ'' وہ علم ہے جو ہماری ساکن اور پژمردہ قوتوں کو متحرک اور شگفتہ وشاداب کرے، نہ کہ وہ علم جو ہمارے متحرک اور شگفتہ قویٰ کو بھی ساکن اور پژمردہ کردے۔ ایسے علم سے بے علمی سو درجے بہتر ہے۔ بقول شخصی کہ ''بخشو بی بلّی چوہا لنڈورا ہی جئے گا۔''

ہم جیتے ہیں یا مَر گئے؟

(از رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جلد:۱، نمبر:۳، بابتہ یکم ذی الحجہ ۱۳۱۱ھ، صفحہ:۴۸ تا ۵۲)

عربی میں ایک مشہور مقولہ ہے کہ ''**العمل من شان الاحیاء والبطالة من شان الاموات.**''

یعنی'' کام کرنا زندوں کو شایاں ہے اور بے کار رہنا مُردوں کو۔'' اس قوم کے موافق ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہماری قوم میں کچھ جان باقی ہے یا نہیں؟ سچ یہ ہے کہ اگر مستثنیٰ مثالوں سے قطع نظر کی جائے تو نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری قوم میں کچھ جان باقی نہیں رہی اور بے اختیار یہ شعر زبان پر آتا ہے۔

اَیّتُھَا النّفسُ اَجمِلِی جَزَعَا　　اَنّ الّذینُ تجذرِینَ قَدُ و قعَا[1]

اِس بات کے بیان کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے کہ ہر قوم کی ترقی کا مدار صرف اس بات پر ہے کہ اُس کے افراد میں عموماً مستعدی، محنت اور استقلال کے ساتھ کام کرنے کی عادت پائی جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کسی خاندان بلکہ کسی قوم میں اگر ایک شخص بھی ایسا پیدا ہو جاتا ہے۔ جس میں یہ صفات موجود ہوں تو اس کی ذات سے تمام خاندان بلکہ تمام قوم کو فائدہ پہنچتا ہے۔ پس جس قوم کے افراد میں عموماً یہ خصلتیں پائی جائیں گی ممکن نہیں کہ وہ قوم اپنی بساط کے موافق ترقی میں کوئی ممتاز درجہ حاصل نہ کرے۔ لیکن جہاں تک کہ ہم اپنی قوم کی حالت پر غور کرتے ہیں اُس میں چاروں طرف ہم کو ایک سناٹا نظر آتا ہے اور وہ اسلام جو بحرِ قلزم کی طرح موجیں مارتا ہوا اُٹھا تھا آج بحرِ منجمد کی طرح ساکن اور بے حس اور

---

[1] یعنی اے دل اپنی بے قراری کو کم کر (کیوں کہ) جس بات کا تجھ کو ڈر تھا وہ تو ہو چکی۔

بے حرکت معلوم ہوتا ہے۔

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم　　　اب ہوئے خاک، انتہا ہے یہ

ترقی کی پہلی سیڑھی اپنے تنزل کا یقین ہے اور امن و آزادی ترقی کے دو بڑے معاون ہیں۔

ہم کو اپنے تنزل کا پختہ یقین ہو گیا ہے۔

امن و آزادی جو برٹش حکومت کی بدولت ہم کو اس زمانے میں حاصل ہے وہ کسی عہد اور کسی دور میں ہندوستان کو نصیب نہیں ہوئی۔

ترقی کے نمونے بھی اپنے ہم وطنوں میں ہم رات دن اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔

ترقی کی قابلیت بھی ہم میں اُسی قدر ہے یا ہونی چاہیے جس قدر کہ ہندوستان کی اعلیٰ سے اعلیٰ قوم کو قدرت نے عطا کی ہے۔

باوجود ان تمام باتوں کے ہم دیکھتے ہیں کہ ترقی کی روح ہم میں اب تک پیدا نہیں ہوئی۔

ہم خوب جانتے ہیں کہ ہم کو کچھ کرنا چاہیے لیکن کچھ کرتے نہیں۔

ہم کو بھوک شدت سے لگی ہوئی ہے مگر چاہتے ہیں کہ کہیں سے پکا پکا یا ہاتھ لگ جائے تو کھالیں۔

ہم پیاس کے مارے مرے جاتے ہیں مگر منتظر ہیں کہ کوئی خدا کا بندہ ہمارے حلق میں آ کر پانی چوا جائے۔

ہم توکل کو اس لیے ضروری نہیں سمجھتے کہ اس میں خدا پر بھروسا کرنا ہوتا ہے بلکہ اس لیے کہ توکل کی بدولت ہم کو ہاتھ پاؤں ہلانے نہیں پڑتے۔

ہم تدبیر کو اس لیے بے سود خیال نہیں کرتے کہ وہ تقدیر الٰہی کا مقابلہ نہیں کر سکتی بلکہ اس لیے کہ تقدیر کے حیلے سے ہم کو کچھ کرنا نہیں پڑتا۔

ہم دُنیا اور دُنیا کے کاموں کو اکثر فانی اور حقیر بتاتے ہیں مگر نہ اس لیے کہ فی الحقیقت ہم دُنیا کو ایسا ہی سمجھتے ہیں بلکہ صرف اس لیے کہ ہم کو ہاتھ پاؤں ہلانے نہ پڑیں۔

ہم اُس حیلہ جو لومڑی کی طرح انگور کے خوشوں سے اس لیے ناک نہیں چڑھاتے کہ اُن کو کھٹّا سمجھتے ہیں بلکہ اس لیے اُن کے توڑنے میں ہم کو دقت معلوم ہوتی ہے۔

ہم کہتے سب کچھ ہیں مگر کرتے نہیں۔ ہماری حالت ہم کو جھٹلاتی ہے اور ہمارے افعال ہمارے قول کی تکذیب کرتے ہیں۔

ہم قدریہ اور جبریہ دونوں فرقوں کو گمراہ بتاتے ہیں مگر ہم قدری بھی ہیں اور جبری بھی۔ ہمارے دعوے قدریوں کے سے ہیں اور ہمارے کام جبریوں جیسے ہماری زبان قدری ہے اور ہمارا دل جبری۔

مسلمانوں میں قوت عملی کی فقدان اور اس کی چند مثالیں

اگرچہ ہم میں لائق آدمیوں کا قحط ہے تاہم کم وبیش مصنف لکچرار اور شاعر ہم میں موجود ہیں۔ ہمارے مصنّفین کو یہ شکایت ہے کہ پڑھنے والوں میں قوت منفعلہ نہیں اور پڑھنے والوں کو یہ شکایت ہے کہ مصنفوں میں قوت فاعلہ نہیں۔ ہمارے اسپیکر اور لکچرار جب کچھ بولتے ہیں تو بعض اوقات اُن میں قومی جوش کسی طرح کم نہیں معلوم ہوتا، ہمارے شاعر جب کچھ پڑھتے ہیں تو قومی ہمدردی اُن کے ایک ایک لفظ سے ٹپکتی ہے مگر فی الحقیقت اُن کے کلام میں اور فونوگراف کی آواز میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ گویا ایک ہوا بھری ہوئی تھی جب وہ نکل گئی تو اب بالکل خالی ہیں۔

ہماری قوم میں انگریزی تعلیم (جو پریکٹکل آدمی [عملی یعنی کام کرنے والے اشخاص] پیدا کرنے کا دعویٰ کرتی ہے) چشم بددور روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور تعلیم یافتہ اصحاب کی تعداد میں ہر سال معقول اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ مستثنیٰ صورتوں کے سوا عملی قوت اور سلف ہیلپ (اپنی مدد آپ کرنا) کا مادّہ ان میں تعلیم کے بعد اتنا بھی باقی نہیں رہتا جتنا کہ مدرسہ میں داخل ہوتے وقت وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔

ان میں سے ایک گروہ وہ ہے جس کی بڑی دوڑ بی اے یا ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد یہ ہے کہ مڈل پاس کیے ہوئے طلبہ کی طرح سرکاری نوکری کے لیے اِدھر

اُدھر سلسلہ جنبانی کرتا پھرے اور ذریعوں اور سفارشوں کی تلاش میں ایک مدت تک سرگردان و پریشان رہیں۔ ان کو اپنے دست و بازو پر اتنا بھی بھروسا نہیں ہوتا جتنا کہ چرندوں اور پرندوں کو اپنی قوتِ لایموت کی تلاش میں ہوتا ہے۔ وہ وجہ معاش کو غلامی یعنی نوکری ہی میں منحصر جانتے ہیں۔ اُن میں اور ایک غریب اورینٹل اسکالر (عربی یا فارسی کے عالم) میں صرف اتنا ہی فرق ہوتا ہے کہ انھوں نے زمانے کی ضرورت کے موافق باقاعدہ غلامی کا پیشہ سیکھا ہے اور اس بے چارہ نے نہیں سیکھا۔ ان میں سے جن کو سرکاری نوکری مل جاتی ہے اُن کو چارناچار کتاب بالائے طاق رکھنی پڑتی ہے اور لکھنے پڑھنے سے ہمیشہ کے لیے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ اُن کی مثال بعینہٖ اُس بدقسمت عربی گھوڑے کی سی ہے جس کو گھوڑ دوڑ کے لیے تیار کیا گیا ہو اور پھر بجائے گھوڑ دوڑ کے چھکڑے یا ہل میں جوتا گیا ہو۔

مگر وہ عالی ہمت گریجویٹ جو نوکری کو پسند نہیں کرتے یا نوکری اُن کو پسند نہیں کرتی ان کا حال پہلوں سے بھی کیا گذرا ہے۔ اگر وہ چھکڑے یا ہل میں جوت دیے جاتے تو کچھ کام بھی آتے، لیکن اب وہ کسی کام کے نہیں۔ اُن کی کوششیں اکثر بے مصرف ہوتی ہیں، جن سے نہ ان کو اور نہ کسی اور کو کچھ فائدہ پہنچتا ہے۔ اُن کو رومن ایمپائر (سلطنت روم) کی تمام ہسٹری اور اُس کے تنزل کے اسباب ازبر ہوتے ہیں مگر اپنی ہستی کی مطلق خبر نہیں ہوتی۔ وہ یورپ کے مصنفوں، موجدوں اور رفارمروں کے کام نہایت فخر کے ساتھ بیان کرتے ہیں لیکن سوائے اس کے کہ ان کے کارنامے بیان کرکے اپنی واقفیت کی داد چاہیں خود کچھ نہیں کرتے اور نہ کرسکتے ہیں۔ وہ ہندوستانیوں کے حقوق جو گورنمنٹ کے ذمہ ہیں کمالِ ادب سے بیان کرتے ہیں مگر اُن کے، اُن کے خاندان کے اور اُن کی قوم کے حقوق جو خود اُن کے ذمہ ہیں اُن پر کبھی غور نہیں کرتے۔ وہ گورنمنٹ کے انتظام پر نکتہ چینی کرنے میں آندھی ہیں مگر اپنے گھر کے انتظام سے محض بے پروا۔

ہمارے بہت سے نوجوان ولایت سے تعلیم پاکر آئے ہیں اور اُس پارس کی پتھری کو چھو آئے ہیں جو مِس کو طلا کر دیتی ہے۔ وہ اپنی عمر کا ایک عمدہ حصہ اُس قوم میں بسر کر آئے ہیں جو حبِّ وطن اور قومی ہمدردی کو اپنا دین وایمان سمجھتی ہے۔ انھوں نے برسوں اس

ملک کی ہوا کھائی ہے جہاں انسان علم وعمل کے سایہ میں پرورش پاتا ہے مگر جب وہ مع الخیر ہندوستان میں پہنچتے ہیں تو اکثر کی حالت بعینہٖ اس شعر کی مصداق ہوتی ہے ؎

مکّہ گیا، مدینہ گیا، کربلا گیا　　جیسا گیا تھا ویسا ہی چل پھر کے آ گیا

حبِّ وطن اور قومی ہمدردی اُن میں اتنی بھی باقی نہیں رہتی جتنی کہ وہ یہاں سے اپنے ساتھ لے کر جہاز میں سوار ہوئے تھے۔ قوم سے ان کو نفرت ہو جاتی ہے اور ہندوستانی سوسائٹی میں شریک ہونے سے اُن کو شرم آنے لگی ہے۔ جس حقارت سے کہ انگریز ہندوستانیوں کو دیکھتے ہیں وہ اُن سے بھی زیادہ حقارت کی نگاہ سے اپنے ہم وطنوں کو دیکھنے لگتے ہیں۔ انگریز ان کو ہاف سویلائزڈ (نیم وحشی) کہتے ہیں تو وہ ان کو ان سویلائزڈ (وحشیٔ مطلق) کا خطاب دیتے ہیں۔ وہ اپنی قوم کو ترقی اور اصلاح کے ناقابل بتاتے ہیں اور اس لیے اُن کی بھلائی کے لیے مطلق کوشش نہیں کرتے بلکہ جو لوگ ایسے کاموں میں کوشش کرتے ہیں ان کی کوششوں پر ہنستے ہیں اور ان کو بے سود خیال کرتے ہیں۔ یہ تمام شہادتیں اس بات کی ہیں کہ ہماری قوم عملی قوت باقی نہیں رہی۔

کبھی کبھی ہمارے بھائیوں کے دل میں ایک غیر معمولی جوش دودھ کے اُبال سے بھی زیادہ خود بخود اُٹھتا ہے۔

کبھی وہ اپنے چند ہم خیال آدمیوں کو متفق کر کے ایک انجمن محض قوم کی بھلائی کے لیے منعقد کرتے ہیں۔

کبھی مسلمانوں کی تعلیم کے لیے کوئی اسلامی یا انگریزی مدرسہ قائم کرتے ہیں۔

کبھی کوئی رسالہ یا اخبار محض قوم کے فائدے کی غرض سے جاری کرتے ہیں۔

اسی طرح کبھی ایک تدبیر اور کبھی دوسری تدبیر خاص قوم کی بھلائی کے لیے کرتے ہیں اور اکثر ان تدبیروں کے محرک جہاں تک ہم کو معلوم فی الواقع نہایت خلوص اور صدق دل سے ان کاموں کو شروع کرتے ہیں اور اُن کا یہ دلی ارادہ ہوتا ہے کہ تادم واپسیں ان کاموں میں کوشش کریں گے اور ان کو ترقی دیں گے۔ مگر درحقیقت اُن کی حرکت ایک حرکت مذبوحی ہوتی ہے۔ وہ ایک ہی دو جست کے بعد بالکل ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ اُن کا

کوئی منصوبہ (الا ماشاءاللہ) پورانہیں ہوتا۔اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو کچھ ہم کرنا چاہتے ہیں وہ نہیں کر سکتے۔جس کے یہ معنی ہیں کہ ہم میں قوتِ عملی باقی نہیں رہی۔

ہم میں ہزاروں بلکہ لاکھوں ایسے سمجھ دار آدمی موجود ہیں جو پرانی بے ہودہ رسموں کو بُرا جانتے ہیں۔شادی اور غمی میں جو بیدریغ روپیہ صرف ہوتا ہے اُس کو محض فضول اور لغو بلکہ اور معصیت سمجھتے ہیں۔جو لوگ ایسے موقعوں پر سودی روپیہ قرض لے کر خرچ کرتے ہیں اُن پر نہایت افسوس کے ساتھ ہاتھ ملتے ہیں مگر جب ویسا ہی موقع خود اُن کو پیش آتا ہے نہ تو آنکھیں بند کر کے اُسی اندھے کوئیں میں آپ بھی کود پڑتے ہیں جس میں اوروں کو گرتے دیکھ کر افسوس کرتے تھے۔اکثر لڑکیوں کی تعلیم کو نہایت ضروری سمجھتے ہیں اور دل سے اس بات کے خواہاں ہیں کہ ان کی تعلیم کا کسی مناسب اور قابل اطمینان طریقے سے رستہ نکلے۔ اس باب میں لوگوں کی ترغیب اور تحریص کے لیے کتابیں اور رسالہ تصنیف کرتے اور اخباروں میں مضامین لکھتے ہیں مگر عملی طور پر کوئی کارروائی ان سے نہیں ہوسکتی اور زبانی جمع خرچ کے سوا وہ کوئی عملی کرشمہ نہیں دکھا سکتے۔اس سے صاف ظاہر ہے کہ عملی قوت ہم میں باقی نہیں رہی۔

ہم میں ہزاروں بلکہ لاکھوں ایسے ہیں جو تنگیٔ معاش کے سبب نہایت حیران و پریشان ہیں اور چاہتے ہیں کہ جس حیلے سے روٹی میسر آئے وہ طریقہ اختیار کریں۔

بعضے بیوپار کرتے یا دوکان کھول کر بیٹھتے ہیں،اگر اپنے پاس کافی سرمایہ نہیں ہوتا تو چند اور اشخاص کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیتے ہیں۔لیکن سوا ان لوگوں کے جو قدیم سے تجارت پیشہ رہے ہیں باقی سب ہمیشہ نقصان اٹھاتے ہیں۔دوالہ نکالتے ہیں،مقروض ہوتے ہیں اور پھر کبھی بھول کر بیوپار یا دوکان کا نام نہیں لیتے۔بعضے کھیتی میں قسمت آزمائی کرتے ہیں۔بعضے صیغۂ تعمیرات سرکاری میں ٹھیکے لیتے ہیں۔بعضے پریس جاری کرتے ہیں۔بعضے اخبار نکالتے ہیں۔مگر جہاں دیکھئے اخیر نتیجہ ہمیشہ ناکامی،خسارہ اور مایوسی ہوتی ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عملی قوت ہماری قوم میں باقی نہیں رہی۔

اگر کسی خاندان میں حسن اتفاق سے ایک کماؤ پیدا ہو جاتا ہے تو تمام خاندان اس

کے سہارے پر فکرِ معاش سے فارغ البال ہوجاتا ہے۔ایک کماتا ہے اور بیس کھاتے ہیں۔ ایک شکاری ہے اور بیس اُس کے فضلہ خوار ہیں۔ وہ کماتے کماتے تھک جاتا ہے مگر یہ کھاتے کھاتے نہیں تھکتے۔ کھاتے ہیں اور غرّ اتے ہیں مرغی اپنی جان سے جاتی ہے اور کھانے والوں کو مزہ نہیں آتا۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ ہم میں قوت عمل باقی نہیں رہی۔

آٹھ برس سے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس مختلف شہروں میں صرف اس لیے ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی ترقی کی جو تدبیر کسی کے ذہن میں آئے وہ اُس کو مجمع عام میں پیش کرے اور جو تجویز بعد بحث و مباحثہ کے اتفاق یا کثرت رائے سے صائب اور معقول قرار پائے اُس سے عام مسلمانوں کو مطلع کیا جائے تا کہ جو باتیں اُن کے کرنے کی ہوں ان کو عمل میں لائیں۔لیکن آج تک کانفرنس کی ایک صلاح پر بھی غالباً کسی نے عمل نہیں کیا۔ بجائے اس کے کہ خود اپنے دل میں شرمندہ ہوں اُلٹے کانفرنس کی کارروائیوں پر نفریں کرتے ہیں اور اُس کو محض لغو اور بے سود بتاتے ہیں اس سے ظاہر ہے کہ جس طرح اُن میں قوتِ عمل باقی نہیں اسی طرح وہ اپنے فرائض کو بھی نہیں سمجھ سکتے اور مثل جمادات کے اپنے آپ کو کسی تکلیف کا مکلّف نہیں جانتے۔

ہماری قوم میں جو اس قابل ہیں کہ ترقی وتنزل کے مفہوم کو سمجھتے ہیں اور اپنے میں اور دوسری ترقی یافتہ اقوام میں اُن کو کم وبیش فرق محسوس ہوتا ہے وہ دو حال سے خالی نہیں یا پرانے خیال والے ہیں یا نئے خیال والے، جو پُرانے خیالات رکھتے ہیں اور قومی تنزل کے اخیر نتائج کا بخوبی اندازہ نہیں کر سکتے وہ اس حیلے سے سعی و کوشش کو بے سود بتاتے ہیں کہ دنیوی تنزل اور دنیوی ترقی سب ہیچ ہے۔ انجام دونوں کا فنا ہے۔ ہم کو صرف وہاں کی فکر کرنی جہاں ہمیشہ رہنا ہے اور بس۔

نئے خیال والے جو ترقی وتنزل کی ماہیئت اور اس کے نتائج سے بخوبی واقف ہیں۔ اور دیگر اقوام کی ترقی اور اپنے تنزل میں جو نسبت ہے اس کو سمجھے ہوئے ہیں اُن میں اکثر کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ مسلمانوں کی قوم ہرگز ابھرنے والی نہیں۔ اُس کا ضعف کسی ایسے مرض کے سبب سے نہیں ہے جو روایت مادہ سے عارض ہوا ہوتا کہ اُس کو قابل علاج سمجھا جائے

بلکہ اس سبب سے ہے کہ اُس میں حرارت غریزی باقی نہیں رہی اور اس لیے اس کو سنبھالنے کی کوشش کرنی محض بے فائدہ ہے۔

الغرض کیا پرانے خیال والے اور کیا نئے خیال والے دونوں عموماً سعی و کوشش کو عبث اور رائیگاں خیال کرتے ہیں۔ پہلے اس لیے کہ ترقی ضروری نہیں اور پچھلے اس لیے کہ ترقی ممکن نہیں۔ اسی طرح ہمارے بعضے گروہ کچھ کر نہیں سکتے اور بعضے کچھ کرتے نہیں اور یہ بہت بڑا ثبوت اس بات کا ہے کہ ہماری قوم میں عملی قوت باقی نہیں رہی۔

عملی قوت والوں سے وہ لوگ مراد نہیں ہیں جو محنت مزدوری اور پیشے یا حرفے کے ذریعے سے بری بھلی طرح اپنا پیٹ پال لیتے ہیں۔ ایسے لوگ تو مردہ سے مردہ قوم میں بھی جب تک کہ اُس قوم کے تھوڑے بہت افراد دُنیا میں موجود ہیں ضرور ہے کہ پائے جائیں کیوں کہ ؂

این شکم بے ہنر پیچ پیچ
صبر ندارد کہ بسازد بہ ہیچ

نہیں بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جو زمانے کی رفتار کے موافق نہ صرف باتوں سے بلکہ کاموں سے قوم کے لیے خود نمونہ بن کر اُس کو ترقی کی طرف مائل کریں۔ مثلاً معاشرت میں جو خرابیاں اُن کو نظر آئیں صرف اُن کی بُرائی اور مذمت کرنے ہی پر اکتفا نہ کریں۔ بلکہ خود اُن کو ترک کر کے قوم کے لیے ایک مثال قائم کریں۔ معاش کے وہ جائز ذریعے جو قوم کی اکثر جماعتوں میں معیوب گنے جاتے ہیں جیسی دوکانداری یا صنعت و دست کاری، اُن کو خود اختیار کر کے ان جماعتوں کی جھجک دور کریں۔ تجارت کے وہ اصول جن کے ذریعے سے کم مقدور آدمی بھی بڑی بڑی تجارتیں کر سکتے ہیں، اُن پر خود کار بند ہو کر قوم تجارت کا چرچا پھیلائیں۔ اسی طرح ترقی کی ہر شاخ میں خود کچھ کر کے دکھائیں تاکہ اور لوگ بھی اُن کی دیکھا دیکھی وہی رستہ اختیار کریں۔ تعلیم جو ترقی کی جڑ ہے اُس کی اشاعت میں دم سے، قدم سے، درم سے، قلم سے غرض ہر طرح کوشش کریں۔

مختصر یہ ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوان جن کو ترقی کا مقدمۃ الجیش کہنا چاہیے وہ اپنی اپنی

قابلیت اور اپنے اپنے مذاق کے موافق ایسے کام اختیار کریں جو اولاً خود اُن کے حق میں اور ثانیاً قوم اور ملک دونوں کے حق میں مفید ہوں۔

لیکن افسوس ہے کہ ایسے آدمی قوم میں نایاب ہیں اور اسی لیے ہم کو اس میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے قوائے متحرکہ بالکل معطل اور بے کار ہو گئے ہیں۔ ہماری جرأت اور دلیری مفقود ہو گئی ہے۔ ہم میں ہمت اور الوالعزمی کا نام ونشان نہیں رہا۔ ہم کہنے کو انسان ہیں لیکن جمادات سے بدتر۔ ہم بظاہر زندہ ہیں لیکن حقیقت میں مردہ۔

پس ہماری قوم میں جن بزرگوں کو قومی ترقی کا خیال ہے اُن کو غور کرنا چاہیے کہ یہ عام خاموشی اور سناٹا جو ہماری قوم میں ہر طرف نظر آتا ہے اور یہ مردنی جو ہمارے تمام طبقوں پر چھائی ہوئی ہے آیا یہ محض ایک اتفاقی بات ہے جس کا کچھ فکر نہیں کرنا چاہیے بلکہ ایک دوسرے اتفاق کا منتظر رہنا چاہیے جس سے تمام قوم کی حالت خود بخود بدل جائے؟ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ وبائے یہ نہایت زبردست اور قومی اسباب سے تمام قوم میں پھیلی ہے اور جب تک کہ نہایت زبردست تدبیروں سے اس کا تدارک نہ کیا جائے گا اور آئندہ نسلوں کی تعلیم میں عملی تربیت کی روح نہ پھونکی جائے گی اُس وقت تک مسلمانوں میں قومی زندگی پیدا ہونی دشوار ہے۔

بالفعل ہم اس مضمون کو یہیں ختم کر دیتے ہیں لیکن آئندہ ہم بتائیں گے کہ مسلمانوں میں یہ عام سکون وانجماد کہاں سے آیا ہے؟ اور اُن کے قوائے عملیہ کیوں معطل و بے کار ہو گئے ہیں؟ اس کے بعد ہم اپنی سمجھ کے موافق کسی موقع پر یہ بھی بیان کریں گے کہ وہ کونسی تدبیریں ہیں جن سے ہماری آئندہ نسلوں میں ایکٹوٹی Activity پیدا ہونے کی اُمید ہو اور اُن کے قوائے عملیہ از سرِ نو شگفتہ وشاداب ہو سکیں۔

حسب اور نسب

(از رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جلد: نمبر۴، بابت یکم محرم ۱۳۱۲ھ، صفحہ ۶۳ تا ۶۵)

مسلمانوں میں انسان کے خاندان کے متعلق اکثر یہ دو لفظ مستعمل ہوتے ہیں حسب اور نسب، نسب آدمی کی اصل اور نژاد کو کہتے ہیں۔

حسب اس شرف اور بزرگی کا نام ہے جو کسی شخص کی علمیت یا نبوت یا سلطنت یا دولت یا درویشی یا کسی اور فضیلت کے سبب اُس کے خاندان میں ہمیشہ یا چند پشتوں تک باقی رہے۔

پس نسب کے لحاظ سے جیسا کہ ظاہر ہے تمام بنی نوع انسان ایک درخت کی ڈالیاں یا ایک ڈالی کے پتّے ہیں۔ ایک کو دوسرے پر کسی طرح کی فوقیت اور ترجیح نہیں ہے۔ امیر المومنین علی مرتضیٰؑ فرماتے ہیں ؎

الناس من جهة التمثال اکفاء

ابو هم اٰدم و الام حواء

یعنی ''انسان باعتبار پیکرِ عنصری کے ایک دوسرے کے ہمسر ہیں۔ اُن کا باپ آدم ہے اور ماں حوّا۔

پس جو کچھ تفوق اور بڑائی ایک دوسرے پر ہے وہ محض حسب کے لحاظ سے ہے نہ کہ نسب کے لحاظ سے۔

اس بارہ میں کہ حسب کی بزرگی کتنے عرصے تک قائم رہتی ہے مشہور مورخ ابن

خلدون[1] اپنی تاریخ کے مقدمے میں حسب ذیل رائے ظاہر کرتے ہیں:-

''حسب یعنی خاندانی شرافت اکثر چوتھی نسل میں زائل ہو جاتی ہے کیوں کہ جو شخص خاندان کا بانی ہوتا ہے اس کو خوب معلوم ہوتا ہے کہ میں نے کیسی کیسی مشقتوں سے یہ عزت حاصل کی ہے۔ اس لیے وہ اُن محاسن اور خوبیوں کو جن کے ذریعے سے اُس کو امتیاز حاصل ہوا ہے۔ کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ پھر اُس کا بیٹا جس نے باپ کا طریقہ دیکھا ہے اُن محاسن اور خوبیوں کی قدر کرتا ہے جن سے باپ کو یہ مرتبہ حاصل ہوا تھا اور وہ بھی اکثر باپ ہی کا طریقہ اختیار کرتا ہے مگر باپ اور بیٹے میں ایسا ہی فرق رہتا ہے جیسا دیکھنے والے اور سننے والے میں ہوتا۔ گویا باپ نے جو چیز آنکھوں سے دیکھی تھی بیٹے نے اس کو کانوں سے سنا ہے۔ اب تیسری نسل آتی ہے اور وہ محض تقلیداً باپ دادا کی ڈگر اختیار کرتی ہے لیکن ابھی تک خاندانی عظمت کا طلسم ویسا ہی بندھا رہتا ہے اور بہ ظاہر دادا اور پوتے کے طریقے میں کچھ فرق معلوم نہیں ہوتا مگر چوتھی نسل میں وہ طلسم بالکل ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ نسل باپ دادا کی خوبیوں کو ملیامیٹ کر دیتی ہے اور اکتساب سے پیدا نہیں ہوئی بلکہ ابتدائے آفرینش سے یہ خاندان اسی طرح ممتاز چلا آیا ہے اور اس خاندان کا ذاتی خاصہ یہی ہے کہ اوروں سے ممتاز رہے۔ اس خیال خام میں وہ بغیر اس کے کہ تعظیم وتکریم کا استحقاق پیدا کریں آپ کو اپنی قوم یا قبیلے سے بالاتر سمجھنے لگتے

---

[1] ابن خلدون مسلمانوں میں سب سے بڑا تاریخ داں گذرا ہے، اُس کی مشہور و معروف تالیف جس کا نام ''کتاب العبر فی دیوان المبتدا وا لجز'' ہے۔ فن تاریخ میں بڑے پایہ کی کتاب مانی جاتی ہے۔ اس تاریخ کا ''مقدمہ'' فلسفہ تاریخ کا بے مثل نمونہ ہے۔ تونس (افریقہ) میں ۱۳۳۲ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۴۰۶ء میں ۷۶ سال کی عمر پا کر وفات پائی۔ اُس نے اپنی بے نظیر کتاب میں اقوام عرب کی تاریخ اور بربریوں کے حالات ابتدا سے چودھویں صدی کے آخر تک کے بیان کیے ہیں۔ اہل علم کے نزدیک اس کی تاریخ نہایت مستند اور صحیح مانی جاتی ہے۔ مگر تاریخ سے زیادہ اس کا ''مقدمہ'' قابل قدر ہے

ہیں اور اُن سے اپنی تعظیم وتکریم کے خواہاں ہوتے ہیں اور اُن خوبیوں کو فراموش کر دیتے ہیں جن کے سبب سے اُن کے خاندان کی تعظیم وتکریم ہوتی تھی۔''

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:۔

''چوتھی پشت کی قید باعتبار اکثر کے لگائی گئی ہے ورنہ بعض گھرانے اس سے بھی پہلے بگڑ جاتے ہیں اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ پانچوں یا چھٹی پشت تک خاندان بنا رہتا ہے۔''

جس زمانے میں قاضی ابن خلدون نے یہ رائے قائم کی تھی۔ اُس وقت گو مسلمانوں کی طاقتیں متفرق اور پراگندہ ہوگئی تھیں مگر پھر بھی اُن میں بہت کچھ جان باقی تھی۔ جو خاندان ابھرتا تھا اُس کی ہوا چند پشتوں تک بندھی رہتی تھی۔ اگر کوئی خاندان دینی عظمت کی وجہ سے ممتاز ہوتا تھا اس کا احترام لوگوں کی خوش اعتقادی کے سبب کئی کئی پشتوں تک باقی رہتا تھا۔ جو خاندان دنیوی اعتبارات سے وجاہت پیدا کرتا تھا خود سلطنت اُس کی پشت و پناہ ہوتی تھی اور اُس کی مراعات اور بزرگ داشت متعدد نسلوں تک جاری رہتی تھی۔ بایں ہمہ دو تین پشت سے زیادہ کوئی خاندان موقر ومحترم نہیں رہ سکتا تھا۔

جب اُس زمانے کا یہ حال تھا تو اِس زمانے میں ہم مسلمان خاندانوں کی نسبت خاص کر ہندوستان میں کیا خیال کر سکتے ہیں۔ اول تو آج کل ہماری قوم میں کسی خاندان کا اُبھرنا ایسا ہی خلاف قیاس معلوم ہوتا ہے جیسے سورج کی روشنی میں چھوٹے چھوٹے ستاروں کا نظر آنا لیکن اگر بر سبیل ندرت کسی خاندان کا کوئی ممبر کچھ امتیاز حاصل کر بھی لے تو وہ امتیاز اُسی کی ذات تک محدود رہتا ہے۔ دینی عظمت کی وجہ سے تو فی زمانناکسی شخص کا مرجع خلائق بننا نہایت ہی مشکل ہے کیوں کہ خوش اعتقادی روز بروز زمانے سے رخصت ہوتی جاتی ہے اور اگر کوئی ایسی مثال پائی بھی جائے تو باپ کی مرجعیت بیٹے تک جب ہی منتقل ہو سکتی ہے جب کہ بیٹا فضل وکمال میں اگر باپ سے برتر وافضل تر نہ ہو تو اس کی برابر ضرور ہو۔ دنیوی امتیاز کا اس زمانے میں یہ حال ہے کہ ہر شخص کی عزت اور اعتبار کا اُسی کی ذات پر خاتمہ ہو

جاتا ہے۔ جس گورنمنٹ کے ہم ماتحت ہیں وہ کسی اعلیٰ خاندان کو ادنیٰ خاندان، بغیر ذاتی استحقاق کے ترجیح نہیں دیتی۔ خود انگلستان میں ایک لارڈ کا بیٹا مقابلے کے امتحان میں ایک موچی کے لڑکے کے برابر بٹھایا جاتا ہے اور سوائے اس کے کہ امتحان میں اُس سے سبقت لے جائے کسی طرح اس پر ترجیح حاصل نہیں کرسکتا۔ جب انگلستان میں یہ حال ہے تو ایسی حالت میں ہندوستان کی نسبت کیا توقع کی جاسکتی ہے۔

پس آج کل کسی خاندان کا امتیاز بدون اس کے قائم نہیں رہ سکتا کہ ہر نسل اپنے سے پچھلی نسل کی تعلیم و تربیت میں جہاں تک ممکن ہو کر کوشش کرے اور اپنے بعد اس کو ایسی حالت میں چھوڑ جائے کہ زمانہ اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھے اور اُس کی قدر کرے۔ نہ اس لیے کہ وہ بڑے باپ کی اولاد ہے بلکہ اس لیے کہ وہ خود بڑائی کی مستحق ہے۔ اضافی خوبیوں کو ہمارے مقتداؤں نے ہمیشہ حقیر و ناچیز سمجھا ہے اور انسان کا کمال محض اُس کی کسبی اور ذاتی خوبیوں پر منحصر رکھا ہے۔ چناں چہ امیر المومنین علی مرتضیٰؓ فرماتے ہیں ؎

اِنَّ الْفَتیٰ مَنْ یَقُوْلُ ھَا اَنَاذَا

لَیْسَ الْفَتیٰ مَنْ یَقُوْلُ کَانَ اَبِیْ

یعنی ''مرد وہ ہے جو کہے کہ میں ایسا ہوں نہ وہ جو یہ کہے کہ میرا باپ ایسا تھا۔''

اکثر لوگ اس خیال سے کہ ہمارے بعد ہماری اولاد عزت و آبرو سے دُنیا میں زندگی بسر کرے، اُس کے واسطے جائداد خرید کر چھوڑ جاتے ہیں مگر اُن کی تعلیم و تربیت کا کچھ خیال نہیں کرتے۔ گویا وہ چاہتے ہیں کہ ہماری اولاد صرف نالائق ہی نہ رہے بلکہ بدچلنی میں بھی شہرہ آفاق ہو جہل اور جوانی اور اس کے ساتھ بے فکری جہاں یہ تینوں چیزیں جمع ہوگئیں پھر خاندان کا اللہ ہی مالک ہے۔

مسلمانوں میں عملی قوت کیوں نہیں رہی؟

(از ''محمڈن اینگلواورینٹل کالج میگزین''، علی گڑھ، جلد:۲، نمبر:۷، بابت جولائی ۱۸۹۵ء)

یہ بات مُسلّم ہے کہ مسلمانوں میں عملی قوت باقی نہیں رہی۔ یہاں ہم صرف اس قدر بیان کرنا چاہتے ہیں کہ یہ عام خاموشی اور سناٹا جو ہماری قوم میں ہر طرف نظر آتا ہے اور یہ مُردنی جو ہمارے تمام طبقوں پر چھائی ہوئی ہے یہ کوئی اتفاقی بات نہیں ہے بلکہ ایسے زبردست اور قوی اسباب پر مبنی ہے جن کا اثر کسی خاص جماعت یا خاص فرقے پر محدود نہیں رہا بلکہ اُس نے تمام قوم کے قوائے عملیہ کو معطل و بے کار کر دیا ہے۔

اکثر مسلمانوں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ بالطبع کاہل اور سست ہیں اور اُن کی کاہلی اور سستی کو اسلام کی تعلیم کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ چناں چہ پنجاب کے ایک معزز افسر نے پنجاب کی مردم شماری کی رپورٹ میں لکھا تھا:-

> ''پنجاب کے رہنے والوں پر مذہب اسلام کا اختیار کر لینا نہایت بڑا اثر پیدا کرتا ہے وہ اُن کو مغرور اور مشیخت مآب بنا دیتا ہے۔ اُن کی طبیعت کو حق حلال اور ریاض کا لقمہ حاصل کرنے سے پھیر دیتا ہے۔ کیوں کہ سستی اور کاہل اور بناوٹ خاص اوصاف ہیں جو مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں اور جن سے مسلمانوں اور ہندوؤں میں تمیز ہوتی ہے۔''

درحقیقت نہ مسلمان بالطبع کاہل اور سست ہیں اور نہ اسلام نے ان کو ایسا بنا دیا ہے بلکہ یہ تمام کاہلی اور سستی اور یہ عام سکون و انجماد جو ہماری رگ و پے میں سما گیا ہے یہ

وہ ترکہ ہے جو نہ صرف ہم کو بلکہ تقریباً تمام ایشیائی قوموں کو اُن کے آباؤ اجداد کی میراث میں پہنچا ہے۔

ایشیائی طرز حکومت جو ایک طاقت کو اعتدال سے بڑھانے والی اور اُس کے سوا تمام طاقتوں کو ملیا میٹ کرنے والی ہے اُس نے ایشیا کی کسی قوم میں جان باقی نہیں چھوڑی۔

خود مختار سلطنت میں عام اس سے کہ بادشاہ ظالم ہو یا منصف، رعیت بعینہ ایسی ہوتی ہے جیسے غسال کے قبضہ میں میت۔ اس کو سوائے اس کے کہ مویشی اور چوپاؤں کی مانند بری یا بھلی طرح اپنا پیٹ بھر لیں اور اپنی جسمانی ضروریات کو جس طرح ہو سکے پورا کر لیں ملک یا قوم کی برائی یا بھلائی سے کچھ سروکار نہیں ہوتا۔ خدا کی سلطنت میں تو کوئی اپنے تئیں مختار سمجھتا ہے اور کوئی مجبور۔ مگر خود مختار سلطنت میں ہر شخص کا فرض ہے کہ اپنے تئیں مجبور جانے کیوں کہ ہر متنفس کو اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ ملک اور قوم کے حق میں برائی یا بھلائی بادشاہ اور اُس کے ارکان کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔

حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ سے ان کے عہد حکومت میں ایک شخص نے زمانے کی شکایت کی۔ انھوں نے کہا: **نحن الزمان من رفعناه ارتفع و من و ضعنا التضع** یعنی ''تو کس کی شکایت کرتا ہے زمانہ تو ہم ہیں جس کو ہم نے بلند کر دیا وہ بلند ہو گیا اور جس کو پست کر دیا وہ پست ہو گیا۔''

جو امور مصالحِ عامہ سے علاقہ رکھتے ہیں، خود مختار سلطنت میں اُن سے پبلک کو کچھ سروکار نہیں رہتا۔ مسلمانوں کے دور دورے میں ہزاروں مدرسے اور شفاخانے ممالک اسلامیہ میں جاری ہوئے مگر شاید ہی کوئی مثال ایسی نکلے کہ رعایا نے باہم مجتمع ہو کر کوئی مدرسہ یا شفاخانہ جاری کیا ہو۔ قریباً تمام مدرسے اور شفاخانے یا بادشاہوں کے قائم کیے ہوئے پاؤ گے یا ان کے وزراء اور امرا کے۔

کمزوروں اور مظلوموں کی اعانت کرنا یا حقداروں کے حقوق دلوانے میں کوشش کرنا یا عالموں کے ظلم و تعدی کی شکایت کرنا خود مختار سلطنت میں ایسا ہی جرم ہوتا ہے جیسے

بغاوت اور سرکشی۔ نوشیرواں[1] جیسے عادل بادشاہ کے سامنے اس کے عاملوں کی رشوت ستانی اور ظلم کی کوئی صریح شکایت نہ کرسکتا تھا۔ جن موبدوں کا وہ نہایت ادب کرتا تھا۔ جب اُن سے ملک کا حال پوچھتا تو وہ محض رمز دکنایہ میں ایسی باتیں عرض کرتے تھے۔

خودمختار سلطنت میں بعض اوقات ضعیفوں کی حمایت کرنے کا قانوناً امتناع ہوتا تھا۔ ہندوستان کی قدیم سلطنتوں میں جب کہ منوشاستر[2] کے موافق عمل درآمد ہوتا تھا کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ شودر کو وید یا مذہبی کتابوں کی تعلیم دے سکے یا اس کو کسی برتر فرقے کے برابر حقوق دلوا سکے۔

اگر بالفرض قانوناً ایسا صریح امتناع نہ ہو تو بھی ایشیائی طرزِ حکومت کا طبعی اقتضا یہی تھا کہ ملک کی بُرائی بھلائی ہے سلطنت کے سوا کسی کو کچھ سروکار نہ ہو۔ کسی حکیم کا قول ہے کہ ''خودمختار سلطنت میں صرف ایک شخص ملک کا خیر خواہ ہوتا ہے۔ اور بس۔'' جان[3] اسٹوارٹ مِل کہتے ہیں کہ ''اگر کسی کو ایسا بنادو کہ ملک کے لیے کچھ نہ کرسکے تو اُس کو اپنے ملک کی کچھ پروا نہ رہے گی۔''

جو شخص ہمیشہ صرف دماغ سے کام لے گا اس کے اعضا و جوارح یقیناً بے کار ہو جائیں گے۔

جو باپ تمام مہماتِ خانگی کا بوجھ اپنے سر دھر لیتا ہے اور کوئی کام اپنی اولاد سے نہیں

---

[1] نوشیرواں: ایران کے خاندان ساسانیاں کا بیسواں شہنشاہ اور نہایت ہی عادل اور منصف مزاج تھا۔ اس کا عہد ایران میں ساسانیوں کے کمال عروج کا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ سب سے پہلے اسی نے بغداد کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ قیصر روم سے لڑ کر اُس پر فتح پائی۔ ۵۱۳ء میں تخت پر بیٹھا اور ۴۸ سال حکومت کرنے کے بعد ۵۷۹ء فوت ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُسی کے زمانے میں ۵۷۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔

[2] منوشاستر: یعنی منومہاراج کا مرتب کیا ہوا ضابطہ قوانین ملکی و مذہبی۔ زمانۂ قدیم میں منو نام ایک قانون داں نے ایک بڑی ضخیم کتاب ملکی، اخلاقی، معاشرتی اور مذہبی ضوابط اور قوانین کی تصنیف کی تھی جو منو سمرتی کے نام سے مشہور ہے۔ سلطنتیں اُسی کے مطابق ہر امر کا فیصلہ کرتی تھیں۔

[3] جان اسٹوارٹ مِل (John Stuart Mill) انگلستان کا اعلیٰ درجہ کا فلاسفر پولیٹکل اکانومی (معاشیات) کا ماہر تھا۔ ۱۸۰۶ء میں پیدا ہوا۔

لیتا اس کے مرنے کے بعد اولاد کو گھر تھامنا مشکل ہو جاتا ہے۔

جس گھر کی بیوی کو کسی کا کام پسند نہیں آتا اور خود ہر ایک کام اپنے ہاتھ سے کرنے کا شوق ہوتا ہے اُس گھر کی لڑکیاں اور نوکریں کاہل اور سست ہو جاتی ہیں۔

تم اپنے نوکروں میں سے صرف ایک نوکر کو اپنا معتمد بنالو اور سب بڑے بڑے کام ہمیشہ اسی سے لیا کرو تو اس طرح تمہارے دوسرے ملازم کاہل اور نکمّے ہو جائیں گے۔

جب ایسی سرسری اور اتفاقی شخصیت و امتیاز سے یہ نتائج پیدا ہوتے ہیں تو ایک ایسے شخص کی خودمختاری سے جو حاکم علی الاطلاق مانا گیا ہو رعیت میں کیا جان باقی رہ سکتی ہے۔

الغرض اس میں شک نہیں کہ خودمختار سلطنت رعیت کے قوائے عملیہ کو بالکل معطل اور بے حس و حرکت کر دیتی ہے، نہ وہ ملکی معاملات کے متعلق دم مار سکتے ہیں نہ مذہبی امور میں کوئی بات خلاف جمہور زبان پر لا سکتے ہیں۔ نہ قوم کی سوشل خرابیوں کی اصلاح کر سکتے ہیں۔ اور صرف اپنی مادی اغراض مہیا کرنے کے سوا پبلک کاموں سے کچھ سروکار نہیں رکھتے۔ ان میں صبر و تحمل اور قناعت روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہے مگر ہمت، دلیری، الوالعزمی، غیرت و حمیت کم ہوتے ہوتے چند نسلوں کے بعد بالکل فنا ہو جاتی ہے۔

لیکن بااینہمہ دوسری محکوم قوموں میں (جن کو سلطنت کا ایسا سہارا نہیں ہوتا جیسا بادشاہ کی قوم کو ہوتا ہے) عملی قوت بالکل زائل نہیں ہوتی۔ چوں کہ فوجی اور ملکی خدمات میں اُن کا حصہ بہ نسبت حکمراں قوم کے کم ہوتا ہے اور اس کے سوا اور بہت سی رعایتوں سے جو حکمراں قوم کے لیے مخصوص ہوتی ہیں محکوم قومیں کم مستفید ہوتی ہیں۔ اس لیے چارناچار اُن کو زیادہ تر بنج بھوار، کھیتی اور دست کاری وغیرہ پر اپنی معاش کا مدار رکھنا پڑتا ہے۔ اور اس طرح اُن میں سلف ہیلپ (اپنی مدد آپ کرنا) کا مادّہ روز بروز بڑھتا جاتا ہے اور عقلِ معاش زیادہ ہوتی جاتی ہے۔

برخلاف اس کے حکمراں قوم میں سلف ہیلپ کا ملکہ بالکل باقی نہیں رہتا۔ ان کا مدار معاش اکثر بادشاہی ملازمت یا جاگیر، منصب، ملک، مدد معاش اور معافی وغیرہ پر ہوتا ہے۔ تجارت زراعت اور دست کاری کو وہ عیب سمجھتے لگتے ہیں اور سلطنت کے سہارے پر

کوئی ایسا حیلہ اختیار نہیں کرتے جس میں اُن کو محض اپنے دست و بازو پر بھروسا ہو۔ ان کا حال بعینہٖ اس چھت کا سا ہوتا ہے جو محض اڑواڑ کے سہارے پر تھمی ہوئی ہے اِدھر اڑواہٹی اور اُدھر چھت گری۔

یہی بپتا ہماری قوم پر پڑی ہے۔ کچھ تو طرز حکومت نے ہماری حالت میں سکون و انجماد کی بنیاد ڈالی اور کچھ قومی سلطنت کے سہارے نے ہمارے رہے سہے قوائے عملیہ کو معطل کر دیا اور نسلاً بعد نسلٍ یہ حالت منتقل ہوتی چلی آئی۔ یہاں تک کہ کاہلی، سستی، بے کاری، افسردگی، مایوسی اور بزدلی ہماری قومی خصلتیں بن گئیں۔ اور شدہ شدہ بزرگوں کی میراث ہم تک پہنچی۔ اس صورت میں کون کہہ سکتا ہے کہ یہ خصلتیں خود بخود ہم میں پیدا ہوگئی ہیں یا ہم اپنی نالائقی سے ایسی مردار اور اپاہج بن گئے ہیں یا (نعوذ باللہ) اسلام نے ہم کو ایسا بنا دیا ہے ؂

چہ کند گر پئے دوراں نہ رود چوں پر کار
ہر کہ در دائرۂ گردشِ ایام افتاد

لیکن ہم کو یاد رکھنا چاہیے کہ ہماری یہ حالت خواہ کسبی ہو، خواہ موروثی، خواہ اختیاری ہو، خواہ اضطراری، خواہ اس کے باعث ہم خود ہوئے ہوں، خواہ زمانے کے واقعات اس کا سبب ہوں، لیکن جب تک ہم اس حالت کو نہ بدلیں گے کسی طرح معذور نہیں سمجھے جا سکتے اور الزام سے بری نہیں ہو سکتے۔ غلام جب تک غلام ہے بے شک حقیر و ذلیل سمجھا جائے گا خواہ وہ خود غلام بن گیا ہو اور خواہ جبر سے اس کو غلام بنایا گیا ہو۔

یہ سچ ہے کہ زمانہ گزشتہ کے واقعات نے ہم کو گرا دیا ہے لیکن موجودہ زمانے کے حالات ہم کو اُبھار رہے ہیں۔

ملک بیرونی حملوں اور اندرونی جھگڑوں سے بالکل پاک ہے۔
طرز حکومت بجائے اس کے کہ ترقی کی مانع ہو اس کی معین و مددگار معلوم ہوتی ہے۔
آزادی نے ہمارے طوق اور زنجیریں کاٹ ڈالی اور ہماری مشکیں کھول ڈالی ہیں۔
ہماری ہم وطن قومیں پستی سے بلندی کی طرف چڑھ رہی ہیں اور تمام دُنیا میں ترقی

کی پکار پڑ رہی ہے۔

خود ہماری ترقی کا حیرت انگیز سامان ہمیں میں سے ایک زبردست ہاتھ نے ہمارے لیے مہیا کر دیا ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ اس مردہ قوم کے مسیحا اسی قوم میں موجود ہیں[1]۔

ہماری آسمانی کتاب ہم کو ترقی کا سیدھا راستہ وبتا رہی ہے اور بزدلی و ذلت سے بچنے کی تدبیر ہم کو سمجھا رہی ہے۔ سنو وہ فرماتی ہے: اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِیْحُکُمْ وَاصْبِرُوْا. یعنی ''خدا اور رسول کا حکم مانو اور آپس میں جھگڑا مت کرو جس سے تم بزدل ہو جاؤ اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے اور ثابت قدم رہو۔

غرض کہ ترقی کے اسباب اور ترغیبیں کثرت سے ہمارے گردو پیش موجود ہیں گو کہ افسردگی اور کم ہمتی نے ہم کو دبالیا ہے۔ لیکن پھر آخر ہم انسان ہیں جماد نہیں۔ اگر بالفرض ہم حیوانِ ناطق نہیں تو جسمِ نامی حساس متحرک بالا رادہ ضرور ہیں۔ اگر ہم میں قومی سپرٹ نہیں ہے تو اسلامی روح ضرور ہے۔ وہ اسلام جس کی ابتدائی حیرت انگیز ترقیاں قیامت تک یادگار رہیں گی اور جو اس تنزل اور پستی کے زمانے میں بھی نئی اور پرانی دُنیا کی ایک ایک کھونٹ میں توحید کا ڈنکا بجا رہا ہے ؎

یاراں بکوئے عشق گزاری نمی کنید
اسباب جملہ حاضر و کاری نمی کنید
چوگانِ کام درکف و گوئی نمی زنید
بازی چنیں بدست و شکاری نمی کنید
ترسم کزیں چمن نبرید آستینِ گل
کزگلبنش تحملِ خاری نمی کنید

---

[1] مولانا کی مراد سرسید احمد خاں سے ہے۔

تجارت کا اثر عقل اور اخلاق پر

(از ''محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین''، بابت ۱۰۹۶ء، صفحہ: ۳۴۳)

جس طرح بڑے بڑے کامیاب تاجر نوکری کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اُس کو ایک ادنیٰ درجے کی غلامی اور آزادی کی برباد کرنے والی سمجھتے ہیں اسی طرح وہ لوگ جنھوں نے علم و فضل یا مناصب و خدمات کی وجہ سے امتیاز حاصل کیا ہے بیوپار اور دوکانداری کو قوائے ذہنی اور عقل و اخلاق کے حق میں نہایت مضر بتاتے ہیں، مگر حق یہ ہے کہ تجارت میں ہمیشہ وہی لوگ کامیاب ہوئے ہیں اور ہوتے ہیں جن کے اخلاق درست اور عقل سلیم ہوتی ہے۔ ایک لائق مصنف لکھتا ہے:-

''تجارت کے برابر کوئی چیز انسان کے اخلاق کی کسوٹی نہیں ہے۔ ایک عالم جو محض کتابوں کے مطالعہ اور فلسفیانہ استدلال و احتجاج میں رات دن مصروف رہتا ہے۔ وہ خود نہیں جانتا کہ میں کیا چیز ہوں؟ اگر وہ اپنی حقیقت سے آگاہ ہونا اور اپنی عقل اور اخلاق کی آزمائش کرنی چاہتا ہے تو اس کو چاہیے کہ بازار میں قدم رنجہ کرے۔ تب اُس کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ وہ دانش مند اور نیک آدمی ہے یا احمق اور شریر النفس۔ اس کی کامیابی اور ناکامی خود اس کو اپنی حقیقت سے خبردار کر دے گی۔''

پس جو قوم تجارت سے کچھ تعلق نہیں رکھتی اُس کے کسی فرد کی نسبت قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ دانش مند یا نیک نہاد ہے یا احمق اور بدنہاد۔

اگرچہ تاجر ہمیشہ مذہب یا کانشنس کی ہدایت سے اپنے اخلاق کی اصلاح نہیں کرتا

بلکہ وہ اپنی کامیابی اسی میں سمجھتا ہے کہ اُس کی دیانتداری، خوش معاملگی اور راست بازی پر لوگوں کو اعتماد ہو۔ لیکن جیسا کہ خصائل انسانی کا خاصہ ہے رفتہ رفتہ یہ خصلتیں جو اُس نے بہ ضرورت اختیار کی تھیں اُس کی طبیعت ثانی بن جاتی ہیں۔

یہ کہنا کہ تجارت قوائے عقلیہ کے حق میں مضر ہے واقع کے بالکل خلاف ہے جس قدر تاجر کو اپنی عقل و تدبر سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے ایسی اور کسی پیشے والے کو نہیں ہوتی۔

نوکری پیشہ کو اپنی نوکری پر قائم رہنے یا ترقی حاصل کرنے کے لیے صرف اپنے معمولی فرائض ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ اور کسان کی کامیابی فقط اس کی محنت اور بخت و اتفاق پر موقوف ہے مگر تاجر کو باوجود ان تمام فرائض کے جو ایک سچے تاجر کو ادا کرنے ضرور ہیں ہر وقت عقل سے مشورہ لینے اور ایک شطرنج باز کی طرح نت نئی چال چلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

وہ ہر وقت زمانے کے تیور دیکھتا اور پبلک کے دل ٹٹولتا رہتا ہے۔

ایک وقت اُس کو قرض لے کر کام چلانا بہت مفید پڑتا ہے مگر دوسرے وقت قرضے کی بدولت اُس کو نقصان عظیم اُٹھانا پڑتا ہے۔

اس کو اپنے گاہکوں کی نسبت فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ کن نقد سودا دینا چاہیے اور کن کو اُدھار پر؟

کبھی نہایت قلیل فائدے پر بلکہ برابر سرابر مال فروخت کر ڈالنا اس کے حق میں مفید ہوتا ہے اور کبھی اس کے فروخت کرنے میں جس قدر زیادہ دیر ہوتی جاتی ہے اسی قدر اُس کی قیمت بڑھتی جاتی ہے۔

اکثر اوقات اُس کو فائدہ کثیر کے لالچ میں راست بازی کے خلاف عمل درآمد کرنے کی ترغیب ہوتی ہے مگر اُسی کے ساتھ اس بات کا بھی خوف دامن گیر ہوتا ہے کہ اگر یہ راز کھل گیا تو پھر اعتبار نہ رہے گا۔

غرض کہ اسی قسم کی بے شمار حالتیں جن میں انسان متردد ہوتا ہے کہ کونسی جانب اختیار

کی جائے۔ تاجر کو قدم قدم پر پیش آتی ہیں اور اس کو عقل و تدبیر سے کام لینے اور کامل غور وفکر کرنے پر مجبور کرتی ہیں اور اس طرح تاجر کی عقلِ معاش روز بروز جلا پاتی جاتی ہے۔

نوکری پیشہ یا کاشت کار کو اس قسم کے مرحلے بہت کم پیش آتے ہیں۔ یہ لوگ معمولی قواعد کی شارع عام پر آنکھیں بند کیے چلے جاتے ہیں۔

نوکری پیشہ اگر اپنے فرائض دیانت اور محنت کے ساتھ انجام دیتا ہے تو اس کو اس بات مطلق اندیشہ نہیں کہ میری وجہ معین میں کچھ کمی ہو جائے گی۔

کاشت کار کی کامیابی زیادہ تر آسمانی مدد پر منحصر ہے جس میں انسانی عقل و تدبیر کو کچھ دخل نہیں۔

اس لیے پہلا عدم ضرورت کے سبب اور دوسرا عدم قدرت کے سبب عقل اور تدبیر سے بہت کم کام لیتا ہے۔

مگر تاجر خوب جانتا ہے کہ ذرا چال چوکا اور مصیبت میں گرفتار ہوا۔ اس وجہ سے اُس کو نہایت پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جو قوم تجارت سے کچھ تعلق نہیں رکھتی اور نوکری کے سوا کسی اور ذریعے سے معاش پیدا نہیں کرتی، چند نسلوں کے بعد اُن میں تدبیر معاش کا مادّہ باقی نہیں رہتا۔ کیوں کہ جس طرح کسی عضو کے معطل و بے کار رکھنے سے اُس کی قوت زائل ہو جاتی ہے اور اس میں سکت باقی نہیں رہتا اسی طرح قوائے ذہنیہ سے جب کچھ کام نہیں لیا جاتا تو وہ بالکل از کار رفتہ ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ ممکن ہے کہ اُس قوم میں مستثنیٰ مثالیں ایسے اشخاص کی پائی جائیں جو اعلیٰ درجے کی عقل معاش رکھتے ہوں لیکن ایسے مستثنیات سے قاعدہ کلیہ نہیں ٹوٹ سکتا۔

اس دعوے کے ثبوت میں ہم کو کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی مثال اس کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔ جہاں تک غور کیا جاتا ہے ہندوستان کی قوموں میں عقلِ معاش کے لحاظ جیسے مسلمان ہیٹے معلوم ہوتے ہیں ایسی کوئی قوم نہیں معلوم ہوتی۔ خصوصاً عرب، ایران اور توران کے لوگ جو مسلمان فتح مندوں کے ہمراہ

ہندوستان میں آئے اور نسلاً بعد نسلِ فوجی ملکی خدمات پر مامور ہوتے رہے اُن کی نسلوں میں تدبیر معاش کا مادّہ بہت کم پایا جاتا ہے۔

کسی قوم کی عقلِ معاش کا اندازہ دوطرح سے ہوسکتا ہے

اولاً موجودہ حالت کے قائم رکھنے یا اُس کو ترقی دینے سے

دوسرے عند الضرورت ایسے وسائل بہم پہنچانے سے جن سے دولت و آسودگی حاصل ہو۔ سو ہم مسلمانوں پر دونوں طرح سے نظر ڈالتے ہیں۔

جہاں تک کہ مذکورہ بالا نسلوں کے مسلمانوں کا حال ہم کو معلوم ہے اہم ایسی مثالیں بہت کم پاتے ہیں کہ کسی ایسے خاندان میں جس کی نگرانی گورنمنٹ کے ہاتھ میں نہ ہو دوچار پشت تک دولت و آسودگی یکساں حالت پر یا ترقی روز افزوں کے ساتھ باقی رہی رہو۔

اکثر یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ جو کچھ باپ نے عمر بھر میں جمع کیا تھا بیٹے نے باپ کے مرتے ہی اس کو چند روز میں اُڑا دیا۔ ناعاقبت اندیشی اور اسراف جو حماقت اور بیدانشی کی نمایاں علامات ہیں وہ مسلمانوں کی قومی خصلتیں بن گئی ہیں۔ باپ کیسا ہی دولت منداور آسودہ حال زیادہ سے زیادہ اُس کی اولاد کی اولاد کی نسبت پیشین گوئی کی جاسکتی ہے کہ وہ محتاج ہوگی یا تنگ معاش۔

جن کے پاس نقد روپیہ ہے مگر آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں وہ اُس روپیہ کو بے دریغ خرچ کرتے چلے جاتے ہیں اور کبھی بھول کر بھی اس بات کا خیال نہیں کرتے کہ جب روپیہ نبڑ جائے گا۔ اس وقت کیا حال ہوگا؟ جائیداد والے دھڑا دھڑ جائیدادیں فروخت کرتے ہیں اور مطلق انجام کی فکر نہیں کرتے۔

جن کے پاس نہ روپیہ ہے اور نہ جائیداد مگر اُن کو کم و بیش سود پر قرض روپیہ مل جاتا ہے وہ اس کو ایسی فراخ دلی سے خرچ کرتے ہیں جیسے کوئی اپنے سرمایہ کو خرچ کرتا ہے۔ سودی قرض لے کر بیاہ شادیوں میں خرچ کرنا تو ایسا عام ہے کہ اس سے شاید کوئی مسلمان بھی خالی نہ ہوگا۔

جب کہ موجودہ روپیہ کو وہ اپنی حالت پر قائم و برقرار نہیں رکھ سکتے تو ظاہر ہے کہ اس

کوترقی دینے کی ان سے کیا امید ہوسکتی ہے۔

رہی دوسری بات یعنی عندالضرورت جائز وسیلوں سے معاش پیدا کرنی اور اپنی ذاتی کوشش سے اپنی حالت کو درست کرنا۔ سو اس لحاظ سے بھی مسلمانوں کے قدیم خاندانوں کی حالت نہایت سقیم نظر آتی ہے۔ تجارت، زراعت یا دستکاری کے ذریعے سے وہ معاش پیدا کرنی بالکل نہیں جانتے۔

چوں کہ اُن کے آباؤ اجداد نے ہندوستان میں آ کر نوکری کے سوا کسی دوسرے ذریعے سے معاش پیدا نہیں کی۔ اس لیے اول تو بجز نوکری کے کسی دوسرے ذریعۂ معاش کا اُن کو خیال ہی نہیں آتا۔ وہ جس طرح مسلمان کی اولاد کا مسلمان ہونا ضروری سمجھتے ہیں۔ اسی طرح نوکری پیشہ کی اولاد کا نوکری پیشہ ہونا ضروری خیال کرتے ہیں اور اگر کوئی مجبور ہو کر بیوپار، دوکان داری یا کاشت کاری اختیار کرتا ہے تو جہاں تک ہم کو معلوم ہے مستثنیٰ صورتوں کے سوا ہمیشہ اُس میں ناکامی ہوتی ہے۔

رہی ملازمت جس کو وہ اپنا موروثی پیشہ سمجھتے ہیں اُس میں بھی اُن کی مقدار اس قدر قلیل ہے کہ گویا بالکل نہیں۔ اول تو سرے سے عام مسلمانوں ہی کی تعداد سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں بمقابلہ ہندوستان کی دوسری قوموں کے نہایت کم ہے اور پھر خاص کر مسلمانوں کی مذکورہ بالا نسلیں جو اس مقام پر زیر بحث ہیں اُن کا گورنمنٹ سروس (سرکاری ملازمت) میں اتنا بھی حصہ نہیں جتنا کہ آٹے میں نمک۔ اس کا سبب چاہو یہ قرار دو کہ انھوں نے اپنے تئیں گورنمنٹ کی خدمات کے لائق نہیں بنایا اور چاہو یہ سمجھو کہ چوں کہ اُن کے آباؤ اجداد کو کسی فارن گورنمنٹ (بیرونی سلطنت) میں نوکری کی خاص لیاقت بہم پہنچانے کی ضرورت نہ تھی اس لیے ہریڈیٹری جینیس (Hereditary genius) کے قاعدے کے موافق اولاد میں بھی اُس کی لیاقت پیدا نہیں ہوتی۔

دونوں صورتوں میں نتیجہ نکلے گا کہ مذکورہ بالا نسلوں کے مسلمان عقلِ معاش کے لحاظ سے اپنی ہم وطن قوموں سے نہایت پست حالت میں ہیں اور اس کا سبب جہاں تک غور کیا جاتا ہے اس سے بہتر خیال میں نہیں آتا کہ پشتہا پشت سے اُن کا ذریعہ معاش صرف

اسلامی سلطنت کی ملازمت پر منحصر رہا اور تجارت سے جو کہ عقل کی ترقی دینے والی اور جلا کرنے والی ہے کبھی ان کو سروکار نہیں رہا۔

جس طرح تجارت سے قومی عقلِ معاش ترقی پاتی ہے اسی طرح عمدہ اخلاق اور نیک خصلتیں صرف تجارت ہی کے ذریعے سے تمام قوم میں شائع ہوتی ہیں۔ جزرسی اور کفایت شعاری جس کے بغیر کسی خاندان بلکہ کسی قوم کا وقار دُنیا میں قائم نہیں رہ سکتا، صرف تجارت ہی کی بدولت تمام قوم میں سرایت کرتی ہے اگرچہ ممکن ہے کہ ہر ایک قوم میں خواہ وہ قوم تجارت پیشہ ہو اور خواہ نوکری پیشہ، کچھ افراد جزرسی اور کفایت شعاری کے ساتھ موصوف پائے جائیں لیکن ہمارے نزدیک کوئی قوم عام طور پر جزرسی اور کفایت شعار نہیں ہو سکتی جب تک کہ عام طور پر اس میں تجارت شائع نہ ہو۔

یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی وہ مسلمان قومیں جو ابتدا سے روزگار پیشہ چلی آتی تھیں اُن کی نسل میں رفتہ رفتہ جزرسی اور کفایت شعاری کا مادہ بالکل معدوم ہو گیا ہے۔ ایک شریف مسلمان جو ہمیشہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ سلوک کرتا رہتا تھا اُس کا افسوس کے ساتھ یہ کہنا ہمیشہ یاد رہے گا:-

> ''اگر میں اپنے کسی بے مقدور مسلمان کا دس روپیہ ماہوار ہمیشہ کے لیے مقرر کر دوں تو بھی مجھے امید نہیں کہ وہ اپنی حالت درست کر سکے۔ لیکن اگر میں اپنے کسی بے مقدور ہندو دوست کو ایک دفعہ دو روپئے دیدوں تو مجھ کو یقین ہے کہ وہ انہی دو روپیوں سے رفتہ رفتہ اپنی حالت درست کر لے گا اور پھر کبھی مجھ سے مدد کا خواست گار نہ ہو گا۔''

تجارت کے اصول جن کی پابندی کرنی تاجر کا لازم ہوتی ہے خود بخود اُس کو جزرس اور کفایت شعار بنا دیتے ہیں۔ ایک مہاجن کی نقل مشہور ہے کہ اس کا بیٹا آوارہ اور بدچلن ہو گیا تھا اس نے باپ کی بہت سی دولت اس کی زندگی ہی میں اُڑا دی۔ ہر چند باپ ملامت اور نصیحت کرتا تھا مگر اس کے کان پر جُوں بھی نہ رینگتی تھی۔ آخر جب مہاجن مرنے لگا تو اس نے بیٹے کو وصیت کی کہ جو کچھ مال و دولت میں چھوڑتا ہوں اُس کے خرچ کرنے نہ کرنے کا

تجھ کو اختیار ہے کیوں کہ تیرے سوا میرا کوئی وارث نہیں جس کو یہ مال و دولت دے جاؤں۔ لیکن ایک نصیحت کرتا ہوں اُس کو کبھی نہ بھولنا۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک سے لے کر ہزار تک جو کچھ خرچ کرے اور جو کچھ خرچ کے بعد باقی رہا کرے اُس کو ہر روز بہی میں لکھ لیا کیجیو اور ہمیشہ آج کا حساب کل اور کل کا حساب پرسوں دیکھتا رہیو۔ بیٹے نے ایسا ہی کیا اور چند ہی روز میں جب اس نے دیکھا کہ سرمایہ روز بروز گھٹتا جاتا ہے تو دفعتہً اُس کی آنکھیں کھل سی گئیں اور اپنے گھر کو سنبھال لیا۔

جس طرح تجارت سے جُزرسی اور کفایت شعاری کی بنیاد تمام قوم میں پڑتی ہے اسی طرح تحمل، بردباری، نرمی اور مرافقت بغیر تجارت کے کسی قوم کی قومی خصلت نہیں بنتی، جس طرح سلطنت اور حکومت کا میلان ظلم اور تشدد اور غرور و نخوت کی جانب ہوتا ہے اسی طرح تجارت کا اقتضا یہ ہے کہ وہ تند مزاجوں کو دھیما، مغروروں کو خاکسار، سخت کلاموں کو شیریں زبان اور جبّاروں کو منکسر المزاج بناتی ہے۔ تاجر کی ضرورتیں ایسی ہیں کہ جب تک وہ تحمل و بردباری اور شیریں زبانی اختیار نہ کرے ہرگز اپنے پیشے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔

ایک مصنف لکھتا ہے کہ ''دُنیا میں سب سے زیادہ خوش اخلاق اور شیریں زبان یہودی لوگ ہیں نہ فرانسیسی، نہ اٹلی والے اور نہ جرمن اور یہی وجہ ہے کہ دُنیا میں کوئی قوم یہودیوں کے برابر دولت مند نہیں۔'' اسی سبب سے جو قومیں تجارت پیشہ ہوتی ہیں ایک مدت کے بعد اُن کی نسلیں فطرۃً اُن خصلتوں پر مجبول پیدا ہوتی ہیں۔ کیوں کہ اولاد کے جسمانی اور نفسانی قویٰ اپنے آباؤ اجداد کے جسمانی اور نفسانی قویٰ کے تابع ہوتے ہیں۔ جس طرح قوی اور تنومند ماں باپ کی اولاد تنومند ہوتی ہے اسی طرح متحمل و بردبار ماں باپ کی اولاد مستثنیٰ صورتوں کے سوا ضرور ہے کہ متحمل و بردبار پیدا ہو۔

راست بازی اور خوش معاملگی بھی تجارت کی کامیابی کے لیے نہایت ضروری ہے کیوں کہ جو تاجر راست باز اور خوش معاملہ نہیں ہوتا اُس کی ساکھ شہر یا ملک میں کبھی نہیں بندھ سکتی۔ اگر وہ فریب یا بدمعاملگی سے کبھی کامیاب بھی ہو جاتا ہے تو بہت جلد اُس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ اس لیے تاجر کو مجبوراً راست باز اور خوش معاملہ بننا پڑتا ہے۔ ہم

ہمیشہ بازاروں میں اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں کہ جو دوکاندار گاہکوں کو دھوکہ نہیں دیتے اور اپنا مال سب کے ہاتھ ایک ہی نرخ پر بیچتے ہیں وہ چندروز میں اپنے ہم پیشوں سے سبقت لے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کی کامیابی دیکھ کر اوروں کو بھی وہی طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے اور اس طرح ممکن ہے کہ رفتہ رفتہ بازار میں راست بازی پھیل جائے۔

اگرچہ اس بات کا انکار نہیں ہوسکتا کہ دُنیا میں ابھی تک راست باز تاجروں کی تعداد بمقابلہ جوفروش گندم نماؤں کے بہت کم ہے لیکن اس سے تجارت کے پاک دامن پر کوئی دھبّہ نہیں لگتا۔ جس طرح علم کا خاصہ ہے کہ وہ براہِ راست نیکی کی راہ سجھاتا ہے لیکن باوجود اس کے بہت سے اہل علم اپنی بداعمالیوں سے علم کو بدنام کرتے ہیں۔ اسی طرح اگرچہ تجارت براہِ راست آنسٹی (دیانت داری) اور راست بازی کی تعلیم دیتی ہے لیکن نالائق تاجر چندروزہ منفعت کے لیے بددیانتی اور فریب اختیار کر کے تجارت کی پائیدار برکتوں سے محروم رہتے ہیں۔

ایک دانش مند امریکن مصنف اپنے ملک کے تاجروں کو اس طرح نصیحت کرتا ہے:۔

> ''جس قدر تمہاری تجارت میں راست بازی اور خوش معاملگی زیادہ ہوگی۔ اسی قدر تمہارا کام جلد ترقی کرے گا۔ تجارت کی ذات میں بھلائی اور نیکی کے سوا کچھ نہیں ہے مگر انسان نے اپنی بدی سے اُس کو بُرا بنا دیا ہے۔ اور اپنی خیانت اور بددیانتی سے اس کے پاک دامن پر داغ لگایا ہے۔ اگر تم تجارت میں کامیاب ہونا چاہتے ہو تو تمام مکروفریب چھوڑ دو اور سانپ کی چال نہ چلو جو کمینہ پن سے بجائے پاؤں کے چلنے کے پیٹ کے بل چلتا ہے۔ بلکہ ایسا کرو کہ تمہاری دوکانیں، گودام اور منڈیاں عزت اور دیانت داری کے مندر ہوں اور اپنی منڈیوں کے دروازوں پر کندہ کرا دو کہ جو کوئی اس احاطے میں داخل ہوگا اس کو امان دے جائے گی۔''

اصل یہ ہے کہ جب تک کسی ملک کی تجارت وہاں کے تعلیم یافتہ گروہ کے ہاتھ میں نہیں آتی بلکہ جاہلوں اور نالائقوں کے پنجے میں پھنسی رہتی ہے تب تک تجارت کی

کامیابی کا بھید عام نظروں سے مخفی رہتا ہے۔ اکثر نفع یا نقصان کو امورات تقدیری میں شمار کرتے ہیں جن میں انسان کی عقل و تدبیر کچھ کام نہیں دے سکتی (حالاں کہ وہ تدبیر سے ایک دم غافل نہیں رہتے) بعضے چالاکی اور عیاری کو بیوپار کے لوازمات میں سے جانتے ہیں۔ لیکن فی الحقیقت تاجر کی کامیابی کا مدار زیادہ تر اُس کی راست بازی اور خوش معاملگی پر ہوتا ہے جس پر پورا پورا یقین بغیر تعلیم و تربیت کے حاصل نہیں ہوسکتا۔ ایک مصنف لکھتا ہے کہ

''تجارت کی کامیابی کے لیے زیادہ ضرورت صرف علم کی ہے نہ کہ تجربہ کی کیوں کہ تجربہ علم حاصل کرنے کے متعدد ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے، عاقل اپنی عقل اور علم سے سبق لیتے ہیں اور کم عقل تجربہ سے مگر نہایت بے وقوف ضرورت سے اور چوپائے نیچر سے۔''

اسی مصنف کا قول ہے کہ:-

''وہ وقت قریب ہے جب کہ تجارت ہر قسم کی ذہنی اور عقلی پیشوں سے مقابلہ کرسکے گی زمانہ آئندہ کا تاجر ضرور دانش منداور لائق شخص ہوگا جو مصنوعی اور قدرتی چیزوں کا زمین پر تقسیم کرنے والا ہوگا۔ اب وہ اتفاقات روز بروز کم ہوتے جاتے ہیں اور قریب ہے کہ بالکل معدوم ہو جائیں جن سے ایک نالائق تاجر جو بار بار غلطیاں کرتا ہے مدت دراز تک دوالہ نکلنے سے محفوظ رہ سکے۔''

اصلی جرأت اور دلیری بھی جیسی تجارت کی بدولت انسان میں پیدا ہوتی ہے ایسی کسی اور پیشے کے ذریعے سے نہیں ہوتی۔ شاید وہ لوگ جو تجارت اور دلیری میں منافات سمجھتے ہیں اس بات کو سن کر متعجب ہوں مگر ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ دلیری یا بزدلی کسی خاص فرقے کے ساتھ خصوصیت نہیں رکھتی۔ ممکن ہے کہ ایک سپاہی یا سپہ سالار نہایت بزدل ہو اور ایک بیوپاری بہت بڑا بہادر ہو جس طرح بہادروں کو میدان جنگ میں دلیری اور شجاعت کے کام کرنے پڑتے ہیں اسی طرح ہر شخص کو اپنی روزانہ زندگی میں اکثر موقعوں

پر دلیری سے کام کرنا پڑتا ہے۔

کبھی راستی اور ایمانداری سے کام کرنے میں طرح طرح کے خطرے ہوتے ہیں۔

کبھی حرص اور طمع انسان کی نیت ڈانواں ڈول کر دیتی ہے۔

اکثر دوسروں کا سہارا چھوڑ کر اپنے دست و بازو پر بھروسا کرتے ہوئے جی ہچکچاتا ہے۔

اکثر اوقات ارادوں میں تزلزل واقع ہو جاتا ہے، صریح ایک کام کو مفید جانتے ہیں مگر چوں کہ کبھی اس کو نہیں کیا اُس میں ہاتھ نہیں ڈالتے۔

بعض اوقات اپنے فرائض کاہلی سے یا کسی کے لحاظ سے یا کسی کے خوف سے پورے کرنے دشوار معلوم ہوتے ہیں۔

غرض کہ اسی قسم کے بے شمار مواقع ہیں جہاں دلیری کی ضرورت ہوتی ہے۔ پس جو شخص ایسے موقعوں پر دلیری اور جرأت ظاہر کرتا ہے اور خوف یا مروت یا دل کی کمزوری پر غالب آ جاتا ہے اُس کی دلیری اور جرأت فی الحقیقت میدان جنگ کی دلیری اور شجاعت سے بدر جہا زیادہ تعریف کے لائق ہے اور اس قسم کے مواقع جیسے کہ تاجر کو پیش آتے ہیں دُنیا میں کسی شخص کو پیش نہیں آتے۔ وہ لاکھوں من غلہ ایسے اتفاقات کے بھروسے پر جو اس کے اختیار سے باہر ہیں بے دھڑک خرید کر کوٹھے اور کھتیاں بھر لیتا ہے، وہ لاکھوں کی بدنی بدتا ہے اور نقد روپیہ بائع کی جھولی میں ڈال کر محض امید کے سہارے پر بیٹھ رہتا ہے۔ وہ ایک ایسے شخص کے اعتبار پر جس کو کبھی اس نے آنکھ سے نہیں دیکھا اور جو اس سے سات سمندر پار رہتا ہے، مال سے بھرا ہوا جہازوں کا بیڑا سمندر میں چھوڑ کر تسلی اور اطمینان سے پاؤں پھیلا کر سو رہتا ہے۔

ایک مصنف لکھتا ہے کہ ''ایک دور دراز ملک کا سوداگر جو اپنے دوسرے ہم پیشہ بھائی پر صرف خط و کتابت کے ذریعے کرتے ہے اور اپنی دولت کا بھرا ہوا جہازوں کا بیڑا سمندر کی موجود کے حوالے کر کے نچنت ہو جاتا ہے، کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس اعلیٰ درجے کی انسانی خوبی پر نازاں نہ ہو۔''

جوقومیں صرف اس بنا پر کہ اُن کے آباؤ اجداد بڑے تلوار کے دھنی، جنگجو اور سپاہی تھے، اپنے تئیں بہادر اور شجاع خیال کرتی ہیں اُن کے لیے اپنی بہادری کی آزمائش کا اس سے بہتر کوئی موقع نہیں کہ وہ تجارت کے میدان میں آئیں۔ ان کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ وہ فی الواقع دلیر اور جری ہیں یا بزدل اور ڈرپوک۔

تجارت کے فوائد و برکات

الغرض تجارت کی کامیابی کے لیے جس کا مدار تاجر کے مقبول و معتمد خاص و عام ہونے پر ہے نہایت ضرور ہے کہ تاجر علاوہ عاقل اور مدبر ہونے کے عمدہ اخلاق اور عمدہ خصلتوں سے آراستہ ہو اور اس لیے تجارت کو انسان کا معلم اور اتالیق کہا جائے تو کچھ بے جا نہیں۔

وہ صرف تاجر ہی کو نیکی نہیں سکھاتی بلکہ تمام ملک میں نیکی پھیلاتی ہے۔

وہ کسانوں کو ترقی زراعت کی ترغیب دلاتی ہے۔

وہ کاری گروں سے نوع انسان کی تمام آسائش و آرام کی چیزیں تیار کراتی ہے۔

وہ ایک ملک کی پیداوار دوسرے ملک میں اور ایک سرزمین کی برکت دوسری سر زمین میں پہنچا کر تمام دُنیا کی حاجتیں رفع کرتی ہے۔

تجارت نے جو فائدہ دُنیا کی قوموں کو پہنچائے ہیں وہ شمار اور تعداد کی حد سے خارج ہیں۔ ایک مصنف تجارت کی نسبت لکھتا ہے کہ ''لڑائی جو انسان کی خوریز دشمن اور ملکوں کی غارت کرنے والی دیوی ہے اور جواب بھی ویسی ہی مہیب اور ہولناک ہے جیسی یونان کے مشہور شاعر ہومر کے زمانے میں تھی۔ اگر کبھی اس کی تیغ خون آشام ہمیشہ کے لیے میان میں کی جائے گی تو تجارت ہی کی بدولت کی جائے گی۔

تجارت نے دُنیا میں شائستگی کو پھیلایا ہے۔

اُس نے تمام روئے زمین پر انسان کی ضرورت اور آسائش کے سامان برابر تقسیم کیے ہیں۔

اُس نے علوم و فنون کی بیش قیمت اور مفید تحقیقاتوں اور ایجادوں کو رواج دیا ہے۔

اُس نے موجدوں کی طبیعت میں نئے نئے ایجاد واختراع کی تحریک پیدا کی ہے۔
وہ علم اور دین کی اشاعت میں مدد دیتی ہے۔
تجارت اور ترقی ہمیشہ اور ہر جگہ لازم اور ملزوم رہی ہیں۔ انسان کے اندرونی قویٰ کی ترقی علوم وفنون کی ترقی جنزل انفورمیشن (معلومات عامہ) کی ترقی اخلاق کی، ضوابط و قوانین کی ترقی، آزادی کی ترقی، غرض کہ ہر طرح کی ترقی ہی ترقی اُس سے پیدا ہوئی ہے۔
اُس نے ہمیشہ جس چیز کو جس درجے پر پایا ہے اُس سے جُدا ہوتے وقت اُس کو بلند سیڑھی پر چھوڑا ہے۔
وہ اوّل ایک ملک سے دوسرے ملک میں شائستگی کے لیے بطور طلایہ کے جا کر رستہ تیار کرتی ہے اور پھر شائستگی کو اپنے ساتھ لے کر وہاں پہنچتی ہے۔
اُس نے وحشیوں کو انسان بنایا ہے۔
اُس نے عوام الناس اور امرا کو بادشاہی تک پہنچایا ہے۔
اُسی نے موروں (مسلمانوں) کو اپنے عہد میں دُنیا کا عقل مند بنایا تھا۔
اُسی نے انگریزوں کو اکیلا بلاشرکتِ غیرے تمام ہندوستان کا وارث ٹھہرایا۔

زبان گویا

(از ''تزک اُردو'' مطبوعہ ۱۸۹۸ء)

اے میری بُلبُل ہزار داستان! اے میری طوطیٔ شیوا بیان! اے میری قاصد! اے میری ترجمان! اے میرے وکیل! اے میری زبان! سچ بتا، تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے؟ کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جدا اور تیرے ہر پھل میں ایک نیا مزا ہے۔ کبھی تو ایک ساحرِ فسوں ساز ہے جس کے سحر کا رُ ذ نہ جادو کا اُتار۔ کبھی تو ایک افعیٔ جاں گداز ہے جس کے زہر کی دا رو نہ کاٹے کا منتر۔ تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیروں کا جی لبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دکھاتی تھی۔ تو وہی زبان ہے کہ جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کا شکار کرتی تھی اور کہیں اپنی تیزی سے سینوں کو نگار کرتی تھی۔

اے میری زبان! دشمن کو دوست بنانا اور دوست کو دشمن کر دکھانا تیرا ایک ادنیٰ کھیل ہے جس کے تماشے سینکڑوں دیکھے اور ہزاروں دیکھنے باقی ہیں۔

اے میری بنی بات کی بگاڑنے والی! اور میرے بگڑے کاموں کی سنوارنے والی! روتے کو ہنسانا اور ہنستے کو رُلانا، روٹھے کو منانا اور بگڑے کو بنانا نہیں معلوم تو نے کہاں سیکھا؟ اور کس سے سیکھا؟ کہیں تیری باتیں بِس کی گانٹھیں ہیں اور کہیں تیرے بول شربت کے گھونٹے ہیں کہیں تو شہد ہے اور کہیں حنظل، کہیں تو زہر ہے اور کہیں تریاق۔

اے زبان! ہمارے بہت سے آرام اور بہت سی تکلیفیں، ہمارے سینکڑوں نقصان اور ہزاروں فائدے، ہماری عزت، ہماری نیک نامی، ہماری بدنامی، ہمارا سچ، ہمارا جھوٹ،

صرف تیری ایک ''ہاں'' اور ایک ''نہیں'' پر موقوف ہے۔ تیری اس ''ہاں'' اور ''نہیں'' نے کروڑوں کی جانیں بچائیں اور لاکھوں کے سر کٹوائے۔

اے زبان! تو دیکھنے میں تو ایک پارۂ گوشت کے سوا نہیں مگر تیری طاقت نمونۂ قدرتِ الٰہی ہے۔ دیکھ! اس طاقت کو رائیگاں نہ کھو اور اس قدرت کو خاک میں نہ ملا۔ راستی تیرا جوہر ہے اور آزادی تیرا زیور۔ دیکھ دل کی امانت میں خیانت نہ کر اور روح کے پیغام پر حاشیئے نہ چڑھا۔

اے زبان! تیرا منصب بہت عالی ہے اور تیری خدمت نہایت ممتاز، کہیں تیرا خطاب کاشفِ اسرار ہے اور کہیں تیرا لقب محرمِ راز۔ علم کی ایک خزانۂ غیبی ہے اور دل اس کا خزانچی، حوصلہ اُس کا قفل ہے اور تو اُس کی کنجی۔ دیکھ اس قفل کو بے اجازت نہ کھول اور خزانے کو بے موقع نہ اٹھا۔ وعظ و نصیحت تیرا فرض ہے اور تلقین دارشاد تیرا کام۔ ناصحِ مشفق تیری صفت ہے اور مرشدِ برحق تیرا نام۔ خبردار! اس نام کو عیب نہ لگانا اور اس فرض سے بھی نہ چرانا۔ ورنہ یہ منصبِ عالی تجھ سے چھن جائے گا اور تیری بساط میں وہی ایک گوشت کا چھیچھڑا رہ جائے گا۔ کیا تجھ کو یہ امید ہے کہ تو جھوٹ بھی بولے اور طوفان بھی اٹھائے، تو غیبت بھی کرے اور تہمت بھی لگائے، تو فریب بھی کرے اور چغلیاں بھی کھائے اور پھر وہی زبان کی زبان کہلائے۔ نہیں! ہرگز نہیں!! اگر سچی زبان ہے تو زبان ہے ورنہ زبوں ہے بلکہ سراسر زبان ہے اگر تیرا قول صادق ہے تو شہد فائق ہے ورنہ تھوک دینے کے لائق ہے۔ اگر تو راست گفتار ہے تو ہمارے منھ میں اور دوسروں کے دلوں میں جگہ پائے گی ورنہ گدّی سے کھینچ کر نکالی جائے گی۔

اے زبان! جنھوں نے تیرا کہنا مانا اور جو تیرا حکم بجالائے انھوں نے سخت الزام اُٹھائے اور بہت پچھتائے۔ کسی نے انھیں فریبی اور مکار کہا۔ کسی نے گستاخ اور منھ پھٹ اُن کا نام رکھا کسی نے ریا کار ٹھہرایا اور کسی نے سخن ساز۔ کسی نے بدعہد بنایا اور کسی نے غماز غیبت اور بہتان، مکر اور افترا، طعن اور تشنیع، گالی اور دشنام، پھکڑ اور ضلع جگت اور پھبتی۔ غرض دُنیا بھر کے عیب اُن میں نکلے۔ اور وہ اُن سب کے سزاوار ٹھہرے۔

اے زبان! یاد رکھ۔ ہم تیرا کہنا نہ مانیں گے اور تیرے قابو میں ہرگز نہ آئیں گے۔ ہم تیری ڈور ڈھیلی نہ چھوڑیں گے اور تجھے مطلق العنان نہ بنائیں گے۔ ہم جان پر کھیلیں گے پر تجھ سے جھوٹ نہ بلوائیں گے۔ ہم سر کے بدلے ناک نہ کٹوائیں گے۔

اے زبان! ہم دیکھتے ہیں کہ گھوڑا جب اپنے آقا کو دیکھ کر محبت کے جوش میں آتا ہے تو بے اختیار ہنہناتا ہے اور کتّا جب پیار کے مارے بے تاب ہو جاتا ہے تو اپنے مالک کے سامنے دُم ہلاتا ہے۔ سبحان اللہ! وہ نام کے جانور اور اُن کا ظاہر و باطن یکساں۔ ہم نام کے آدمی اور ہمارے دل میں ''نہیں'' اور زبان پر ''ہاں''۔

الٰہی! اگر ہم کو رخصتِ گفتار ہے تو زبانِ راست گفتار دے اور اگر دل پر تجھ کو اختیار ہے تو زبان پر ہم کو اختیار دے۔ جب تک دُنیا میں رہیں سچے کہلائیں اور جب تیرے دربار میں آئیں تو سچے بن کر آئیں۔ آمین۔

سرسیّد کی مذہبی خدمات

(از ''محمڈن اینگلواورینٹل کالج میگزین''
علی گڑھ، جلد: ٦، نمبر: ۵، بابت ماہ مئی ١٨٩٨ء، از صفحہ: ١١۵ تا ١٢٦)

سرسید کی لائف میں منجملہ اُن مختلف حیثیتوں کے جواُن کی ذات میں جمع تھیں سب سے زیادہ مہتم بالشان اور سب سے زیادہ لحاظ کے قابل بلکہ اُن کی تمام لائف کی جان مذہبی حیثیت ہے۔ جس پر اُن کی لائف میں جو عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ ہر ایک پہلو سے نظر ڈالی گئی ہے اور متعدد ابواب میں اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں نہایت اختصار کے ساتھ ہمیں صرف تین امور پر بحث کرنی منظور ہے:-

جو کچھ گزشتہ چالیس (40) برس میں سرسید نے مذہب کے متعلق لکھا اس کے لکھنے کا منشا کیا تھا؟

یہ لٹریچر مسلمانوں کی مذہبی تصنیفات میں کیا درجہ رکھتا ہے؟

ان تصنیفات سے اسلام یا مسلمانوں کے حق میں کیا نتیجے مترتب ہوئے؟

سرسید کا خمیر اُس شہر کی خاک سے ہوا تھا جو کبھی ہندوستان میں اسلام کا مرکز اور مسلمانوں کا ملجا و ماویٰ تھا اور جس زمانے میں وہ پیدا ہوئے، یہ وہ زمانہ تھا کہ دہلی کے مسلمانوں کے پاس کوئی چیز جس پر وہ فخر کر سکیں، دین اسلام کے سوا باقی نہ رہی تھی۔ اور اس لیے وہاں کے شریف مسلمان خاندان مذہب کو زیادہ مضبوط پکڑتے جاتے تھے۔ خصوصاً سرسید کا خاندان اس بات میں کسی قدر امتیاز رکھتا تھا۔ اُس کو ایسے تین مقدس گھرانوں سے قوی تعلق تھا جو نہ صرف دلّی میں بلکہ ہندوستان کے دور دراز حصوں میں مذہبی مقتدا و پیشوا

سمجھے جاتے تھے۔ اُن کے باپ کی ننھیال خواجہ[1] میر دردؔ کے خاندان سے علاقہ رکھتی تھی۔ خود سرسید کی ننھیال کے تمام زن و مرد شاہ عبدالعزیزؒ کے خاندان سے عقیدت رکھتے تھے اور اُن کے باپ سید متقی شاہ غلام علیؒ صاحب کے نہایت مقرب اور مخصوص ارادت مندوں میں سے تھے۔ شاہ صاحب اُن کو اپنا فرزند اور اُن کی اولاد کو اپنے پوتا پوتی سمجھتے تھے۔ سرسید کی والدہ جن کی آغوش تربیت میں انھوں نے نشو و نما پائی تھی نہایت دیندار اور شاہ غلام علی صاحبؒ کی مرید تھیں۔ اور اُن کے خاندان کے چھوٹے بڑے عموماً فرائض مذہبی کے پابند تھے۔ پس سرسید نے آنکھ کھول کر اپنے دائیں بائیں مذہب ہی کا جلوہ دیکھا تھا اور چوں کہ اُن کے خاندان کو ایسے گھرانوں سے جو جامع شریعت و طریقت سمجھے جاتے تھے ارادت مندانہ تعلق تھا اور اُن کے گھر میں ہر ایک کام ان بزرگوں کی ہدایت دارشاد کے موافق ہوتا تھا۔ اس لیے اُن کا گھر بہت سی ایسی جاہلانہ رسموں اور بے ہودہ ادہام اور لغو عقائد سے پاک تھا جن میں اکثر جاہل مسلمان کے خاندان گرفتار ہوتے ہیں۔ گویا سرسید کو ہوش سنبھالتے ہی اسلام کا وہ نقشہ نظر پڑا تھا جو عامیانہ خیالات اور جاہلانہ رسوم اور بدعات کے میل کچیل سے بالکل صاف تھا۔ پھر حسن اتفاق سے چند ایسے اسباب جمع ہو گئے کہ ان کو مولانا اسمٰعیل[2] شہید کی تصنیفات سے جن میں آزادی کی روح موجود تھی، زیادہ دلچسپی ہو گئی اور اس طرح وہ تقلید کی بندشوں سے رفتہ رفتہ آزاد ہوتے گئے۔ مگر غدر کے زمانے تک اُن

---

۱ خواجہ میر دردؔ: خواجہ میر ناصر کے بیٹے اور شاہ گلشن کے مریدوں میں سے تھے۔ سلوک و تصوف میں آپ کی بہت سی تصانیف قابل دید ہیں۔ ''تصوفانہ رنگ'' کے اُردو فارسی اشعار بھی خوب کہتے تھے۔ اُردو شعرا میں بہت بڑا پایہ رکھتے تھے۔ تمام عمر دہلی سے قدم باہر نہیں نکالا۔ نہایت متوکل، قانع اور بے پرواہِ بزرگ تھے۔ ۱۱۳۰ھ (۱۷۲۰ء) میں پیدا ہوئے اور ۶۶ سال کی عمر پا کر ۱۱۹۹ھ (۸۵-۱۷۸۴ء) میں وفات پائی۔

۲ مولانا اسمٰعیل شہیدؒ: حضرت شاہ عبدالغنی کے فرزند اور حضرت شاہ ولی اللہ کے پوتے تھے۔ نہایت ذہن وطبّاع، عالم و فاضل بزرگ اور خاندان کا فخر تھے۔ تبلیغ اسلام کا خاص جوش رکھتے تھے۔ آپ نے فقہ اور رد شرکت و بدعت میں بہت سی کتابیں تحریر فرمائی ہیں۔ ۱۲/ ربیع الثانی ۱۱۹۳ھ (۱۷۷۹ء) کو پیدا ہوئے۔ اور مولانا سید احمد بریلوی اپنے پیر کی زیر قیادت سکھوں سے جہاد کرتے ہوئے بالاکوٹ کے قریب ذی قدر ۱۲۴۶ھ مطابق مئی ۱۸۳۱ء میں شہید ہوئے۔

کے مذہبی خیالات میں کوئی بڑا انقلاب واقع نہیں ہوا۔ وہ اُسی شرک و بدعت اور تقلید و عدم تقلید وغیرہ کے جھگڑوں میں الجھے رہے اور اسی لیے اُن کی وہ مذہبی تصنیفات جو غدر سے پہلے کی ہیں چنداں امتیاز نہیں رکھتیں۔

ایک ہندی دوہے میں علمی بحث ومباحثے کو گڑیوں کے کھیل سے اور خدا کی معرفت کو بیاہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یعنی جب انسان کو خدا کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے تو جس طرح لڑکیاں بیاہ کا لطف اٹھانے کے بعد گڑیوں کے کھیل کو محض فضول سمجھنے لگتی ہیں اسی طرح آدمی خدا کی معرفت کا مزا پاکر علمی قیل وقال اور مذہبی بحث وجدال کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ غدر کے بعد سرسید کا بھی یہی حال ہوا۔ مسلمانوں کی ہمدردی نے مذہبی تحقیقات کا جو مفید پہلوان کو سمجھایا تھا اور جو لذت اس کاوش اور خلش میں ان کو حاصل ہوئی تھی اُس کے آگے ان کو اپنے پہلے مذہبی خیالات بچوں کا کھیل معلوم ہونے لگے۔

مسلمان مذہبی تعصّبات میں سخت بدنام تھے اور انھیں تعصّبات کی بدولت غدر کے بعد اُن کی پولیٹکل حالت کو سخت صدمہ پہنچا تھا اور آئندہ اس سے بھی سخت تر آفتوں کا سامنا نظر آتا تھا۔ سرسید کو جس طرح اسلام کے دینِ برحق ہونے کا یقین تھا اسی طرح اس بات کا بھی یقین تھا کہ سچا دین انسان کے حق میں خدا کی رحمت ہونا چاہیے اس لیے انھوں نے سمجھا کہ اسلام ہرگز ایسے تعصّبات کی تعلیم نہیں دے سکتا جن کی بدولت ہندوستان کی چھ کروڑ مخلوق طرح طرح کی آفات وحوادث کا نشانہ بن رہی ہے، ورنہ بجائے اس کے کہ اسلام کو خدا کی رحمت سمجھا جائے وہ انسان کے حق میں سخت ترین عذاب الٰہی ہوگا۔

ا۔ مسلمانوں کی پولیٹکل مشکلات

اگرچہ گزشتہ زمانوں میں اسلام کو جس قسم کی مشکلات پیش آئیں علمائے اسلام نے اُن کو بخوبی حل کیا اور اپنے فرائض کا حق پورے طور پر ادا کر گئے مگر جو مشکل اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کو درپیش تھی چوں کہ وہ کبھی اُن کے زمانے میں پیش نہیں آئی تھی اس لیے اُن کو اُس کے حل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ ایک ہزار برس سے زیادہ

عرصے تک مسلمانوں کو کسی غیر قوم کی رعایا ہونے کا بہت ہی کم اتفاق ہوا تھا۔ وہ ایک آدھ مستثنیٰ صورت[1] کے سوا ہمیشہ جہاں کہیں رہے حکمراں رہے اور غیر قومیں ان کی محکوم رہیں۔ اس لیے جو برتاؤ مسلمانوں کو اصولِ اسلام کے موافق کسی غیر قوم کے محکوم ہونے کی حالت میں اُس قوم کے ساتھ رکھنا چاہیے اُس کی طرف کبھی کسی کی توجہ مبذول نہیں ہوئی۔

حالاں کہ اسلام نے بادشاہ کے فرائض اُس کی حالت کے موافق اور رعیت کے فرائض اُس کی حالت کے موافق اور اسی طرح ہر طبقے کے مصالحِ معاش جدا جدا بیان کر دئے تھے مگر چوں کہ مسلمان کبھی (الا ماشاء اللہ) کسی کی رعیت بن کر نہیں رہے تھے۔ اس لیے رعیت ہونے کی حالت میں بھی وہ رعیت کے فرائض سے بے خبر رہے۔ انھوں نے اقبال کے دور دورہ میں ہمیشہ زمانے کو اپنے ساتھ موافق دیکھا تھا، اس لیے اوبار کی حالت میں بھی وہ اسی بات کے متوقع رہے کہ زمانہ اب بھی ہمارا ساتھ دے گا، ہم کو زمانے کا ساتھ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

۲۔ مسلمانوں کی مذہبی مشکلات

یہ مشکلات تو مسلمانوں کی پولیٹکل حالت سے علاقہ رکھتی تھیں مگر ان کے سوا دو نہایت سخت اور خطرناک مشکلیں خاص کر مذہب اسلام کو اس وقت اور درپیش تھیں۔

اولاً عیسائی مشنری (مبلّغ) جو تمام دُنیا میں دینِ مسیحی کی اشاعت میں سرگرم ہیں اور

---

[1] اس سے مراد تاتاریوں کی سلطنت ہے جو ایک مدت تک ایران و ترکستان اور دیگر ممالک میں مسلمانوں پر حکمراں رہے لیکن آغاز تسلط میں جب کہ چنگیر خاں نے خردج کیا، تاتاریوں اور مسلمانوں کے تعلقات ہرگز ایسے نہ تھے جیسے بادشاہ اور رعیت میں ہونے چاہئیں۔ چنگیز خاں کہتا تھا کہ خدا نے مجھ کو مسلمانوں کے غارت کرنے کے لیے پیدا کیا ہے اور مسلمان اس کو فی الواقع اپنے حق میں غضب الٰہی جانتے تھے۔ مگر آخر کو تاتاریوں کی سلطنت کی باگ مسلمانوں کے ہاتھ میں آ گئی تھی جس کو وہ ایک اسلامی سلطنت سمجھنے لگے تھے۔ یہاں تک کہ تین چار پشت کے بعد خود بادشاہ مسلمان ہو گیا اور اخیر تک وہ ایک اسلامی سلطنت رہی۔ پس اول میں بہ سبب غائت عداوت کے اور آخر میں بہ سبب کمال رسوخ کے وہ تعلقات پیدا ہی نہیں ہوئے جو بادشاہ اور رعیت میں ہونے چاہئیں اور اس لیے مسلمان ایک غیر قوم کی حکومت میں بھی فرائض رعیت سے بے خبر رہے۔

برٹش انڈیا میں اُس کے پھیلانے کو اپنا قدرتی حق سمجھتے ہیں، ان کا دانت ہندوستان کی قوموں میں سب سے زیادہ مسلمانوں پر تھا۔ اگر چہ غدر سے پہلے اکثر مسلمان عالموں نے اُن کے مقابلے میں اپنے قدیم طریقہ مناظرہ کے موافق عمدہ عمدہ کتابیں لکھی تھیں اور بعض نے اُن سے زبانی مناظرے بھی کیے تھے جن سے بلاشبہ مسلمانوں کو بہت بڑا فائدہ ہوا اور وہ عیسائیوں کا شکار ہونے سے بچ گئے لیکن غدر کے بعد مشنریوں نے مناظرہ کا قدیم طریقہ بالکل بدل دیا تھا اور جس قسم کے اعتراض انھوں نے اب اسلام اور داعی اسلامؐ پر کرنے شروع کیے تھے اُن کی تردید کے لیے مسلمانوں کو بھی مناظرے کا نیا طریقہ اختیار کرنا ضرور تھا۔ کیوں کہ جس طرح آج کل کی نو ایجاد بندوقوں کے سامنے پُرانی توڑے دار بندوقیں کچھ کام نہیں دے سکتیں۔ اسی طرح مشنریوں کے نئے طریقہ مناظرہ سے ہمارے قدیم طرز کے مناظرہ کا عہدہ برآ ہونا دشوار تھا چناں چہ سر ولیم[1] میور کی ''لائف آف محمدؐ'' جو چار جلدوں میں لکھی گئی تھی اس کی نسبت عیسائیوں میں مشہور تھا کہ کوئی کتاب اسلام کی جڑ کاٹنے والی عیسائی دُنیا میں ایسی نہیں لکھی گئی جیسی یہ ہے۔ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کے حق میں مشنریوں کا نیا طریقۂ نکتہ چینی حد سے زیادہ خطرناک تھا اور اس لیے ضرور تھا کہ مسلمان بھی اسلام کی طرف سے مدافعت کا نیا طریقہ اختیار کریں۔

دوسری مشکل جو اسلام کے حق میں پہلی مشکل سے بہت زیادہ خطرناک تھی، وہ یہ تھی کہ انگریزی تعلیم جس سے ہندوستانیوں کو کسی طرح مفر نہ تھا روز بروز ہندوستان میں پھیلتی جاتی تھی اور غدر کے بعد اُس کی ترقی کی رفتار نہایت تیز ہوگئی تھی۔ اگر چہ غدر سے پہلے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی کچھ اشاعت نہیں ہوئی تھی لیکن غدر کے بعد اس کے بغیر مسلمانوں کا اُبھرنا اور ہندوستان میں عزت سے رہنا محال ہوگیا تھا۔ یہاں تک کہ سرسید کو خود اُن میں تعلیم پھیلانی پڑی حالاں کہ انگریزی تعلیم کے نتائج اسلام کے حق میں مشنریوں کی پریچنگ (تبلیغ مذہب) سے زیادہ اندیشہ ناک تھے۔ یورپ میں جو سخت صدمہ علوم جدیدہ کی تعلیم سے دین عیسوی کو پہنچا تھا وہی صدمہ اُن کی اشاعت سے ہندوستان میں

---

[1] سر ولیم میور صوبہ متحدہ آگرہ واودھ کے لفٹنٹ گورنر تھے۔

اسلام کو پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ اور اس مشکل کا اس طرح مقابلہ کرنا کہ مغربی تعلیم مسلمانوں میں جاری نہ ہونے دے جائے اول تو مسلمانوں کی طاقت سے باہر تھا کیوں کہ وہ جس طرح ہندوستان میں روز بروز پھیلتی جاتی تھی اسی طرح تمام دُنیا میں، یہاں تک کہ ممالک اسلامیہ یعنی ٹرکی، مصر اور ایران وغیرہ میں بھی عام ہوتی جاتی تھی۔ دوسرے مغربی علوم کی تعلیم کو اس خوف سے کہ مبادا مذہبِ اسلام کو اُن سے صدمہ پہنچے، روکنا اور اُن کے انسداد میں کوشش کرنا گویا اس بات کو تسلیم کر لینا تھا کہ اسلام علومِ جدیدہ کی روشنی کے آگے نہیں ٹھہر سکتا اور مثل دیگر مذاہب کے اسلام بھی سائنس کے حملے کی تاب نہیں لاسکتا۔

یہ تمام مشکلات ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کو درپیش تھیں اور چھ کروڑ مسلمانوں میں صرف ایک سید احمد خاں ان تمام مشکلوں کا سمجھنے والا، اُن کے انجام کا سوچنے والا اور اُن کا مقابلہ کرنے والا تھا۔

ہمارے مسلم الثبوت علماء کو اول تو ان مشکلات کا احساس ہونا ہی دشوار تھا، اور اگر بالفرض ان کو احساس بھی ہوتا تو ان مشکلات کا تدارک اُن کے احاطۂ قدرت سے خارج تھا کیوں کہ تقلید کی بدولت اُن میں اس بات کی قابلیت باقی نہیں رہی تھی کہ اگر مذہب کے متعلق کوئی ایسی نئی مشکل پیش آئے جو اگلے علماء کو پیش نہیں آئی اور جس کا حل ان کی کتابوں میں صراحتہ موجود نہ ہو تو اس کے حل کرنے میں اپنی سمجھ بوجھ سے کام لے سکیں اور اس کا علاج خود قرآن و حدیث میں جو دینیات کے اصلی مخرج ہیں تلاش کر سکیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ مذہبی مشکلات کے حل کرنے والی صرف فقہ اور تفسیر اور علمائے سلف کی کتابیں ہیں۔ قرآن محض تلاوت کے لیے حدیث محض سند لینے کے لیے، عقل انسانی، امورات مذہبی میں محض معطل و بے کار رہنے کے لیے ہے اور بس۔

جو مشکلات اسلام اور مسلمانوں کو اس وقت درپیش تھیں اُن کے مقابلے کے لیے کسی عالمِ متبحر کی ضرورت نہ تھی بلکہ ایک ایسے معمولی استعداد کے آدمی کی ضرورت تھی جو صاحبِ عقلِ سلیم ہو، قدیم طریقۂ تعلیم کا منتر اُس پر کارگر نہ ہوا ہو، دُنیا کے حالات سے باخبر ہو، علوم جدیدہ کی طاقت سے واقف ہو، تقلید کی بندش سے آزاد ہو، لومتہ لائم سے خائف نہ

ہو، اسلام اور مسلمانوں کا حقیقی خیر خواہ اور جاں نثار ہو۔

سرسید نے غدر کے زمانے سے لے کر اخیر دم تک ان تمام مشکلات کا مقابلہ کیا۔ انھوں نے دلائل عقلیہ سے، قرآن و حدیث کے حوالوں سے، ممالکِ اسلامیہ کے موجودہ علمدرآمد سے بے شمار ثبوت اس بات کے دئے کہ عیسائیوں کے ساتھ سچے دل سے دوستی کا برتاؤ کرنا، اُن کے ساتھ دوستانہ میل جول رکھنا، ان کے کھانوں اور دعوتوں میں شریک ہونا، مصالح دنیوی میں اُن کی پیروی کرنا، اُن کی زبان اور اُن کے علوم سیکھنا، اُن کے اڑے وقت میں کام آنا، اُن کے مصائب میں اُن کے ساتھ ہمدردی کرنا، عین اسلام کی تعلیم کا مقتضا ہے اور جس طرح قرآن کی رُو سے کوئی قوم عیسائیوں سے بڑھ کر مسلمانوں کی دوست نہیں ہے اسی طرح مسلمانوں کو بھی اُن کا خالص و مخلص دوست ہونا ضرور ہے۔

اُنھوں نے پر زور مذہبی دلائل سے ثابت کیا کہ انگریزی حکومت میں رہ کر مسلمانوں کا مذہبی فرض ہے کہ سلطنت کی اطاعت خیر خواہی اور وفاداری میں ثابت قدم رہیں اور جب کبھی سلطنت کو کوئی مشکل پیش آئے تو جان و مال سے اُس کا ساتھ دیں۔ غرض اُن کو طرح طرح سے عقلی اور نقلی دلائل کے ساتھ یقین دلایا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا عزت و آبرو سے رہنا اُسی حالت میں ممکن ہے جب کہ وہ برٹش گورنمنٹ کی وفادار اور خیر خواہ بن کر رہیں۔

سرسید کی تعلیم کا اثر

(قومی نفرت اور مذہبی تعصب دور ہو گیا)

اس باب میں جو کچھ سرسید نے لکھا اگر چہ وہ ایک آدھ بات کے سوا بالکل اصول اسلام کے مطابق تھا لیکن چوں کہ اس میں بہت سی ایسی باتیں شامل تھیں جو ہندوستان کے مسلمانوں نے پہلے کبھی دیکھی یا سنی نہ تھیں اور مذہبی تعصّبات کے ساتھ قومی تعصب بھی شامل تھا اور جس شخص کی زبان یا قلم سے باتیں نکلتی تھیں وہ ایک دُنیادار آدمی سرکار انگریزی کا ملازم اور مذہبی تقدس کے لباس سے معرا تھا اس لیے ایک مدت تک مخالفتیں ہوتی رہیں، مگر آخر کار ہندوستان

کے تمام سمجھ دار مسلمانوں کو سرسید کی نصیحتیں تسلیم کرنی پڑھی اور اُن پر عمل کرنا پڑا۔

جو مسلمان مذہبی خیالات کے سبب انگریزی تعلیم سے نفرت کرتے تھے اُن کے خیالات بدل گئے۔ یہاں تک کہ جن مولویوں نے مدرستہ العلوم کے قائم کرنے پر سرسید کے اوپر کفر کے فتوے لکھے تھے اُن میں سے بعض کی اولاد کو خود انگریزی تعلیم پاتے ہوئے دیکھا گیا۔

ٹرکی لباس جو انگریزی لباس سے بہت مشابہ تھا اور اس لیے مسلمان اُس کے سایہ سے بھڑکتے تھے وہ مسلمان نو جوانوں میں عموماً پھیل گیا۔

ہزاروں آدمی میز کرسی پر چھری، کانٹے سے کھانے لگے اور لاکھوں اس کو جائز اور مباح سمجھنے لگے۔

جو لوگ انگریزوں کے ساتھ کھانا کھانے پر سخت معترض تھے وہ فخریہ اُن کی دعوتیں کرنے لگے اور اُن کے ہاں دعوتوں میں جانے لگے اور اُن کے ساتھ انھیں کے ہاں کا ذبیحہ اور انھیں کے باورچی خانہ کا پکا ہوا ایک میز پر بیٹھ کر کھانے لگے۔

تعلیم کے لیے اولاد ولایت بھیجنے لگے جو وہاں جا کر انگریزوں کے ساتھ شیر وشکر ہو جاتے ہیں۔

علی گڑھ محمڈن کالج جہاں مسلمان طلبہ اپنے یورپین استادوں کے ساتھ بالکل اُسی طریقے سے معاشرت رکھتے ہیں جیسے مسلمان آپس میں ایک دوسرے سے رکھتے ہیں، وہاں کوئی مسلمان اپنی اولاد کے بھیجنے میں پس وپیش نہیں کرتا۔ الا ماشاءاللہ۔

اسی قسم کی اور بہت سی سوشل تبدیلیاں جو مسلمانوں کی سوسائٹی میں سرسید کی مذہبی تحریروں سے ظہور میں آئی ہیں ایسی صاف اور صریح ہیں کہ کوئی شخص اُن کا انکار نہیں کرسکتا۔

ا۔ سرسید کے پولیٹکل کارنامے

اب دیکھنا یہ ہے کہ مسلمانوں کے پولیٹکل خیالات پر سرسید کی تحریروں نے کیا اثر کیا ہے؟ اگرچہ اکثر مذہبی مسائل میں لاکھوں مسلمان اب تک سرسید کے سخت مخالف رہے ہیں

مگر جو کچھ انھوں نے گورنمنٹ اور رعیت کے تعلقات کی نسبت مذہب اسلام کی رو سے لکھا ہے اُس کو ہندوستان کے تمام مسلمانوں نے بالاتفاق تسلیم کیا ہے اور گو سرسید کو مسلمانوں نے اپنا مذہبی پیشوا نہیں مانا۔ لیکن شاید ہندوستان میں ایسا ایک مسلمان بھی نہ ہوگا جس کو اُن کے قومی پولیٹکل لیڈر ہونے میں کچھ تامل ہو۔ اس کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس جو درحقیقت کوئی باغیانہ یا خلافِ قانون مجمع نہ تھا مگر مسلمانوں کی پولیٹکل حالت کے لحاظ سے اُن کا اُس میں شریک ہونا سرسید کے نزدیک خلاف مصلحت تھا، جس وقت سرسید نے اُس کی مخالف کی اور مسلمانوں کو اس میں شریک ہونے سے روکا تو بہ استثنائے معدودے چند تمام ہندوستان کے مسلمان کیا سنی اور کیا شیعہ، کیا وہابی اور کیا غیر وہابی، کیا پڑھے لکھے اور کیا اَن پڑھ، کیا وہ لوگ جو سرسید کی پارٹی میں گنے جاتے تھے اور کیا وہ جماعتِ کثیر جو ہر بات میں اُن کی مخالفت کرتی تھی، سب نے بالاتفاق نیشنل کانگریس سے ہمیشہ کے لیے صرف اس بناء پر علیحدگی اختیار کی کہ سید احمد خاں کے نزدیک اُن کا شریک ہونا مناسب نہ تھا اور لاکھوں مسلمانوں نے اُن کاغذوں پر آنکھیں بند کر کے دستخط کر دیے جو ''پیٹریاٹک ایسوسی ایشن'' نے اس بات کا ظاہر کرنے کو ولایت بھیجے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان کانگریس میں شریک نہیں ہیں۔

سب سے زیادہ وفاداری اور لائلٹی (وفاداری) کی مستحکم بنیاد جو سرسید کی مذہبی تحریروں نے مسلمانوں میں قائم کی ہے وہ انگریزی تعلیم کی مزاحمتوں کو دور کر کے اُن کو عام طور پر اُس کی طرف متوجہ کرنا اور خاص کر اُن کی تعلیم کے لیے محمڈن کالج کا قائم کرنا ہے۔ جس کی وجہ سے نہایت وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جس قدر اعلیٰ تعلیم مسلمانوں میں پھیلتی جائے گی اسی قدر وہ تاجِ برطانیہ کے زیادہ وفادار اور گورنمنٹ کے زیادہ معتمد علیہ بنتے جائیں گے۔

یہاں تک ہم نے ایک نہایت مختصر بیان اُن نتائج کا کیا ہے جو سرسید کی اُن تحریروں سے پیدا ہوئے جو انھوں نے مسلمانوں کی مذہبی غلط فہمیوں کی اصلاح کے لیے وقتاً فوقتاً شائع کیں۔ مگر اُن کے سوا جو کچھ کہ انھوں نے حکمراں قوم کے اُن شکوک وشبہات کے رفع کرنے

کے لیے جو غدر کے بعد اسلام کے بعض مذہبی مسائل کی نسبت اُن میں عموماً پھل گئے تھے اور جن سے مسلمانوں کی پولیٹکل حالت نہایت نازک ہوگئی تھی، گزشتہ چالیس برس میں لکھا وہ بھی ایک دفتر طویل الذیل ہے، جس میں متعدد کتابیں اور رسالے اور بے شمار آرٹیکل شامل ہیں۔ اگرچہ ان تمام تحریروں میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جس کا شریعتِ اسلامیہ میں کافی ثبوت موجود نہ ہو مگر جس بسط اور تفصیل کے ساتھ اور جس خوبی وصفائی سے سرسید نے ان مضامین کو بیان کیا ہے نہ اس صدی میں اور نہ گزشتہ اسلامی صدیوں میں (شاید اس وجہ سے کہ پہلے کبھی اُن کی ضرورت پیش نہیں آئی) کسی مسلمان عالم نے نہیں لکھا۔

ان تحریروں کا مفصل حال اور جو اثر انھوں نے حکمراں قوم کے دل پر کیا اس کو سرسید کی لائف میں جو عنقریب چھپنے والی ہے دیکھنا چاہیے۔ یہاں صرف اس قدر لکھنا کافی ہے کہ سرسید ان کی تحریروں سے جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے انگریزوں کی بہت کچھ غلط فہمیاں جو اُن کو مسئلہ جہاد۔ وہابیوں کے اصول اور بعض دیگر مسائل کی نسبت تھیں، رفع ہوگئی ہیں۔

سرسید ہی کی تحریر کا یہ اثر تھا کہ جس وقت ڈاکٹر ہنٹر کی اُس کتاب پر جو انھوں نے غدر سے دس بارہ برس بعد مسلمانوں اور خاص کر وہابیوں کے برخلاف لکھی تھی سرسید کا ریویو ہندوستان اور انگلستان میں شائع ہوا تھا تو تمام انگریز جن کو ڈاکٹر موصوف کی کتاب نے مسلمانوں پر نہایت بُرا فروختہ کر رکھا تھا، سب کے خیالات بالکل بدل گئے اور ڈاکٹر ہنٹر جیسے مشہور اور نامور مصنف پر اعتراضوں کی بوچھار پڑنے لگی۔ یہاں تک کہ ہندوستان کے ایک اینگلو انڈین اخبار نے ان کی نسبت صاف لکھ دیا کہ ''اصلی واقعات کے محقق ہونے کی ناموری اُن کے (یعنی ڈاکٹر ہنٹر کے) ہاتھ سے ایسی گئی ہے کہ پھر کبھی اُن کی میسر ہونے والی نہیں ہے۔'' اور ایک جلیل القدر حاکم نے جو غالباً سر ولیم میور تھے وہابیوں کی نسبت جن کی صفائی کے لیے سرسید نے ریویو لکھا تھا، یہ ریمارک کیا کہ ''وہابی وہ ہے جو خالصاً خدا کی عبادت کرتا ہو، موحد ہو اور اس کا اسلام ہوائے نفسانی اور بدعت کی آمیزش سے پاک ہو۔ اس کو یہ کہنا کہ وہ ہمیشہ در پردہ تخریبِ سلطنت کی فکر میں رہتا ہے اور چپکے چپکے منصوبے باندھا کرتا ہے اور غدر اور بغاوت کی تحریک کرتا ہے۔ محض تہمت ہے۔'' سر ایلفر ڈلائل اپنے

ایک اِسّے (مضمون) میں جو سرسید کے ریویو کے بعد تھیالوجکل ریویو میں شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریمارک کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''اس مصنف کو مبالغے کا جن بسا اوقات نہایت پریشان کرتا ہے اور بہتر ہوتا اگر اس جن کو وہ اتار دیتا۔'' ہم نے سنا ہے کہ کئی برس پہلے سے جو بنگال میں وہابیوں کی گرفتاری برابر جاری تھی سرسید کا ریویو نکلنے کے بعد پھر کوئی وہابی گرفتار نہیں کیا گیا۔

انھیں دنوں میں ''تہذیب الاخلاق'' کے مذہبی مضامین دیکھ کر سرسید کے ایک انگریز دوست نے اُن کو لکھا کہ ''تہذیب الاخلاق نے ثابت کر دیا کہ اسلام ایسا تنگ و تاریک رستہ نہیں ہے جیسا کہ خیال کیا جاتا تھا۔''

سب سے پہلے جب کہ غدر کو دو ہی تین برس گزرے تھے سرسید کو اس مقصد کے پورا کرنے کے لیے کہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں مصالحت کرائی جائے اور دونوں قوموں کے مذہبی تعصّبات اور مذہبی غلط فہمیوں کو دور کیا جائے۔ ایک ایسے عظیم الشان کام کا خیال آیا تھا جس کا اُن سے پہلے تیرہ سو برس (1300) میں کسی مسلمان کو خیال نہیں آیا۔

انھوں نے نہایت مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ بائبل کی تفسیر اہل اسلام کے اصول کے موافق لکھنی شروع کی تھی جس کی صرف دو جلدیں چھپنے پائی تھیں کہ مالی مشکلات کے سبب اس ارادے سے دست بردار ہونا پڑا۔

اس تفسیر کی نسبت فرانس کا مشہور اورنٹیلسٹ (مستشرق) مسٹر گارسن[1] ڈی ٹاسی پروفیسر اُردو لٹریچر اپنے ایک لکچر میں لکھتا ہے کہ:-

> ''میں اپنے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ یہ کتاب ایسی زبان میں لکھی گئی ہے جس کا سکھانا میرا فرض ہے کیوں کہ مجھ کو یقین ہے کہ یہ پہلا ہی موقع ہے کہ کسی مسلمان نے نہ صرف اُردو میں بلکہ ایشیا کی کسی زبان میں اس

---

[1] ڈی ٹاسی ۱۷۹۴ء میں فرانس میں پیدا ہوا اور وہیں ۱۸۷۸ء میں وفات پائی۔ اکثر یورپین زبانوں کے علاوہ عبرانی، سریانی، کلدانی، سامری، عربی اور فارسی زبانوں کا ماہر تھا۔ اُردو زبان کا پروفیسر تھا۔ اُردو مصنّفین اور شعرا کا بہت بڑا تذکرہ تین جلدوں میں لکھا ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی کتابیں اُردو زبان اور اس کے قواعد پر تصنیف کی ہیں، اُردو کے محسنوں میں سے ہے۔

قسم کے مضمون پر ایسی بسیط اور مکمل بحث کی ہو۔''

یہ کتاب اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھی گئی تھی تا کہ ہندوستان کے مسلمان اور یورپ کے عیسائی دونوں اُس کے مضامین سے مطلع ہوں اور اُس کے نسخے بہ نسبت ہندوستان کے یورپ میں زیادہ شائع ہوئے تھے۔

غالباً اسی کتاب کا یہ نتیجہ ہے کہ ٹرکی اور مصر وغیرہ کے کئی عیسائی عالموں نے جیسا کہ سر سید کی لائف میں مفصل بیان کیا گیا ہے اسلام اور کرسچینیٹی (عیسائیت) میں اتحاد اور مصالحت پیدا کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ یہاں تک کہ جس طرح سر سید نے اپنی تفسیر میں دعویٰ کیا ہے کہ تثلیث کا مسئلہ انجیل کی کسی آیت سے ثابت نہیں ہوتا اسی طرح مصر کے ایک عیسائی عالم نے جو اخبار ''شہادۃ الحق'' کا اڈیٹر ہے اپنی کتاب ''وحدۃ الادیان ووحدۃ الایمان فی التوراۃ والانجیل والقرآن'' میں لکھا ہے کہ تثلیث کا مسئلہ بائبل میں کہیں نہیں ہے، اس لیے عیسائیوں کی ہٹ دھرمی ہے کہ قرآن کے عمدہ عقیدۂ توحید کو نہ مانیں۔

۲۔ سر سید کی مذہبی خدمات

اب ہم نہایت مختصر ذکر سر سید کی اُس غیر معمولی سرگرمی اور عجیب وغریب لیاقت کا کرتے ہیں جو دینِ اسلام کی حمایت میں بحیثیت اس کے دینِ برحق ہونے کے اخیر دم تک اُن سے ظاہر ہوتی رہی ہے اور جس کی رو سے ٹھیک طور پر اُن کو اسلام کے جدید علم کلام کا موجد اور سائنس اور مذہب میں دائمی صلح کی بنیاد ڈالنے والا کہا جا سکتا ہے۔

جو کچھ سر سید نے اسلام کی حمایت میں بمقابلہ عیسائیوں کے لکھا ہے اس میں سب سے زیادہ لحاظ کے قابل وہ بارہ اِسّے یا خطبے ہیں جو انھوں نے سر ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' کی پہلی جلد کے جواب میں لکھے ہیں اور جو اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں چھپ گئے ہیں۔ لیکن جو شخص اس کتاب کی اصل خوبی اور مصنف کی لیاقت سے پوری پوری واقفیت حاصل کرنی چاہے اُس کو چاہیے کہ اُردو اڈیشن کا مطالعہ کرے، کیوں کہ انگریز اڈیشن درحقیقت اُردو اڈیشن کا خلاصہ ہے جس میں بہت سی باتیں بہ نسبت اُردو اڈیشن کے

نہایت اختصار کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔ چوں کہ اس کتاب کا لکھنا سرسید کی مذہبی خدمات میں ایک جلیل القدر خدمت ہے اور اُس کا بیان بہت طولانی ہے جس کی اس مضمون میں گنجائش نہیں ہے اس لیے ہم اس موقع پر اُس کی نسبت زیادہ لکھنا نہیں چاہتے کیوں کہ سرسید کی لائف میں اُس کا مفصل بیان کیا گیا ہے۔ یہاں صرف اس قدر سمجھ لینا چاہیے کہ سرسید سے پہلے جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہوا ہے کبھی کسی مسلمان نے مثل ''خطباب احمد یہ'' کے کوئی ایسی کتاب جس میں اسلام کی خوبیاں ظاہر کی گئی ہوں یا اُس کے مخالفوں کے اعتراضات کے جوابات دئے گئے ہوں اُن قوموں کے ملک میں جا کر جن کو مسلمان گمراہ سمجھتے ہیں اور جن پر اسلام کا عرض کرنا اپنا فرض جانتے ہیں، انھیں قوموں کی زبان میں لکھ کر شائع نہیں کی۔ ایک بہت بڑے عیسائی عالم ریورنڈر ہو پر نے جو ایک زمانے میں لاہور ڈیونٹی کالج کے پرنسپل تھے میرے ایک مسلمان دوست سے کہا تھا:-

''خطبات احمد یہ لکھنے سے سید احمد خاں نے اسلام کی ایک ایسی خدمت کی ہے جو تیرہ سو برس میں کسی مسلمان سے بن نہیں آئی۔''

اگرچہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اب تک اس کتاب کی کچھ قدر نہیں کی بلکہ معدددے چند کے سوا اس کو کسی مسلمانوں نے دیکھا بھی نہیں، مگر امید ہے کہ جب وہ ان ضرورتوں کو سمجھیں گے جو مسلمانوں اور اسلام کو فی زمانناد رپیش ہیں اور جن کو سید احمد خاں کے سوا بہت ہی کم آدمیوں نے اب تک سمجھا ہے تو اُس کی صرف قدر ہی نہیں کریں گے بلکہ فخر کریں گے کہ اُس کا لکھنے والا ایک ہندوستان کا مسلمان تھا۔ جس زمانے میں سرسید لندن میں یہ کتاب لکھ رہے تھے اس وقت ٹرکی کے ایک مسلمان عالم سے وہاں اُن کی ملاقات ہوئی تھی سرسید نے اپنی کتاب کے چند مقالات اس کو سنائے تو اس کا یہ حال تھا کہ وہ بار بار سرسید کے ہاتھ چومتا تھا اور بچھا جاتا تھا۔

کرنل گریہم سرسید کی لائف میں اسی ''خطبات احمد یہ'' کی نسبت لکھتے ہیں:-

''جو لوگ (یعنی انگریز) مذہبی باتوں سے دلچسپی رکھتے ہیں اُن کو چاہیے کہ اس کتاب کو غور سے پڑھیں۔ دین محمدی فی زمانناانگریزوں کے نزدیک

بالکل ایک غیر معقول اور سخت مہتم دین ہے اور وہ اس کو ایک روحانی آفت خیال کرتے ہیں جیسے کہ ہمارے بزرگ اس صدی کے شروع میں بونا پارٹ کو ایک جسمانی آفت خیال کرتے تھے۔ وہ (یعنی اسلام) عموماً ایک تلوار کا مذہب خیال کیا جاتا ہے اور ہر ایک چیز تعصب مغائرت اور تنگ دلی کی اُس میں خیال کی جاتی ہے۔لیکن ہمارے ناظرینِ کتاب جو اس غلطی میں مبتلا ہیں جب سید احمد خاں کی اس کتاب کو غور سے پڑھیں گے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ بالکل دوسرے خیالات لے کر اُٹھیں گے۔
ہمارے مصنف (یعنی سید احمد خاں) نے اپنے دلی دوست سر ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' کی تحریریں کی مخالفت کی ہے اور خوب برچھیاں توڑی ہیں اور میں خیال کرتا ہوں کہ بے تعصب اور دقیقہ سنج ناظرین کتاب بہت سی باتوں میں سر ولیم میور کے خلاف فیصلہ دینے میں اتفاق کریں گے۔''

انگلستان کے اخبار ''انکوائرر'' میں جب کہ ''خطبات احمدیہ'' وہاں شائع ہوئی ایک مبسوط ریویو (جس کا خلاصہ سرسید کی میں درج کیا گیا ہے) کسی آزاد خیال انگریز نے اس کتاب پر لکھا تھا۔جس میں توقع سے بہت زیادہ اُس کی تعریف کی تھی اور بڑے بڑے اہم مسائل میں سرسید کے جوابوں کو تسلیم ہی نہیں کیا تھا بلکہ اُن کی حد سے زیادہ داد دی تھی اور سر ولیم میور نے ڈاکٹر اسپرنگر کے مقابلہ میں سرسید کی کامیابی کا اعتراف کیا تھا۔اس سے بہتر ایک ایسی کتاب کے حق میں جو عیسائیوں کے مقابلے میں لکھی گئی ہو اور کیا شہادت ہوسکتی ہے کہ خود عیسائی قوم کے متعدد ممبروں نے اُس کی نسبت ایسی عمدہ رائے ظاہر کی ہے۔

اس کتاب میں چند جزوی اختلافات کے سوا جن کا ایک محقق مصنف کی کتاب میں ہونا لابدی ہے کوئی ایسی بات نہیں ہے جو جمہورِ اہل اسلام کے خلاف ہو اور امید ہے کہ جس قدر تعصّبات کا طوفان فرو ہوتا جائے (اور اس کے فرو ہونے کا وقت اب آ گیا ہے) اسی قدر اس کتاب کی وقعت روز بروز مسلمانوں میں زیادہ ہوتی جائے گی۔

سب سے زیادہ اہم اور قابل غور سرسید کی وہ مذہبی خدمت ہے جو اُن کے اخیر دم تک برابر جاری رہی۔ یعنی ''تفسیر القرآن'' کا لکھنا جس کا اصل مقصد تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کے خیالات کی اصلاح کرنا اور اسلام کو سائنس کے حملوں سے بچانا تھا۔ جس نیت سے سرسید نے یہ تفسیر لکھنی شروع کی اور جن ضرورتوں نے ان کو اُس کے لکھنے پر مجبور کیا تھا اُس کا مفصل بیان انھوں نے اپنے ایک لکچر میں کیا ہے جو لاہور میں اسلام پر دیا گیا تھا اور جو سفر نامۂ پنجاب میں اور اُن کی اسپیچوں اور لکچروں کے مجموعے میں چھپ گیا ہے۔ اس لکچر میں انھوں نے اس تفسیر کے لکھنے کا اصل منشا ایسی سچائی اور خلوص اور جوش اسلامی کے ساتھ بیان کیا تھا کہ اُن کے ایک سخت مخالف مولوی نے جو اُن کے برخلاف رسالے شائع کرتے تھے اور اُن کو نفریں و ملامت کے گمنام خط لکھتے تھے، لکچر ختم ہونے کے بعد علیٰ رؤس الاشہار اپنی غلط فہمی کا اقرار کیا اور سرسید سے اپنے قصوروں کی معافی چاہی اور خود اپنے اوپر یہ جرمانہ کیا کہ اپنی ایک پوری تنخواہ کالج کے چندے میں دی۔

اس تفسیر پر بھی سرسید کی لائف میں مفصل ریویو کیا گیا ہے جو کسی قدر طویل ہے۔ یہاں صرف اس مختصر بیان پر اکتفا کرنا چاہیے کہ جس وقت سرسید کو مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے کا خیال پیدا ہوا اُسی وقت سے اُن کو اس بات کی فکر تھی کہ جس قدر دنیوی ترقی کے لیے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی طرف مائل کرنا ضرور ہے اُس سے بہت زیادہ اس بات کی ضرورت ہے کہ اُن کو تعلیم کے اُن مضر نتائج سے جو مذہب کے حق میں اُس سے پیدا ہونے نظر آتے ہیں جہاں تک ممکن ہو بچایا جائے۔

سرسید دیکھتے تھے کہ جو لوگ انگریزی تعلیم پاتے ہیں خواہ ہندو ہوں خواہ مسلمان اور خواہ عیسائی، اُن کے دل میں مستثنیٰ صورتوں کے سوا عموماً مذہب کی وقعت باقی نہیں رہتی۔ وہ جانتے تھے کہ اسی تعلیم کی بدولت روز بروز الحاد اور دہریت پھیلتی جاتی ہے اور عیسائی مذہب میں ضعف آتا جاتا ہے، اس لیے ان کو خوف تھا کہ جو تعلیم وہ مسلمانوں میں پھیلانی چاہتے ہیں اور جو ضرور اُن میں پھیلنے والی ہے۔ مباداً اس سے ویسے ہی مضر نتائج اسلام کے حق میں پیدا ہوں۔ چناں چہ ۱۸۷۶ء میں کہ یہی زمانہ مسلمانوں میں تعلیم کی بنیاد پڑنے اور کالج کے

کھلنے کا ہے اور تقریباً یہی زمانہ سرسید کی تفسیر شروع ہونے کا معلوم ہوتا ہے، انھوں نے ایک اسپیچ میں (خاص کر مدرستہ العلوم کے طلبہ سے مخاطب ہوکر) کہا تھا کہ "یاد رکھو سب سے سچا کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّد" رَّسُوْلُ اللّٰهِ ہے، اسی پر یقین کرنے سے ہماری قوم، ہماری قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ کیا اور اِس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے۔ پھر اگر تم آسمان کے تارے ہوگئے تو کیا۔ پس امید ہے کہ تم ان دونوں باتوں (یعنی علم اور اسلام) کے نمونے ہوگے اور جب ہی ہماری قوم کی عزت ہوگی۔"

باوجود اُس اندیشے کے جو اُن کو انگریزی تعلیم سے اسلام کے حق میں تھا، اُن کو اس بات کا بھی یقین تھا کہ خالص اسلام کو وہ ٹھیٹ اسلام کہتے تھے اور جو اُن کے نزدیک حالتِ موجودہ میں صرف قرآن مجید میں منحصر تھا، اس کو انگریزی تعلیم سے وہ صدمہ ہرگز نہیں پہنچ سکتا جو یورپ اور امریکہ میں عیسائی مذہب کو پہنچا ہے۔ اُن کو معلوم تھا کہ مغربی تعلیم سے جو ایک عام یقین ایجوکیٹڈ (تعلیم یافتہ) نوجوانوں کے دل پر نقش ہو جاتا ہے وہ یہ ہے کہ دُنیا میں کوئی امر لا آف نیچر یعنی قانونِ فطرت کے خلاف وقوع میں نہیں آتا۔ اور اس لیے جو چیز وہ مذہب میں ایسی پاتے ہیں جو قانونِ فطرت کے خلاف معلوم ہوتی ہے اُس پر یقین نہیں کرتے۔ سرسید کو بھی اس اصول پر ایسا ہی یقین تھا اور اسی کے ساتھ یہ بھی یقین تھا کہ قرآن میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو درحقیقت قانونِ فطرت کے خلاف ہو۔ مگر اُن کا قول تھا کہ قرآن چوں کہ کافۂ انام کی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے اس لیے اس کا طرز بیان ایسا واقع ہوا ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ اُمّی اور جاہل سے لے کر اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کے عالم اور حکیم تک سب اپنی اپنی سمجھ کے موافق اس سے ہدایت پاتے ہیں۔ پس گو اُس کی ظواہر آیات سے اکثر موقعوں پر عام ذہنوں میں فوق العادۃ امور کا واقع ہونا سمجھا جاتا ہے مگر جب آیتوں پر تعمق نظر کے ساتھ غور کیا جاتا ہے تو اُن میں کوئی بات عادت الٰہی یا قانونِ فطرت کے خلاف نہیں معلوم ہوتی۔

اسی اصول پر انھوں نے "تفسیر القرآن" لکھنی شروع کی جو قریب نصف قرآن کے چھ جلدوں میں چھپ چکی ہے اور بہ قدر ایک جلد کے اُس کا قلمی مسودہ موجود ہے۔

جس طرح سرسید کے اوراکثر کام سب سے نرالے اوراچھوتے تھے اسی طرح اس تفسیر کا بھی سب سے نرالا کام تھا۔ تیرہ سو برس میں کسی مسلمان نے قرآن کی تفسیر اس اصول پر نہیں لکھی کہ قرآن میں کوئی بات قانونِ فطرت کے خلاف نہیں ہے اگرچہ اس میں شک نہیں کہ جس کتاب کی نسبت یہ یقین کیا جائے کہ وہ سرتا سر خدا کا کلام ہے اُس کی سچائی کا اس سے بہتر کوئی معیار نہیں ہوسکتا کہ اُس میں کوئی بیان درحقیقت قانونِ فطرت کے خلاف نہ ہو۔مگر جس طرح یہ کہنا آسان ہے کہ ''خدا کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں۔'' لیکن اُس کے ہرایک کام کی مصلحت بیان کرنی سخت مشکل ہے۔اسی طرح یہ کہنا تو بہت آسان ہے کہ ''قرآن میں کوئی بات قانونِ فطرت کے خلاف نہیں۔'' مگر قرآن کے ہر ایک بیان کو قانونِ فطرت پر منطبق کرنا نہایت دشوار ہے۔کیوں کہ جو کتاب خدا کی طرف سے تمام دُنیا کی ہدایت کے لیے آئی ہو اُس کی شان یہی ہے کہ اُس میں کوئی بات عام لوگوں کی سمجھ سے بالاتر نہ ہواوراس لیے ضرور ہے کہ اس میں بہت سی باتیں ایسے پیرایوں میں کی جائیں کہ اگر اُن کو ظاہری معنوں میں محدود رکھا جائے تو وہ کسی طرح علمی تحقیقات کی میزان میں پوری نہ اُترسکیں۔

بہرحال سرسید نے یہ ایک ایسا مشکل کام اختیار کیا تھا کہ اگر کوئی اور شخص ایسا ارادہ کرتا تو مشکلات کا ہجوم دیکھ کر اس ارادہ سے کبھی کا دست بردار ہوگیا ہوتا۔مگر انھوں نے باوجود ایسی مشکلات کے اور باوجود اپنے ہم مذہبوں کی سخت مخالفت کے اس ارادے کو اخیر دم تک ترک نہیں کیا بلکہ اس کو اپنی زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد اور اسلام کی خیرخواہی کا سب سے بڑا کام سمجھا۔

اگرچہ اُن کو اس تفسیر کے اکثر مقامات میں توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی ہے جس سے ایک عجیب وغریب تھیالوجکل (مذہبی) قابلیت اُن کے دماغ میں ثابت ہوتی ہے مگر اسی کے ساتھ بہت سے مقامات ان کی تفسیر میں ایسے بھی موجود ہیں جن کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ایسے عالی دماغ شخص کو کیوں کہ ایسی تاویلات باردہ پر اطمینان ہوگی اور کیوں کہ ایسی فاحش غلطیاں ان کے قلم سے سرزد ہوئی ہیں؟ لیکن درحقیقت یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے

جن لوگوں نے تقلید کی بندشوں کو توڑ کر تحقیق کے میدان میں قدم رکھا ہے اور زید وعمر کا سہارا چھوڑ کر اپنی خداداد عقل سے کام لینا اور قدما کے علم میں کچھ اضافہ کرنا چاہا ہے ان سب کی رایوں میں اس قسم کی شتر گربگی پائی گئی ہے کہ اُن کی بعضی باتوں پر الہامی ہونے کا گمان ہوتا ہے اور بعضی انتہا درجہ کی رکیک اور سخیف معلوم ہوتی ہیں، یہاں تک کہ ایک کو دوسری کے ساتھ کچھ نسبت نہیں معلوم ہوتی۔ مگر یہی وہ لوگ ہیں جو علوم دینیہ میں اپنے اپنے فن کے امام مانے گئے ہیں۔ ان کی غلطیوں سے دین کو کچھ نقصان نہیں پہنچا۔ کیوں کہ وہ لغو سمجھ کر آخر کار مردود ٹھہر گئیں مگر اُن کی فتوحاتِ جدیدہ سے اسلام کو بے انتہا تقویت پہنچی ہے۔ سرسید کو اپنی اس نئی طرز کی تفسیر کے جن جن مقامات میں پوری کامیابی ہوئی ہے (اور ایسے مقامات کی تعداد کچھ کم نہیں ہے) اُس سے فی الواقع بمقابلہ علوم جدیدہ کے اسلام میں ایک نئے علمِ کلام کی بنیاد پڑ گئی ہے اور اس بات کی امید بندھ گئی ہے کہ جب اس قدر مشکلات صرف ایک شخص کی کوشش سے حل ہو گئی ہیں تو باقی مشکلات بھی ضرور کبھی نہ کبھی حل ہو جائیں گی۔ دُنیا میں ہمیشہ بڑے بڑے کام اسی طرح پورے ہوئے ہیں کہ ایک شخص کسی کام کی بنیاد ڈالتا ہے اور آئندہ نسلیں اس کام کو پورا کرتی ہیں اور اُس کی غلطیوں کی اصلاح کرتی ہیں۔ سرسید نے خود اپنے ایک لکچر میں جو انھوں نے بمقام لاہور ''اسلام'' پر دیا تھا اس بات کا اقرار کیا ہے کہ:-

> ''میں معصوم نہیں ہوں اور نہ معصوم ہونے کا دعویٰ کرتا ہوں۔ میں ایک جاہل آدمی ہوں۔ اسلام کی محبت سے میں نے یہ کام کیا ہے جس کے میں لائق نہیں ہوں ممکن ہے کہ اس میں غلطی ہو مگر آئندہ علماء اس کی صحت کر دیں گے اور اسلام کی مدد دیں گے۔ میرے خیال میں مخالفین اور مشککینِ فی الاسلام کے مقابلے میں اسلام کی تائید اسی طریقہ پر ہو سکتی ہے اور کسی طریقہ پر نہیں ہو سکتی۔''

اگرچہ اسی نئی طرز کے علم کلام کو جس کی بنیاد بمقابلہ علوم جدیدہ کے سرسید نے اپنی تفسیر میں ڈالی ہے اب تک ہمارے علماء نے اسی نفرت اور کراہیت سے دیکھا ہے جیسے

عباسیہ کے عہد میں محدثین وفقہانے قدیم طرز کے علم کلام کو اُس کے آغاز کے زمانہ میں دیکھا تھا۔ مگر جس طرح قدیم علمِ کلام آخر کار علوم دینیہ کا ایک نہایت ضروری حصہ سمجھا جانے لگا تھا اسی طرح امید ہے کہ اگر ہمارے علمائے تعصب اور تقلید کی بندشوں سے آزاد ہوکر ٹھنڈے دل سے اس تفسیر پر غور کی اور سرسید کے عمدہ خیالات کو اخذ کیا اور اُن کی غلطیوں کی اصلاح اور جس عمارت کی انھوں نے بنیاد ڈالی ہے اس کو پورا کرنا چاہا تو تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کے مذہبی خیالات کی اصلاح کے لیے یہ جدید علمِ کلام نہایت مفید بلکہ علومِ دینیہ کا ایک نہایت ضروری حصہ سمجھا جائے گا۔ اور اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ جو کچھ سرسید نے اس مضمون پر ''تفسیر القرآن'' یا ''تہذیب الاخلاق'' میں یا چھوٹے چھوٹے متعدد رسالوں میں لکھا ہے اس کا ایجوکیٹڈ (تعلیم یافتہ طبقہ) کے مسلمانوں پر عجیب وغریب اثر ہوا ہے۔ میں ایسے متعدد مسلمان نوجوان سے واقف ہوں جنھوں نے انگریزی تعلیم پانے کے زمانے میں مذہب کو بالکل خیر باد کہدی تھی اور بعضوں نے عیسائی ہونے کا ارادہ ٹھان لیا تھا اور ایسے تو بے شمار تھے جن کا ایک قدم لامذہبی کی طرف اٹھتا تھا تو دوسرا قدم مذہب کی طرف سے پیچھے ہٹ جاتا تھا، مگر جب سے سرسید مرحوم کی مذکورہ بالاتحریریں شائع ہونی شروع ہوئیں اُس وقت سے جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے یہ رخنہ تقریباً بالکل بند ہوگیا ہے۔ بعض مسلمان نوجوانوں نے اخباروں میں بذریعہ تحریر کے اور بعضوں نے پبلک لکچروں میں اور بعض نے اپنے دوستوں سے زبانی بیان کیا ہے کہ ''اگر سید صاحب کی تحریریں ہماری نظر سے نہ گذرتیں تو ہم اسلام سے منحرف ہوجاتے۔'' اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا یہی مقصد سرسید کا ''تفسیر القرآن'' لکھنے سے تھا۔

ایک بار ایک مولوی صاحب سرسید کے ملنے کو آئے اور اُن کی تفسیر دیکھنے کو مانگی۔ سرسید نے اُن سے کہا کہ ''آپ کو خدا کی وحدانیت اور رسول خداصلعم کی رسالتؐ پر تو ضرور یقین ہوگا؟'' انھوں نے کہا: ''الحمد للہ'' پھر کہا کہ ''آپ حشر ونشر اور عذاب وثواب اور بہشت ودوزخ پر بھی یقین رکھتے ہوں گے؟'' انھوں نے کہا: ''الحمد للہ'' اس پر سرسید نے کہا: ''بس تو آپ کو میری تفسیر دیکھنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ اس کی ضرورت اُن لوگوں کو

ہے جو مذکورہ بالا عقائد پر پختہ یقین نہیں رکھتے یا ان میں متردد و مذبذب ہیں۔''

سرسید کا خیال تھا کہ اس تفسیر سے کچھ عجب نہیں بلکہ نہایت قرین قیاس ہے کہ مسلمانوں میں ایجوکیٹڈ (تعلیم یافتہ) لوگوں کا ایک نیا فرقہ پیدا ہو جائے جو مذہبی خیالات میں مسلمانوں کے موجودہ فرقوں سے کسی قدر مختلف ہو لیکن وہ کہا کرتے تھے کہ ''ایسا نیا اسلامی فرقہ بہ نسبت اس کے کہ وہ اسلام کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر لیں یا کسی مذہب کے پابند نہ رہیں ہزار درجہ بہتر ہے۔''

یہاں ایک لطیفہ ذکر کرنے کے قابل ہے۔علی گڑھ کے ایک مشنری (پادری) صاحب نے سرسید کے ایک دوست سے کہا کہ ''سید صاحب یہ تو خوب جانتے ہوں گے کہ محمڈن کالج کے طالب علم عام مسلمانوں کے طریقے پر قائم نہیں رہ سکتے، پھر وہ تفسیر لکھ کر ان کو ہمارے ہاتھ سے بھی کیوں کھوتے ہیں؟''

قرآن مجید میں اب نئی تفسیر کی گنجائش باقی ہے یا نہیں؟

(از رسالہ ''معارف'' علی گڑھ، بابت دسمبر ۱۸۹۹ء)

سرسید کی تفسیر جس میں بیسیوں آیات کے معانی جمہور مفسرین کے خلاف لکھے گئے ہیں اُس کی نسبت پہلا شبہ جو ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ''باوجود بے شمار تفسیروں کے جو گزشتہ تیرہ سو برس میں وقتاً بعد وقت قرآن مجید کی لکھی گئی ہیں۔ اب تفسیر قرآن کے متعلق ایسا کون سا مرحلہ باقی رہ گیا ہے جس کو علمائے سلف نے طے نہ کرلیا ہو؟ اولاً رسول خدا صلعم نے جن کی برابر قرآن کا علم کسی امتی کو نہیں ہوسکتا جن آیتوں کے معانی بیان کرنے کی ضرورت تھی خود زبان مبارک سے اُن کا مطلب ارشاد فرما دیا۔ پھر آپ کے بعد صحابہ[1]، تابعین[2]، تبع تابعین[3] اور علمائے امت نے جو یقیناً اس زمانے کے لوگوں سے بہتر قرآن کے معنی سمجھنے والے تھے، قرآن کی ایک ایک آیت اور ایک ایک لفظ کو بالکل حل کردیا۔ پس زمانۂ حال میں مفسر کے لیے اس کے سوا کوئی منصب باقی نہیں رہا کہ وہ انھیں تفسیروں کا ماحصل جو علمائے سلف لکھ گئے ہیں زیادہ شرح و بسط یا زیادہ اختصار یا زیادہ فصاحت و بلاغت کے ساتھ بیان کردے یا ایک زبان سے دوسری زبان میں ان کا ترجمہ کردے۔ یہ منصب اب کسی کا نہیں ہے کہ ایک بھی آیت کے معنی ایسے بیان کرے جو تیرہ سو برس میں کسی نے نہ بیان کیے ہوں۔'' چناں چہ اسی شبہ کی بنا پر ستم ظریفوں کو کہتے سنا ہے

---

[1] صحابہ: یعنی وہ مقدس ترین گروہ جس نے آنحضرت صلعم کا فیضِ صحبت حاصل کیا۔

[2] تابعین: وہ لوگ جنھوں نے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی صحبتیں اٹھائیں اور اُن سے اکتسابِ علم کیا۔

[3] تبع تابعین: وہ جماعت جس نے تابعین کا زمانہ پایا اور اُن سے فیض حاصل کیا۔

کہ ''جو مطلب قرآن کا سرسید نے بیان کیا ہے وہ نہ خدا کو سوجھا نہ نبی کو نہ صحابہ وتابعین کو اور نہ دیگر علمائے اُمّت کو۔''

اس مضمون میں ہم کو اسی شبہ کا حل کرنا مقصود ہے مگر پہلے اس سے کہ اصل مقصود بیان کیا جائے چند باتیں ذہن نشین کر لینی ضرور ہیں۔

ایک یہ کہ محکمات ومتشابہات کے الفاظ جو قرآن مجید میں وارد ہوئے ہیں اُن سے کیا مراد ہے؟ شاہ ولی اللہ کے نزدیک جیسا کہ ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں مذکور ہے:-

''محکمات'' وہ آیتیں ہیں جن میں ایک معنی سے زیادہ کا احتمال نہ ہو۔

''متشابہات'' وہ ہیں جن میں متعدد معنوں کا احتمال ہو مگر مقصود ایک معنی سے زیادہ نہ ہوں۔

اس سے ظاہر ہے کہ قرآن مجید میں جس قدر آیتیں ایسی ہیں جن میں معانی متعددہ کا احتمال ہوسکتا ہے وہ سب متشابہات کے تحت میں مندرج ہیں۔

دوسرے یہ کہ قرآن مجید میں متشابہات کے لانے سے شارع کا کیا مقصد تھا؟ امام رازی نے ان کی کئی وجہیں بیان کی ہیں مگر سب سے عمدہ وجہ جس کو انھوں نے تمام وجوہ پر ترجیح دی ہے وہ یہ ہے کہ ''قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس میں خواص وعوام سب کو حق کی طرف بلایا گیا ہے اور عوام کی طبیعتیں ادراکِ حقائق سے بعید ہوتی ہیں۔ مثلاً اگر اُن کے سامنے ایک ایسی ہستی کا بیان کیا جائے جو نہ جسم ہے نہ کسی مکان میں ہے اور نہ اُس کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے تو اُن کو یہی خیال ہوگا کہ ایسی چیز معدوم محض کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے؟ پس مقتضائے حکمت یہی تھا کہ اُن کو ایسے الفاظ کے ساتھ خطاب کیا جائے جو من وجہ اُن کے خیالات سے مناسبت رکھتے ہوں۔''

شاہ صاحب نے اسی مطلب کو ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں اس طرح بیان کیا ہے کہ

> ''شارع نے محض لوگوں کو معمولی سمجھ کے موافق جو وقائقِ علم وحکمت تک پہنچنے سے پہلے اُن کی اصل خلقت میں ودیعت تھی اُن سے خطاب کیا ہے۔ اور اسی لیے (اُن کی سمجھ کے موافق) فرمایا: اَلرَّحْمٰنُ عَلَی

الْعَرْشِ اسْتَوٰی.''

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ ''آنحضرتؐ نے ایک حبشیہ عورت سے پوچھا کہ ''خدا کہاں ہے؟'' اُس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''یہ مومنہ ہے۔'' یعنی آنحضرتؐ نے باوجودیکہ آپ خدا تعالیٰ کو کسی خاص جہت میں ہونے سے منزہ جانتے تھے اُس کے آسمان کی طرف اشارہ کرنے کو اُس کے ایمان کے لیے کافی سمجھا اور اس دقیق بات کے سمجھانے کو مناسب نہ جانا کہ وہ ذات اقدس جہت اور مکان سے پاک ہے۔

ان سب حوالوں سے ظاہر ہے کہ قرآن میں وہ تمام روحانی اور اعلیٰ مقاصد جو عموماً انسان کی فہم و ادراک سے اور خاص کر عرب کے اُمّیوں کی سمجھ سے بالاتر تھے اور جن پر بالاجمال ایمان لانا کافی تھا، اُن کو مجاز و استعارہ اور تمثیل کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے تاکہ اُمّی اور حکیم دونوں اپنی اپنی سمجھ کے موافق اس سے ہدایت حاصل کریں۔

عہد عتیق کی کتابیں جن کو مسلمان، یہودی اور عیسائی سب آسمانی کتابیں مانتے ہیں چوں کہ وہ اُس زمانے میں القا کی گئی تھیں جب کہ انسان کی سمجھ نہایت ابتدائی حالت میں تھی اس لیے اُن میں قرآن سے کہیں زیادہ کلام کی بنیاد مجاز اور استعارہ پر رکھی گئی ہے۔ تمام عہد عتیق کی کتابیں اور صحیفے متشابہات سے بھرے ہوئے ہیں جیسے:-

خدا کا طوفان نوحؑ پر اس قدر رونا کہ اُس کی آنکھیں آشوب کر آئیں۔

ایک دوسرے موقع پر اُس کا ایسا ہنسنا کہ کچلیاں نظر آنے لگیں۔

سرکشوں کا اُس کو کھجا کر غصہ دلانا اور اُس کی ناک میں دھوئیں کا سا اثر کرنا۔

اس کے سانس کا گندھک کے سیلاب کی مانند ہونا۔

شہر اشور کا اس کی آواز سے تباہ ہونا اور اس کا اشور والوں کو لٹھوں سے مارنا وغیرہ وغیرہ۔

ایک جگہ کتاب ''یرمیاہ'' میں یروشلم کی تباہی پر خدا تعالیٰ اپنا غصہ اس طرح ظاہر کرتا ہے۔ ''اے میری انتڑیوں! اے میری انتڑیوں! میرے دل کے پردہ میں درد ہے۔ میرے دل کی ایسی گھبراہٹ ہے کہ میں چپ نہیں رہ سکتا۔ اے میری جان! تو نے تُرّی کی

آواز اور لڑائی کی للکار سنی۔ شکست پر شکست کی خبر ہوئی۔ یقیناً تمام سرزمین برباد ہوگئی۔ میرے خیمے اچانک اور میرے پردے ایک دم میں غارت کیے گئے۔ کب تک میں یہ جھنڈا دیکھا کروں اور تُرّی کی آواز سنا کروں۔"

"زبور" میں ایک جگہ خدا تعالیٰ داؤدؑ کے مقرب اور محبوب ہونے کو اس طرح بیان کرتا ہے۔ "میں نے تجھے جنا ہے، میں آج کے دن تیرا باپ ہوا۔"

دوسری جگہ "زبور" ہی میں خدا کے انتقام لینے کا بیان اس طرح ہے۔ "آخر خداوند خواب سے بیدار ہوا اور اُس پہلوان کی طرح جو شراب پی کر عربدہ کرے، اپنے دشمنوں کے پچھاڑ ماری۔"

غرض کہ تمام عہد عتیق کی کتابیں اسی قسم کے متشابہات سے مالا مال ہیں جن میں روحانی تعلیم جسمانیات کے پیرایہ میں کی گئی ہے۔ اس لیے شاہ ولیؒ اللہ صاحب انبیاء کے خواص کے ذکر میں لکھتے ہیں: **وَمِنْ سِيَرَ تِهِمْ اَنْ لاَ يُكَلّمِوُا النَّاسَ اِلَّاعَلٰى قَدْرِ عُقُوْلِهِمُ الَّتِىْ خُلِقُوْا عَلَيْهَا وَعُلُوْ مِهِمُ الَّتِى هِىَ حَاصِلَة" عِنْدَهُمْ بِاصَلِ الَخِلْقَة."**

تیسرے یہ بات بھی سمجھ لینی ضرور ہے کہ متشابہات کی تاویل جس کی نسبت قرآن مجید میں کہا گیا ہے: **وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّااللّٰهُ.** اس سے کیا مراد ہے؟ ظاہر ہے کہ اس آیت کے یہ معنی قرار دینے تو بالکل غلط ہیں کہ متشابہات کی تاویل کا علم اجمالاً یا تفصیلاً کسی طرح پر انسان کو نہیں دیا گیا ورنہ مسلمانوں کا یہ دعویٰ غلط ہو جائے گا کہ ہمارے دین میں عیسائیوں کے مسئلہ تثلیث کی مانند کوئی ایسا رازِ سربستہ نہیں ہے جو انسان کی عقل اور سمجھ سے بالاتر ہو۔

امام نووی شرح صحیح مسلم میں تاویل متشابہات کے متعلق لکھتے ہیں:-

يَبْعَدُاَنْ يُخَاطِب اللّٰهُ عِبَادَهٗ بِمَالاَسَبِيْلَ لِاحَدٍمِنَ الْخَلْقِ اِلٰى مَعْرِفَتِهٖ وَقَدْ اِتَّفَقَ اَصْحَابُنَا وَغَيْرهِمْ مِنَ الْمُحلقَقِيْنَ عَلٰى اِنَّهٗ يَسْتَحِيْلُ اَنْ يَتَكَلَّمَ اللّٰهُ تَعَالٰى بِمَالاَيُفِيْدُ. یعنی "بعید از عقل ہے کہ اللہ جل شانہ اپنے بندوں سے ایسے کلام کے ساتھ خطاب کرے جس کے سمجھنے کی کوئی سبیل کسی مخلوق کے لیے نہ ہو۔ اور ہمارے علمائے مذہب

اور اُن کے سوا اور محققین اس بات پر متفق ہیں کہ خدا تعالیٰ کا ایسے کلام کے ساتھ متکلم ہونا جو مفید معنی نہ ہو محال ہے۔‘‘

غرض کہ آیۃً مذکور کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان کو تاویلِ متشابہات کا علم مطلقاً نہیں دیا گیا۔ بلکہ یہ معنی ہیں کہ خاص کر مبدأ و معاد کے متعلق جو باتیں انسان کی سمجھ بوجھ سے باہر ہیں اور جن کا بیان آیات متشابہات میں بطور مجاز و استعارہ کے واقع ہوا ہے اور جن پر ایمان لانے کو یُومِنُوْنَ بالْغَیْبِ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اُن کی حقیقت اور کنہ خدا کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔ اور اس لیے انسان جن الفاظ و عبادات سے ان حقائق کو تعبیر کرے گا وہ تعبیر ناقص اور ادائے معنی مقصود سے قاصر ہو گی۔

’’طیبی شرح مشکوٰۃ‘‘ میں لکھتا ہے کہ **المتشابه الذی یحذ رمنه هو صفات اللّٰه تعالیٰ التی لا کیفیة لها والاوصاف القیمة التی لاسبیل الی ادراکها بالقیاس والاستنباط ولاسبیل الی استحضارهافی النفوس.** یعنی ’’جن متشابہات کے اتباع سے بچے کا حکم ہے وہ صفاتِ باری تعالیٰ یا قیامت کے حالات کا بیان ہے جو قیاس اور استنباط سے دریافت نہیں ہو سکتا اور نہ لوگوں کو اُس کا تصور دلانے کی کوئی سبیل ہے۔‘‘

لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ انسان یہ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ آیات متشابہات میں وہ اسرار و حقائق بطور استعارہ یا تمثیل کے بیان ہوئے ہیں اور الفاظ اپنے حقیقی معنوں میں استعمال نہیں ہوئے۔ مثلاً سورۃ کورت میں ہول قیامت کا بیان اِن لفظوں میں کیا گیا ہے۔ **وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ** یعنی جب کہ عنقریب بیانے والی اونٹنیاں چھٹی پھریں گی اور اُن کی کوئی خبر نہ لے گا۔‘‘ بے شک ہول قیامت کی جس کیفیت کو اس تمثیل میں بیان کیا گیا ہے اُس کے ادراک سے انسان کی عقل قاصر ہے اور اُس کی قدرت سے باہر ہے کہ اُس کیفیت کو کسی لفظ یا عبارت کے ذریعے سے پورا پورا ادا کر سکے۔ لیکن یہ سمجھنا اُس کی طاقت سے باہر نہیں ہے کہ یہ بیان اُس کیفیت کی تمثیل ہے اور ایک اونٹ چرانے والی قوم جس کی دولت اونٹ اور اونٹنیوں کے سوا کچھ نہ تھی، اُس کو ہولِ قیامت کا تصور دلانے کے لیے کوئی اسلوب اس سے زیادہ بلیغ نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ عرب اپنی اِلف و عادت کے سبب اس

بات کو ناممکن سمجھتے تھے کہ جب اونٹنی بیانے کے قریب ہو اُس وقت مالک اُس کی نگرانی سے غافل ہو جائے۔ پس انھوں نے اُس وقت کو کیسا ہولناک تصور کیا ہوگا جب کہ ایسی اونٹنیوں کی خبر گیری کا ہوش باقی نہ رہے گا۔

لیکن یہاں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر تاویل متشابہات کا علم خدا تعالیٰ کے ساتھ مخصوص نہ تھا تو سلفِ صالح تاویل کرنے کو کیوں ناجائز سمجھتے تھے اور جو تاویل کا مرتکب ہوتا تھا اُس سے اس لیے مواخذہ کیا جاتا تھا۔ چناں چہ حضرت عمرؓ نے صبیغ بن عسل کو اتباع متشابہ پر سزا دلوائی اور مدینہ منورہ سے جلا وطن کر کے بصرہ کو بھجوا دیا۔ اور جب امام مالک سے **استواء علی العرش** کا مطلب پوچھا گیا تو انھوں نے اس کے سوا کوئی جواب نہیں دیا کہ ''استوار کے معنی معلوم ہیں اور اُس کی کیفیت مجہول ہے اور اُس پر ایمان لانا واجب ہے اور اُس سے سوال کرنا بدعت ہے۔''

سو اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ جس زمانے میں قرآن نازل ہوا اس وقت اہلِ کتاب تحریف کتبِ مقدسہ کے سبب سے نہایت بدنام تھے۔ وہ اکثر اپنے اغراض فاسدہ کے لیے کتب مقدسہ کے معنی لوگوں کو غلط بتاتے تھے اور اس طرح دین میں رخنہ ڈالتے تھے چناں چہ قرآن مجید میں جابجا ان پر تحریف کا الزام لگایا گیا ہے اور بہت سی حدیثیں اس مضمون کی صحاح وغیرہ میں موجود ہیں بلکہ خود اہل کتاب نے تسلیم کیا ہے کہ بلاشبہ قدیم یہودی اور عیسائی عالم بائبل کی کتابوں میں تحریفِ معنوی کے مرتکب ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ تحریف سے زیادہ کوئی چیز دین کے حق میں خطرناک نہیں ہوسکتی اور اہل کتاب اُس کی مثال قائم کر چکے تھے اور چوں کہ مسلمانوں کو بنی اسرائیل سے روایت کرنے کی اجازت تھی اور دونوں اصولِ دین میں عموماً باہم گر مشابہت رکھتے تھے اس لیے مسلمانوں کا سب زیادہ میل جول اہل کتاب کے ساتھ تھا لہٰذا اُن میں تحریف کا فتنہ پھیلنے کا قوی احتمال تھا۔ چناں چہ منجملہ بہت سی بندشوں کے جو شارع نے اسلام میں انسدادِ تحریف کے لیے باندھیں ایک یہ تھی کہ آیاتِ متشابہات کے معنی میں چھان بین کرنے کی مذمت کی گئی اور قرآن میں صاف کہہ دیا گیا کہ **فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ'' فَيَتَّبِعُوْنَ مَاتَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ**

الْفِتْنَۃِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِہٖ اور آنحضرتؐ نے عموماً قرآن کی تفسیر کی نسبت فرمایا کہ مَنْ فَسَّرَالْقُرآنَ بِرَأیِہٖ فَلْیَتَبَوَّأ مَقْعَدًا اور جھوٹی روایت کرنے کی نسبت فرمایا: مَنْ کَذَبَ عَلیٰ مُتَعَمِدً فَلْیَتَبَوَّأ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ۔

اسی بنا پر سلفِ صالح متشابہات کی تاویل سے کوسوں دور بھاگتے تھے باوجودیکہ تشبیہ کے عقیدے سے بالکل مبرا تھے اور جس بات میں تشبیہ کا ادنیٰ شائبہ پاتے تھے اُس سے خدر کرتے تھے۔ پھر بھی جو آیتیں تشبیہ پر دلالت کرتی تھیں اُن کی تاویل سے ہمیشہ سکوت کرتے تھے اور اُن کے ظاہری معنوں سے ہرگز تجاوز نہ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم آیات متشابہات کے ظاہری معنوں پر ایمان رکھتے ہیں اور اُن کے اصلی معنوں کی جو خدا نے مراد رکھے ہیں ہیں۔ تصدیق کرتے ہیں اور اُن کا علم خدا پر چھوڑتے ہیں کیوں کہ اُن کے سمجھنے کی ہم کو تکلیف نہیں دی گئی۔ بعض یہاں تک احتیاط کرتے تھے کہ مثلاً ید یا وجہ یا استوا کا ترجمہ تک دوسری زبان میں نہیں کرتے تھے۔ اور کسی ایسی آیت کے ترجمے کی ضرورت ہوتی تھی تو انھیں الفاظ کو بعینہٖ ترجمے میں رکھ دیتے تھے، حالاں کہ عربی زبان جس میں شاعری نزولِ قرآن کے وقت حدِ کمال کو پہنچ چکی تھی۔ استعارہ و کنایہ اور اقسامِ مجاز سے مالا مال تھی اور اُسی زبان میں قرآن نازل ہوا تھا باوجود اس کے علمائے سلف محض اس نیت سے کہ دین میں فتنہ پیدا نہ ہو اور اہل اسلام میں مثل اہل کتاب کے تحریف کا باب مفتوح نہ ہونے پائے، تاویل متشابہات اور تفسیر بال رائے سے اجتناب کرتے تھے اور جہاں تک ممکن ہوتا تھا متشابہاتِ قرآن کے الفاظ کو اُن کے حقیقی معنوں پر مقصود رکھتے تھے اور بغیر سخت ضرورت کے ان کو مجازی معنوں پر محمول نہ کرتے تھے اور کسی آیت کی تفسیر کرنے پر جب تک کوئی روایت اُس کی موید نہ ہو عموماً مبادرت نہ کرتے تھے۔ حالاں کہ تفسیر بال رائے سے ممانعت ہونے کی یہ معنی نہیں ہیں کہ کسی آیت کے معنی جب تک کہ اس کی تفسیر حدیث نہ ہو بیان کرنے جائز نہیں ہیں۔ چناں چہ امام غزالی اور صاحب مجمع الجار اور دیگر محققین نے تصریح کی ہے کہ اگر حدیث مذکور کے یہ معنی ہوں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ابن عباس کے حق میں یہ دعا کرنا کہ اَللّٰھُمَّ فَقِّھہُ فِیْ الدِّیْن وَعَمِلّہُ التَّاوِیْدَ نعوذ باللہ بے کار ٹھہرا

ہے۔ باوجود اس کے سلفِ صالح جہاں تک ہوسکتا تھا بغیر روایت کے سنے تفسیرِ قرآن میں دم نہ رمارتے تھے تاکہ جس مصلحت سے شارع نے تفسیر بالرائے کی ممانعت فرمائی ہے وہ مصلحت فوت نہ ہو اور تحریفِ کا رستہ محدود رہے۔

لیکن یہ مصلحت اُسی وقت تک محدود رہ سکتی تھی جب تک کوئی اور اس سے بھی زیادہ ضروری اور مہتمم باشان مصلحت پیش نہ آئے۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا کہ جو آیتیں بظاہر تشبیہ پر دلالت کرتی تھیں جب اُن کی اصلی معنی بیان کرنے سے علما نے سکوت کیا اور اُن کو محض حقیقی معنوں پر مقصود رکھا تو ایک طرف تو خود مسلمانوں میں حشویہ اور غلاۃ شیعہ عقیدۂ تشبیہ میں غلو کرنے لگے اور دوسری طرف جوں جوں یونانی فلسفے کا رواج زیادہ ہوتا گیا اُسی قدر آیات متشابہات کے معنوں پر زیادہ چون و چرا ہونے لگی اور مخالفین طرح طرح کے شبہات قرآن پر وارد کرنے لگے۔ اب علمائے اسلام کو اس کے سوا کچھ چارہ نہ تھا کہ سلفِ صالح نے جو محض از راہِ مصلحت زبانوں پر مہر لگا رکھی تھی، اُس کو توڑ دیا جائے اور جو الفاظ قرآن مجید میں درحقیقت مجاز و استعارہ کے طور پر اطلاق کیے گئے ہیں بقدر ضرورت اُن کے اصلی معنی صاف صاف بیان کیے جائیں۔

چناں چہ سب سے پہلے علمائے معتزلہ نے تاویلِ متشابہات کی راہ کھولی۔

آخر کو اسلام میں عموماً یہ قاعدہ مسلم ٹھہر گیا کہ جب نقل اور عقل میں تعارض واقع ہو تو نقل کے ایسے معنی لینے چاہئیں جن سے وہ تعارض رفع ہو جائے۔ یعنی جب نصِ شرعی کے حقیقی معنی دلیل قاطعِ عقلی کے خلاف ہوں تو اس کو اصولِ عربیت کے موافق مجازی معنوں پر محمول کرنا چاہیے اور یہی معنی تاویل کے ہیں۔

یہ اصول علمِ کلام کی عام کتابوں مثل ''مقاصد''، ''مواقف''، ''تفسیر کبیر''، ''دُر رغرر''، ''تہافتہ الفلاسفہ'' اور ''فصل المقال قاضی ابن رشد'' وغیرہ وغیرہ میں مفصل بیان کیا گیا ہے۔ اور شیخ حسین آفندی طرابلسی نے جو ابھی ایک کتاب موسوم بہ ''حمیدیہ حکمائے'' زمانۂ حال کے مقابلے میں لکھی ہے اس میں بھی اس اصول کو قاعدۂ مسلمۂ اہل اسلام قرار دیا ہے، بلکہ شیخ موصوف نے اپنے ملک کے تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کو جو معجزاتِ حسیہ کو علومِ

جدیدہ کے خلاف سمجھتے ہیں یہ ہدایت کی ہے کہ **علیهم ان یقتغو ابما تقیله عقو لهم ثم مالم تقیله ویرفضه البرهان العقلی القاطع یرجعون فیه الی التاویل الجامع بین النقل و العقل.** (حمیدیہ صفحہ:۳۸) یعنی ''اُن کو چاہیے کہ جس بات کو اُن کی عقل قبول کرے اس پر قناعت کریں اور جس بات کو وہ قبول نہ کرے اور بُرہانِ عقلی اس کے منافی ہو تو تاویل کی طرف رجوع کریں جس سے عقل اور نقل میں تطبیق ہو جائے۔

اگر چہ ابوالحسن اشعری جو فرقہ اشاعرہ کے سرگروہ ہیں متشابہات کی تاویل کو جائز نہیں سمجھتے مگر اُن کی یہ ممانعت صرف اُن راسخ الاعتقاد مسلمانوں کے لیے مخصوص معلوم ہوتی ہے جن کے دل ہر قسم کے وساوس اور شبہات سے پاک ہیں۔ کیوں کہ ضرورت کے وقت کیا معتزلی اور کیا اشعری اور کیا اسلامی فرقے سب کو ناگزیر متشابہات کتاب وسنت کی تاویل کرنی پڑتی ہے۔ امام غزالہ جو خود بھی اشعری المذہب ہیں ''رسالہ التفرقہ بین الاسلام والزندقۃ'' میں لکھتے ہیں کہ ''اسلام کا کوئی فرقہ ایسا نہیں جو تاویل کا محتاج نہ ہوا ہو۔ سب سے زیادہ تاویل سے بچنے والے امام احمد بن حنبلؒ ہیں۔ باوجود اس کے وہ سب سے زیادہ بعید تاویلات کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔''

اس مقام پر ہم ایک آیت بطور مثال کے اس غرض سے لکھتے ہیں تا کہ معلوم ہو جائے کہ آیات متشابہات کے معنی ابتدا میں کیا سمجھے جاتے تھے اور پھر رفتہ رفتہ علم وحکمت کی ترقی اور زمانے کی ضرورتوں سے اُن کے کیا معنی قرار دئے گئے۔

آیۃ الکرسی میں جو جملہ وَسِعَ کُرۡسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ آیا ہے اُس کی تفسیر میں امام رازی نے جو کچھ لکھا ہے اس سے پایا جاتا ہے کہ کرسی کو پہلے ایک جسمِ عظیم (جو آسمان وزمین پر محیط ہے) سمجھا جاتا تھا۔ بعضے اُسی کو عرش اور بعضے عرش و کرسی دونوں کو جدا جدا جسم سمجھتے تھے۔ بعضے کرسی کو خدا کے قدم رکھنے کی جگہ کہتے تھے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں میں علومِ حکمیہ نے رواج پایا اور علما کو زمانے کی ضرورتوں نے مجبور کیا کہ مہر سکوت کو توڑ دیا جائے اور عرش و کرسی وغیرہ الفاظ سے جو معنی اصل مقصود ہیں وہ صاف صاف بیان کیے جائیں۔ چناں چہ امام رازی نے علمائے شافعیہ میں سے قفال کا یہ قول آیۃ مذکور کی تفسیر

کے متعلق نقل کیا ہے کہ ''خدا تعالیٰ نے اپنی ذات وصفات کے بیان میں لوگوں سے ایسے الفاظ کے ساتھ خطاب کیا ہے جن کو وہ امرا وسلاطین کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً اس نے کعبہ کو اپنا گھر بتایا ہے جس کے گرد وہ بادشاہوں کے محلوں کی طرح طواف کرتے ہیں اور اس کی زیارت کا حکم دیا جس طرح وہ بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہوتے ہیں اور حجر اسود کو اپنا دایاں ہاتھ قرار دیا اور اُس پر بوسہ دینے کا حکم کیا جس طرح کہ وہ سلاطین کے ہاتھوں پر بوسہ دیتے ہیں اسی طرح قیامت کے حساب کتاب کے موقع پر ملائکہ اور انبیا اور شہدا کا حاضر ہونا بیان فرمایا اور اسی طرح اپنے لیے عرش یعنی تخت قرار دیا اور فرمایا کہ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى پھر اپنے تخت کی نسبت یہ کہا کہ وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَاءِ اور پھر فرمایا: وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ اور فرمایا: وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ اور کہا: اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ اور اپنے لیے کرسی قرار دی اور فرمایا: وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اس کے بعد امام رازی کہتے ہیں۔ **اذا عرفت هذا فنقول كل ماجاء من الالفاظ الموهمة التشبيه فى العرش والكرسى فقد ورد مثلها بل اتوى منها فى الكعبة الطواف وتقبيل الحجر ولما تو افقنا ههنا علىٰ انّ المقصود تعريف عظمة اللّٰه وكبريائه مع القطع بانه منزة عن ان يكون فى الكعبة فكذا الكلام فى العرش و الكرسى** یعنی ''جب تم قفال کا قول سن چکے تو اب میں کہتا ہوں کہ جتنے الفاظ موہم تشبیہ عرش وکرسی کے متعلق واقع ہوئے ہیں۔ ویسے ہی بلکہ اُن سے موہم تشبیہ کعبہ اور طواف اور بوسۂ حجر اسود کے متعلق آئے ہیں۔ پس جب ہم نے یہاں اتفاق کر لیا کہ الفاظ سے محض خدا کی عظمت و کبریائی کا تصور دلانا ہے اور خدا کی نسبت یقین ہے کہ وہ کعبہ میں ہونے سے پاک ہے تو ہم کو ایسا ہی عرش وکرسی کی نسبت سمجھنا چاہیے۔''

لیکن چوں کہ اُس زمانے کی علمی تحقیقات نہایت محدود تھی اس لیے بہت سے شبہات جو زمانے میں قرآن کی نسبت پیدا ہو سکتے ہیں، اُس زمانے میں ان کا خطرہ بھی کسی کے دل میں نہیں گذرتا تھا۔ اور اس وجہ سے بہت سی آیاتِ متشابہات جو درحقیقت تاویل طلب تھیں

ان کی تاویل کرنے کی ضرورت علمائے سلف کو محسوس نہیں ہوئی۔ مثلاً جب تک یونانی فلسفہ اسلام میں نہیں پھیلا اور الفاظِ قرآنی میں شک اور وسوسہ نے راہ نہیں پائی لوگ اُن آیتوں کے الفاظ کو (جن سے زمین کا مثل فرش کے بچھا ہوا ہونا مفہوم ہوتا ہے) اُن کے حقیقی معنوں پر محمول کرتے تھے اور اب تک بھی اُن ملکوں کے بعض علما جہاں کسی زمانے[1] میں یونانی فلسفے کا رواج نہیں ہوا۔ زمین کو مثل فرش کے بچھا ہوا سمجھتے ہیں۔ مگر جب علم وحکمت کا مسلمانوں میں رواج ہوا اور دلائلِ قاطعہ سے زمین کی کردیت ثابت ہوگئی تو علمائے متکلمین کو تصریح کرنی پڑی کہ قرآن میں جو زمین کی نسبت الفاظ فرشنٰھا اور دحاھا اور طحٰھا اطلاق کیے گئے ہیں وہ اپنے حقیقی معنوں پر محمول نہیں ہیں۔ لیکن چوں کہ اُس وقت تک زمین کی حرکت کا مسئلہ سائنس کے درجے تک نہیں پہنچا تھا اس لیے قرآن کے بعض الفاظ جو بظاہر زمین کے ساکن ہونے پر دلالت کرتے ہیں اُن کی کچھ تاویل نہیں کی گئی یا مثلاً جن آیتوں سے مینہ کا آسمان سے برسنا سمجھا جاتا ہے جب تک قرآن کے الفاظ میں کسی نے چون و چرا نہیں کی۔ لوگ اُن آیتوں کو اُس کے حقیقی معنوں پر محمول کرتے تھے۔ مگر جو دلائل سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ مینہ درحقیقت آسمان سے نہیں برستا تو لفظ سَمَاء جو قرآن میں جابجا دارد ہوا ہے اس سے مجازی معنی یعنی جانب فوق مراد لی گئی۔ لیکن چوں کہ اُس وقت تک یہ تحقیق نہیں ہوا تھا کہ آسماں درحقیقت کوئی جسم محیط عالم مثل گول گنبد کے جیسا کہ بظاہر نظر آتا ہے نہیں ہے بلکہ تمام ثوابت اور سیارے فضائے بسیط میں بکھرے ہوئے اور ایک عجیب کرشمۂ قدرت سے جس کا نام جاذبیہ یعنی کشش ہے اپنی اپنی (ایک) جگہ قائم ہیں اس لیے جو الفاظ کہ آسمان کے موجود یا مجسم ہونے پر بظاہر دلالت کرتے تھے اُن کی کچھ تاویل نہیں کی گئی۔

اسی سبب سے قرآن مجید کی بہت سی آیتیں اور بہت سے الفاظ ایسے باقی رہ گئے

---

[1] شیخ حسین آفندی نے ''رسالہ حمیدیہ'' میں اپنے زمانے کے ایک قشری عالم کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''دین اسلام میں امریکہ کے وجود پر اعتقاد رکھنا جائز نہیں کیوں کہ اس سے زمین کی کردیت کا اعتقاد کرنا لازم آتا ہے جو اسلامی عقیدے کے خلاف ہے۔'' شیخ اس کی نسبت لکھتے ہیں کہ ''اس نادان نے اپنی جہالت سے مسلمانوں کو اس بات پر مجبور کیا ہے کہ ایک محسوس چیز کا انکار کردیں اور اپنے دین کو لوگوں کی نظر میں مضحکہ بنائیں۔۱۲ (حالی)

جن میں درحقیقت تاویل کی ضرورت تھی مگر چوں کہ وہ ضرورت کسی کو محسوس نہیں ہوئی اس لیے اُن کی تاویل کرنے کا کسی کو خیال نہیں آیا۔ اور سب سے بڑا مانع تاویل متشابہات پر جرأت کرنے کا یہ تھا کہ امام ابوالحسن اشعری جو تاویلِ متشابہات کے باب میں سلفِ صالح کے پورے مقلد تھے اور اس لیے اس کو بغیر اشد ضرورت کے جائز نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے مذہب نے چوتھی صدی ہجری کے آخر میں ترقی کرنی شروع کی اور چھٹی صدی میں وہ تقریباً تمام ممالک اسلامیہ میں پھیل گیا۔ اور معتزل جنھوں نے ملاحدہ اور دیگر مخالفین اسلام کے مقابلے میں سب سے پہلے تاویلِ متشابہات کی ضرورت کو محسوس کیا تھا اور ان کو عند الضرورت واجب سمجھتے تھے، جوں جوں اشاعرہ کے مذہب کی ترقی ہوتی گئی اسی قدر وہ اور اُن کا مذہب اور اُن کے اصول اور اُن کی تصنیفات ناپید ہوتی گئیں۔ اکثر بادشاہوں نے جبراً اشعری مذہب کو رواج دیا اور معتزل کے اصول کا استیصال کیا، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ دُنیا سے معدوم ہوگئے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تمام اسلامی دُنیا میں زیادہ تر اشاعرہ کی تفسیریں پائیں جاتی ہیں جن میں بغیر سخت ضرورت کے متشابہات کی تاویل میں کسی نے دم نہیں مارا اور جس قدر تاویلات ان تفسیروں میں منقول ہیں اُن کا ماخذ زیادہ تر وہی معتزل کی تفاسیر ہیں جو ایک آدھ کے سوا اب بالکل مفقود ہیں۔ صرف اُن کے اقوال جستہ جستہ اشاعرہ کی تفسیروں میں پائے جاتے ہیں۔ چناں چہ قفال[1] جن کا قول کرسی کی تفسیر میں امام[2] رازی نے نقل کیا ہے وہ بھی معتزلہ میں شمار کیے گئے ہیں۔

اگرچہ امام ابوالحسن[3] اشعری سے جیسا علامہ شہرستانی[4] نے ''ملل ونحل'' میں لکھا ہے

---

[1] قفال: محمد بن علی بن اسمٰعیل ان کا نام تھا، بڑے مشہور عالم گزرے ہیں۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور علوم ادبیہ کے امام تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ۳۶۵ھ میں وفات پائی۔

[2] امام رازی: ''تفسیر کبیر'' کے مصنف اور تاریخ اسلام میں بڑے اعلیٰ پایہ کے عالم شمار ہوتے ہیں۔ بہت سے علوم میں کامل دست گارر کھتے تھے۔ ۵۴۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۶۰۶ھ میں وفات پائی۔

[3] ابوالحسن اشعری: فرقہ اشاعرہ کے بانی، علم کلام کے زبردست عالم اور قریباً ۴۰۰ کتابوں کے مصنف تھے۔ ۲۷۰ھ میں بصرہ میں پیدا ہوئے ار ۳۰۳ھ میں بغداد میں انتقال کیا۔

[4] شہرستانی: مسلمانوں میں مشہور متکلم گزرے ہیں۔ ''الملل والنحل'' ان کی کتاب نہایت مشہور ہے۔ ۴۶۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۵۴۰ھ میں وفات پائی۔

ایک قول یہ بھی منقول ہے کہ عندالضرورت تاویل کرنی جائز ہے اوراسی بناپر اشاعرہ بھی مثل دیگرفرقوں کے جہاں نقل اورعقل میں تعارض واقع ہوتاویل کو جائز سمجھتے ہیں۔لیکن جہاں تک دیکھا جاتا ہے وہ متشابہات کی تاویل پرحتی المقدور جرأت نہیں کرتے۔شاہ ولی اللہ صاحبؒ ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں لکھتے ہیں: **من اصول الدین ترک الخوض بالعقل فی المتشابهات من الکتاب السنة.** اس کے بعدفرماتے ہیں: **(من ذلک رای من المنشابهات) امورکثیرة لایدریٰ ارید حقیقة الکلام و اقرب مجازٍ الیهاو ذلک فیمالم یجمع علیه الامة ولم ترتفع فیه الشبهة.** یعنی''قرآن اور حدیث میں ازقبیل متشابہات بہت سے بیانات ہیں جن کی نسبت نہیں معلوم کہ اُن کے حقیقی معنی مقصود ہیں یا ایسے مجازی معنی جوحقیقت سےقریب ترہوں اور یہ تردداُن بیانات میں ہے جن کی نسبت اجماعِ امت سے فیصلہ نہیں ہوااوراشتباہ رفع نہیں ہوا۔''

شاہ صاحب کے اس قول سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک قرآنِ مجید میں بہت سے مقامات ایسے باقی ہیں جن میں حقیقی اورمجازی دونوں معنوں کا احتمال ہےاور باوجودیکہ صدہاتفسیریں نہایت مبسوط لکھی جاچکی ہیں مگرآج تک کسی مفسر نے اس بات کا فیصلہ نہیں کیا کہ اُن مقامات پرجوالفاظ حقیقی اورمجازی دونوں معنوں کومحمل ہیں اُن سے درحقیقت معنی مقصودہیں یامجازی۔

قطع نظراس محققانہ کلام کے جوشاہ صاحب نے متشابہات کے باب میں لکھا ہے۔ ''تفسیرکبیر'' اور''حجۃ اللہ البالغہ'' کے دیگرحوالوں سے جوہم پہلے دے چکے ہیں صاف پایا جاتا ہے کہ خدا کا کلام جوکافۂ انام کی ہدایت کے لیے نازل ہوتا ہےاُس کاطرز بیان ایسا ہونا چاہیے کہ ہرطبقے اور ہردرجے اور ہرزمانے کے لوگ اپنی اپنی سمجھ اوراپنی اپنی معلومات کے موافق اُس سے ہدایت پاسکیں۔جب انسان کی معلومات نہات محدوداوراُس کی سمجھ محض ابتدائی حالت میں ہواُس وقت بھی اُس کی تعلیم سے وہی نتیجہ حاصل ہوجوعلمِ انسانی کے منتہائے ترقی پرپہنچنے کے وقت حاصل ہو۔ورنہ اس کی نسبت یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ وہ کافۂ انام کی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہےاوراس تقدیرپرامکان سے خارج ہے کہ جب تک انسان

میں علمی ترقی کرنے کی قابلیت باقی ہے کلام الٰہی نئی تفسیروں سے بالکل مستثنیٰ ہو جائے۔ کیوں کہ جس قدر انسان پر حقائق موجودات زیادہ منکشف ہوتے جائیں گے اُسی قدر کلام الٰہی کے معنوں سے زیادہ پردے مرتفع ہوں گے۔

علامہ ابن الحاج اپنی مشہور کتاب ''مدخل'' میں لکھتے ہیں: **قال علیه الصلوٰة و السلام فی القرآن "لاتنقضی عجائبه ولایخلق علیٰ کثرة الرّدّ نعجائب القرٰان لاتنقضی الی یوم القیمه فکلّ قرنٍ لابدَّله ان یا خذمنه فوائد جمّة خصّة اللّٰه تعالیٰ بهاوضمّها الیه برکة هذه الامة مستمرة الیٰ یوم السَّاعة."** یعنی ''آنحضرت صلعم نے قرآن کے باب میں فرمایا ہے کہ ''اس کے عجائب یعنی وقائق واسرار جواس میں مضمر ہیں ختم نہ ہوں گے اور وہ باوجود بار بار دُھرانے کے پُرانا نہ ہوگا۔'' پس قرآن کے عجائب قیامت تک ختم ہونے والے نہیں ہیں اور اس لیے ہر زمانے کے لوگوں کو چاہیے کہ اُس سے فوائد کثیرہ جوان کے حصے میں آئے ہیں حاصل کریں تا کہ اس امت کی برکت روز قیامت تک جاری ہے۔''

اس کے بعد علامہ موصوف لکھتے ہیں: **قال علیه الصَّلوٰة و السلام "مثل امتی کمثل امطرلا یدری اوّله خیرامرا خره" یعنی فی البرکة والخیر والدعوة الی اللّٰه تعالیٰ و تبئین الاحکام.** یعنی ''آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ ''میری امت کی مثال مینہ کی سی ہے جس کا نہیں معلوم اول بہتر ہے یا آخر۔'' یعنی برکت اور خیر لوگوں کو خدا کی طرف بلانے میں اور احکام الٰہی کے بیان کرنے میں۔''

دونوں مذکورہ بالا حدیثوں سے جو علامہ ابن الحاج نے نقل کی ہیں صاف ظاہر ہے کہ قرآن کے عجائب اور وقائق ہمیشہ وقتاً فوقتاً انسان پر ظاہر ہوتے رہیں گے اور جس طرح امت کے اول قرنوں میں قرآن کے بہت سے وقائق واسرار خلقت پر ظاہر ہوئے ہیں اسی طرح اُس کے اخیر فرقوں میں بہت سے نئے وقائق واسرار دُنیا پر منکشف ہوں گے۔

امام حجۃ الاسلام غزالیؒ اس باب میں لکھتے ہیں کہ **کم من معاونٍ دقیقة من اسرار القرآن یخطرعلی قلب المتجردین للذکر و الفکریخلو عنها کتب**

التفاسير ولایطّلع علیھا فاضل المفسرین. یعنی ''قرآن کے ایسے بہت سے وقائق واسرار جن سے تفسیر کی کتابیں خالی ہوتی ہیں اور بڑے بڑے مفسروں کو اُن کی خبر نہیں ہوتی اُن لوگوں کے دلوں پر کُھلتے ہیں جو ہمہ تن قرآن کے ذکر اور فکر میں محو ہو جاتے ہیں۔''

ابتدائی اعتراض کا جواب

(قرآن مجید میں مزید تفسیر کی گنجائش باقی ہے)

اوپر کے بیان سے غالبًا اس بات میں کچھ شبہ نہ رہا ہوگا کہ باوجود بے شمار تفسیروں کے جو گزشتہ تیرہ سو برس میں لکھی گئیں، قرآن کی تفسیر سے ابھی استغنا نہیں ہوا۔ بہت سے مقامات اُس میں اب بھی ایسے موجود ہیں جن کے معنی متعین نہیں ہوئے اور بہت سے عجائب اور وقائق واسرار ایسے باقی ہیں جو امت پر ہنوز منکشف نہیں ہوئے۔ اب صرف یہ دیکھنا باقی ہے کہ جن مقامات کی نسبت شاہ صاحب کی لکھا ہے کہ اجماعِ امت سے یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ وہاں الفاظ اپنے حقیقی معنوں میں بولے گئے ہیں یا مجازی معنوں میں۔ آیا عندالضرورت اجماعِ امت کے خلاف اُن مقامات میں خوض کرنا اور ان متشابہ الفاظ کے معنی متعین کرنا مناسب ہے یا نہیں؟ اور اگر مناسب ہے تو اسلام کو اب ایسی ضرورت درپیش ہے یا نہیں کہ خرقِ اجماع پر مبادرت کی جائے اور جن متشابہات کی تاویل سے اب تک سکوت کیا گیا اُن کے معنی صاف صاف بیان کیے جائیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائے اسلام سے اس قاعدے پر برابر عمل ہوتا چلا آیا ہے کہ یعنی ضرورتیں ممنوعات کو مباح و جائز کر دیتی ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ صحابہ اور تابعین کسی مسئلہ پر رائے اور قیاس سے گفتگو کرنے کو نہایت مکروہ جانتے تھے۔ چناں چہ ابن مسعودؓ سے کسی نے کوئی مسئلہ پوچھا۔ چوں کہ اُن کو اُس کے متعلق کوئی حدیث معلوم نہ تھی انھوں نے کہا: ''میں مکروہ جانتا ہوں اس بات کو کہ تیرے لیے حلال کر دوں جس کو خدا نے حرام کیا ہے اور حرام کر دوں جس کو خدا نے حلال کیا ہے۔''

ابن عمرؓ نہ جابر بن زید فقیہ بصرہ سے کہا کہ ''قرآن و حدیث کے بغیر کوئی فتویٰ نہ

دینا۔ اگر تو نے ایسا کیا تو خود بھی ہلاک ہوگا اور اوروں کو بھی ہلاک کرے گا۔''

ابوسلمہؓ جب بصرہ میں آئے تو انھوں نے حسن بصریؒ سے کہا: ''میں نے سنا ہے کہ تم اپنی رائے سے فتویٰ دیتے ہو سو کبھی بغیر قرآن وحدیث کے فتویٰ نہ دینا۔''

شعبیؒ سے کسی نے پوچھا کہ ''جب تم لوگوں سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تھا تو تم کیا کرتے تھے؟'' انھوں نے کہا: ''جب ہمارے مجمع میں کسی سے کوئی سوال پوچھا جاتا تھا تو وہ دوسرے کی طرف اشارہ کرتا تھا کہ اس کے سوال کا جواب دو۔ اور دوسرا تیسرے کی طرف یہاں تک کہ پھر اول شخص تک سوال کی نوبت پہنچتی تھی۔'' یعنی جب کسی کو اُس مسئلہ کے متعلق کوئی روایت معلوم نہ ہوتی تھی تو سب جواب دینے سے سکوت کرتے تھے اور قیاس کو بالکل دخل نہ دیتے تھے۔

مگر آخرکار ضرورتوں نے قیاس کو ایسا ضروری چیز بنا دیا کہ وہ کتاب وسنت کا ہم پلہ اور دلائلِ شرعیہ سے ایک دلیل قرار دیا گیا۔

ایک زمانہ تھا کہ قدر کے مسئلہ پر گفتگو کرنا ممنوع سمجھا جاتا تھا کیوں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس زمانے کی مصلحت کے موافق اس مسئلہ میں خوص کرنے سے منع فرمایا تھا اور لوگوں کو قدر کے متعلق بحث کرتے ہوئے دیکھ کر نہایت غیظ وغضب میں ارشاد کیا تھا کہ ابھٰذا اُمِرْتم اَمْ بھٰذا اُرْسِلْتُ مگر جب ضرورت داعی ہوئی تو علماء کو چارناچار اُس پر بحث کرنی پڑی۔

بنی امیہ کے عہد میں جب استحکامِ سلطنت کے لیے سخت خون ریزیاں ہونے لگیں اور ارکان سلطنت سے لوگوں نے متعجب ہوکر پوچھا کہ ''کیوں مسلمان قتل کیے جاتے ہیں؟'' تو ان کو یہ جواب ملا کہ القَدر یخرہ وَشرہ من اللّٰہ تَعالیٰ آخرکار علما کو یہ عقدہ حل کرنا پڑا اور قدر کے معنی بتانے پڑے اور یہ مسئلہ علم کلام کا ایک نہایت اہم اور ضروری مسئلہ قرار دیا گیا۔

چوتھی صدی ہجری تک اسلام میں تقلید شخصی کا بالکل وجود نہ تھا۔ عوام کو جب کوئی واقعہ پیش آتا تھا تو وہ جس مذہب کے عالم سے چاہتے تھے مسئلہ پوچھتے تھے۔ اور خواص کو جب احادیث نبوی یا آثار صحابہ وتابعین میں کوئی بات اطمینان کے قابل نہ ملتی تھی تو جس

فقیہ کے قول کو چاہتے تھے اختیار کرتے تھے، خواہ اہل مدینہ سے ہو یا اہل کوفہ سے۔ مگر اس کے بعد وقتاً فوقتاً ایسے اسباب پیدا ہوتے گئے کہ رفتہ رفتہ تقلید شخصی قرین مصلحت سمجھی گئی۔ حالاں کہ صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین کا اس امر پر ہمیشہ اجماع رہا کہ نہ وہ خود کسی خاص شخص کا ہر ایک بات میں اتباع کرتے تھے اور نہ اوروں کا ایسا کرنا پسند کرتے تھے۔ مگر زمانے کی ضرورتوں نے مجبور کیا کہ ہر شخص ائمہ اربعہ[1] میں سے کسی امام کو تمام احکام میں پانا مقتدا قرار دے۔ ورنہ اسلام میں طرح طرح کے فتنے پیدا ہوں گے اور جس کا جو جی چاہے گا سو کرے گا۔ چناں چہ آج تک تمام ممالک اسلامیہ میں تقلید شخصی کی پابندی برابر چلی آتی ہے اور کوئی شخص علی الاعلان اس پابندی سے آزاد نہیں ہوسکتا۔

متشابہات کی تاویل میں جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے جب تک شک اور وسوسہ کا زمانہ نہیں آیا کسی نے دم نہیں مارا مگر آخر کار اُس زمانے کی ضرورتوں کے موافق علما کو تاویل پر مبادرت کرنی پڑی اور یہ بات کچھ قرآن مجید ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام الہامی کتابیں اور صحیفے جو انبیائے بنی اسرائیل پر نازل ہوئے۔ چوں کہ اُن میں کثرت سے آیاتِ متشابہات وارد ہوئی تھیں اس لیے اگرچہ ایک مدت دراز تک لوگ ان کو حقیقی معنوں پر محمول کرتے رہے مگر جس قدر علم انسانی ترقی کرتا گیا اُسی قدر ان کے مجازی معنی جو اصل مقصود تھے، منکشف ہوتے گئے۔ یہودی جیسا کہ ملل والنحل شہرستانی سے ظاہر ہوتا ہے زمانۂ دراز تک متشابہات توریت کو جن کی چند مثالیں ہم اوپر لکھ چکے ہیں، عموماً اُن کے حقیقی معنوں پر محمول کرتے تھے مگر آخر کار علمائے یہود میں سے وقتاً فوقتاً ایسے لوگ اٹھنے شروع ہوئے جنھوں نے اس بات کو ظاہر کیا کہ تمام آیات متشابہات نازل ہیں۔ چناں چہ فرقہ یوذعانیہ اور موشکانیہ اور دونوں فرقوں کی بہت سی شاخیں جملہ متشابہاتِ توریت کی تاویل کرتے ہیں اور برخلاف عامہ یہود کے ذاتِ باری کو اوصافِ بشریٰ سے منزہ جانتی ہیں۔

قرآن مجید میں جو آیتیں یا الفاظ اب تک ایسے موجود ہیں جن کی نسبت بقول شاہ

---

[1] ائمہ اربعہ سے مراد حضرت امام ابوحنفیہ، امام شافعی، امام مالک اور امام احمد بن حنبل ہیں جن کی نسبت سے اسلام کے چار فرقے ''حنفی''، ''شافعی''، ''مالکی'' اور ''حنبلی'' کہلاتے ہیں۔

ولی اللہؒ صاحب کے یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ اُن کے حقیقی معنی مقصود ہیں یا مجازی اگر یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جائے کہ اُن کے معنی متعین کرنے کا وقت اب آ پہنچا ہے تو اس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ فوراً یہ پردہ اٹھا دیا جائے اور جو معنی اصول عربیت کے موافق ایسے قرار پائیں جن سے کوئی اعتراض جو قدیم تفسیروں پر وارد ہوتا ہے رفع ہو جائے تو بلا تامل وہی معنی اختیار کیے جائیں، اگر چہ تیرہ سو برس میں کسی مفسر نے وہ معنی نہ لکھے ہوں۔

مگر سوال یہ ہے کہ آیا ایسی ضرورت سرِ دست درپیش ہے جو محظورات کو مباح کر دیتی ہے؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ:-

جو لوگ زمانے کے حال سے بے خبر ہیں اور جن کے کان میں کوئی مخالف آواز نہیں پہنچی اُن کے نزدیک تو اس کے سوا کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں کہ جو شخص جمہور کے خلاف ایک حرف زبان سے نکالے اُس کو فوراً دائرہ اسلام سے خارج کر دیا جائے۔ اُن کے حال میں پر تو یہ شعر صادق آتا ہے ؎

آفاتِ بحر سے ہیں ناواقف آشنا سب
ہنستے ہیں ناخدا پر، روتا ہے ناخدا جب

مگر وہ لوگ جو اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں کہ مغربی تعلیم جس قدر دُنیا میں زیادہ پھیلتی جاتی ہے اسی قدر مذہبی عقائد اور مذہبی خیالات لوگوں کے دلوں سے کافور ہوتے جاتے ہیں، اُن کو وہ ضرورت روز روشن کی طرح نظر آتی ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ جس ضرورت نے حکمائے اسلام یعنی قدیم متکلمین کو سلفِ صالح کے برخلاف تاویلِ متشابہات پر مجبور کیا تھا وہ ضرورت ہمارے زمانے میں حد غایت کو پہنچ گئی ہے۔ اُس زمانے میں حکمت اور فلسفہ خاص کر علما و مصنّفین کے گروہ میں محدود تھا جو معقولات کو زیادہ تر منقولات کی تقویت اور دین کی حمایت کے لیے حاصل کرتے تھے۔ مگر اس زمانے میں مغربی تعلیم ضروریاتِ زندگی میں داخل ہو گئی۔ ہر شخص عام اس سے کہ نوکری پیشہ ہو، تاجر ہو یا اہل حرفہ ہو مجبور ہے کہ اولاد کو مغربی تعلیم دلوائے اور اس لیے مغربی علوم کی تعلیم مذہب کے حق میں بہ نسبت یونانی علوم کے زیادہ خطرناک ہو گئی ہے۔ اس کے سوا اُس زمانے کے علوم زیادہ تر

محض قیاسات پر مبنی تھے اور اس لیے جو شبہات اُن سے مذہب کی نسبت پیدا ہوتے تھے اُن کے دفعیہ کے لیے اکثر حالتوں میں صرف لانُسَلِّمُ کہہ دینا کافی تھا۔ مگر اس زمانے میں علم کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ اور استقرار پر رکھی گئی ہے اور اس لیے جو شکوک اب مذہب کی نسبت پیدا ہو سکتے ہیں وہ صرف لانُسَلِّم کہہ دینے سے رفع نہیں ہو سکتے۔

غرض کہ گزشتہ اور موجودہ صدی میں علم و حکمت نے بے انتہا ترقی کی ہے۔ ہزاروں باتیں جو پہلے معلوم نہ تھیں اب معلوم ہوئی ہیں۔ بہت سی باتیں جو پہلے صحیح مانی جاتی تھیں اب غلط ثابت ہوئی ہیں۔ بہت سی باتیں جو پہلے ممکن الوقوع مانی جاتی تھیں اب غیر ممکن الوقوع مانی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ علوم قدیمہ اور علوم جدیدہ میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا ہے۔

اگرچہ ممکن ہے کہ آئندہ کوئی ایسا زمانہ آئے کہ زمانۂ حال کے اکثر مسلمات غلط ثابت ہو جائیں لیکن چوں کہ حال کی تحقیقات کا مدار صرف قیاسی اور ظنّی باتوں پر نہیں بلکہ زیادہ تر تجربہ اور مشاہدہ پر ہے اس لیے بہت ہی کم احتمال اس بات کا ہے کہ جو علوم اور مسائل سائنس کے درجے کو پہنچ گئے ہیں اُن میں آئندہ کسی قسم کی تبدیلی واقع ہو۔ پس جو باتیں قرآن میں بظاہر زمانۂ حال کی تحقیقات کے خلاف معلوم ہوتی ہیں جب تک کہ اُس تحقیقات کو غلط ثابت نہ کیا جائے ضرور ہے کہ یا تو قرآن کو حقائقِ محققہ کے برخلاف تسلیم کریں اور یا اُس کے ایسے معنی بیان کریں جو زمانۂ حال کی تحقیقات کے برخلاف نہ ہوں۔

مگر ہم قرآن میں بہت سی ایسی آیاتِ متشابہات پاتے ہیں کہ اگر اُن کو مجازی معنوں پر محمول کیا جائے تو نہ ہم کو اصولِ عربیت کے خلاف تکلفات لایعنی کرنے پڑتے ہیں اور نہ قرآن کے اسلوبِ بیان سے تجاوز کرنا لازم آتا ہے۔ اور باوجود اس کے زمانۂ حال کے شبہات جو اُن آیتوں کی قدیم تفسیر پر وارد ہوتے ہیں بالکل رفع ہو جاتے ہیں اور اس لیے کوئی وجہ نہیں ہے کہ اُن آیتوں کو صرف اس خیال سے کہ جمہورِ مفسرین نے اُن کو ہمیشہ حقیقی معنوں پر مقصود رکھا ہے ہم مجازی معنوں پر محمول نہ کریں۔

جو لوگ سر سید کی تفسیر کی نسبت کہتے ہیں کہ

''جو معنی قرآن کے انھوں نے لکھے ہیں نہ وہ خدا کو سوجھے نہ رسول کو۔'' سو شاید سر

سید کی بعض تاویلات کی نسبت یہ کہنا صحیح ہو مگر اُن کی تمام تفسیر کی نسبت ایسا کہنا محض ستم ظریفی ہے۔

یہ بات تو خدا ہی کو معلوم ہے کہ جو معنی سرسید نے قرآن کے بیان کیے ہیں وہ خدا اور خدا کے رسولؐ کو سوجھے یا نہیں؟ مگر اس میں شک نہیں کہ ان معنوں کا اُس زمانے میں جب کہ قرآن نازل ہوا مخاطبین پر ظاہر کرنا شارعؑ کے مقصود کے بالکل برخلاف تھا۔

ہم اوپر بحوالہ ''تفسیر کبیر'' اور ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے لکھ چکے ہیں کہ قرآن میں انسان کی سیدھی سادی سمجھ کے موافق (جو علم و حکمت تک پہنچنے سے پہلے اُس کی خلقت میں ودیعت تھی) خطاب کیا گیا ہے اور بہت سے حقائق مجاز و استعارہ و تمثیل کے پیرایہ میں بیان کیے گئے ہیں تا کہ جب تک مخاطبین اپنی عقل طبیعی سے ترقی کر کے علم و حکمت کے اعلیٰ درجے تک نہ پہنچیں اس وقت تک جو معنی اُن الفاظ سے بہ ظاہر متبادر ہوں انھیں پر قانع رہیں۔ مگر جوں جوں حقائقِ اشیا اُن پر منکشف ہوتے جائیں اسی قدر اُن الفاظ کے معنی مقصود اُن پر کُھلتے جائیں۔ پس جو معنی قرآن کے اب آئندہ ایسے بیان کیے جائیں جو اصول عربیت اور اسلوبِ قرآن کے خلاف نہ ہوں اور باوجود اس کے اُن کے اختیار کرنے سے کوئی اعتراض جو قدیم تفسیروں پر وارد ہوتا ہے بخوبی رفع ہوتا ہو اُن کی نسبت صرف اس بنا پر کہ نزول قرآن کے وقت اُن کو شارعؑ نے بیان نہیں کیا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ معنی خدا کو سوجھے نہ رسول کو۔

قرآن مجید میں بہت سی آیتیں جبر پر اور بہت سی قدر پر دلالت کرتی ہیں مگر آنحضرت صلعم نے مسئلہ جبر و قدر کی نسبت اس کے سوا کبھی کچھ نہیں فرمایا کہ لوگوں کو اس پر بحث کرتے ہوئے دیکھ کر نہایت ناراضی ظاہر کی اور اس پر بحث کرنے سے منع فرمایا باوجود اس کے جب ضرورت داعی ہوئی تو صحابہ ہی کے وقت میں اُس پر بحث شروع ہوگئی۔ چناں چہ عمرو بن عاص اور ابوموسیٰ اشعری میں جو اس مسئلہ کے متعلق گفتگو ہوئی وہ ملل ونحل شہرستانی میں مذکور ہے اور پھر مفسرین اشاعرہ نے بمقابلہ معتزل کے آن آیات کی تفسیر میں جو جبر یا قدر پر دلالت کرتی ہیں اس مسئلہ کے متعلق کوئی تیر اپنے ترکش میں باقی نہیں چھوڑا۔ پھر کیا

کوئی اشعری یہ کہہ سکتا ہے کہ جو معنی ان آیتوں کے ہمارے علما اور ائمہ نے بیان کیے ہیں وہ خدا کو سوجھے نہ خدا کے رسولؐ کو۔

یہاں تک جو کچھ ہم نے بیان کیا اس سے صرف اس قدر ثابت کرنا مقصود تھا کہ قرآن مجید میں باوجود بے شمار تفسیروں کے جو گزشتہ تیرہ سو برس میں لکھی گئیں اب تک نئی تفسیر کی گنجائش باقی ہے۔ اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ:-

سرسید نے جن آیتوں کی تفسیر جمہور مفسرین کے خلاف لکھی ہے وہ کہاں تک اصولِ عربیت اور اسلوبِ قرآن کے موافق ہے؟

جن اعتراضات کے رفع کرنے کی غرض سے انھوں نے جمہور سے اختلاف کیا ہے اُن کے رفع کرنے کی فی الواقع ضرورت ہے یا نہیں؟

جو معیار قرآن کے الہامی ہونے کا انھوں نے قرار دیا ہے اس کے سوا کوئی دوسرا معیار قرار پا سکتا ہے یا نہیں۔

سوان عنوانوں پر ہم آئندہ اپنے خیالات ظاہر کریں گے وَمَاتوفیقی الاّ باللّٰہ۔

قرون اُولیٰ کی حق گوئی وحق پسندی

(از رسالہ ''معارف'' پانی پت، بابت ستمبر ۱۹۰۱ء، جلد: ۴، نمبر: ۹، صفحہ: ۳۶۵ تا ۲۷۲)

اگر چہ وحشیانہ آزادی و بے باکی عربِ عربا کی طبیعتوں میں قدیم سے متوارث چلی آتی تھی مگر اسلام کی تعلیم سے (جب تک کہ خود مختار سلطنتوں کے سیلاب نے اس کو گدلا اور مکدر نہیں کیا) ان کی یہ جبلّی خصلت تہذیب وشائستگی کے زیور سے آراستہ ہوگئی تھی اور آزادی کا جوہر حق گوئی وحق پسندی کے قالب میں ڈھل گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ خلفا کی غلطیوں پر گرفت کی جاتی تھی اور وہ معقول اعتراض سُن کر خاموش ہو جاتے تھے۔

عمر فاروقؓ پر جب کوئی اعتراض کرتا تھا اور کہتا تھا کہ ''اے عمر! خدا سے ڈر۔'' تو وہ اُس کا شکریہ ادا کرتے تھے اور کہتے تھے۔ ''خدا اس کا بھلا کرے جس نے ہمارے عیب سے ہم کو آگاہ کیا۔'' ایک دفعہ انھوں نے ایک معمر آدمی کو جب کہ وہ اپنے گھر کے اندر شراب و نغمہ میں مشغول تھا جا پکڑا اور اُس کو سخت نفریں کی، اُس نے کہا: ''اے امیر المومنین! تیری حرکت اس سے بھی زیادہ قابل نفریں ہے۔ تو نے تجسس کیا، حالاں کہ خدا تجسس کرنے سے منع کرتا ہے۔ پھر تو گھر میں بغیر اذن کے چلا آیا، حالاں کہ خدا نے اس کی ممانعت کی ہے۔'' عمر فاروقؓ نے کہا: ''بے شک تو سچ کہتا ہے۔'' اور وہاں سے نہایت ندامت اور افسوس کے ساتھ یہ کہتے ہوئے نکلے **تکلت عمر امه ان لم یغفر له ربّه** یعنی عمر کی ماں اس کو روئیو اگر خدا اس کا قصور معاف نہ کرے۔

مسلمان عورتوں کی بہادری وحق گوئی کی چند مثالیں

قرونِ اولیٰ کی تاریخ میں اس قسم کی مثالیں شمار و احصاء سے خارج ہیں اور جس

طرح مردوں کی آزادی وحق گوئی کی مثالیں جابجا ملتی ہیں اسی طرح عورتوں کی بھی ایسی مثالوں کی کچھ کمی نہیں ہے۔ یہاں ہم کتاب ''عقدالفرید'' سے چند حکایتیں اُن عورتوں کی نقل کرتے ہیں جو جنگ صفین میں بنی ہاشم کی طرف دار تھیں اور عین جنگ کے موقع پر اہل شام کے برخلاف نہایت جوش وخروش کے ساتھ خطبے پڑھتی تھیں اور جنگ کے خاتمے کے بعد جب حضرت امیر معاویہؓ سے اُن کی گفتگو ہوئی تو انھوں نے نہایت آزادی کے ساتھ اپنے دلی خیالات ظاہر کیے اور جس بات کو وہ اپنے نزدیک حق جانتی تھیں اس کے ظاہر کرنے سے امیر شام کا رعب وداب ان کو مانع نہیں آیا۔

ازآنجملہ شعبی سے روایت ہے کہ بنی ہلال کی ایک عورت بکارہ نامی نے حضرت امیر معاویہؓ کے روبرو (جب کہ وہ مدینہ میں تھے) حاضر ہونے کی اجازت چاہی۔ چناں چہ اس کو اجازت دی گئی۔ بکارہ اس وقت معمر ہوگئی تھی۔ اُس کی بنیائی میں فرق آگیا تھا۔ قویٰ ضعیف ہوگئے تھے اور بدن میں رعشہ تھا۔ دو خادم اس کو تھام کر امیر کے سامنے لائے۔ بکارہ نے سلام کیا اور بیٹھ گئی۔ امیر نے سلام کا جواب دیا اور مزاج پوچھا اور کہا: ''افسوس ہے کہ زمانے نے تمہارے حال دگرگوں کر دیا۔'' بکارہ نے کہا: ''بے شک اُس کی گردشیں ایسی ہی ہیں۔''

مروان نے بطور سعایت کے کہا: ''اے امیرالمومنین! تم نے اس کا کلام بھی سنا ہے یہ کہتی ہے ؎

انری ابن هند لخلافة مالگا
هيهات ذاک وان اراد بعيد
مَلتّک نفسک فی الخلاء ضلالةً
اغواک عمرُو للشقا و سعيد

یعنی ''کیا ہم ابن ہند (یعنی معاویہؓ) کو خلافت کا مالک سمجھیں؟ یہ دور از قیاس ہے اور اگر وہ ایسا چاہے تو اس کے مرتبے سے بالاتر ہے، (اے معاویہ) تیرے نفس نے گمراہی سے یہ آرزو تیری دل میں ڈالی ہے اور عمرو ابن العاص نے تجھ کو بدبختی کے لیے ورغلایا ہے۔

جب مروان یہ اشعار پڑھ چکا تو سعید بن العاصؓ نے کہا کہ اس نے یہ اشعار بھی

کہے ہیں ؎

قدکنت ان اطمع ان اموت ولاارئ
فوق المنا برمن امیة خاطبا
فاللّٰہ اخر مُدّتی فتطاولت
حتی رایت من الزمان عجائبا
فی کُلِّ یومٍ للزمان خطیھم
بین الجمیع لاٰل احمد عائبًا

یعنی ''میری آرزو تھی کہ میں مرجاؤں اور بنی امیہ میں سے کسی کو منبر پر خطبہ پڑھتا ہوا نہ دیکھوں مگر خدا نے میری رسّی دراز کردی یہاں تک کہ زمانے کے عجیب عجیب کرشمے میری نظر سے گزرے اور میں برابر اُن خطیبوں سے علی الاعلان آلِ احمدؐ کی برائیاں سنتی رہی۔

مروان وغیرہ جب یہ چھیڑ کرنے کے بعد خاموش ہورہے تو بکارہ بولی: ''اے معاویہ! بے شک یہ میرا کلام ہے جو انھوں نے اُس وقت پڑھا۔ اور جو کلام ابھی تجھ پر ظاہر نہیں کیا گیا وہ اس سے بہت زیادہ ہے۔'' امیر کو یہ سن کر ہنسی آ گئی اور کہا: ''یہ امر تمہاری حاجت براری کرنے سے مجھ کو مانع نہیں آ سکتا۔ تم اپنی حاجت بیان کرو۔'' اُس غیرت مند عورت نے کہا: ''بس! اب اس بے لطفی کے بعد ایسا نہیں ہو سکتا۔'' اور وہ وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔

شبعی نے بنی امیہ کی ایک جماعت سے روایت کی ہے کہ ایک دن رات کو جب کہ امیر معاویہؓ کے پاس عمرو، سعید، عتبہ، ولید موجود تھے۔ عدی بن قیس ہمدانی کی بیٹی زرقا کا ذکر چلا جو اپنی قوم کے ساتھ جنگِ صفین میں شریک تھی۔ امیر نے کہا: ''تم میں سے کسی کو اُس کا کلام یاد ہے؟'' اُن میں سے بعض نے کہا: ''ہاں اے امیر المومنین! ہم کو یاد ہے۔'' امیر نے کہا: ''مجھ کو مشورہ دو کہ اُس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟'' بعضوں نے کہا کہ اُس کو قتل کر دیا جائے۔ امیر نے کہا: ''تم نے بہت بُرا مشورہ دیا۔ کیا مجھ کو زیبا ہے کہ میں اپنی نسبت لوگوں سے یہ کہلواؤں کہ ایک عورت کو جب کہ وہ قابو میں آ گئی قتل کروا ڈالا؟''

اس کے بعد امیر نے کوفہ کے عامل کو (جہاں زرقا رہتی تھی) لکھا کہ زرقا کو اس کے

چند معتمد محرموں اور قبیلے کے سرداروں کے ہمراہ عمدہ ساز و سامان کے ساتھ اور معقول سفر خرچ دے کر ہمارے پاس روانہ کردو۔ عامل نے زرقا کو طلب کیا اور امیر کا خط پڑھوا دیا۔ زرقا نے کہا: ''اگر امیر نے میرا وہاں جانا میری مرضی پر منحصر رکھا ہے تو میں جانا نہیں چاہتی اور اگر حتمی حکم ہے تو بہرحال جانا پڑے گا، فرمانبرداری ضروری ہے۔'' آخر عامل نے جیسا کہ اُس کو حکم تھا بہت تزک و احتشام کے ساتھ اس کو روانہ کیا۔

جب وہ معاویہؓ کے پاس پہنچی تو امیر نے اُس کو بہت خاطر داری اور اعزاز کے ساتھ لیا اور پوچھا کہ ''سفر کس طرح طے ہوا؟'' کہا: ''جس طرح لڑکی ماں کی گود میں پرورش پاتی ہے یا بچہ گہوارے میں سوتا ہے۔'' امیر نے کہا: ''ہم نے اسی طرح عامل کو ہدایت کی تھی۔'' پھر زرقا سے پوچھا: ''تم کو معلوم ہے کہ تم کیوں بلائی گئی ہو؟'' اُس نے کہا: ''جو راز مجھ پر ظاہر نہیں کیا گیا اُس کو میں کیوں کر جان سکتی ہوں؟''

امیر نے کہا: ''اے زرقا! کیا تو سرخ اونٹ پر سوار جنگِ صفین کے مجمع میں موجود نہ تھی اور کیا تو اپنے خطبوں سے آتشِ حرب کو نہیں بھڑکا رہی تھی اور لوگوں کو مقابلے پر برانگیختہ نہیں کر رہی تھی؟ آخر کار اس جوش کا کیا سبب تھا؟'' زرقا نے کہا: ''اے امیرالمومنین! سر[1] مر چکا اور دُم کٹ چکی اور جو کچھ جانا تھا جا چکا، زمانہ پلٹیاں کھانے والا ہے اور حوادث و واقعات کا سلسلہ برابر جاری ہے۔''

امیر نے کہا: ''اے زرقا! تجھ کو اپنا اُس دن کا خطبہ یاد ہے؟'' اُس نے کہا: ''لا واللہ مجھ کو بالکل یاد نہیں رہا۔'' تجھ کو نہیں تو مجھ کو یاد ہے۔ تیری اُس تقریر کا کیا کہنا ہے جو تو اُس وقت کہہ رہی تھی کہ ''اے لوگو! باز آؤ اور پلٹ جاؤ۔ تم اُس فتنہ میں پڑ گئے ہو جس نے تم پر ظلمت کے پردے ڈال دئے ہیں اور تم کو راہِ راست سے برگشتہ کر دیا ہے۔ یہ کیسا اندھا اور بہرا اور گونگا فتنہ ہے کہ نہ ہانکنے والے کی آواز سنتا ہے نہ کھینچنے والے کی مرضی پر چلتا ہے۔ دیکھو! چراغ آفتاب کے سامنے روشن نہیں ہوتا اور ستارے چاند کے سامنے ماند رہتے ہیں

[1] عربی کی یہ مثل کہ ''مات الراس و بتر الذنب'' ایسے موقع پر بولی جاتی ہے جیسے ہم کہتے ہیں ''گزشتہ را صلوات'' یا ''الماضی لا یذکر''۔ (حالی)

اور لوہے کو لوہا ہی کاٹ سکتا ہے۔ دیکھو! جو ہم سے راہ پوچھے گا ہم اس کو راہ بتائیں گے اور جو ہم سے سوال کرے گا ہم اُس کو جواب دیں گے۔ لوگو! حق اپنی کھوئی ہوئی چیز کو ڈھونڈ رہا تھا سو وہ اُس کو مل گئی۔ پس اے مہاجرین! غم وغصہ پر صبر کرو۔ تفرقہ کا رخنہ بند ہو گیا ہے اور کلمۂ حق پر سب متفق ہو گئے ہیں اور سچائی نے ظالموں کا سر توڑ دیا ہے۔ یاد رکھو! عورتوں کی آرائش مہندی سے ہے اور مردوں کی زیبائش خون سے۔'' غرض کہ جس قدر امیر کو اُس کے فقرے یاد تھے پڑھ کر کہا: ''اے زرقا! جو خون علیؑ نے بہائے اُن میں تو بھی شریک تھی؟'' زرقاء نے کہا: ''خدا تیرا بھلا کرے اور تجھے سلامت رکھے۔ تو نے ایک مژدہ سنا کر اپنی جلیس کو (یعنی مجھ کو) خوش کر دیا۔'' امیر نے کہا: ''کیا اس بات سے کہ سفکِ دماء میں تو علیؑ کے ساتھ شریک تھی تجھ کو خوشی ہوئی؟'' کہا: ''بے شک! اور اب تجھ کو میرے خیالات کا بخوبی اندازہ ہوگا۔'' امیر یہ سن کر ہنسا اور کہا: ''واللہ علیؑ کے ساتھ تمہاری وفاداری اُس کی وفات کے بعد زیادہ عجیب ہے۔ بہ نسبت اُس محبت و ولا کے جو اُس کی زندگی میں تم اُس کے ساتھ رکھتی تھی۔'' ''اے زرقاء! اب تو اپنی حاجت بیان کر۔ میں اس کو پورا کروں گا۔'' زرقاء نے کہا: ''میں نے قسم کھائی ہے کہ جن کے برخلاف میں نے کوشش کی ہے اُن سے کبھی کچھ سوال نہ کروں گی۔ ہاں اگر تو بغیر طلب اور خواہش کے کچھ دے تو تجھ کو اختیار ہے۔'' امیر نے کہا: ''ٹھیک ہے۔'' اور اُس کو اور اُس کے ہمراہیوں کو انعام و اکرام اور خلعت دے کر رخصت کیا۔

سعید ابن خدافہ سے منقول ہے کہ مروان نے (جب کہ مدنیہ کی ولایت اُس کے نامزد تھی) ایک لڑکے کو کسی قصور قید کر دیا۔ جب اُس کے گھر خبر پہنچی تو اُس کی دادی اُمّ سنان بنت جشمہ مروان کے پاس گئی اور اپنے پوتے کے باب میں کچھ گفتگو کی۔ مروان نے نہایت سخت جواب دیا۔ وہ اس پر سیدھی امیر معاویہؓ کے دربار میں پہنچی اور اپنا حسب ونسب بیان کیا۔ امیر نے اس کو پہچان لیا اور کہا: ''اے بنت جشمہ! بہت اچھا ہوا کہ تو آئی۔ مگر یہاں قدم رنجہ کرنے کا کیا باعث ہوا؟ مجھ کو خوب معلوم ہے کہ تو ہم پر تبّرا کرتی تھی اور ہمارے دشمنوں کو ہمارے مقابلے میں برانگیختہ کرتی تھی۔'' اُمّ سنان نے کہا: ''سن اے

معاویہ! عبدمناف کی اولاد کو اخلاقِ پاکیزہ اور حلمِ وسیع دیا گیا ہے۔ وہ واقف ہو کر انجان نہیں بنتے اور حلم اختیار کر کے سفاہت اختیار نہیں کرتے اور عفو کے بعد انتقام نہیں لیتے اور اپنے اسلاف کے قدم بہ قدم چلنا سب سے زیادہ تجھ کو سزاوار ہے۔'' امیر نے کہا: ''ہاں بے شک ہم ایسے ہی ہیں۔'' اس کے بعد امیر نے اُمّ سنان کے چند اشعار پڑھے جن میں علی مرتضیٰؓ کی مدح وثنا۔ اور اُن کے مخالفین پر تعریض کی گئی تھی۔ اُمّ سنان نے اقرار کیا کہ بے شک یہ اشعار میرے ہیں مگر میں اُمید کرتی ہوں کہ تو ہمارے لیے (علی مرتضیٰ کے بعد) اچھا جانشین ہو گا۔''

امیر کے ایک جلیس نے اُمّ سنان کے کچھ اور اشعار پڑھے جن سے امیر کی طبیعت پر اس کی نسبت بُرا اثر ہوا۔ اُمّ سان نے کہا: ''اے امیر المؤمنین! مسلمانوں کے دل میں تیری دشمنی پیدا ہونے کے یہی لوگ باعث ہیں۔ ان کی باتوں کو حقیر جان اور ان کو اپنا مقرب نہ بنا۔ اگر تو ایسا کرے گا تو خدا کا قرب اور مومنوں کی محبت تیرے ساتھ زیادہ ہو گی۔ تو ہماری رائے اور ہمارے دلی خیالات سے واقف ہے۔ واللہ! علیؓ کو ہم تجھ سے زیادہ محبوب رکھتے تھے، لیکن تجھ کو بھی اور لوگوں سے زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔'' امیر نے پوچھا: ''کن سے؟'' کہا: ''مروان بن الحکم اور سعد بن العاص سے۔'' امیر نے پوچھا: ''میں اس محبت کا مستحق تیرے نزدیک کیوں کر ہوا؟'' کہا: ''اپنے وسعتِ علم اور عفو و درگذر کے سبب سے۔''

امیر نے پوچھا: ''یہاں کیوں کر آنا ہوا؟'' مروان نے مدینہ میں ایسے قدم جمائے ہیں کہ گویا کبھی وہاں سے نہ ٹلے گا۔ نہ وہ انصاف کے ساتھ حکومت کرتا ہے اور نہ شریعت کے موافق فیصلہ کرتا ہے۔ مسلمانوں کی لغزشیں ڈھونڈتا رہتا ہے اور اُن کے پردے فاش کرتا رہتا ہے۔ چناں چہ ابھی اُس نے میرے پوتے کو قید کیا ہے۔ میں اس کے پاس گئی تھی۔ اُس نے کہا: ''تو نے ایسا کیا اور تو نے ویسا کیا۔'' (یعنی بنی امیہ کے خلاف کارروائیاں کیں) میں نے بھی اس کو پتھر سے زیادہ کرخت اور حنظل سے زیادہ کڑوے جواب دئے اور اپنے تئیں ملامت کی اور دل میں کہا کہ میں کیوں نہ اپنا معاملہ اُس شخص کے پاس لے جاؤں جس سے بہ نسبت مروان کے زیادہ عفو اور درگذر کی امید ہے پس

میں تیرے پاس آئی ہوں تا کہ تو میرے معاملے میں غور کرے۔'' امیر نے کہا: ''تو سچ کہتی ہے۔ میں تجھ سے تیرے پوتے کی صفائی کے متعلق کچھ پوچھنا نہیں چاہتا۔'' اور کاتب کو اشارہ کیا کہ رہائی کا حکم لکھ کر اس عورت کو دیدو، اور پانچ ہزار درہم زادراہ کے لیے اور اونٹ سواری کے لیے اس کو دے کر رخصت کیا۔

ابوبکر ہذلی نے عکرمہؓ[1] سے روایت کی ہے کہ اطرش ابن رواحہ کی بیٹی اپنے عصا کے سہارے سے امیر معاویہ کے دربار میں آئی اور یہ کہہ کر کہ ''السلام علیک یا امیر المومنین!'' بیٹھ گئی۔ امیر نے کہا: ''اے عکرشہ! کیا اب میں تیرے نزدیک امیر المومنین ہوگیا؟'' عکرشہ نے کہا: ''ہاں! کیوں کہ اب علیؓ زندہ نہیں رہے۔'' اس کے بعد امیر نے کہا: ''تو تلوار حمائل کے صفین میں یہ خطبہ نہیں پڑھ رہی تھی؟'' اے مہاجرین وانصار! معاویہ ناسمجھ عربوں کو جو نہ ایمان کو جانتے ہیں اور نہ شریعت کو سمجھتے ہیں ساتھ لے کر تم سے لڑنے کو آیا ہے۔ اُن کو دنیا کا لالچ دیا ہے سو وہ لالچ میں آ گئے ہیں اور اُن کو باطل کی طرف پکارا ہے، سو وہ اُس کی طرف دوڑ پڑے ہیں۔ پھر امیر نے کہا: ''میں اُس وقت تجھ کو دیکھ رہا تھا کہ تو گویا اِسی عصاء کے سہارے سے کھڑی تھی اور دونوں لشکر بالاتفاق کہہ رہے تھے کہ یہ اطرش بن رواحہ کی بیٹی عکرشہ ہے۔ اگر اُس وقت تیرے اختیار میں ہوتا تو اہل شام کو قتل وقمع کر ڈالتی۔ مگر جو خدا کو منظور ہوتا ہے وہی ظہور میں آتا ہے۔ آخر اس جوش کا کیا سبب تھا؟'' عکرشہ نے کہا: ''اے امیر المومنین! صدقات میں ہمارا حق تھا جو کہ ہمارے مقدور والوں سے لیے جاتے تھے اور ہمارے بے مقدوروں پر تقسیم کیے جاتے تھے۔ سو یہ حق ہمارے ہاتھ سے جاتا رہا تھا۔ نہ ہمارے شکستہ حالوں کی خبر لے جاتی تھی نہ ہمارے محتاجوں کی دستگیری کی جاتی تھی۔ پس اگر یہ تیری رائے سے ہوا تھا تو تجھ کو غفلت سے ہوشیار ہونا اور اپنی رائے سے رجوع کرنا چاہیے تھا۔ اور اگر تیری رائے کے خلاف تھا تو تجھ کو زیبا نہیں تھا کہ خائنوں سے مدد لے اور ظالموں کو کام سپرد کرے۔'' امیر نے کہا: ''اے عکرشہ! ہم کو رعیت کے معاملات میں ایسے امور

---

[1] یہ عکرمہؓ ابوجہل کے بیٹے نہیں بلکہ عبداللہ بربری کے لڑکے، حضرت ابن عباس کے غلام اور بڑے عالم فقیہ محدث اور مفسر ہیں۔ ۱۰۷ھ (۷۲۵ء) میں وفات پائی۔

پیش آجاتے ہیں جن کی روک تھام کرنا اور سمیٹنا مشکل ہو جاتا ہے۔'' عکرشہ نے کہا: ''خدا نے ہمارے لیے کوئی حق ایسا مقرر نہیں کیا جس میں دوسرے کا ضرر ہو۔'' آخر امیر نے اُس کی خواہش کے موافق حکم دے دیا۔

ابوسہیل تمیمی سے روایت ہے کہ معاویہ ابن ابی سفیان نے موسم حج میں بنی کنانہ کی ایک عورت کا حال پوچھا جو حجو نیہ میں آکر اُترا کرتی تھی اور جس کو دارمیہ حجو نیہ کہتے تھے اور جو نہایت سیہ فام اور فربہ تھی۔ لوگوں نے کہا وہ موجود ہے، امیر نے اُس کو بلا بھیجا۔ جب وہ آئی تو اس سے پوچھا: ''اے دارمیہ! تو جانتی ہے کہ تجھ کو کیوں بلایا گیا ہے؟'' اس نے کہا: ''غیب کا علم تو خدا ہی کو ہے۔'' امیر نے کہا: ''میں نے تجھ کو یہ پوچھنے کو بلایا ہے کہ تو کس لیے علیؓ سے محبت اور مجھ سے بغض رکھتی تھی؟'' اُس نے کہا: ''تو مجھ کو معاف کرے گا؟'' امیر نے کہا: ''نہیں۔'' اُس نے کہا: ''اگر تو نے معافی سے انکار کیا ہے تو سُن! میں علیؓ کو اس لیے دوست رکھتی تھی کہ وہ رعیت کے ساتھ انصاف کرتا تھا۔ سب کو استحقاق کے موافق حقوق دیتا تھا۔ مسکینوں سے محبت رکھتا تھا اور دینداروں کی تعظیم کرتا تھا۔ اور تجھ سے اس لیے بغض رکھتی تھی کہ تو اپنے سے افضل کے ساتھ لڑا اور جس کا تو مستحق نہ تھا اُس حق کا طالب ہوا۔ تو نے خون ریزی کرائی۔ فیصلوں میں ناانصافی کی۔ ہوائے نفس کے موافق حکومت کی۔'' امیر نے کہا: ''نیک بخت! تو نے علیؓ کو دیکھا بھی ہے؟'' کہا: ''کیوں نہیں!'' امیر نے کہا: ''تو نے اس کو کیسا پایا؟'' کہا: ''واللہ! اُس کو حکومت نے تیری طرح فتنے میں نہیں ڈالا۔ اور دولت نے تیری طرح اس کو غافل نہیں کیا۔'' امیر نے پوچھا تو نے اس کا کلام بھی سنا ہے؟'' کہا: ''کیوں نہیں۔ اُس کا کلام تاریکی سے دلوں کو اس طرح جلا کرتا تھا جیسے تیل برتن کا زنگ چھڑا دیتا ہے۔'' امیر نے کہا: ''بے شک تو سچ کہتی ہے۔ اگر مجھ کو کوئی حاجت ہو تو بیان کر۔'' اُس نے کہا: ''کیا تو اُسے پورا کرے گا؟'' امیر نے کہا: ''ضرور۔'' اُس نے کہا: ''مجھ کو سو اونٹنیاں سرخ رنگ کی دے جن کے ساتھ اُن کا ساربان بھی ہو۔'' امیر نے کہا: ''اگر میں یہ انٹنیاں تجھ کو دوں تو بھی میری جگہ تیرے دل میں علیؓ کے برابر ہو گی یا نہیں؟'' دارمیہ نے کہا: ''سبحان اللہ! کیا اُس کے سوا دوسرے شخص کی جگہ؟'' امیر نے اس کے

جواب میں دو شعر پڑھے ؎

اذالم اعد بالحلم منّی علیکم

فمن ذا الذی بعدی یوتل بالحلمِ

خدیھا ھنیئاً وا ذکری فعل ماجدٍ

جزاک علیٰ حرب العداوۃ بالسِّلم

یعنی ''اگر میں تیرے ساتھ فراخ حوصلگی سے پیش نہ آؤں تو پھر میرے بعد کون ہے جس سے امید کی جائے؟ لے یہ اونٹنیاں تجھ کو مبارک ہوں اور یاد رکھ اُس شخص کو جس نے تیرے ساتھ عداوت کی لڑائی کا معاوضہ صلح کے ساتھ کیا ہے۔'' اس کے بعد امیر نے کہا: ''واللہ اگر علیؓ زندہ ہوتا تو ان میں سے ایک اونٹنی بھی تجھ کو نہ دیتا۔'' وہ بولی: ''واللہ! اونٹنی تو اونٹنی! وہ ایک بلی کا بچہ بھی مسلمانوں کے مال میں سے دینے والا نہ تھا۔''

شعبی سے روایت ہے کہ معاویہؓ نے کوفے کے والی کو لکھا کہ ''اُمّ الخیر بنت حریش ابن سراقہ کو سوار کرا کر عزت و احترام کے ساتھ ہمارے پاس بھیج دے۔ والی نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور اُمّ الخیر بہت آرام کے ساتھ معاویہؓ کے پاس پہنچی۔ معاویہ نے اس کو اپنے محل میں اتارا۔ اور چوتھے روز جب کہ جلیس و مصاحب جمع تھے اس کو بات چیت کے لیے بلایا۔ اُمّ الخیر نے آتے ہی کہا: ''السلام علیک یا امیر المومنین! ورحمتہ اللہ و برکاتہ۔'' امیر نے سلام کا جواب دیا اور تعریضاً اس بات کا شکریہ ادا کیا کہ تو نے مجھے امیر المومنین کے لفظ سے یاد کیا اُمّ الخیر نے کہا: ''اے! امیر المومنین! لکل (بکل) اجل کتاب یعنی ہر چیز کی مدت معین ہے۔'' امیر نے کہا: ''سچ ہے۔'' پھر اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے پوچھا کہ عمار یاسرؓ کے قتل کے وقت تو نے کیا خطبہ پڑھا تھا؟'' کہا: ''نہ میں نے اُس کو پہلے سے بنایا تھا اور نہ اُس موقع کے بعد کسی کو سنایا۔ یہی چند جملے تھے جو صدمے کے سبب ٹپک پڑے تھے۔ لیکن اگر اس کے سوا کوئی اور کلام تو سننا چاہے تو میں سناؤں۔'' امیر یہ سن کر مصاحبوں کی طرف ملتفت ہوا اور پوچھا: ''تم میں سے کسی کو اس کا وہ کلام یاد ہے؟'' ایک نے اُن میں سے کہا: ''اے امیر المومنین! مجھ کو کچھ کچھ اس میں سے یاد ہے۔'' اور اُس نے اُس بلیغ خطبے کے چند فقرے امیر

کے سامنے پڑھے۔ جن میں لوگوں کو علی مرتضیٰؓ کے فضائل و مناقب کا ذکر کر کے اُن کے ساتھ دینے اور اہلِ شام سے لڑنے کی ترغیب نہایت پرزور الفاظ میں دی گئی تھی۔ امیر نے ان فقروں کو سن کر اُمّ الخیر سے کہا: ''ظاہر ہے کہ اس کلام سے تیرا مطلب میرے قتل کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ پس اگر میں تجھ کو قتل کرادوں تو اس میں کوئی حرج نہیں معلوم ہوا۔'' اُمّ الخیر نے کہا: ''واللہ مجھ کو ہرگز شاق نہیں کہ میرا قتل اُس شخص کے ہاتھ سے ظہور میں آئے جس کی شقاوت سے میری سعادت مقصود ہے۔'' امیر نے کہا: ''اے فضول گو! عثمان بن عفانؓ کے باب میں تو کیا کہتی ہے؟'' اُمّ الخیر نے کہا: ''لوگوں نے جب اس کو خلیفہ کیا تو اس سے راضی تھے اور جب اُس کو قتل کیا تو اُس سے ناراض تھے۔'' امیر نے کہا: ''اے اُمّ الخیر! مدح ایسی ہی ہوتی ہے؟'' وہ بولی: ''خدا گواہ ہے اور اس کی گواہی کافی ہے۔ میرا مطلب اس سے عثمانؓ کی تنقیص نہیں ہے بلکہ وہ سابقین اولین میں سے تھا اور بے شک آخرت میں اُس کا درجہ بلند ہوگا۔'' امیر نے کہا: ''اچھا زبیرؓ کے باب میں تو کیا کہتی ہے؟'' کہا: ''بھلا میں رسول اللہ صلعم کی پھوپھی کے بیٹے اور اُن کے حواری کے حق میں کیا کہہ سکتی ہوں جن کی نسبت خود رسول مقبولؐ نے جنتی ہونے کی شہادت دی ہے۔'' اس کے بعد اُمّ الخیر نے کہا: ''اے معاویہؓ! تو قریش میں احلم الناس مشہور ہے۔ میں تجھ کو خدا کی قسم دیتی ہوں کہ مجھے ان سوالات سے معذور رکھ اور اُن کے سوا جو تیرا جی چاہے سو پوچھ۔'' امیر نے سوالات موقوف کیے اور اُس کو معقول رخصتانہ دے کر عزت و احترام کے ساتھ رخصت کیا۔

مذکورہ بالا حکایتوں سے قطع نظر اس کے قرونِ اولیٰ کی عورتوں کی راست بازی اور حق گوئی کما حقہ ثابت ہوتی ہے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ:-

وہ جنگ کے معرکوں میں شریک ہوتی تھیں۔

اپنے جتھوں کا ساتھ دیتی تھیں۔

فریقِ مخالف کے برخلاف لوگوں کو اُکسانے کے لیے نہایت فصیح و بلیغ اور پرزور خطبے خود انشاء کر کے پڑھتی تھیں۔

خلیفہ کے دربار میں بے حجابانہ حاضر ہوتی تھیں۔

بھرے مجمع میں آزادانہ بے باکانہ گفتگو کرتی تھیں۔

سب سے بڑھ کر ان حکایتوں سے امیر معاویہؓ کے تحمل اور فراخ حوصلگی کا ثبوت ملتا ہے کہ باوجود ہر طرح کے اقتدار اور اختیار کے رعیت کے ضعیف ترین فرقے کی ایسی تلخ اور ناگوار باتیں برداشت کی جاتی تھیں اور اعیانِ دربار کے سامنے اُن کو اپنے اوپر اعتراض اور خُردہ گیری کرنے کا موقع دیا جاتا تھا۔ امیر کا یہ قول مشہور ہے کہ **النساء یغلبن الکرام و یغلبھن اللئام** یعنی عورتیں شریفوں پر غالب اور کمینیوں سے مغلوب رہتی ہیں۔ اور اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ امیر اغماض اور تحمل شاید عورتوں کے ساتھ مخصوص ہو۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ امیر کا یہ برتاؤ عورتوں اور مردوں کے ساتھ برابر تھا۔

چناں چہ ابوعمر نے ہمدان کے ایک شخص سے روایت کی ہے کہ معاویہؓ نے ضرار السدی سے کہا کہ ''میرے سامنے علیؓ کے کچھ اوصاف بیان کر۔'' اُس نے جناب مرتضویؓ کے عدل انصاف، علم و حکمت، دُنیا سے نفرت، شب بیداری، اشکباری، ذکر و فکر، قناعت مسکینوں پر شفقت، اہل دین کی تعظیم، قوی اور کمزور کے ساتھ یکسا برتاؤ اور اسی قسم کی بہت سی خصلتیں بیان کیں۔ معاویہؓ پر اس ذکر سے رقت طاری ہوگئی اور کہا: ''ابوالحسن پر خدا کی رحمت ہو، واللہ وہ ایسا تھا۔'' پھر ضرار سے پوچھا کہ تجھ پر اُس کے غم میں کیا گذرتی ہے؟'' ضرار نے کہا: ''جو اُس عورت پر گذرتی ہے جس کا اکلوتا بیٹا اُس کی گود میں ذبح کیا گیا ہو۔''

ظاہر ہے کہ امیر معاویہؓ کا جو معاملہ جناب مرتضویؓ کے ساتھ رہا تھا اُس کو ہر شخص خوب جانتا تھا۔ باوجود اس کے لوگ آپ کے فضائل و مناقب بے ڈھرک امیر کے سامنے بیان کرتے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اُس وقت تک اسلام کی تعلیم کا اثر جو اُس نے عربِ عرباء کی آزاد طبیعتوں پر کیا تھا زائل نہیں ہوا تھا اور وہ باوجود ہر طرح کی قدرت اور کمنت کے حق کی تلخ اور ناگوار باتیں جو اُن کی طبیعت اور مرضی کے خلاف کہی جاتی تھیں گوارا کرتے تھے۔ اگر چہ خلافت راشدہ کے تیس برس (جن کی رسول مقبولؐ نے پیشین گوئی فرمائی تھی) گذر چکے تھے اور ملکِ عضوض کا دور دورہ شروع ہوگیا تھا مگر آزادی جو عرب کی خاک کا اصلی جوہر تھا اور اسلام کی تعلیم نے اُس کو جلا دی تھی، اُس

میں ابھی تک کچھ فرق نہیں آیا تھا۔

مذکورہ بالا حکایتوں کا مضمون ہم نے بطور خلاصے کے بیان کیا ہے۔ خصوصاً اُن خطبوں میں سے جو صفین میں امیر معاویہؓ کے برخلاف پڑھے گئے صرف معدودے چند جملوں کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ اور بعض حکایتیں جو صاحب عقدالفرید نے اسی باب میں عورتوں کے متعلق نقل کی ہیں بالکل چھوڑ دی گئی ہیں۔ ورنہ نتائجِ مذکور الصدر کے سوا اور بھی بہت سے نتیجے ان حکایتوں سے استخراج ہو سکتے تھے مگر بخوفِ تطویل صرف اسی خلاصے پر اکتفا کیا گیا۔

ترجمۂ حالی

(اپنی یہ مختصر سوانح عمری مولانا نے ۱۹۰۱ء میں نواب عماد الملک بہادر کی فرمائش پر لکھ کر حیدر آباد بھیجی تھی۔ جن سے اُن کے کسی انگریز دوست نے لندن سے مولانا کے حالات منگائے تھے۔ مولانا نے ان حالات کی ایک نقل اپنے قلم سے اپنے مستعملہ ''دیوانِ حالؔی'' کے ابتدائی اوراق پر لکھ لی تھی وہیں سے یہ نقل لے کر یہاں درج کی جاتی ہے۔)

ولادت:- میری ولادت تقریباً ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں بمقام قصبہ پانی پت جو شاہجہاں آباد (دہلی) سے جانب شمال ۵۳ میل کے فاصلے پر ایک قدیم بستی ہے واقع ہوئی۔
سلسلۂ نسب:- اس قصبے میں کچھ کم سات سو برس سے قوم انصار کی ایک شاخ جس سے راقم کو تعلق ہے، آباد چلی آتی ہے۔ ساتویں صدی ہجری اور تیرھویں صدی عیسویں میں جب کہ غیاث الدین[1] بلبن تخت دہلی پر متمکن تھا۔ شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ[2] انصاری معروف بہ پیر ہرات کی اولاد میں سے ایک بزرگ خواجہ ملک[3] علی نام جو علوم متعارفہ میں اپنے عام

---

۱ غیاث الدین بلبن: خاندان غلامان کا نواں بادشاہ اور بڑا منتظم، لائق، منصف، متقی اور پرہیزگار انسان تھا۔ شمس الدین التمش نے بطور ایک غلام کے خریدا تھا۔ پھر اپنی بیٹی اُس سے بیاہ دی۔ تقدیر نے ۶۶۴ھ (۱۲۶۶ء) میں دہلی کے تخت پر بٹھا دیا۔ نہایت کامیابی اور امن و امان کے ساتھ ۳۰ سال ہندوستان پر حکومت کرنے کے بعد ۸۰ برس کی عمر میں ۶۸۶ھ (۱۲۸۷ء) میں انتقال کیا۔

۲ خواجہ عبداللہ انصاری: ہرات کے نہایت مقدس اور صاحب علم و فضل بزرگ تھے۔ یہ بہت سی کتابوں کے منصف اور بڑے صوفی منش انسان تھے۔ آل سلجوق کے زمانے میں ۹ / شعبان ۳۹۶ھ (۱۰۰۶ء) کو پیدا ہوئے اور ۸۵ برس کی عمر پا کر ۴۸۱ھ (۱۰۸۸ء) میں اس دار فانی سے رحلت فرمائی۔

۳ خواجہ ملک علی: یہی بزرگ تھے جو انصاریوں میں سب سے پہلے پانی پت میں وارد ہوئے۔ ۷۱۸ھ ان کا سالِ وفات ہے۔

معاصرین سے ممتاز تھے۔ ہرات سے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے۔جن کا سلسلہ نسب ۲۶ واسطے سے حضرت ابوایوب[1] انصاریؓ تک اور ۱۸ واسطے سے شیخ الاسلام تک اور ۱۰ واسطے سے ملک محمود شاہ انجو ملقب بہ آق خواجہ تک جو غزنوی دور میں فارس و کرمان و عراقِ عجم کا فرمانروا تھا پہنچتا ہے۔

آباؤاجداد کا ہندوستان آنا:- چوں کہ غیاث الدین اس بات میں نہایت مشہور تھا کہ وہ قدیم اشراف خاندانوں کی بہت عزت کرتا ہے اور اُس کا بیٹا سلطان[2] محمد علما وشعرا اور دیگر اہل کمال کا حد سے زیادہ قدر دان تھا اس لیے اکثر اہل علم اور عالی خاندان لوگ ایران وترکستان سے ہندوستان کا قصد کرتے تھے۔ اسی شہرت نے خواجہ ملک علی کا سفر ہندوستان پر آمادہ کیا تھا چناں چہ سلطان غیاث الدین چند عمدہ اور سیر حاصل دیہات پرگنہ پانی پت میں اور متعد بہ اراضی سواد قصبہ پانی پت میں بطور مدد معاش کے اور بہت سی زمین اندرون آبادی قصبہ پانی پت واسطے سکونت کے اُن کو عنایت کی اور منصبِ قضا و صدارت و تشخیصِ نرخِ بازار اور تولیتِ مزاراتِ ائمہ جو سواد پانی پت میں واقع ہیں اور خطابتِ عیدین اُن کے متعلق کر دی۔ پانی پت میں جو اب تک ایک محلّہ انصاریوں کا مشہور ہے وہ انھیں بزرگ کی اولاد سے منسوب ہے۔

میں باپ کی طرف سے اسی شاخ سے علاقہ رکھتا ہوں اور میری والدہ سادات کے ایک معزز گھرانے کی جو یہاں ''سادات شہدا پور'' کے نام سے مشہور ہیں، بیٹی تھیں۔

خاندان کا ذریعۂ معاش:- اگر چہ ملک علی کی اولاد میں بہت سے لوگوں نے اول سلطنت

---

[1] حضرت ابوایوب انصاریؓ: آنحضرت کے جلیل القدر صحابی ہیں۔ ۴۷ھ (۶۸۸ء) میں قسطنطنیہ کی دیواروں کے نیچے انتقال فرمایا۔ جہاں آپ جہاد کے لیے تشریف لے گئے تھے۔آپ کا مزار آج بھی زیارت گاہ عوام ہے۔

[2] محمد سلطان غیاث الدین کا بیٹا اور ملتان اور سندھ کو صوبیدار تھا۔نہایت علم دوست اور فاضل شخص تھا اس کا دربار ہمیشہ علما وفضلا سے بھرا رہتا تھا۔ شیخ سعدیؔ کو ایران سے طلب کیا مگر وہ نہ آسکے۔ البتہ انھوں نے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی ''گلستاں بوستاں'' کا ایک ایک نسخہ ہدیتہً بھیجا۔افسوس کہ یہ شاہزادہ مغلوں سے ایک لڑائی کے دوران میں ۶۸۳ھ میں مارا گیا۔

مغلیہ کے عہد میں پھر شاہانِ اودھ کی سرکار میں نہایت درجے کا امتیاز حاصل کیا تھا۔مگر زیادہ تر یہ لوگ اُسی ملک و مدد معاش پر قانع رہے جو سلاطین اسلام کی طرف سے وقتاً فوقتاً اُن کو عطا ہوتی رہی۔

میرے آباؤ اجداد نے جہاں تک معلوم ہے ظاہرا کوئی خدمت دلّی یا لکھنؤ میں اختیار نہیں کی۔سب سے پہلے میرے باپ نے سرکار انگریزی کی نوکری سررشتہ پرمٹ میں اختیار کی تھی۔

والد کا انتقال اور بھائی کی پرستی:- میری ولادت کے بعد میری والدہ کا دماغ مختل ہوگیا تھا اور میرے والد نے (۴۰ سال کی عمر میں) سنِ کہولت میں انتقال کیا جب کہ میں نو برس کا تھا،اس لیے میں نے ہوش سنبھال کر اپنا سرپرست بھائی بہنوں کے سوا کسی کو نہیں پایا۔

تعلیم:- اُنھوں نے اول مجھ کو قرآن حفظ کرایا۔اس کے بعد اگرچہ تعلیم کا شوق خود بخود میرے دل میں حد سے زیادہ تھا مگر باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا کبھی موقع نہیں ملا۔ایک بزرگ سید جعفر علی مرحوم جو میر ممنونؔ دہلوی کے بھتیجے اور نیز داماد بھی تھے اور بوجہ تعلق زناشوئی کے پانی پت میں مقیم تھے اور فارسی لٹریچر،تاریخ اور طب میں یدطولیٰ رکھتے تھے اُن سے دو چار فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور اُن کی صحبت میں فارسی لٹریچر سے ایک نوع کی مناسبت پیدا ہوگئی۔پھر عربی کا شوق ہوا۔انھیں دنوں میں مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری مرحوم لکھنؤ سے امامت کی سند لے کر آئے تھے اُن سے صرف ونحو پڑھی۔

شادی:- چند روز بعد بھائی اور بہن نے جن کو میں بمنزل والدین کے سمجھتا تھا تاہل پر مجبور کیا۔اُس وقت میری عمر ۱۷ برس کی تھی اور زیادہ تر بھائی کی نوکری پر سارے گھر کا گذارہ تھا کہ یہ جوا میرے کندھے پر رکھا گیا۔

تعلیم کا شوق دہلی لے گیا:- اب بظاہر تعلیم کے دروازے چاروں طرف سے مسدود ہوگئے۔سب کی یہ خواہش تھی کہ میں نوکری تلاش کروں۔مگر تعلیم کا شوق غالب تھا اور بیوی کا میکا آسودہ حال۔میں گھر والوں سے روپوش ہوکر دلّی چلا گیا اور قریب ڈیڑھ برس کے وہاں رہ کر کچھ صرف ونحو اور کچھ ابتدائی کتابیں منطق کی مولوی نوازش علی مرحوم سے وہاں

جوایک مشہور واعظ اور مدرس تھے پڑھیں۔

انگریزی نہ پڑھنے کے وجوہات:- اگرچہ اُس وقت قدیم دہلی کالج خوب رونق پر تھا مگر جس سوسائٹی میں، میں نے نشو ونما پائی تھی وہاں علم صرف عربی اور فارسی زبان میں منحصر سمجھا جاتا تھا۔ انگریزی تعلیم کا خاص کر پانی پت میں اول تو کہیں ذکر ہی سننے میں نہیں آتا تھا اور اگر اُس کی نسبت لوگوں کا کچھ خیال تھا تو صرف اس قدر کہ وہ سرکاری نوکری کا ایک ذریعہ ہے، نہ یہ کہ اُس سے کوئی علم حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ برخلاف اس کے انگریزی مدرسوں کو ہمارے علما مجہلے[1] کہتے تھے۔ دلّی پہنچ کر جس مدرسے میں مجھ کو شب وروز رہنا پڑا وہاں سب مدرس اور طلبہ کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں کو محض جاہل سمجھتے تھے۔ غرض کبھی بھول کر بھی انگریزی تعلیم کا خیال دل میں نہ گذرتا تھا۔ ڈیڑھ برس تک دلّی میں رہنا ہوا، اس عرصے میں کبھی کالج کو جاکر آنکھ سے دیکھا تک نہیں۔ اور نہ ان لوگوں سے (اُس زمانے میں) کبھی ملنے کا اتفاق ہوا جو اُس وقت کالج میں تعلیم پاتے تھے۔ جیسے مولوی ذکاء اللہ، مولوی نذیر احمد، مولوی محمد حسین آزاد وغیرہ وغیرہ۔

دلّی سے جبری واپسی:- میں نے دلّی میں شرح سُلّم، مُلّا حسن اور بیندی پڑھنی شروع کی تھی کہ سب عزیزوں اور بزرگوں کے جبر سے چاروناچار مجھ کو دلّی چھوڑنا اور پانی پت واپس آنا پڑا۔ یہ ذکر ۱۸۵۵ء کا ہے۔ دلّی سے آکر برس ڈیڑھ برس تک پانی پت سے کہیں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہاں بطور خود اکثر بے پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا۔

ملازمت:- ۱۸۵۶ء میں مجھے ضلع حصار میں ایک قلیل تنخواہ کی آسامی صاحب کلکٹر کے دفتر میں مل گئی۔

۵۷ء کا غدر اور ملازمت کا چھوٹ جانا:- ۵۷ء میں جب کہ سپاہ باغی کا فتنہ ہندوستان میں برپا ہوا اور حصار میں بھی اکثر سخت واقعات ظہور میں آئے اور سرکاری عملداری اُٹھ گئی تو میں وہاں سے پانی پت چلا آیا اور قریب چار برس کے پانی پت میں بے کاری کی حالت میں گزرے۔

---

[1] یعنی جہالت کی جگہ۔

دوبارہ تعلیم کا آغاز:۔اس عرصے میں پانی پت کے مشہور فضلا مولوی عبدالرحمٰن، مولوی مُحب اللہ اور مولوی قلندر علی مرحومان سے بغیر کسی ترتیب اور نظام کے کبھی منطق یا فلسفہ، کبھی حدیث، کبھی تفسیر پڑھتا رہا۔ اور جب ان صاحبوں میں سے کوئی پانی پت میں نہ ہوتا تھا تو خود بغیر پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا اور خاص کر علم ادب کی کتابیں شروح اور لغات کی مدد سے اکثر دیکھا کرتا تھا۔ اور کبھی کبھی عربی نظم ونثر بھی بغیر کسی کی اصلاح یا مشورے کے لکھتا تھا مگر اس پر اطمینان نہ ہوتا تھا۔ میری عربی اور فارسی تحصیل کا منتہا صرف اسی قدر ہے جس قدر اوپر ذکر کیا گیا۔

مرزا غالبؔ کی خدمت میں باریابی:۔جس زمانے میں میرا دلّی جانا ہوا تھا۔ مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ مرحوم کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ اور اکثر اُن کے اُردو اور فارسی دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے اُن کے معنی اُن سے پوچھا کرتا تھا اور چند فارسی قصیدے انھوں نے اپنے دیوان میں سے مجھے پڑھائے بھی تھے۔ اُن کی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکر شعر کرنے سے منع کیا کرتے تھے۔ مگر میں نے جو ایک آدھ غزل اُردو یا فارسی کی لکھ کر اُن کو دکھائی تو انھوں نے مجھ سے یہ کہا کہ ''اگرچہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمہاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے، مگر اُس زمانے میں ایک دو غزل سے زیادہ دلّی میں شعر لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ سے تعلق:۔ غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں بے کار کی حالت میں گذر گئے تو فکرِ معاش نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا۔ حسنِ اتفاق سے نواب[1] مصطفیٰ خاں مرحوم رئیس دہلی وتعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر سے جو فارسی میں حسرتیؔ اور اُردو میں شیفتہؔ تخلص کرتے تھے اور شاعری کا اعلیٰ درجہ کا مذاق رکھتے تھے۔ شناسائی ہوگئی اور آٹھ

---

[1] شیفتہؔ: بہت متین، سنجیدہ اور مہذب بزرگ تھے۔ ۱۸۰۶ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ عربی وفارسی کے عالم اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ حکیم مومن خاں مومنؔ کے فنِ شعر میں شاگرد تھے۔ ان کا تذکرہ شعرائے اُردو ''گلشن بے خار'' بہت مشہور ہے۔ ۱۸۶۹ء انتقال کیا۔

سات برس تک بطور مصاحبت کے اُن کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔

نواب صاحب جس درجے کے فارسی اور اُردو زبان کے شاعر تھے اُس کی بہ نسبت اُن کا مذاقِ شاعری مراتب بلندتر اور اعلیٰ تر واقع ہوا تھا۔ انھوں نے ابتدا میں اپنا فارسی اور اُردو کلام مومن[1] خاں کو دکھایا تھا مگر اُن کے مرنے کے بعد وہ مرزا غالب سے مشورہ سخن کرنے لگے تھے۔ میرے وہاں جانے سے اُن کا پرانا شعروسخن کا شوق جو مدت سے افسردہ ہورہا تھا تازہ ہوگیا اور اُن کی صحبت میں میرا طبعی میلان بھی جو اب تک مکروہات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا چمک اُٹھا۔ اُسی زمانے میں اُردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب صاحب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ انھیں کے ساتھ میں بھی جہانگیرآباد سے اپنا کلام مرزا غالب کے پاس بھیجتا تھا۔ مگر درحقیقت مرزا کے مشورے و اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا جو نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔ وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دل فریب بنانا۔ اسی کو منتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ ومحاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے۔

نواب شیفتہ کے مذاق کا اندازہ اس ایک واقعہ سے بخوبی ہوسکتا ہے کہ ایک روز انیس کا مرثیہ کا ذکر ہورہا تھا۔ انھوں نے انیس کے مرثیہ کا یہ پہلا مصرع پڑھا۔ ع

آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے

اور کہا کہ انیس[2] نے ناحق مرثیہ لکھا، یہی ایک مصرعہ بجائے خود ایک مرثیہ کے برابر تھا۔

اُن کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ہوگیا۔

---

[1] حکیم مومن خاں مومن: کشمیری الاصل اور خاندانی طبیب تھے۔ دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ پچھلے دور کے نہایت مشہور شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۷ء) میں پیدا ہوئے اور ۱۲۶۹ھ (۱۸۵۲ء) میں اتفاقیہ کوٹھے سے گر کر مر گئے۔ صرف ۳۵ سال کی عمر پائی۔

[2] انیس: میر حسن دہلوی کے پوتے۔ زبردست شاعر اور اُردو میں مرثیہ گوئی کی ایک خاص طرز کے موجد ہیں۔ صفائی کلام، خوبی بیان لطف محاورہ اور سوز وگداز اُن کے کلام کی خاص خصوصیات ہیں۔ ۲۹ر شوال ۱۲۹۱ھ کو ۷۱ سال کی عمر پاکر لکھنؤ میں انتقال کیا۔

گورنمنٹ بک ڈپو کی ملازمت:- نواب شیفتہ کی وفات کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو (لاہور) میں ایک آسامی مجھ کو مل گئی۔ جس میں مجھے یہ کام کرنا پڑتا تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اُردو میں ہوتے تھے اُن کی اُردو عبارت درست کرنے کو مجھے ملتی تھی۔ تقریباً چار برس میں نے یہ کام لاہور میں رہ کر کیا۔ اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہوگئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرق اور خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی۔

لاہور میں ایک نئی قسم کے مشاعرے کا انعقاد:- لاہور ہی میں کرنیل ہالرائڈ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب کے ایماء سے مولوی محمد حسین[1] آزاد نے اپنے پُرانے ارادے کو پورا کیا۔ یعنی ۱۸۷۴ء میں ایک مشاعرہ کی بنیاد ڈالی جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا اور جس میں بجائے مصرع طرح کے کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا کہ اس مضمون پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں نظم میں ظاہر کریں۔

میں نے بھی اسی زمانے میں چار مثنویاں ایک ''برسات'' پر دوسری ''امید'' پر تیسری ''انصاف'' پر اور چوتھی ''حب وطن'' پر لکھیں۔

اینگلو عربک اسکول دہلی کی مدرسی مسدس اور بعض دیگر نظموں کی تصنیف:- اس کے بعد میں لاہور سے دہلی میں اینگلو عربک اسکول کی مدرسی پر بدل آیا۔ یہاں آ کر اول میں نے ایک آدھ نظم بطور خود اُسی طرز کی جس کی تحریک لاہور میں ہوئی تھی لکھی۔ پھر سر سید احمد خاں مرحوم نے ترغیب دلائی کہ مسلمانوں کی موجودہ پستی و تنزل کی حالت اگر نظم میں بیان کی جائے تو مفید ہوگی۔ چناں چہ میں نے اول مسدس ''مد و جزرِ اسلام'' اور اس کے بعد نظمیں جو چھپ چھپ کر بار بار شائع ہو چکی ہیں لکھیں۔

---

[1] شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد: دہلی کے رہنے والے، مولوی باقر علی کے بیٹے اور محمد ابراہیم ذوقؔ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ بہت سی ادبی اور تاریخی کتابوں کے مصنف اور زبردست انشا پرداز تھے۔ افسوس ہے کہ آخر میں مجنون ہو گئے تھے اور اسی حالت میں ۲۱ سال مبتلا رہنے کے بعد ۲۲؍جنوری ۱۹۱۰ء کو لاہور میں انتقال فرمایا۔

''تریاق مسموم'' کا لکھنا:- نظم کے سوا میں نے نثر اُردو میں بھی چند کتابیں لکھی ہیں۔ سب سے پہلے غالباً ۱۸٦۷ء میں ایک کتاب ''تریاق مسموم'' ایک نیٹو کرسچن کی کتاب کے جواب میں ''جو میرا ہم وطن تھا'' اور ''مسلمان سے عیسائی ہوگیا تھا''، لکھی تھی، جس کو اُسی زمانے میں لوگوں نے مذہبی میگزینوں میں شائع کر دیا تھا۔

''علم طبقات الارض'' پر ایک کتاب کا ترجمہ:- اس کے بعد لاہور میں ایک عربی کتاب کا جو جیولوجی میں تھی اور جو فرنچ سے عربی میں کسی مصری فاضل نے ترجمہ کی تھی اُردو میں ترجمہ کیا اور اس کا کاپی رائٹ (حق تصنیف) بغیر کسی معاوضے کے پنجاب یونی ورسٹی کو دے دیا۔ چناں چہ ڈاکٹر لائٹز کے زمانے میں اس کو یونی ورسٹی نے چھاپ کر شائع کر دیا تھا۔ مگر اول تو وہ اصل کتاب پچاس ساٹھ برس پہلے کی لکھی ہوئی تھی جب کہ جیولوجی (علم طبقات الارض) کا علم ابتدائی حالت میں تھا۔ دوسرے مجھ کو اس فن سے محض اجنبیت تھی۔ اس لیے اصل اور ترجمہ دونوں غلطیوں سے خالی نہ تھے۔

''مجالس النساء'' کی تصنیف:- لاہور ہی میں ایک کتاب عورتوں کی تعلیم کے لیے قصہ کے پیرایہ میں موسوم بہ ''مجالس النساء'' لکھی تھی۔ جس پر کرنیل ہالرائڈ نے ایک ایجوکیشنل دربار میں بمقام دہلی مجھے لارڈ نارتھ[1] بروک کے ہاتھ سے چار سو روپیہ کا انعام دلوایا تھا اور جو اودھ اور پنجاب کے مدارس نسواں میں مدت تک جاری رہی اور شاید اب بھی کہیں کہیں جاری ہو۔

''حیات سعدیؒ'' کا لکھنا:- پھر دلّی میں سعدیؒ شیرازی کی لائف اور اُن کی نظم و نثر پر ریویو لکھ کر شائع کیا جس کا نام ''حیات سعدیؒ'' ہے اور جس کے دس بارہ اڈیشن اب سے پہلے شائع ہو چکے ہیں۔

''مقدمہ شعروشاعری'' اور دیوان کا شائع کرنا:- پھر شاعری پر ایک مبسوط اسّے (مضمون) لکھ کر بطور مقدمے کے اپنے دیوان کے ساتھ شائع کیا۔

''یادگار غالبؒ'' کی تصنیف:- اس کے بعد مرزا غالبؒ مرحوم کی لائف جس میں اُن کی

---

[1] لارڈ نارتھ بروک ہندوستان کا وایسرائے تھا جس نے ۱۸۷۲ء سے ۱۸۷٦ء تک یہاں حکومت کی ہے۔ اس کے عہد میں سب سے پہلے پرنس آف ویلز ۱۸۷۵ء میں ہندوستان کی سیاحت کے لیے آئے۔

فارسی اور اُردو نظم ونثر کا انتخاب بھی شامل ہے اور نیز اُن کی شاعری پر ریویو بھی کیا گیا ہے۔ ''یادگار غالبؔ'' کے نام سے لکھ کر شائع کی۔

''حیات جاوید'':- اب سرسید احمد خاں مرحوم کی لائف موسوم بہ ''حیات جاوید'' جو تقریباً ہزار صفحے کی کتاب ہے لکھی جو امید ہے کہ مارچ یا اپریل میں شائع ہو جائے گی۔

فارسی صرف ونحو کے متعلق چند کتابیں:- ان کے سوا اور بھی بعض کتابیں فارسی گریمر وغیرہ میں لکھی ہیں جو چنداں ذکر کے قابل نہیں ہیں[1]۔

مختلف مضامین:- اس کے علاوہ تیس بتیس مضمون بھی مختلف عنوانوں پر مختلف اوقات میں لکھے جو ''تہذیب الاخلاق''، ''علی گڑھ گزٹ'' اور دیگر اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔

فارسی نظم ونثر:- نیز اُردو کے علاوہ فارسی میں کسی قدر زیادہ اور عربی میں کم میری نظم ونثر موجود ہے جو ہنوز شائع نہیں ہوئی[2]۔ جب سے ان دونوں زبانوں کا رواج ہندوستان میں کم ہونے لگا ہے اُس وقت سے ان کی طرف توجہ نہیں رہی۔

سب سے اخیر فارسی و اُردو نظم:- میری سب سے اخیر فارسی نظم وہ ترکیب بند ہے جو سرسید کی وفات پر میں نے ۱۹۰۰ء میں لکھا تھا[3]۔ اور اُردو میں سب سے اخیر وہ نظم ہے جو حال میں ایمپرس وکٹوریہ کی وفات پر لکھی ہے اور علی گڑھ گزٹ میں شائع ہو چکی[4]۔

حیدرآباد سے وظیفہ کا تقرر اور ملازمت سے علیحدگی:- ۱۳۰۵ھ میں جب میں اینگلو عربک اسکول دہلی میں مدرس تھا نواب سر آسمان جاہ بہادر مرحوم مدارالمہام سرکار عالی نظام اثنائے سفرِ شملہ میں علی گڑھ محمڈن کالج کے ملاحظہ کے لیے سرسید احمد خاں مرحوم کی کوٹھی واقع علی

---

[1] فارسی گریمر میں مولانا نے ایک کتاب ''اصول فارسی'' کے نام سے لکھی تھی مگر اُس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔

[2] عربی و فارسی نظم ونثر کا مجموعہ مولانا کی وفات سے چند ماہ پیشتر اگست ۱۹۱۴ء میں شائع ہو چکا تھا۔

[3] سرسید کا یہ فارسی مرثیہ مولانا کی شائع کردہ ''کلیات نظم'' میں موجود ہے۔

[4] یہ ''دل گداز'' اور ''پُر زور'' نظم ''کلیات نظم حالیؔ اُردو'' میں موجود ہے۔

گڑھ میں فروکش ہوئے تھے۔ اور میں بھی اُس وقت علی گڑھ گیا ہوا تھا۔ نواب صاحب ممدوح نے بصیغہ امداد مصنّفین ایک وظیفہ تعدادی پچھتّر روپے ماہوار کا میرے لیے مقرار فرمایا۔ اور ۱۳۰۹ھ میں جب میں سر سید مرحوم کے ہمراہ بشمول دیگر ممبران ڈیپوٹیشن ٹرسٹیان محمڈن کالج علی گڑھ حیدر آباد گیا تھا۔ اُس وظیفہ میں پچیس روپیہ ماہوار کا اضافہ کر کے سو (۱۰۰) روپیہ سکۂ حالی کا وظیفہ میرے لیے مقرر کر دیا جب اب تک مجھ کو ماہ بماہ سرکار عالی سے ملتا ہے۔ اور اُسی وقت سے میں نے اینگلو عربک اسکول دہلی کا تعلق قطع کر دیا ہے۔

ہماری معاشرت کی اصلاح کیوں کر ہوسکتی ہے؟

(از رسالہ ''عصر جدید'' میرٹھ، بابت اگست ۱۹۰۳ء، صفحہ: ۲۹۶ تا ۳۰۰)

ہماری معاشرت کی اصلاح کے ضروری ہونے پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے جس کے بعد زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ اب صرف یہ دیکھنا ہے کہ قوم کی موجودہ حالت میں یہ اصلاح کیوں کر ہوسکتی ہے؟

بے شک آج کل کے خیالات کے موافق اس قسم کی اصلاحوں کے لیے قومی انجمنیں قائم کرنا۔ عام جلسوں میں اسپیچیں دینا۔ رسالے جاری کرنا، ناول یا ڈرامے لکھنا، عموماً مفید خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن جب تک کچھ لوگ ان تدبیروں کے موافق عمل کرنے والے اور خود مثال بن کر اوروں کو ریس دلانے والے پیدا نہ ہوں۔ یہ سب تدبیریں سر دست بے کار معلوم ہوتی ہیں۔ ان تدبیروں کا اثر جہاں تک دیکھا جاتا ہے زیادہ تر انھیں لوگوں تک محدود رہتا ہے جو خود انجمنیں قائم کرتے۔ اسپیچیں دیتے، مضامین لکھتے اور ناول غیر تصنیف کرتے ہیں۔ ان کے سوا شاذ و نادر ہی کسی کے دل پر ان چیزوں کا اثر ہوتا ہے۔

کیوں کہ انسان فطرتاً جیسا دوڑ کر مثال کی تقلید کرنے والا ہے ایسا خالی نصیحتوں اور ہدایتوں پر (اگرچہ وہ کیسی ہی مدلل اور موجہ ہوں) عمل کرنے والا نہیں ہے۔

کچھ کم سات سو برس کا زمانہ گذرا جب کہ ایک افریقہ کے سائل نے حلب کے بازار میں بزازوں سے مخاطب ہو کر کہا تھا:-

''اے خداوندانِ نعمت! اگر شمارا انصاف بودے و مارا قناعت، رسم سوال از جہاں برخاستے۔''

فی الواقع بھیک مانگنے کے انسداد کا کوئی طریقہ اس سے بہتر نہیں ہوسکتا جو سات سو برس پہلے اس افریقی سائل نے بتایا تھا۔ مگر چوں کہ باوجود اس قدر طول طویل زمانہ گذرنے کے نہ دولت مندوں میں انصاف پیدا ہوا اور نہ سوال کرنے والوں میں قناعت، اس لیے سوال کی وہی مذموم رسم آج تک دُنیا میں برابر چلی جاتی ہے۔ پس کیسی ہی سچی اور معقول بات کیوں نہ ہو جب تک اُس پر عمل کرنے والے پیدا نہ ہوں کچھ اثر نہیں رکھتی۔

آریہ سماج کے ممبروں کی تعداد جو روز بروز بڑھتی جاتی ہے اس کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ اتنا کہتے نہیں جتنا کرتے ہیں۔ چناں چہ اسی وجہ سے وہ بہت سی ایسی قدیم رسموں کے ترک کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جن پر مذہب کا گہرا رنگ چڑھا ہوا تھا اور جن کا موقوف ہونا بظاہر محال معلوم ہوتا تھا۔

مگر حق یہ ہے کہ آریہ سماج کو اپنی اصلاحات میں چند سہولتیں ایسی میسر ہیں جو مسلمان مصلحوں کو میسر نہیں ہیں اور جن کی بدولت آریہ فرقہ کے لوگ جس اصلاح کا ارادہ کرتے ہیں اس میں آسانی سے کامیاب ہو جاتے ہیں۔

آریہ سماج درحقیقت ایک مذہبی سوسائٹی کا نام ہے جس کے تمام ممبر اپنے تئیں ایک جدید اصلاح شدہ قدیم مذہب کا پابند خیال کرتے ہیں اور آریہ سماج کی ہر ایک تجویز یا اصلاح کو مذہبی احکام میں شمار کرتے ہیں اور چوں کہ ایک جدید مذہبی فرقہ بہ نسبت قدیم فرقوں کے زیادہ جوشیلا اور زیادہ جذبیلا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ نہایت جوش و خروش کے ساتھ ہر وقت سماج کے حکم کی تعمیل پر آمادہ اور کمر بستہ رہتے ہیں۔

برخلاف مصلحوں کے جو زیادہ تر نئے تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ پرانے خیالات کے مسلمانوں میں تو اُن کی دقعت اس لیے نہیں ہوتی کہ وہ تعلیم یافتہ یا دوسرے لفظوں میں نیچری کہلاتے ہیں اور نئے خیالات والوں نے درحقیقت آج تک کوئی ایسی سوسائٹی قائم نہیں کی جس کی ایک مذہبی جماعت کہا جا سکے اور جس کے ممبروں میں اس قسم کا جوش پایا جائے جو مثل آریہ سماج کے ایک جدید مذہبی فرقہ ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ تو مسلمان مصلحوں کا منتر پُرانے خیالات والوں پر چلتا ہے اور نہ خود اُن میں اس قدر جوش پایا جاتا ہے کہ وہ کم سے کم

اپنے محدود دائرے ہی میں اپنی اصلاحیں جاری کرسکیں۔اسی لیے ہمارے نزدیک (خاص کر پرانے خیالات کے مسلمانوں سے)اصلاح معاشرت کی امید اُسی وقت کی جاسکتی ہے جب کہ ہمارے علماءاور واعظین اس ضروری کام کی طرف متوجہ ہوں۔

ہم ہمیشہ سنتے ہیں کہ فلاں گاؤں یا قصبہ میں فلاں مولوی صاحب کا وعظ ہوا اور وہاں کے باشندوں نے یک قلم بہت سی پُرانی اور بے ہودہ رسمیں ترک کردیں۔انھیں دنوں میں کیتھل ضلع کرنال کا یہ واقعہ سنا گیا کہ ایک مولوی صاحب کے وعظ سے وہاں کے جلا ہوں اور تیلیوں نے تمام شادی اور غمی کی رسمیں ہمیشہ کے لیے اپنی اپنی قوم میں سے موقوف کردیں۔

بات یہ ہے کہ مسلمانوں پر کوئی نصیحت یا ترغیب یا تحریص کارگرنہیں ہوتی جب تک کسی ثواب اخروی کی امید یا عذاب اخروی کا خوف اس میں شامل نہ ہو۔اس لیے وہ کسی رسم یا رواج کی اصلاح پر رضا مندنہیں ہوسکتے جب تک کہ ہمارے علماء اور واعظین اپنے وعظ وترغیب وترہیب کوقوم کی اصلاحِ حال پر وقف نہ کردیں اور وعظ وتذکیر کا سب سے زیادہ اہم اورضروری مقصدقوم کی طرز معاشرت کی اصلاح کو نہ قرار دیں۔آریہ سماج میں اکثر وہ قومیں داخل ہوتی ہیں جوتجارت پیشہ ہیں اور جن کی گھٹی میں کفایت شعاری اور جزرسی پڑی ہوئی ہے۔پس جس قدر رسمیں اصول کفایت شعاری کے برخلاف قوم میں جاری ہیں جس وقت سماج میں اُن کی بُرائی بیان کی جاتی ہےفوراً اُن کے دل میں تہ نشین ہو جاتی ہےاور مذہبی جوش کے ساتھ طبعی میلان شامل ہوکرتمام سماج کوان رسموں کی بیخ کنی پر آمادہ کردیتا ہے۔

اسی لیے ہمارے نزدیک محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اس سیکشن (صیغہ) کو جو کہ اُس نے اصلاح معاشرت کے لیےقائم کیا ہےاپنے کام کا آغاز اول مسلمان تاجروں سے کرنا چاہیے۔مثلاً

جو رسالہ یا اخبار اس مقصد کے لیے جاری کیا جائے اُس کو جہاں تک ممکن ہو تاجروں میں زیادہ متداول کیا جائے۔

جو دورے ملک میں اس غرض سے کیے جائیں اِن میں اُن لوگوں کو خصوصیت کے ساتھ مخاطب کیا جائے۔

اسپیچوں میں زیادہ تر اُن رسموں کی بُرائی پر زیادہ زور دیا جائے جن کے ترک کرنے سے فضول خرچی اور اسراف کا انسداد مقصود ہے۔

ایک اور سہولت آریہ سماج کو ہندو عورتوں کی حالت کے سبب سے ہے جو مسلمان عورتوں کی حالت سے بالکل مختلف ہے۔ ہندو عورتوں میں اور خاص کر اُن عورتوں میں جو آریہ سماج کے ممبروں سے تعلق رکھتی ہیں۔ زمانۂ حال کی تعلیم زیادہ رواج پاتی جاتی ہے۔

برخلاف مسلمان عورتوں کے جن میں اگر کچھ تعلیم ہے بھی تو صرف قدیم طریقے کی مذہبی تعلیم ہے جس سے کسی قدر اُردو نوشت وخواند کی لیاقت یا نماز روزہ وغیرہ کے مسائل سے فی الجملہ واقفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ باقی جو خیالات متعلق بہ اصلاح رسوم و عادات اُن کے رشتہ دار مردوں کے دماغ میں گشت کرتے رہتے ہیں اُن سے وہ ویسی ہی بے خبر اور اجنبی ہوتی ہیں جیسی محض جاہل عورتیں۔ اس لیے آریہ فرقہ کے لوگ جس رسم و رواج کی اصلاح یا انسداد کرنا چاہتے ہیں بہت آسانی سے اُس میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ پُرانی رسموں کی محبت اور اُن کی پابندی عموماً مردوں کی نسبت عورتوں میں زیادہ ہوتی ہے پس جس قدر عورتوں کی طرف سے مزاحمت کم ہوتی ہے اسی قدر مردوں کو اصلاح میں زیادہ آسانی ہوتی ہے۔

اس کے سوا جن قوموں میں پردہ کا رواج ہوتا ہے اُن میں عورتیں بیاہ شادی اور دیگر رسمیات پر زیادہ شیفتہ اور فریفتہ ہوتی ہیں کیوں کہ اُن کی تمام خوشیاں اور اُمنگیں اور چاؤ انھیں باتوں پر منحصر ہوتے ہیں کہ کنبے یا برادری کی عورتوں کو کسی میلہ یا بہانے سے اپنے گھر بُلا کر ایک دو روز اُن کے ساتھ ملنے جلنے ہنسنے بولنے اور اُن کی خاطر تواضع کرنے سے اپنا اور اُن کا دل خوش کریں۔ اسی بنیاد پر وہ ہمیشہ ایسی تقریبیں ڈھونڈتی رہتی ہیں جن میں ان کو اپنی زیادہ ہم جنسوں سے ملنے کا موقع ملے۔ اگر بیاہ شادی کا موقع نہیں ملتا تو چھٹی، مونڈن، ختنہ، بسم اللہ وغیرہ ہی کے بہانے سے اپنے دل کا ارمان نکال لیتی ہیں۔

جس قوم میں عورتوں کی تمام خوشیاں اور امنگیں انھیں باتوں پر منحصر ہوں اُن کے مرد کیوں کر اصلاحِ طرز معاشرت میں کامیاب ہو سکتے ہیں؟ وہ بغیر اس کے کہ عورتوں پر جبر کریں اور اپنے گھر کو دوزخ کا نمونہ بنائیں نہایت مشکل ہے کہ کسی قسم کی اصلاح کر سکیں۔

پس تاوقتیکہ عورتوں میں زمانۂ حال کی تعلیم رواج نہ پائے اور ہمارے واعظین زبانی مجلسوں میں قرآن اور حدیث کی رو سے بے ہودہ فضول رسموں کی برائیاں اُن کے ذہن نشین نہ کریں۔ بہت ہی کم امید ہے کہ ہماری طرز معاشرت میں کوئی معتد بہ اصلاح ہو سکے۔

باوجود ان تمام مشکلات کے جو ہماری معاشرت کی اصلاح میں حائل میں ہمت اور استقلال سے ان سب پر غالب آنا ممکن ہے۔

سر سید مرحوم کو جو مشکلات انگریزی تعلیم کے پھیلانے میں درپیش تھیں۔ اصلاحِ معاشرت میں ویسی مشکلات درپیش نہیں ہیں۔ باوجود اس کے وہ اپنے استقلال سے تمام مشکلات پر غالب آئے اور ایسی نمایاں کامیابی اپنے مقاصد میں حاصل کی جس کی بالکل امید نہ تھی۔ اسی طرح جو کوشش محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبہ اصلاحِ تمدن نے شروع کی ہے۔ اگر وہ صبر اور استقلال کے ساتھ برابر جاری رہی تو ضرور کبھی نہ کبھی سرسبز و بارور ہوگی۔

قومی جلسوں میں نظموں کی بھرمار
(قلمی مسودے سے نقل کیا گیا)

مذکورہ بالاعنوان سے ایک نوٹ ہفتہ وار ''پیسہ'' اخبار مورخہ ۱۶/اپریل ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا ہے جس کو پڑھ کر ہم کو اپنے وہ خیالات ظاہر کرنے کا موقع ملا ہے جو بہت دن سے اس معاملہ کے متعلق ہمارے دماغ میں گشت کر رہے تھے۔

اگرچہ یہ بات وثوق کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی کہ اس بدعت کی بنیاد ہمارے قومی جلسوں میں کب اور کس کی تحریک سے پڑی؟ لیکن جہاں تک خیال کیا جاتا ہے اس کے محرک اور بانی خود نظمیں لکھنے والے اور اپنی نظمیں سنانے کی خود تقریبیں ڈھونڈنے والے معلوم ہوتے ہیں۔

چوں کہ ایک مدت سے قدیم طرز کی شاعری متروک ہوتی جاتی ہے اور اُس کے مشاعرے بند ہوتے جاتے ہیں اس لیے اُن لوگوں کے لیے جو قدیم طرز کی شاعری سے متنفر ہوگئے ہیں۔ سوائے قومی جلسوں کے اپنے کلام کی داد لینے کا کوئی اور موقع باقی نہیں رہا۔ پس ضرور تھا کہ وہ اپنا کمال ظاہر کرنے اور اُس کی داد لینے کے لیے ایک دوسرا میدان تلاش کریں۔

ہم نہ قدیم شاعری کے مخالف ہیں اور نہ جدید شاعری کے مزاحم، بلکہ ایک لحاظ سے جدید شاعری کے زیادہ موئد ہیں۔ لیکن ہمارے رائے میں نئی شاعری کو ترقی دینے کا مقام بجائے قومی جلسوں کے نئی طرز کے مشاعروں کو جن کا نمونہ ایک دفعہ پہلے لاہور میں قائم ہو چکا ہے[1]۔ قرار دینا چاہیے۔

---

[1] یہ اُس مشاعرے کی طرف اشارہ ہے جس کی بنیاد کرنیل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب کے ایماء سے شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد نے ۱۸۷۴ء میں لاہور میں ڈالی تھی۔ اس مشاعرے میں شاعروں کو بجائے مصرع طرح دینے کے کوئی کوئی مضمون دے دیا جاتا تھا کہ اس کے متعلق طبع آزمائی کریں۔

نئی طرز کی شاعری سے ہماری مراد یہ ہے کہ قدیم دستور کے موافق اُس میں شعرا مصرع طرح نہ دیا جائے بلکہ کسی مضمون کا عنوان دے کر اس پر نظمیں لکھوانی چاہئیں اور اس بات کا اختیار کہ وہ کس بحر یا کس صنف میں ترتیب دی جائیں، خود شعراؑ کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔

نئی طرز کی شاعری میں سوا اس کے کہ لوگوں نے کہیں کہیں مسلمانوں کے تنزل کا رونا رویا ہے اور مضامین کی طرف بہت ہی کم توجہ کی گئی ہے حالاں کہ نیچرل مضامین کا ایک وسیع و ناپیدا کنار میدان موجود ہے جس میں ہمارے شعراؑ طبیعت کی جولانیاں اور فکر کی بلند پروازیاں دکھا سکتے ہیں۔

برخلاف اس کے قومی جلسوں میں اگر مقتضائے مقام کے موافق کسی مضمون پر نظم لکھی جائے تو سوا اس کے کہ وہی قومی ترقی یا تنزل کا راگ بار بار گایا جائے اور کیا لکھا جاسکتا ہے۔ اور اگر غیر متعلق مضامین پر نظمیں ترتیب دے کر ان جلسوں میں پڑھی جائیں تو ایسا کرنا صرف بے موقع و بے محل ہی نہ ہوگا بلکہ اہل جلسہ کے لیے جو درحقیقت شعر وسخن سننے کے لیے نہیں بلکہ قومی مقاصد پر غور کرنے کے لیے آتے ہیں بار خاطر اور ناگوار طبع ہوگا۔

قومی مقاصد کے لیے جو جلسے آج کل ہندوستان میں ہوتے ہیں یہ درحقیقت اہل مغرب کی تقلید ہے۔ مگر ہم نے آج تک نہیں سنا کہ اہلِ مغرب کے قومی جلسوں میں سوائے اسپیچوں اور لکچروں کے شعرا کو بھی نظمیں پڑھنے کا موقع دیا جاتا ہو۔

اہل مغرب کو جانے دو۔ ہمارے ملک میں جو قومیں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ اور باخبر ہیں جیسے بنگالی، مرہٹی، پارسی اُن کے ہاں بھی جہاں تک ہم کو معلوم ہے ایسے جلسوں میں نظمیں نہیں پڑھی جاتیں اور اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو آریہ سماج اور سناتن دھرمیوں کے جلسوں میں بھی سوائے بھجن گانے کے جو مذہبی خیالات پر نہایت عمدہ اثر رکھتے ہیں۔ نظمیں پڑھے جانے کا دستور نہیں ہے۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ سر سید احمد خاں مرحوم نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں ایک

حد تک نظمیں پڑھنا جائز رکھا تھا۔ مگر اُس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ نظمیں پڑھوانے کو کانفرنس کے حق میں درحقیقت کچھ مفید سمجھتے تھے۔ بلکہ اس زمانے میں جب کہ مسلمان ایسے جلسوں سے بالکل غیر مانوس اور اُن کے نتائج سے بالکل بے خبر تھے ضرور تھا کہ ایجوکیشنل کانفرنس میں ایسا سامان بھی مہیا کیا جائے جس سے مسلمان بالطبع مانوس ہوں اور کانفرنس میں نہایت شوق اور رغبت سے آ کر شریک ہوا کریں۔

لیکن اب مسلمانوں کی وہ حالت نہیں ہے۔ اُن میں قومی کاموں کا مذاق پیدا ہو گیا ہے اور اُن کو قومی جلسوں میں بلانے کے لیے اس بات کی ضرورت اب باقی نہیں رہی کہ اُن کی دل لگی کے لیے کانفرنس میں شاعروں کی چند جوڑیاں بلائی جائیں۔ اس لیے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں اب نظموں کا پڑھا جانا سوائے اس کے کہ اُس کو مسلمانوں کی جہالت اور وحشت کی ایک یادگار قرار دیا جائے اور کچھ معنی نہیں رکھتا۔

بلاشبہ انجمن حمایت اسلام کی حالت کانفرنس کی حالت سے بالکل مختلف ہے۔ کیوں کہ کانفرنس میں اول تو اطراف ہندوستان سے صرف تعلیم یافتہ لوگ یا کم سے کم نئے خیالات اور جدید مذاق کے لوگ آتے ہیں جو قومی مقاصد پر بحث اور گفتگو کرنے کی بخوبی لیاقت رکھتے ہیں۔

دوسری کانفرنس کے اجلاسوں کا اصل مقصد چندہ جمع کرنا نہیں ہے بلکہ جو مسائل مسلمانوں کی تعلیم وغیرہ کے متعلق تصفیہ طلب ہوتے ہیں اُن کی نسبت جو بات اتفاق یا کثرت رائے سے قرار پائے اُس سے مسلمان پبلک کو آگاہ کرنا اصل مقصد کانفرنس کا ہے۔

برخلاف اس کے:-

انجمن حمایت اسلام میں جو سالانہ جلسہ ہوتا ہے اس کا مقصد چندہ جمع کرنا ہے جس پر زیادہ تر انجمن کے قیام و دوام کا دارومدار ہے۔

دوسرے اس جلسے میں تعلیم یافتہ لوگوں کے علاوہ کثرت سے ایسے لوگ بھی جمع ہوتے ہیں جن کی دلچسپی کے لیے کم و بیش نظموں کا پڑھا جانا سردست فائدہ سے خالی

نہیں معلوم ہوتا۔

پس ہمارے نزدیک رائے صواب یہ ہے کہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں تو نظموں کا سلسلہ بالکل منقطع ہو جانا چاہیے، لیکن انجمن حمایتِ اسلام میں ابھی اس سلسلہ کا بالکل منقطع ہونا خلاف مصلحت معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جیسی کہ پیسہ اخبار کی رائے ہے وہاں بھی اس دستور کو بتدریج گھٹانا چاہیے اور بجائے نظموں کے مذہبی وعظوں اور مفید لکچروں کو رفتہ رفتہ ترقی دینی چاہیے۔

موجودہ مذہبی مناظرے

(از رسالہ ''عصر جدید''میرٹھ، جلد:۵، نمبر:۳ بابتہ مارچ ۱۹۰۷ء، صفحہ:۸۵تا۸۹)

امام غزالی نے ''احیاء العلوم'' میں لکھا ہے کہ مناظرے سے چند کمینہ خصلتیں خواص علماء میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جیسے حسد، تکبر، کینہ، غیبت، خود پسندی، عیب جوئی، شماتت، نفاق، حق بات سے انکار اور باطل پر اصرار وغیرہ وغیرہ۔ اور سفہا و جہلا میں اکثر گالی گلوج اور جوتی پیزار تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔

بلاشبہ جیسی کہ ''احیاء العلوم'' میں تصریح کی گئی ہے مناظرہ کرنے والوں میں یہ اور اِسی قسم کے بہت سے رذائل مناظرے کے متعارف طریقے سے پیدا ہونے چاہئیں۔ لیکن ہمارے نزدیک اگر مذہبی مناظرے کے مضر نتیجے جو اوپر بیان کیے گئے۔ صرف مناظرہ کرنے والوں ہی کی ذات تک محدود نہیں رہتے اور اُن کی آنچ دور دور پہنچتی تو چنداں نقصان نہ تھا۔ مگر افسوس یہ ہے کہ یہ نتائج اصل مناظرے ہی تک محدود نہیں رہتے بلکہ وبائے عام کی طرح تمام قوم میں پھیل جاتے ہیں۔ قوم میں جُدا جُدا اڈھڑے اور فریق بندھ جاتے ہیں ہر فریق دوسرے فریق کا دشمن ہو جاتا ہے اور اس طرح قوم میں پھوٹ اور نااتفاقی پھیل جاتی ہے۔

انسان کی طبیعت نزاع و خلاف اور جنگ و جدل پر مجبول ہوئی ہے جیسا قرآن میں ارشاد ہوا ہے و کان الانسان اکثر شئً جَدَلًا اس کا فطرۃً سلوک اور ملاپ میں وہ لطف حاصل نہیں ہوتا جو خصومت اور جھگڑے میں حاصل ہوتا ہے۔ پس جو اہل علم اس مضرت رساں سلسلہ کو چھیڑتے ہیں وہ درحقیقت ابنائے جنس کے اُس فطری مادہ کو مشتعل کرتے ہیں

جو ذرا سی اشتعالک سے بھڑک اُٹھتا ہے اور پھر کسی طرح بجھائے نہیں بجھتا۔

ہندوستان کے سنی شیعوں میں مذہبی مناظرے کی ابتدا کچھ شک نہیں کہ اہل سنت کی طرف سے ہوئی۔ ''تفضیل الشیخین''، ''ازالۃ الخفاء'' اور ''تحفہ اثنا عشریہ'' سے پہلے جہاں تک ہم کو معلوم ہے کوئی چھیڑ چھاڑ شیعوں کی جانب سے نہیں ہوئی۔

ان کتابوں کی اشاعت سے پہلے دونوں فریق ہر ایک موقع پر شیر وشکر رہتے تھے۔

سُنّی مجالس عزا میں برابر شریک ہوتے تھے۔

سُنّیوں کی لڑکیاں شیعہ لڑکوں سے اور شیعوں کی لڑکیاں سنی لڑکوں سے بیاہی جاتی تھیں۔

سُنّی قاضی شیعوں کے نکاح پڑھتے تھے۔

دونوں فریق کے آدمی ایک مسجد میں نمازیں ادا کرتے تھے۔

مگر جب سے مذکورہ بالا کتابیں شائع ہوئیں اور مذہبی مناظرے دونوں فرقوں میں شروع ہوئے تب سے وہ تمام میل جول جاتا رہا اور باہمی اتحاد و یگانگت نفرت اور مغائرت کے ساتھ بدل گئی۔

ہر چند کہ شیعوں نے ان کتابوں کی تردید کرتے وقت دل کے بخارات خوب دل کھول کر نکالے ہیں مگر چوں کہ ابتدا اہل سنت کی طرف سے ہوئی ہے اس لیے شیعوں کو زیادہ الزام نہیں دیا جا سکتا۔

میں نے سنا ہے کہ مولانا عبدالعلی بحرالعلوم نے ''تحفہ'' کو دیکھ کر افسوس کیا تھا کہ اس کتاب سے یہاں کے شیعہ سُنّیوں میں سخت تفرقہ پڑ جائے گا۔

اگر یہ خبر صحیح ہے تو (افسوس ہے کہ) مولانا کی پیشین گوئی پوری ہوگئی۔ دونوں فرقوں کا اختلاف منجر بہ عناد و دشمنی ہو گیا اور رفتہ رفتہ تمام روابط منقطع ہو گئے۔

ہر سال ہندوستان کے کسی نہ کسی شہر یا قصبہ میں دو چار ناگوار واقعات ایسے سننے میں آتے ہیں جن کا عدالت کو فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ جن میں فریقین کا ہزار ہا روپیہ صرف ہو جاتا ہے اور دونوں کی تفضیح اپنے پرائے کی نظر میں جدا ہوتی ہے۔

(اس قسم کے تمام جھگڑوں میں) جب بنائے مخاصمت کی تفتیش کی جاتی ہے تو ہمیشہ

اسی قسم کی کوئی بات نکلتی ہے کہ ''محمد شاہ کی داڑھی بڑی ہے یا احمد شاہ کی؟''

جو معرکہ آج کل نہ صرف ہندوستان میں بلکہ تمام دُنیا میں سائنس اور مذہب کے درمیان گرم ہو رہا ہے اس کے مقابلے میں اہل مذہب کے یہ باہمی مناظرے نزاع لفظی سے زیادہ کچھ وقعت نہیں رکھتے۔

مغربی تعلیم سے تو اب دُنیا کو کسی طرح مفر نہیں اور اُس کا لازمی نتیجہ مستثنیٰ صورتوں کے سوا یا تو مذہب سے قطعی انکار کرنا اور دلوں میں اُس کی وقعت کا باقی نہ رہنا ہے یا کم سے کم اس میں شکوک وشبہات کا پیدا ہونا اور مذہبی یقین کا متزلزل ہو جانا ہے۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ اس مذہب کا سب سے مقدم فرض یہ ہے کہ آپس کے جھگڑوں کو چھوڑ کر ان شکوک وشبہاک کو دفع کرنے میں کوشش کریں جو مغربی تعلیم کے اثر سے پلیگ کے کیٹروں کی طرح ملک میں ترقی کر رہے ہیں۔

چناں چہ یورپ میں مسیحی مشنریوں نے اب اسلام اور دیگر مذاہب کی تردید کو چھوڑ کر ملحدوں اور دہریوں کی تردید پر اپنی ہمتیں مقصود کر لی ہیں اور اُن کی زیادہ تر تصنیفات اثبات واجب الوجود توحید باری تعالیٰ بقائے روح حدوثِ مادہ کے اثبات اور جزا و سزا کے برحق ہونے پر سُنی اور دیکھی جاتی ہیں۔

ہمارے نزدیک علمائے اسلام کو بھی اگر وہ اسلام اور مسلمانوں کے خیر خواہ ہیں۔ یہی چاہیے کہ وہ آپس کے جھگڑوں کو خیر باد کہیں اور مغربی تعلیم جو اندر ہی اندر مذہب کی جڑ کاٹ رہی ہے اُس کے مضر نتائج سے قوم کے نوجوانوں کو بچائیں اور اپنے ہتھیاروں کو جو اب تک خانہ جنگی ہی میں صرف ہوتے رہے ہیں ملحدوں اور دہریوں کے مقابلے میں استعمال کریں۔

آپس کے مذہبی مناظروں سے اگر اُن کا مقصد یہ ہے کہ جس مذہب کے خلاف وہ کتابیں یا رسالے لکھتے ہیں اُس مذہب والوں کو اپنے مذہب کی حقیقت کا یقین دلائیں۔

سو اس مقصد میں تو ان کا کامیاب ہونا قریب ناممکن کے ہے۔ کیوں کہ جس طرح مذہب کا یقین عموماً دلیل و برہان سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ بچپن کے اِلف و عادات اور

والدین کی عملی تعلیم وتلقین سے پیدا ہوتا ہے اسی طرح وہ کسی دلیل و برہان سے زائل بھی نہیں ہوتا۔ الا ماشاءاللہ۔

اور اگر ان کا مقصد صرف اپنے ہم مذہبوں کی تشفی اور اطمینان زیادہ کرنا اور اُن کو مذہب پر ثابت قدم رکھنا ہے تو بلا شبہ اس میں کما حقہ کامیابی ہو سکتی ہے۔

یہ نہایت شریف و اعلیٰ مقصد ہے جو ہر مذہب کے علما کا نصب العین رہنا چاہیے۔ مگر اس غرض کے لیے صرف اپنے مذہب کی حقیقت ثابت کرنا اور اُس کو دلائل و براہن سے تقویت دینا کافی ہے۔ دوسرے مذہب کی توہین یا تنقیص کرنا اور فریقِ مقابل کا دل دُکھانا ضرور نہیں ہے۔

اگرچہ مناظرہ اپنے اصلی معنوں کے لحاظ سے فی نفسہ نہایت مفید چیز ہے کیوں کہ مناظرہ کے اصل معنی یہ ہیں کہ دو گروہ یا دو شخص کسی مسئلہ کو اس نظر سے دیکھیں کہ اُس کو کونسا پہلو صحیح ہے اور کونسا غلط؟ اور جو صحیح ثابت ہو اُس کو دونوں فریق بلا تامل تعلیم کر لیں۔ لیکن ایسے مناظرے کی مثالیں بہت ہی کم سننے میں آئی ہیں۔ ہمیشہ یہی دیکھا جاتا ہے کہ ہر ایک فریق کا مقصد دوسرے فریق کو مغلوب کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا اور اسی وجہ سے مناظرہ کا نتیجہ ہمیشہ بُرا ہوتا ہے۔

آج کل ہندوستان میں جس قدر قحط اور وبا کے انسداد کی ضرورت ہے اس سے بہت زیادہ نااتفاقی کے انسداد کی ضرورت ہے۔ اس وقت ہر ایک قوم بمقابلہ دیگر قوموں کے اپنا وزن قائم رکھنے کے لیے اور تمام ہندوستان کی قومیں گورنمنٹ کی نظر میں اپنی عزت اور وقار قائم رکھنے کے لیے باہمی اتفاق واتحاد کی محتاج ہیں۔

خصوصاً مسلمانوں کو بہ نسبت دیگر اقوام کے اتفاق کی زیادہ ضرورت ہے کیوں کہ ہندوستان میں ایرین نسل کی جتنی قومیں آباد ہیں سب غلطی سے مسلمانوں کو ایک اجنبی اور بے گانہ قوم تصور کرتی ہیں۔ حالاں کہ وہ خود بھی بمقابلہ اصلی باشندوں کے اس ملک میں ویسے ہی بے گانے ہیں جیسے کہ مسلمان۔ پس تاوقتیکہ یہ غلطی رفع نہ ہو اور آریا قومیں مسلمانوں کو بھی دل سے اپنا وطنی بھائی نہ سمجھنے لگیں اُس وقت تک مسلمان اس ملک میں بغیر

اسلامی اخوت کے اپنا وزن قائم و برقرار نہیں رکھ سکتے۔

اور اس اخوت واتحاد کا سب سے بڑا اور قوی مانع مذہبی مناظرہ یا مجادلہ ہے جو کتابوں، رسالوں اور اخباروں کے ذریعہ سے فریقین میں تعصب کی آگ بھڑکا تا رہتا ہے۔

اگرچہ مسلمانوں میں اور بھی بہت سے فرقے ایسے ہیں جن میں بحث ومباحثہ ہمیشہ جاری رہتا ہے مگر سب سے زیادہ مضر اور خطرناک اور تمام قوم نا اتفاقی کی جڑ مضبوط کرنے والے وہ مناظرے ہیں جو سُنّی اور شیعوں میں اب تک ہوتے رہے ہیں۔

ان (مناظروں، مباحثوں اور مجادلوں) کی بدولت بعض اصحاب کی یہ رائے ہوگئی ہے کہ ہندو مسلمانوں میں تو اتحاد ممکن ہے مگر سُنّی وشیعہ میں اتحاد کا ہونا امکان سے خارج ہے۔

اگرچہ میں اس رائے کو صحیح نہیں سمجھتا کیوں کہ میرے نزدیک جس قدر مسلمان زمانے کی ضرورتوں سے بدلتے جائیں گے اور جس قدر مذہبی مناظرے فضول اور بے سود بلکہ مضر ثابت ہوتے جائیں گے۔ اُسی قدر اسلامی فرقوں میں اتفاق واتحاد بڑھتا جائے گا۔

اس مقام پر اس بحث سے قطع نظر کر کے فریقین سے التجا کرتا ہوں کہ وہ مناظرے کے متعارف طریقہ کو یک قلم خیر باد کہہ دیں اور بجائے اس کے کہ ایک دوسرے کے مذہب پر ردوقدح کریں اسلام کی جڑ مضبوط کرنے میں کوشش کریں جس کو دہریوں اور ملحدوں کے شکوک وشبہات متزلزل کر رہے ہیں۔

اس مقام پر ہم ایک شاعر کے چار مصرعے نقل کرنا مناسب سمجھتے ہیں جن میں لامذہبوں کے خیالات کی تصور کھینچی گئی ہے۔ جو مسلمانوں کے باہمی جھگڑوں کی نسبت اُن کے دل میں گذر سکتے ہے

کہتا تھا کل اک منکرِ قرآن و بے خبر
''کیا لیں گے یہ اہلِ قبلہ باہم لڑکر؟
کچھ دم ہے تو میدان میں آئیں، ورنہ
کتّا بھی ہے شیر اپنی گلی کے اندر''

دیوانِ حافظؔ کی فالیں

(قلمی مسودہ سے نقل کیا گیا)

خواجہ حافظؔ کے دیوان میں فال دیکھنے کا رواج اور اُس کی فالوں کے سچا ہونے کا اعتقاد جیسا کہ ہندوستان یا ایران کے مسلمانوں میں پایا جاتا ہے ایسا ہی کم وبیش اُن ممالک اسلامیہ میں سنا گیا ہے جہاں فارسی زبان بولی یا پڑھی جاتی ہے۔

خواجہ حافظؔ کی عموماً یہ ایک کرامت سمجھی جاتی ہے کہ اُن کے دیوان کو بند کر کے جب ایک خاص طریقے سے کھولا جاتا ہے تو جو شعر صفحے کے سرے پر رہتا ہے وہ صراحتاً یا کنایتاً اُس امر کے متعلق جس میں تردد ہے صاف خبر دیتا ہے کہ وہ امر واقع ہوگا یا نہیں؟ یا اُس کا نتیجہ خواہش کے موافق ہوگا یا مخالف؟ یا فال دیکھنے والے کا خیال اُس کی نسبت صحیح ہے یا غلط؟ چناں چہ اسی بناء پر دیوان مذکور کو لسان الغیب کے لقب سے ملقب کیا گیا ہے۔

دیوانِ حافظؔ کی بعض فالیں جو سچی نکلیں

صدہا واقعات کی نسبت مشہور ہے کہ دیوانِ مذکور میں فال دیکھی گئی اور اُسی کے مطابق ظہور میں آیا۔

شیخ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ جلال الدین اکبر اور سکندر لودھی کی لڑائی سے پہلے ''دیوانِ حافظؔ'' میں فال دیکھی گئی کہ لڑائی کا انجام کیا ہوگا؟ اُس میں یہ شعر نکلا ؎

سکندر را نمی بخشند آبے

بہ زور و زر میسر نیست ایں کار

چناں چہ سکندر کو شکست ہوئی اور اکبر فتحیاب ہوا۔

ایک تعجب انگیز واقعہ مشہور ہے کہ کوئی قیمتی جواہر یا زیور گم ہو گیا تھا، رات کے وقت اُس کو چراغ کی روشنی میں تلاش کر رہے تھے کہ ''دیوانِ حافظؔ'' میں فال دیکھی گئی تو سرِ صفحہ یہ بیت برآمد ہوئی ؂

بفروغِ چہرہ زلفش رہِ دین زند ہمہ شب
چہ دلا و رست دزدی کہ بکف چراغ دارد

چناں چہ جس خادم کے ہاتھ میں چراغ تھا اُسی کے پاس سے وہ گم شدہ جواہر برآمد ہوا۔

اِسی قسم کے بعض واقعات ہم نے ایسے معزز ذریعوں سے سنے ہیں جن میں بناوٹ کا مطلق احتمال نہیں ہو سکتا۔

میرے بڑے بھائی کو جب کہ وہ پولیس میں ملازم تھے اکثر بیمار رہنے کے سبب سروس (ملازمت) کے پورا ہونے سے پہلے پنشن لینے اور ڈاکٹر کا معائنہ کرانے پر مجبور کیا گیا تھا۔ مگر وہ چاہتے تھے کہ جو سروس پوری ہو جائے اُس وقت خود درخواست کر کے پنشن لے جائے۔ چناں چہ ڈاکٹر معائنہ کی تاریخ معین سے ایک دن پہلے انھوں نے دیوانِ مذکور میں فال دیکھی تو صفحہ کے سرے پر یہ بیت نکلی ؂

ہر چند پیر خستہ دل و ناتواں شدم
ہر گہ کہ روئے خوب تو دیدم جواں شدم

انھوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ ڈاکٹر میری خواہش کے موافق رائے دے گا۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا۔

بعض فالیں ایسی بھی سنی گئی ہیں جن سے اگر چہ زمانۂ مستقبل کی نسبت کوئی پیشین گوئی مفہوم نہیں ہوتی مگر فال دیکھنے والے کی سرگزشت اور زمانۂ ماضی کے برتاؤ کی طرف ایک لطیف اشارہ مستنبط ہوتا ہے۔

ایک نہایت باخدا اور صاحب نسبت امیر نے اپنی سرگزشت خود مجھ سے بیان کی کہ عنفوانِ شباب کی غفلت و بدمستی کے زمانے میں کبھی کبھی اپنی حالت پر سخت افسوس اور

انفعال ہوتا تھا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد وہی غفلت کا پردہ عقل پر پڑ جاتا تھا۔ ایک روز ساری رات لہو ولعب میں گذری، جب صبح ہوئی تو سخت ندامت وانفعال دامن گیر ہوا اور یہ خیال دل میں گذرا کہ آخر کبھی اس سے نجات بھی ہوگی یا نہیں؟ اسی بے چینی میں ''دیوانِ حافظؔ'' کو کھول کر دیکھا تو اس میں پہلا شعر یہ نکلا ؎

وظیفۂ شب دوشیں مگر زیادت رفت

کہ با مداد بطرزِ دگر برآمدۂ

سب سے زیادہ عجیب وہ فال ہے جو شیخ علی حزیںؔ کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ شیخ غزل میں اپنے نزدیک خواجہ حافظؔ کا تتبع کرتا تھا۔ مشہور ہے کہ ایک دن اس بات کے دریافت کرنے کو کہ مجھے تتبع میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے اُس نے ''دیوانِ حافظؔ'' میں فال دیکھی اُس میں چھوٹتے ہی یہ بیت نکلی ؎

کے شعرِ تر انگیز د خاطر حزیں باشد

یک نکتہ ازیں دفتر گفتیم و ہمیں باشد

یہ اور اسی قسم کی بے شمار فالیں مشہور ہیں جو خواجہ حافظؔ کی کرامت سے منسوب کی جاتی ہیں۔ ہم ان لوگوں کے اعتقاد پر جو خواجہ حافظؔ کی اس کرامت کے قائل ہیں اعتراض کرنا نہیں چاہتے اور نہ اس موقع پر ہمارا یہ مقصد ہے کہ نفسِ کرامت کے امکان یا امتناع پر بحث کریں۔ بلکہ صرف یہ دکھانا منظور ہے کہ جن اسباب سے خواجہ حافظؔ کے کلام کو یہ درجہ حاصل ہوا ہے اُن میں کوئی غیر معمولی کرشمہ نہیں ہے۔

خواجہ حافظؔ کی غزلیات میں اعلیٰ درجے کے حسن بیان کے علاوہ سب سے بڑی چیز جس نے اُن کو مقبولِ خاص و عام بنا دیا ہے وہ عشقِ حقیقی کو عشق مجازی کے پیرایہ میں ادا کرنا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ کتاب کی صورت میں مرتب ہوکر ملک میں شائع ہوئیں تو باوجودیکہ اشاعت کے ذریعے اُس وقت نہایت محدود تھے تاہم تمام ملک میں گھر گھر اُس کے نسخے پھیل گئے اور ہر طبقے نے اس کو اپنا حرز جان بنالیا۔ جس طرح آزاد طبع نوجوان قہوہ خانوں اور تفریح کے جلسوں میں اس سے صحبتیں گرم کرتے تھے اسی طرح مشائخ اور اہل اللہ

حال وقال کی مجلسوں میں اس پر وجد کرتے تھے۔ جس طرح وہ درویشوں کا مونس و ہمدم تھا اسی طرح بادشاہوں اور امیروں کا تعویذ بازو تھا۔

ظاہر ہے کہ انسان کی طبیعت میں آئندہ کا حال قبل از وقت دریافت کرنے کی طرف قدرتی میلان ہے اور اس قدرتی میلان کا نتیجہ ہے کہ اُس نے نجوم و رمل و جفر اور فال اور شگون اور بعض دیگر وسائل مستقبل کا حال دریافت کرنے کے لیے بہم پہنچائے ہیں۔

اسی کے ساتھ اُس کی فطرت میں دوسری خاصیت یہ ہے کہ جس چیز یا جس شخص کے ساتھ اس کو عقیدت ہوتی ہے اُس سے خود بخود دل میں غیر معمولی کرشمے ظاہر ہونے کی توقع ہو جاتی ہے یہاں تک کہ اُس سے جو کچھ عادتِ مستمرہ کے موافق ظہور میں آتا ہے اُس کو بھی وہ اکثر فوق العادت کرشموں پر محمول کر لیتا ہے۔

خواجہ حافظؔ کا دیوان چوں کہ متصوفانہ کلام پر مشتمل ہے اس لیے اس میں مذہبی عقیدت کا ایک زبردست پہلو موجود تھا۔ اور ہر طبقے کے لوگ اُس کو ایک عارف کا کلام سمجھ کر متبرک خیال کرتے تھے۔ اس لیے ضرور کسی نہ کسی وقت دُنیا داروں کے گروہ میں جو ہر وقت اپنی گوناگوں خواہشوں کے پورا ہونے کی دُھن میں رہتے ہیں۔ خواجہ حافظؔ کے کلام سے تفاؤل کرنے کا خیال پیدا ہوا ہوگا۔ اور حسن اتفاق سے ایک دو بار جو کچھ فال میں نکلا۔ اُس کے مطابق ظہور میں آیا ہوگا۔ لیکن یہاں تک کوئی بات ایسی نہ تھی جس کو ایک غیر معمولی کرشمہ ماننے کی ضرورت ہو۔ مگر چوں کہ انسان بالطبع عجائب پسند ہے، اس لیے وہ ہمیشہ ایسے اتفاقات کو غیر معمولی کرشموں کی طرف کھینچ لے جاتے ہے۔

کچھ شک نہیں کہ دیوانِ مذکور میں فال دیکھنے کی بنیاد اسی طرح پڑی ہے۔ مگر اس کے بعد خود اُس کی شاعری اور طرزِ بیان نے اس خیال کو بہت کچھ مدد پہنچائی۔ وہ عام شعرا کی طرح ان مشتنئ حالتوں سے کبھی تعرض نہیں کرتا جو دُنیا میں نادر الوقوع ہیں بلکہ ہمیشہ نیچرل جذبات اور معمولی خواہشوں اور امیدوں اور عام معاملات اور واقعات کی تصویر کھینچتا ہے، اور اُس کے الفاظ ایسے حاوی اور لچک دار ہوتے ہیں کہ ہر ایک شعر میں متعدد پہلو نکل سکتے ہیں۔

مسلمانوں میں مسئلہ خیرات

(یہ مضمون مولانا نے ۱۳۲۶ھ میں ''انجمن بہبودِ مسلمانانِ دہلی'' کے سکریٹری کی درخواست پر تحریر فرمایا تھا۔)

بھیک مانگنے کی جس قدر ندامت اسلام میں کی گئی ہے شاید ہی کسی مذہب میں اس کی اس قدر بُرائی کی گئی ہوگی۔ کچھ کم ڈیڑھ سو روایتیں سوال کی مذمت میں حدیث کی مختلف کتابوں سے ''کنزالعمال'' میں نقل کی گئی ہیں۔

سوال کے انسداد کو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ والہ وسلم اس قدر مہتم بالشان تصور فرماتے تھے کہ جس طرح آپ توحید اور نماز پنج گانہ کی تعلیم کو ضروری سمجھتے تھے اسی طرح لوگوں کو سوال سے باز رکھنے میں ہمتِ عالی مصروف رکھتے تھے۔ چناں چہ عبدالرحمٰن بن عوف بن مالک اشجعی سے روایت ہے کہ ''ہم نو یا آٹھ یا سات آدمی آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر تھے کہ آپؐ نے ہم سے فرمایا: ''کیا تم خدا کے رسولؐ سے بیعت نہیں کرتے؟'' ہم نے فوراً ہاتھ بڑھایا مگر چوں کہ ہم چند ہی روز پہلے بیعت کر چکے تھے ہم نے عرض کیا: ''یارسول اللہؐ! ہم تو ابھی بیعت کر چکے ہیں اب آپؐ ہم سے کس بات پر بیعت لیتے ہیں؟'' آپؐ نے فرمایا: ''اس بات پر کہ خدا کی عبادت کرو، اُس کے ساتھ کسی کو شریک مت کرو اور احکام الٰہی بجالاؤ۔'' اور پھر آہستہ ارشاد فرمایا: ''وَلَاتَسَآء لوا النّاسَ شیئاً.'' یعنی ''لوگوں سے کچھ نہ مانگو۔'' اس روایت کے بعد عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ میں نے اس کے بعد اُن لوگوں میں سے (جنھوں نے بیعت کی تھی) بعض کو دیکھا کہ اگر کسی کے ہاتھ سے سواری کی حالت میں کوڑا بھی گر جاتا تھا تو وہ اس خیال سے کہ کہیں یہ بھی سوال میں داخل نہ

ہو کسی راہ چلتے سے اپنا کوڑا نہ مانگتا تھا۔''

سوال نہ کرنے کی اس قدر تاکید صرف اسی واسطے ہے کہ گداگری پیشہ نہ ہو جائے اور اُسے آج کل کی طرح ذریعۂ معاش نہ بنالیا جائے۔ کیوں کہ دوسری حدیثوں سے یہ بھی ثابت ہے کہ ''ایک دوسرے کی مدد کرو۔'' اور ''اپنے کاموں میں دوسرے بھائیوں سے مشورہ لو۔'' اور جیسے زکوٰۃ اور خیرات وغیرہ لینے کی حدیثیں ہیں۔ جیسے اُس وقت بعض رقوم کو قوم سے وصول کر کے اسلام کی ضروری خدمات کے صرف کے واسطے بیت المال میں جمع رکھا جاتا تھا، اسی طرح اگر اب بھی قوم کی اہم ضروریات کے واسطے روپیہ فراہم کیا جائے تو یہ گداگری نہیں ہے اور نہ یہ ''تساء لوا الناس شیئاً'' میں آسکتا ہے۔ ورنہ اگر ''کچھ نہ مانگو۔'' کے مطلق معنی مراد لیے جائیں تو دُنیا کا سارا معاملہ درہم برہم ہو جاتا ہے۔

اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بیعتِ مذکور کا اصل مقصد خاص کر سوال کرنے کی بُرائی اُن کے ذہن نشین کرتی تھی۔ جن باتوں کی تصریح پہلی بیعت میں فرما چکے تھے اُن کی تکرار اس موقع پر بطور یاددہانی کے تھی نہ کہ اصل مقصود۔ نیز بیعت کرنے والوں کا بعد بیعت کے سوال سے اس قدر بچنا بھی اسی بات پر دلالت کرتا ہے کہ بیعت کا اصل مقصد صرف سوال کرنے کی ممانعت تھی اور بس!

بے شمار روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنخضرت صلعم سائل سے نہایت نفرت کرتے اور جو شخص بغیر اضطراری حالت کے سوال کے ذریعے سے کچھ وصول کرتا تھا اُس کو اُس کے حق میں حرام سمجھتے تھے۔ جو شخص ایک وقت کی بھی خوراک موجود ہونے پر سوال کرے اُس کی نسبت فرماتے کہ ''وہ اپنے لیے کثرت سے آتشِ دوزخ طلب کرتا ہے۔''

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار فرمایا ہے کہ

> ''تم میں سے جو شخص اپنی رسی لے کر پہاڑ پر جائے اور وہاں سے لکڑیوں کا گٹھا باندھ کر اپنی پشت پر لائے اور اس کو فروخت کرے تا کہ خدا تعالیٰ اس کی حاجت رفع کر دے یہ اُس کے حق میں بہت بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ لوگوں سے بھیک مانگے پھر وہ اُس کو کچھ دیں یا دھتکار دیں۔''

عائذ ابن عمر سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ''اگر تم لوگ جانو کہ سوال کرنے کے کیا نتائج ہیں تو کوئی شخص سوال کرنے کے لیے دوسرے شخص کی طرف رُخ نہ کرے۔''

اگر کوئی فلاسفر یا اکانومسٹ (ماہر اقتصادیات) اس مطلب کو بیان کرتا تو زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا تھا کہ:-

> ''جس قدر قوم میں بھیک مانگنے والوں کی کثرت زیادہ ہوتی جاتی ہے اسی قدر قوم کی دولت میں محنت و جفاکشی میں، غیرت وحمیت میں، ہمت والو العزمی میں گھاٹا ہوتا جاتا ہے۔ مفلسوں کو کاہلی اور بے غیرتی کی ترغیب ہوتی ہے اور دولت مندوں کا بہت سا روپیہ ایسی جماعت کی تعداد بڑھاتے اور تقویت دینے میں صرف ہوتا ہے جن کا وجود سوسائٹی کے حق میں سمِ قاتل کا حکم رکھتا ہے۔''

مگر جو جامعیت مذکورہ بالا حدیث نبویؐ میں پائی جاتی ہے وہ اس فلاسفر یا اکانومسٹ کے اس لمبے چوڑے بیان میں ہرگز نہیں پائی جاتی۔

حدیث کے الفاظ جس طرح مذکورہ بالا سوشل (معاشرتی) اور مورل (اخلاقی) خرابیوں کو شامل ہیں اسی طرح اُن تمام روحانی آفتوں اور بیماریوں پر حاوی ہیں جو سوال کی مذموم عادت سے سائل کو عارض ہوتی ہے۔

سائل خدا کو صرف بھیک مانگنے کا ایک اوزار جانتا ہے جس کی نسبت آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ ''ملعون'' من سال لوجه اللّٰه۔''

اُس کے دل میں نبیؐ کی عظمت اس سے زیادہ نہیں ہوتی کہ جب خدا کے ساتھ رسولوں کا بھی واسطہ دیا جاتا ہے تو ایک مسلمان آدمی کو خواہ مخواہ کچھ نہ کچھ دینا ہی پڑتا ہے۔

وہ قیامت کے معنی شاید کے سوا کچھ نہیں سمجھتا کہ خیرات دینے والے کو وہاں ایک کے عوض ستر ستر ملیں گے۔

سائل اپنے اندوختہ کو جو بھیک کے ذریعے سے اُس نے پیدا کیا ہے چھپاتا ہے اور باوجود استطاعت کے اپنی ناداری کا اظہار کرتا ہے اور اس طرح کفرانِ نعمت، وروغ گوئی

اور مکاری کے سخت ترین گناہوں کو اپنی کامیابی کا ذریعہ گردانتا ہے۔

پس جن جامع الفاظ میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیک مانگنے کی مذمت فرمائی ہے اس سے زیادہ جامع الفاظ سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ یہاں ایک بات قابل غور ہے یعنی یہ کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کرنے پر تو اس قدر لے دے کی ہے کہ بے شمار مرفوع حدیثیں سوال کی مذمت کے متعلق کتبِ احادیث میں موجود ہیں، مگر غیر مستحق سائلوں کا سوال پورا کرنے والوں کی مدح یا ذم کہیں صراحت کے ساتھ نہیں فرمائی۔ اس کی وجہ ادنیٰ تامل سے معلوم ہو سکتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات مقدسہ (جیسا کہ محققین نے بیان کیا ہے) دو قسم کی تھیں:۔

ایک وہ تعلیم تھی جس کی نسبت آپ کو حکم تھا بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَۃَ. یعنی ''اے رسولؐ پہنچا دے لوگوں کو وہ احکام جو خدا کی طرف سے تجھ پر نازل ہوئے ہیں اور اگر تو نے اُن کو نہ پہنچایا تو خدا کے پیغام کی کچھ تبلیغ نہ کی۔''

یہ تعلیم تو ایسی لازمی اور لابدی تھی کہ کسی حالت یا کسی مصلحت کے مقتضاء سے اس میں سکوت یا کوتاہی نہیں ہو سکتی تھی۔

دوسری تعلیم وہ تھی جو دنیوی مصالح سے علاقہ رکھتی تھی اور جس کی نسبت آپؐ نے ارشاد فرمایا تھا کہ اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاَمُوْ دُنْیَا یعنی ''تم اپنے دنیوی معاملات کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔''

اس تعلیم میں ملکی اور قومی مصلحتوں کے لحاظ سے ممکن تھا کہ سکوت یا تاخیر کی جائے یا بجائے تصریح کے کنایتہً ادا کی جائے۔

چوں کہ غیر مستحق سائلوں کا سوال پورا کرنا زیادہ تر سوشل (معاشرتی) خرابیوں کا موجب تھا اور سوال پورا کرنے والوں کی مدح یا ذم تبلیغِ رسالتؐ سے کچھ علاقہ نہ رکھتی تھی اس لیے رسول خدا صلعم نے جس صراحت کے ساتھ سوال کی مذمت فرمائی ویسی صراحت کے ساتھ غیر مستحق سائلوں کا سوال پورا کرنے والوں کی مذمت نہیں فرمائی۔

علاوہ ازیں اُس وقت عرب کے عام خیالات کے لحاظ سے سائل کا سوال رد کرنا (خواہ وہ مستحق ہو یا غیر مستحق) غائت درجہ کی دنائت سمجھی جاتی تھی اور یہ بات نبوت کی شان سے بعید تھی کہ جو امر قوم میں اس قدر حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہو اور اس کے متعلق کچھ کہنا یا نہ کہنا تبلیغِ رسالتؐ سے کچھ علاقہ نہ رکھتا ہو، قوم کو علی الاعلان اُس کی ترغیب دی جائے۔

بااین ہمہ اگرچہ آپ نے علی الاعلان غیر مستحق سائلوں کا سوال رد کرنے کی تاکید نہیں فرمائی لیکن خود سوال کرنے کی اس قدر مذمت کرنے سے صاف پایا جاتا ہے کہ آپؐ ملک میں سائلوں کی تعداد بڑھنے کو نہایت مکروہ جانتے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ کوئی چیز سائلوں کی تعداد بڑھانے والی ایسی نہیں ہے جیسے ہر مستحق و غیر مستحق مسائل کا سوال پورا کرنا۔

اس کے سوا متعدد روایتوں کے فحوائے کلام سے پایا جاتا ہے کہ آپ غیر مستحق سائلوں کا سوال پورا کرنے سے خوش نہ ہوتے تھے۔ چناں چہ ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ''قسم ہے خدا کی جو سائل میرے پاس سے اپنا مطلب حاصل کر لے جاتا ہے وہ مطلب نہیں ہے اس کے حق میں مگر ایک آگ۔'' یہ سن کر حضرت عمرؓ نے عرض کیا: ''آپؐ کیوں اُس کا مطلب پورا کرتے ہیں۔'' آپؐ نے فرمایا: ''کیا کیا جائے لوگ تو مانتے نہیں اور خدا تعالیٰ ردِ سوال کو مجھ سے پسند نہیں کرتا۔''

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی کا سوال رد نہ کرنے کو آپؐ اپنی خصوصیات میں شمار کرتے تھے۔ اور قرآن مجید کی متعدد آیتیں بھی جیسے وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلاَ تَنْھَرْ اور وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ اور فَبِمَا رَحْمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ لِنْتَ لَھُمْ وَلَوْ کُنْتَ فَظًّا غَلِیْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِکَ اس خصوصیت پر دلالت کرتی ہیں۔ پس عامہ امت کو اس خاص معاملہ میں آپ کا اتباع کرنا گویا اپنے تئیں آنحضرتؐ کی خصوصیات میں شریک گردانا ہے۔

لیکن اس باب میں سب سے عمدہ مشکوٰۃ کی وہ حدیث ہے جس میں آنحضرتؐ نے سائل کے ساتھ برتاؤ کرنے کا طریقہ تعلیم فرمایا ہے۔ یعنی انصار میں سے ایک شخص آپؐ کی خدمت میں کچھ مانگنے کے لیے حاضر ہوا۔ آپؐ نے پوچھا: ''کیا تیرے گھر میں کچھ بھی

نہیں؟'' اُس نے عرض کیا: ''کیوں نہیں، ایک موٹی سی کمبلی ہے اُسے کچھ اوڑھتا ہوں کچھ بچھاتا ہوں اور ایک پیالہ ہے جس میں پانی پیتا ہوں۔'' آپؐ نے فرمایا: ''دونوں کو میرے پاس لے آ۔'' وہ دونوں چیزیں لے کر حاضر ہوا۔ آپؐ نے اُن کو ہاتھ میں لے کر لوگوں سے فرمایا: ''ان کو کوئی خریدتا ہے؟'' ایک شخص بولا: ''میں ایک درہم کو خریدتا ہوں۔'' پھر آپؐ نے دو یا تین بار فرمایا: ''کوئی ایک درہم سے زیادہ دے سکتا ہے؟'' ایک شخص نے کہا: ''میں دو درہم دیتا ہوں۔'' آپؐ نے کمبلی اور پیالہ اُسے دے کر دو درہم لے لیے اور اُس انصاری سے فرمایا کہ ''ایک درہم کا تو کھانا لے جا کر اپنے گھر میں پہنچا اور دوسرے درہم کی کلہاڑی خرید کر میرے پاس لا۔'' وہ کلہاڑی خرید لایا۔ آپؐ نے اپنے دست مبارک سے ایک لکڑی کا دستہ اس میں ٹھونک دیا اور فرمایا: ''جا لکڑیاں کاٹ اور بیچ۔ اب میں تجھ کو پندرہ دن تک نہ دیکھوں۔'' وہ شخص چلا گیا اور لکڑیاں کاٹ کاٹ کر بیچنے لگا۔ پندرہ دن کے بعد جب آنحضرتؐ کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوا تو اس کے پاس دس درہم جمع ہو گئے تھے اُس نے اُن میں سے کچھ کا تو کپڑا خریدا اور کچھ سے کھانے کا سامان مول لیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''یہ تیرے لیے اس سے بہتر ہے کہ جب تو قیامت کے دن آئے تو تیرے چہرے پر بھیک مانگنے کا داغ ہو دیکھ سوال کرنا صرف اُس شخص کو حلال ہے جو سخت محتاج ہو یا جس کی ذمہ بھاری تاوان ہو یا جس کی گردن پر خوں بہا ہو۔''

اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سائل کو سوال کرنے سے روکا جائے اور سوال کرنے کی بُرائی اور محنت و مشقت کرنے کی خوبی اس کے ذہن نشین کی جائے مگر اس زمانے کے سائلوں کی بے غیرتی اور ڈھٹائی اس حد سے گذر گئی ہے کہ کسی کی فہمائش یا ممانعت کا اُن پر کچھ اثر نہیں ہو سکتا اور نیز عام آدمیوں کی فہمائش میں وہ تاثیر پیدا ہونی محالات سے ہے جو رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی دلسوزی اور شفقت بھری نصیحتوں میں ہوتی تھی لہٰذا اس وقت اس طریقہ پر عمل نہیں ہو سکتا۔

نظر بحالاتِ موجودہ ہم کو اس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ غیر مستحق سائلوں کی داد و دہش سے یک قلم ہاتھ روک لیا جائے اور جہاں تک ہو سکے مستحقین کی امداد کی جائے جو

باوجود استحقاق کے کسی سے سوال نہیں کرتے یا جو سخت مجبوری اور ناداری کی حالت میں سوال کرتے ہیں۔

غیر مستحق سائلوں کے ساتھ کوئی سلوک اور کوئی بھلائی اس سے بڑھ کر نہیں ہوسکتی کہ اُن کو اس بے غیرتی اور بے شرمی کے پیشے سے باز رکھا جائے۔

ملک وقوم کے حق میں کوئی احسان اس وقت اس سے زیادہ نہیں ہوسکتا کہ بھیک مانگنے کا بدترین پیشہ جو مرضِ متعدی کی طرح افرادِ قوم میں سرایت کرتا جاتا ہے اور جس سے روز بروز بھیک منگوں کی تعداد ملک میں زیادہ ہوتی جاتی ہے، رفتہ رفتہ اس کی بیخ کنی کی جائے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ آنحضرت صلعم کے بعد مدتِ دراز تک ممالکِ اسلامیہ میں سوال کرنا نہایت مذموم سمجھا جاتا تھا اور طرح طرح سے اس کا انسداد کیا جاتا تھا۔

روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک سائل کی آواز سنی اور یہ سمجھ کر کہ بھوکا ہے اس کو کھانا کھلانے کا حکم دیا۔ تھوڑی دیر میں اُس کی آواز پھر سنائی دی۔ معلوم ہوا کہ یہ وہی سائل ہے اور کھانا کھانے کے بعد اب پھر مانگتا ہے۔ آپؓ نے اس کو بلوایا اور دیکھا کہ اُس کی جھولی روٹیوں سے بھری ہوئی ہے۔ آپؓ نے جھولی کا ایک سرا پکڑ کر اُس کو اونٹوں کے آگے جھاڑ دیا اور فرمایا: ''تو سائل نہیں ہے تاجر ہے۔''

علامہ مقری ''تاریخ اندلس'' میں لکھتے ہیں کہ ''اندلس میں جس سائل کو تندرست اور کام کے لائق دیکھتے ہیں اس کو نہایت ذلیل کرتے اور سخت وسست کہتے ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ یہاں اپاہج اور معذور آدمی کے سوا کوئی سائل نظر نہیں آتا۔''

پس سب سے پہلے مسلمانوں کا فرض ہے کہ اپنے اپنے حدود اور اختیارات میں جہاں تک اُن کی دسترس ہو اس نالائق اور کمینہ رسم کا انسداد کریں۔

خاص کر ہمارے علما اور واعظین کو لازم ہے کہ نہایت آزادی اور بے باکی کے ساتھ وعظ کی مجلسوں میں سوال کی مذمت جو حدیثوں میں وارد ہوئی ہے اور جو مضر نتیجے سائلوں کی کثرت سے قوم کے حق میں پیدا ہوتے ہیں اور اسراف اور فضول خرچی کی برائی

جو قرآن مجید میں جا بجا بیان ہوئی ہے، عام مسلمانوں کے ذہن نشین کریں۔

خاص کر زنانی مجلسوں میں عورتوں کو جو ہر فقیر کو مستجاب الدعوات اور اُس کی آواز کو غیب کی آواز سمجھتی ہیں ان لوگوں کے مکر و فریب سے آگاہ کرنا چاہیے۔ اُن کے دلوں میں بٹھا دیا جائے کہ ہٹے کٹے بھیک مانگنے والوں کو کچھ دینا بجائے نیکی اور بھلائی کرنے کے الٹا گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ کیوں کہ جس قدر ایسے لوگوں کو دیا جاتا ہے اُسی قدر مستحق بیواؤں اور یتیموں اور ہمسایوں کی حق تلفی ہوتی ہے، اُسی قدر بھیک مانگنے کا ناپسندیدہ طریقہ زیادہ رواج پاتا ہے اور اُسی قدر قوم میں کام کے آدمیوں کی کمی ہوتی ہے۔

تقی الدین ابن تیمیہ حرانی

(یہ مضمون مولانا کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے قلمی مسودے سے نقل کیا گیا ہے۔ مسودے سے یہ معلوم نہ ہوسکا کہ مولانا نے یہ مضمون کس سنہ میں لکھا تھا۔ نیز سخت افسوس ہے کہ مضمون ناتمام ہے اور مولانا نہ معلوم کس وجہ سے اس کو مکمل نہ لکھ سکے۔ بہر حال جس قدر مولانا کے ہاتھ لکھا ہوا مسودہ تھا پیش خدمت ہے۔)

خاندان:- حرّان جو بلادشام میں ایک شہر ہے وہاں چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں ایک نامور خاندان اہل علم کا گذرا ہے جس میں چھ جلیل القدر اور متبحر عالم "ابن تیمیہ" کے نام سے مشہور ہوئے ہیں۔ ان میں سب سے پہلے "شیخ فخر الدین ابوعبداللہ بن ابی القاسم" کا نام "ابن تیمیہ" رکھا گیا ہے جن کی اولاد میں سے ایک "تقی الدین ابن تیمیہ" ہیں جن کا ہم کو یہاں حال لکھنا منظور ہے اور جن پر اسلامی دُنیا میں سب سے زیادہ ابن تیمیہ کا اطلاق کیا جاتا ہے۔

ولادت:- شیخ الاسلام احمد بن عبدالحلیم بن عبدالسلام تقی الدین ابن تیمیہ ربیع الاول ۶۶۱ھ کی دسویں یا بارھویں کو "حرّان" میں پیدا ہوئے جہاں اُس وقت تاتاریوں کا زور تھا۔

والدین کی ہجرت اور ابن تیمیہ کا دمشق آنا:- ان کی عمر چھ سات برس سے زیادہ نہ تھی جب کہ اُن کے والد مع اہل وعیال کے تاتاریوں کے پڑوس سے تنگ آ کر دمشق میں چلے آئے تھے۔

بچپن میں تحصیل علوم:- دمشق جو اُس وقت بلاد اسلام میں علوم دینیہ کا مرکز تھا وہاں شیخ زین الدین مقدسی کے حلقۂ درس میں شریک ہوکر ابن تیمیہ حدیث کی سماعت کرنے لگے۔ لکھا

ہے کہ ابن تیمیہ کے شیوخ جن سے انھوں نے حدیث کی سماعت کرنے لگے۔ تعداد میں سو (۱۰۰) سے زیادہ ہیں۔ سب سے پہلے انھوں نے حدیث ہی کی طرف توجہ کی اور سالہا سال حدیث کے سماع میں بسر کیے۔ پھر خوشنویسی، حساب اور حفظِ قرآن کے بعد فقہ کی طرف متوجہ ہوئے اور ایک مدت تک عربیت کی کتابیں پڑھیں۔ خصوصاً ''سیبویہ'' کی کتاب ''النحو''، جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ کسی علم میں ایسی عمدہ کتاب نہیں لکھی گئی۔ خصوصیت کے ساتھ دیکھی پھر تفسیر اور اصول فقہ کی طرف خاص توجہ کی اور ان سب فنون میں معاصرین سے سبقت لے گئے۔ حالاں کہ ابھی اُن کی عمر بیس برس سے بھی کم تھی۔

ذہانت، پرہیز گاری اور شوقِ علم:- اس زمانے کے فضلا ابن تیمیہ کی ذہانت اور جودت اور قوتِ حافظہ سرعتِ انتقال دیکھ کر حیران تھے۔ اور اسی کے ساتھ اخلاق فطرۃً نہایت اعلیٰ درجے کے پائے تھے۔ پارسائی، تقویٰ، خداپرستی، کھانے پہنچنے میں میانہ روی، والدین کی اطاعت، عبادت الٰہی کا شوق، ہر وقت خدا کی طرف لو لگائے رکھنا، حدودِ الٰہی سے کبھی تجاوز نہ کرنا۔ نیک باتوں کی سب کو ترغیب دینا اور بُری باتوں سے روکنا، یہ سب خوبیاں پوری پوری اس کی ذات میں پائی جاتی تھیں۔ علم سے اس کی کبھی سیری نہیں ہوتی تھی اور مطالعہ کی پیاس کبھی نہ بجھتی تھی۔ ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ اُس نے کسی مضمون کی طرف توجہ کی ہو اور غیب سے فتح یابی نہ ہوئی ہو۔

قوتِ مناظرہ:- وہ بچپن سے علمی مجلسوں میں شریک ہو کر اہل علم سے بحث اور مناظرہ کرتا تھا اور بڑے بڑے علما کو ساکت کر دیتا تھا۔ اور اکثر ایسی باتیں اُس کے منہ سے نکل جاتی تھیں جن کو سن کر حاضرین حیران رہ جاتے تھے۔

بچپن میں فتویٰ نویسی:- وہ سترہ برس کی عمر میں فتویٰ لکھنے لگا تھا اور اُسی وقت سے اُن کو جمع اور ترتیب کرنے لگا تھا۔

باپ کا انتقال اور ابن تیمیہ کا حلقۂ درس:- جب اُس کے باپ شیخ عبدالسلام نے جو حنبلیوں میں امام کا درجہ رکھتا تھا انتقال کیا تو ابن تیمیہ نے باپ کی جگہ طلبہ کو درس دینا اور باپ کے فرائض ادا کرنے شروع کیے۔ اس وقت اس کی عمر اکیس سال کی تھی۔ چند روز میں اس کی

شہرت دور دور پہنچ گئی۔ انھیں دنوں میں اُس نے قرآن مجید کی تفسیر کا درس ہر جمعہ کو بغیر مدد کتاب کے کہنا شروع کیا، آواز بہت بلند تھی، درس کی حالت میں کہیں نہیں رکتا تھا۔

حج:-۶۹۱ھ میں اُس نے حج کیا جب کہ اس کی عمر تیس برس کی تھی۔

شہرت اور مقبولیت:-اب وہ بہ لحاظ اپنے کمالاتِ علمی و عملی اور اعلیٰ درجے کے اخلاق و خصائل کے اور زہد و درع اور نفع رسانی خلائق کے نواحِ شام میں مرجعِ خلائق اور امامِ وقت سمجھا جانے لگا۔ وہ دین مبین کی نصرت اور اعلانِ کلمۂ حق میں بمقابل اہلِ بدعت کی ننگی تلوار تھا۔

فضل و کمال:-''ابوالحجاج'' کا قول ہے کہ ''میں نے کسی کو اس کا مثل نہیں پایا اور اُس نے بھی کسی کو اپنا نظیر نہ دیکھا ہوگا۔ کوئی شخص کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہؐ کا اُس سے زیادہ جاننے والا اور اُس سے بڑھ کر اُن کی پیروی کرنے والا میری نظر میں نہیں گذرا۔''

''علامہ کمال الدین زملکانی'' نے کہا ہے کہ ''جس علم کے متعلق اس سے کوئی سوال کیا جاتا تھا تو سننے والے اُس علم میں اس کا تبحر دیکھ کر یہ خیال کرتے تھے کہ شاید یہ اس علم کے سوا کوئی دوسرا علم نہ جانتا ہوگا۔ ہر مذہب کے فقہا جب تک کہ اُس کے مذہب سے واقف نہ ہوتے تھے اپنے اپنے مذہب کے متعلق اس سے استفادہ کرتے تھے۔ تصنیف کا سلیقہ حسنِ بیان اور حسنِ ترتیب گویا اُس کا حصہ تھا۔ ایک بار تقسیمِ میراث کے متعلق اور دوسری بار حدود کے متعلق دو مسئلوں میں اُس زمانے کے مفتیوں میں اختلاف واقع ہوا۔ اُس نے دونوں مسئلوں پر ایک ایک ضخیم کتاب لکھی مگر کہیں اصل سوال کی حد سے قدم باہر نہیں رکھا۔ ہر ایک مسئلہ کے متعلق جو کچھ لکھا وہ ایسا ضروری معلوم ہوتا تھا کہ گویا بغیر اُس کے بیان ناتمام تھا۔ لیکن ہر ایک مسئلہ پر جو کچھ لکھا اُس کا غالب حصہ ایسا تھا کہ کسی کے وہم و گمان میں بھی اُس موقع کے متعلق وہ باتیں نہ گذری تھیں۔ اُس میں اجتہاد کی تمام شرطیں جیسی کہ چاہئیں خدا نے جمع کر دی تھیں۔''

ابوالحجاج کہتے ہیں کہ ''میں نے علامہ موصوف کے قلم کا لکھا ہوا جو انھوں نے تقی الدین ابن تیمیہ کی کتاب ''رفع الاعلام عن ائمۃ الاسلام'' پر لکھا تھا پڑھا۔ ابوالحجاج نے علامہ زملکانی کی وہ عبارت نقل کی ہے جو انھوں نے شیخ کی اس مشہور کتاب پر اپنے قلم سے

لکھی تھی۔ اُس میں شیخ کے بے شمار محامد بیان کرنے کے بعد وہ یہ اشعار لکھتے ہیں:-

[1] مَاذَا يَقُوْلُ الْوَاصِفُوْنَ لَهٗ
وَصِفَاتُهٗ قَلَّتْ عَنِ الْحَصْرِ
هُوَ حُجَّةٌ لِلّٰهِ قَاهِرَةٌ
هُوَ بَيْنَنَا اَعْجُوْبَةُ الدَّهْرِ
هُوَ آيَةٌ فِى الْخَلْقِ ظَاهِرَةٌ
اَنْوَارُهَا اُرِيَتْ عَلَى الْفَجْرِ

ابوالحجاج کہتے ہیں کہ وہ اس تعریف کا اُس وقت مستحق ہوگیا تھا جب کہ اس کی عمر تیس برس سے زیادہ نہ تھی۔

اُس کے شیوخ اور ہمعصر علماء کی جماعتِ کثیر نے بھی اس کی بے انتہا مدح وثنا کی ہے۔ جیسے شمس الدین ابن ابی عمرو۔ شیخ تاج الدین فزاری، ابن منجا، ابن عبدالقوی قاضی جونی، ابن دقیق العبد اور ابن الخاس وغیرہم۔ اور یہ سب علماء شافعی المذہب ہیں۔ شیخ عماء الدین وسطی نے اس کو اتباعِ سنت اور ترکِ بدعت کے لحاظ سے خلفائے راشدین اور ائمہ مہدیئین کا نمونہ قرار دیا ہے۔ اور اس کی بے انتہا تعریف کے بعد لکھتے ہیں کہ "کسی فن میں کوئی اس کی گرد تک نہ پہنچ سکتا تھا۔ جس وقت وہ قرآن کی تفسیر بیان کرتا تھا تو لوگ اُس کی یادداشت دیکھ کر مبہوت ہو جاتے تھے۔ وہ مفسرین کے ہر قول پر جب ترجیح یا تصنیف یا ابطال کا حکم لگاتا تھا تو حاضرین حیران رہ جاتے تھے۔ حالاں کہ وہ ایک زاہد وعابد اور ذاکر و شاغل آدمی تھا اور اس کا بہت سا وقت لوگوں کو خدا کی طرف بلانے یعنی وعظ و تذکیر میں گزرتا تھا۔

---

[1] یعنی "تعریف کرنے والے اُس کی تعریف کیا بیان کریں گے جب کہ اُس کی صفات غیر محصور ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی ایک حجتِ قاہرہ اور ہم میں ایک نادرِ روزگار انسان ہے۔ وہ اس دُنیا میں خدا کا ایک کھلا ہوا نشان ہے اور اُس کی برکات طلوعِ فجر کی طرح نمایاں ہیں۔

التماس بخدمت برادران وطن متعلق مسئلہ حجاب

(قلمی مسودہ سے نقل کیا گیا)

(یہ مضمون ۱۳۰۰ھ میں مولانا نے اپنے وطن پانی پت کے شرفا کے لیے لکھا تھا۔ مگر چھاپا نہیں گیا بلکہ قلمی شکل میں معززین شہر کے پاس فرداً فرداً بھیجا گیا تھا۔ یہ مضمون ہمیشہ کے لیے ناپید ہو جاتا اور اس کا کچھ بھی پتہ نہ چلتا۔ مگر حسن اتفاق سے اس کی ایک نقل مولانا کے قدیمی دوست حافظ محمد یعقوب صاحب مجددی کے پاس نہایت احتیاط سے محفوظ تھی۔ میں حافظ صاحب کا نہایت ممنون ہوں کہ میری درخواست پر انھوں نے یہ مضمون مجھے مرحمت فرما دیا۔ جس کو میں آج سب سے پہلی مرتبہ عام طور پر شائع کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔)

آپ سب صاحب واقف ہیں کہ پردہ کا حکم مسلمانوں کے ہاں ایسا ہی تاکیدی ہے جیسا اور فرائض اور واجبات کا۔

اور تمام دُنیا کی قوموں میں صرف مسلمانوں ہی کو یہ فخر ہے کہ ان کی ننگ و ناموس کو نامحرموں کے سامنے آنے سے منع کیا گیا ہے۔

مگر انگریزی عمل داری کی خاصیت سے آپ بخوبی واقف ہیں کہ وہ پردہ نشینی کی دشمنی ہے اور عورتوں کی آزادی اور خود مختاری کی حامی ہے۔ اگرچہ وہ جبراً کسی کے پردے میں دست اندازی نہیں کرتے مگر چوں کہ آزادی اور بے قیدی ہمیشہ انسان کو مرغوب ہوتی ہے اور حکمراں قوم کی پیروی کرنے کو ہر ایک کا جی چاہتا ہے، اس سبب سے اُن کی دیکھا

دیکھی ہندوستان کی اکثر پردہ نشین قوموں میں خودبخود پردہ کم ہوتا جاتا ہے۔ ہندوؤں کی بعض قومیں جنھوں نے مسلمانوں سے پردہ کی رسم سیکھی تھی، اُن کے ہاں سے اب یہ رسم کم ہوتی جاتی ہے اور برہمو ہندو جو ایک جدید فرقہ ہندوستان میں پیدا ہوا ہے وہ لوگ تمام ہندوستان میں کوشش کرتے پھرتے ہیں یہ رسم بالکل اس ملک سے جاتی رہے۔ وہ برابر رسالوں اور اخباروں اور کتابوں میں پردے کے خلاف مضمون لکھ کر چھپواتے ہیں اور پردہ کی برائی پر بیسیوں دلیلیں پیش کرتے ہیں۔

مسلمانوں میں بھی بیسیوں قومیں ایسی ہیں جن کے ہاں پردہ کی رسم جاری نہیں ہے۔صرف چار قومیں شیخ، سید، مغل، پٹھان برائے نام پردہ کی پابند رہ گئی۔مگر شہروں میں اُن کے پردے کی حقیقت یہ ہے کہ ڈولیوں میں، بہلیوں میں اور رتھوں میں بیٹھنے کا نام پردہ رہ گیا ہے۔ باقی بیاہ شادیوں کی مجلسوں میں اکثر جگہ پردہ بالکل اُٹھ جاتا ہے۔

اس سے بڑھ کر شہروں اور قصبوں میں عموماً یہ خرابی پھیلی ہوئی ہے کہ شرعی محرموں کے سوا بیسیوں نامحرموں سے بھی پردہ نہیں کیا جاتا بلکہ شہروں کے لوگ ایسا خیال کرتے ہیں کہ یہ خرابی قصبات میں بہ نسبت شہروں کے زیادہ پھیلی ہوئی ہے۔

دلّی میں ایک روز ایک دوست کے مکان پر چند احباب جمع تھے اور میں بھی وہاں موجود تھا، ایک شخص نہایت دریدہ دہن اور آزاد منش اتفاقاً وہاں وارد ہوئے۔اثنائے صحبت میں شہر کے بعض خاندانوں کی خرابی کا ذکر چلا اور ایک صاحب نے قصبات کے لوگوں کے چال چلن کی تعریف کی۔ اس پر اُس شخص نے کہا کہ آپ قصبات کے حالات سے واقف نہیں ہیں۔قصبات کا حال شہروں سے بدتر ہے اور خورجہ اور شاہجہاں پور کی چند مثالیں بیان کیں۔ اُس کے بعد یہ کہا کہ قصبات جو زیادہ بدنام نہیں ہیں اُس کا یہ سبب ہے کہ وہاں ہر ایک خاندان کے مرد و عورت ایک دوسرے کے سامنے آتے ہیں اس لیے جو اندرونی خرابیاں وہاں پیدا ہوتی ہیں ان کا اعلان بہت کم ہوتا ہے۔ اس پر میں نے یہ کہا کہ بُرا کام سات پردوں میں بھی کیا جائے گا، ممکن نہیں کہ آخرکار اُس کی رسوائی اور تفضیح نہ ہو۔ پس نیک نام وہی خاندان اور وہی بستیاں رہ سکتی ہیں جو حقیقت میں ہر ایک داغ اور دھبّے سے

پاک ہیں۔ اگر اندرونی خرابیوں کا اعلان کم ہوتا ہے تو کیا سبب ہے کہ قلعہ تمام دُنیا سے زیادہ بدنام تھا۔ قلعہ میں تمام شاہی خاندان کے مرد و عورت ایک دوسرے کے سامنے آتے تھے اور وہاں جس قدر خرابیاں تھیں وہ اندرونی تھیں۔ اُنھوں نے کہا کہ قلعہ کی بدنامی کا سبب یہ تھا کہ وہاں اندرونی اور بیرونی دونوں طرح کی خرابیاں انتہا کے درجے کو پہنچ گئی تھیں۔ قصبات میں بیرونی خرابیاں بالکل نہیں ہیں اور اندرونی خرابیاں بھی زیادہ نہیں بڑھیں۔ اس تقریر پر گفتگو ختم ہوگئی۔

اگرچہ بعض قصبات کی نسبت اُن کا یہ قول بالکل صحیح تھا مگر جہاں تک میرا علم ہے میں نہایت وثوق اور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارا قصبہ آج تک ہر ایک داغ دھبّے سے پاک رہا ہے اور جیسی مذموم اور قبیح باتیں بڑے بڑے شہروں میں ہمیشہ سنی جاتی ہیں۔ ویسی ایک بات بھی یہاں کے شریف خاندانوں میں نہیں سُنی گئی۔

لیکن اس میں شک نہیں کہ نامحرم رشتہ داروں کے سامنے آنے کا طریقہ قطع نظر اس کے کہ احکامِ خدا اور رسولؐ کے برخلاف ہے۔ اس زمانے کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر بالخصوص نہایت خطرناک معلوم ہوتا ہے۔

جس قدر شرم و حجاب شریف خاندانوں کے مرد و عورت میں آج سے تیس چالیس برس پہلے دیکھا جاتا تھا اب اُس کا عشر عشیر بھی نہیں دیکھا جاتا۔ اس کے سوا پہلے عورتوں کے لباس کی وضع ایسی سیدھی سادی تھی کہ نامحرم رشتہ داروں کے سامنے آنے سے کوئی برا خیال پیدا نہ ہوتا تھا۔ لیکن اب حالت اس کے بالکل برخلاف ہے پہلے ہر ایک محلّہ میں آدمیوں کی کثرت تھی، کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں دس پندرہ آدمی مرد و عورت موجود نہ ہوں۔ اب گھر کے گھر سُونے پڑے ہیں، کسی گھر میں ایک عورت رہتی ہے کسی میں دو عورتیں رہتی ہیں۔ اس کے سوا تمام شریف خاندانوں میں چرخہ کاتنے کا رواج تھا۔ مستورات جب گھر کے کاروبار سے فارغ ہوتی تھیں چرخہ پونی اور ایٹرنوں میں مصروف رہتی تھیں۔ اب اُس کا رواج بہت کم گھروں میں نظر آتا ہے۔ اور عورتوں کی فرصت کے اوقات پان کھانے اور چھالیا کترنے میں صرف ہوتے ہیں۔ صرف بال بچوں والی عورتیں بچوں کی خبر گری اور اُن

کے کھلانے، پہنانے اور نہانے دھلانے میں کسی قدر مصروف رہتی ہیں باقی سب بے کار رہتی ہیں اور بے کاری تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ ایسی حالت میں نامحرم رشتہ داروں کا گھر میں بلا حجاب آنا نہایت خطرناک ہے۔

اگر ابھی سے اس خطرناک رسم کا انسداد نہ کیا جائے گا تو آئندہ سخت دشواریاں پیش آئیں گی۔ کیوں کہ ؂

سر چشمۂ شاید گرفتن بہ میل
چو پُرشد نشاید گزشتن بہ میل

آپ نے سنا ہوگا کہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بی بی عائشہ صدیقی رضی اللہ عنہا کو جن کی طہارت وعفت پر خدائے پاک نے قرآن مجید میں گواہی دی ہے۔ ایک بار دیکھا کہ اپنے باپ حضرت ابوبکر صدیقی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس تنہائی میں بیٹھی ہوئی کچھ باتیں کر رہی تھیں۔ آپؐ نے حضرت صدیق اکبر سے فرمایا کہ "اے ابوبکر! کیا شیطان کو دور سمجھتے ہو کہ اس طرح مخلی بالطبع ہو کر جوان بیٹی سے باتیں کر رہے ہو؟"

جائے غور ہے کہ جب ایسے پاک زمانے میں اور ایسے باپ اور ایسی بیٹی کی نسبت آنحضرتؐ کا ایسا خیال ہو تو اس ناپاک اور نجس زمانے میں نامحرموں کی نسبت کیوں کر عفت اور طہارت کے سوا اور کوئی خیال نہیں ہو سکتا۔

شاید کوئی صاحب یہ خیال کریں کہ نامحرم رشتہ داروں کے سامنے آنا اس قصبہ میں قدیم سے جاری ہے اور آج تک اس رسم سے کوئی قباحت یا خرابی پیدا نہیں ہوئی۔ ہاں بے شک یہ رسم قدیم سے یہاں چلی آتی ہے، لیکن اُس زمانے میں اور حال کے زمانے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اُس زمانے میں عورتیں محکوم تھیں اور مرد حاکم تھے۔ اس زمانے میں مرد محکوم ہیں اور عورتیں حاکم ہیں۔ اُس زمانے میں بڑے سے بڑے گھر کی بیویاں جو لباس پہنتی تھیں وہ آج کل لونڈی باندیوں کے بھی خاطر میں نہیں آتا۔ جس قدر آرائش و زیبائش کے سامان آج ایک پسنہاری کو میسر آسکتے ہیں اُس وقت امیر زادیوں کو بھی نصیب نہ تھے۔ اُس زمانے میں اپنے قصبہ کی پوشش اور لباس اور چال چلن کے سوا کسی غیر شہر کا

لباس یا چال چلن نہ کبھی آنکھوں سے دیکھا جاتا تھا نہ کانوں سے سنا جاتا تھا۔اب ہر روز نت نئی تراش وخراش آنکھوں سے دیکھی جاتی ہے۔اور دُنیا کے عجیب وغریب معاملات کانوں سے سُنے جاتے ہیں۔اس کے سوا قدیم اور حال کے زمانے میں اور بہت سے تفاوت اور امتیاز ہیں جن کا بیان کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

پس آپ صاحبوں سے میری یہ درخواست ہے کہ اس معاملہ کو خوب غور سے ملاحظہ فرمائیں اس کے بعد اگر آپ کے نزدیک بھی یہ رسم موقوف کرنے کے قابل ہو تو مردانہ دار اس کے انسداد کے لیے کھڑے ہو جائیں اور جہاں جہاں آپ کی دسترس ہو وہاں سے اس رسم کو موقوف کرادیں۔

اگر چہ کہیں کہیں اس رسم کے توڑنے میں دقتیں پیش آئیں گی لیکن وہ دقتیں اُن خرابیوں سے بدرجہا کمتر ہوں گی جو اس رسم کے جاری رہنے سے خیال میں آتی ہیں۔ جو قومیں پردے کی پابند نہیں ہیں۔اُن کو نہایت تعجب ہوتا ہے کہ مسلمان پردے کی دقتوں اور تکلیفوں کو کیوں کر برداشت کرتے ہیں؟ حالاں کہ ہم لوگوں کو کچھ بھی دقت معلوم نہیں ہوتی۔ پس اگر یہ رسم بھی موقوف ہو جائے گی تو جو دقتیں اُس کے برطرف کرنے میں اس وقت معلوم ہوتی ہیں وہ چند روز کے بعد عادت میں داخل ہو جائیں گی اور کوئی اشکال باقی نہ رہے گا۔

سب سے پہلے میں اس رسم کو اپنے عشیرہ سے موقوف کرنے پر آمادہ ہوں اور میرا مصمم ارادہ ہے کہ میرے کنبے میں سے جس مرد یا عورت کو میری اس تجویز سے اتفاق نہ ہوگا میں اُس سے ہمیشہ کے لیے ملنا جلنا چھوڑ دوں گا۔

میری آپ صاحبوں سے بھی یہی التماس ہے کہ اگر اس رسم کو موقوف کرانا ہے تو آپ بھی ایسی ہی سختی اختیار کریں، ورنہ اگر صرف چند گھروں سے یہ رسم اُٹھ گئی تو کوئی عمدہ نتیجہ پیدا ہونے کی توقع نہیں ہے۔

پردہ کی بابت ہماری قوم کے شیعہ اور سنّی صاحبوں کو چاہیے کہ اپنے اپنے عالموں سے پردے کا شرعی قاعدہ دریافت فرما کر اُس کے موافق کاربند ہوں۔

آپ صاحبوں کو معلوم رہے کہ میں کچھ اوپر تیس برس سے شہر دہلی میں آمد و رفت

رکھتا ہوں اور کم سے کم پندرہ سولہ برس اس شہر میں میرا قیام رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اس قدر مدت تک کسی جگہ رہے۔ اگر چہ وہ ایک مختصر گاؤں ہی ہو تو بھی اُس سے طبیعت مانوس ہو جاتی ہے، چہ جائیکہ دلّی جیسا شہر جو پردیسی کو چند روز میں اپنا دلدادہ اور مفتوں کر لیتا ہے۔ چناں چہ یہی سب ہے کہ ہزاروں پردیسیوں نے اپنا عزیز وطن چھوڑ کر یہاں کی بود و باش اختیار کر لی ہے۔ اس تقدیر پر مجھ کو بھی چاہیے تھا کہ میں بھی اپنے عزیز وطن سے قطع تعلق کر کے دلّی کی بود و باش اختیار کر لیتا۔ لیکن میں نے آج تک ایسا نہیں کیا اور ہمیشہ دلّی کو پردیس سمجھتا رہا۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ شہر اور قلعہ کے اکثر خاندانوں کا حال جو سننے میں آتا تھا اور شہر کا مقابلہ اپنے قصبے کے خاندانوں کے چال چلن سے جاتا تھا تو شہر کی سکونت اور اہل شہر کے میل جول سے نہایت نفرت اور اپنے وطن کی حد سے زیادہ قدر معلوم ہوتی تھی اور یہ ارادہ ہوتا تھا کہ اگر اتفاقاتِ قضا و قدر سے اپنی تمام عمر دلّی میں بسر ہو جائے تو بھی اس کو اپنا وطن بنانا اور اپنے وطنِ مالوف سے تعلق قطع کرنا نہیں چاہیے۔

اگر چہ اب تک میں اپنے اس ارادہ پر قائم ہوں اور میری یہ رائے ہے کہ جو شخص غیرت اور حمیت رکھتا ہو اور جس کو اپنے ننگ و ناموس کی عفت اور پاک دامن کا خیال ہوا، اُس کو قصبہ چھوڑ کر شہر میں کبھی بود و باش اختیار کرنی نہیں چاہیے۔ لیکن افسوس ہے کہ کچھ مدت سے قصبات کی حالت بھی نازک ہوتی جا رہی ہے اور آئندہ آثار اچھے نظر نہیں آتے۔

ہر چند کوئی قصبہ اور کوئی گاؤں اور کوئی شہر زمانے کی زبردست تاثیروں سے کسی طرح بچ نہیں سکتا، لیکن جب تک مسلمانوں میں اسلام باقی ہے اور شریعت کی قید سے آزاد نہیں ہوتے اُس وقت تک ہمارے خاندانوں کی عفت اور پاک دامنی کی حفاظت کے لیے پردے کا ایک ایسا پاک اور محکم قاعدہ موجود ہے جس پر زمانے کی تاثیر کا کوئی افسوں اور کوئی منتر چل نہیں سکتا۔ روم اور مصر میں ترکوں نے تمام معاشرت کے طریقے بدل ڈالے ہیں۔ مکان اور طعام اور لباس اور سواری غرض کہ ہر چیز میں اہلِ یورپ کی پیروی اختیار کر لی ہے مگر چوں کہ شریعت کی پابندی نے پردے سے آج تک آزاد ہونے نہیں دیا، اس لیے جس قدر عفت اور پاک دامنی وہاں کے مسلمانوں میں اب تک

موجود ہے، یورپ کی کسی قوم میں خواہ انگریز ہوں، خواہ روسی، خواہ فرانسیسی، خواہ جرمن اس کا دسواں حصہ بھی نہیں پایا جاتا۔

پس اے میرے بزرگو اور عزیزو! پردے کے محکم اور مضبوط قاعدے کو ہاتھ سے نہ چھوڑو کہ اس اخیر زمانے میں صرف یہی ایک چیز باقی رہ گئی ہے جس کی بدولت ہم تمام دُنیا کی قوموں پر فخر کر سکتے ہیں اور صرف یہی ایک چیز ایسی ہے جس سے قوم میں غیرت اور حمیت باقی رہ سکتی ہے۔ وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ۔

تحریک سودیشی کے متعلق تین سوالوں کے جواب

(از رسالہ ''زمانہ'' کان پور، جلد:۶، نمبر:۴، بابت اپریل ۱۹۰۶ء، صفحہ:۲۱۴)

(اوائل ۱۹۰۶ء میں جناب دیانرائن نگم بی اے اڈیٹر رسالہ ''زمانہ'' کان پور نے تمام مسلم مشاہیر ہند سے تحریکِ سودیشی کے متعلق تین سوال پوچھے تھے اور اُن کے جوابات کو رسالہ ''زمانہ'' میں شائع کیا تھا وہ تینوں سوال مندرجہ ذیل تھے:-

۱۔ سودیشی تحریک بذاتِ خود ملک کی ترقی کے لیے کہاں تک مفید ہے۔ اور اس تحریک کے نشیب وفراز اور نفع ونقصان اور عمل درآمد کے متعلق آپ کی مفصل رائے کیا ہے۔

۲۔ اس تحریک میں ہندو مسلمانوں کے اتفاق کی کہاں تک ضرورت ہے۔ خاص مسلمانوں کے لیے اس سے کوئی نفع یا نقصان پہنچنے کی کہاں تک امید ہے؟

۳۔ اس تحریک کی کامیابی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ اور اس کی کامیابی کا ہندو مسلمانوں پر جداگانہ اور ملک پر بہ حیثیت مجموعی کیا اثر ہوگا؟

منجملہ دیگر مشاہیر کے مولانا حالؔی کی خدمت میں بھی یہ سوالات نگم صاحب نے لکھ کر بھیجے تھے۔ مولانا نے اُن کے جو صائب اور معقول جواب دئے وہ ذیل میں درج ہیں۔)

پہلے سوال کا جواب:- جس قدر تحریکیں اب تک ہندوستان کی بھلائی کے لیے دیسیوں کی طرف سے ہوئی ہیں، میرے نزدیک اُن میں سے کوئی ایسی تحریک جس سے ملک کو حقیقی

فائدہ پہنچنے کی امید ہو، سودیشی تحریک سے بہتر نہیں ہوئی۔ لیکن اس تحریک کو تقسیمِ بنگال کے معاملے سے متعلق کرنا گویا اس بات کا اعتراف کرنا ہے کہ اگر یہ تجویز منسوخ ہو جائے تو ہم اس تحریک سے دست بردار ہو جائے گے۔ میں نے سنا ہے کہ گزشتہ کانگریس کے اجلاس میں ایک ریزولیوشن اس مضمون کا پیش ہوا تھا کہ سودیشی تحریک کو تقسیمِ بنگال کے مسئلہ سے کچھ تعلق نہ ہونا چاہیے، لیکن بنگالیوں نے اس کی سخت مخالفت کی اور اس کو ہرگز پاس نہ ہونے دیا۔ جب اس تحریک کے اصل محرکوں کو یہ خیالات ہیں اور جب کہ اس کی بنیاد محض بنگالیوں کی خودغرضی (نہ کہ تمام ہندوستان کی بھلائی) پر ہے تو ایسی تحریک سے کیا بھلائی کی اُمید ہو سکتی ہے؟ خود اکثر انگریز جو منصف مزاج، راست باز اور نوع انسان کے ہمدرد ہیں۔ اس تحریک کو پسند کرتے ہیں۔ خود مجھ سے ایک معزز انگریز نے کہا کہ ''یہ تحریک ہندوستان کے حق میں نہایت مفید ہوگی۔ بشرطیکہ ہندوستان استقلال کے ساتھ اس باب میں اپنی کوشش جاری رکھیں۔'' مگر میں کہتا ہوں کہ جس طریقے سے یہ تحریک شروع کی گئی ہے۔ اس میں خود بے استقلالی کا تخم ہے۔

دوسرا سوال کا جواب:- ہندو مسلمانوں کے اتفاق کی ضرورت سودیشی تحریک میں بلکہ ہر کام میں جو ہندوستان کی عام بھلائی سے تعلق رکھتا ہو۔ اشد ضرورت ہے اور جہاں تک میں سمجھ سکتا ہوں سودیشی تحریک جیسی ہندوؤں کے حق میں مفید ہے ایسی ہی مسلمانوں کے حق میں مفید ہے مگر مجھے اُمید نہیں ہے کہ جب تک بنگال سودیشی تحریک کو تقسیمِ بنگال کی منسوخی پر معلق رکھیں گے اور ملک کی عام ہمدردی کے خیال کو اس خودغرضی کے میل کچیل سے پاک نہ کریں گے۔ تب تک مسلمان اُن کے شریک نہ ہوں گے۔ ممکن ہے کہ تقسیمِ بنگال کی مخالفت کو پبلک کا جوش قائم رکھنے کا ایک آلہ سمجھا گیا ہو مگر میرے نزدیک سودیشی تحریک کا خیال اب اس بات کا محتاج نہیں رہا کہ اس کے قائم رکھنے کے لیے تقسیمِ بنگال کی مخالفت کا جوش برقرار رکھا جائے۔ تقسیمِ بنگال کے موقوف ہو جانے سے اگر کوئی فائدہ ہندو مسلمان یا خاص کر اہل بنگال کے حق میں متصود ہے تو اُس کے سمجھنے والے بنگال میں بھی خال خال اشخاص ہوں گے۔ لیکن سودیشی تحریک کے عمدہ نتائج سے ہندوستان کے خاص و عام واقف

ہو گئے ہیں یا ہوتے جاتے ہیں۔ پس اس کے قائم رکھنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ عملی تدابیر سے اس کو ترقی دی جائے اور اس کو کسی ایسی شرط سے مشروط نہ کیا جائے کہ جب وہ فوت ہو جائے تو مشروط بھی فوت ہو جائے۔

تیسرے سوال کا جواب:- اس تحریک کا اثر ملک پر ضرور ہوگا اور رفتہ رفتہ کم و بیش ہوتا جاتا ہے۔ لوگوں کو اس سرنگ کا راستہ معلوم ہو گیا ہے جس راستے سے ملک کی دولت غیر ملکوں میں کھنچی چلی جاتی ہے۔ مگر اس راستے کا بند کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے اور اس کے لیے جلدی کرنا نیچر سے مقابلہ کرنا ہے ع

ایک دن کا کام کچھ روما کی آبادی نہیں

اگر ایک صدی میں بھی ہندوستان غیر ملکوں کی مصنوعات کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائے تو سمجھو اُس کی بہت جلد کامیابی ہوئی۔

❑❑❑

تقاریر

''ہمدردی'' پر ایک لکچر

(مولانا کا یہ لکچر ''دہلی سوسائٹی'' کے عظیم الشان جلسہ واقع ۲۱/اپریل ۱۸۷۶ء میں ہوا تھا۔ اور ''انجمن مفید عام قصور'' کی طرف سے جو ماہوار رسالہ شائع ہوتا تھا اُس کے ماہ اپریل ۱۸۷۶ء کے پرچے میں چھپا تھا۔)

یہ جلسۂ مبارک جس میں مختلف قوموں کے ممتاز اور جلیل القدر آدمی جمع ہیں اور ظاہرا اُن کا تشریف لانا کسی ذاتی غرض کے لیے نہیں معلوم ہوتا، انسان کی اُس خصلت کا ایک عمدہ نمونہ ہے جس پر مجھ کو اس وقت بحث کرنی منظور ہے، اور جو آج کل ہمدردی کے نام سے مشہور ہے۔ ہمدردی کا لفظ ہم اور درد دو فارسی کلموں سے مرکب ہے۔ درد کے معنی دُکھ اور تکلیف کے ہیں اور ہم کا لفظ اشتراک کے معنی دیتا ہے۔ پس ہمدردی کے لفظ سے دو یا کئی شخصوں کا دُکھ اور تکلیف میں شریک ہونا ظاہر ہوتا ہے، خواہ ارادہ سے ہو، خواہ بے ارادہ، مگر آج کل کے استعمال میں ہمدردی سے وہ شرکت مراد لی جاتی ہے جو ارادہ سے کی جائے مثلاً ایک شخص بیمار ہے اور دوسرا رحم یا محبت سے اُس کی دوا دارو کرتا ہے، تو دوسرے کو پہلے کا ہمدرد کہیں گے۔

ہمدردی پر جس قسم کی بحث فلاسفی میں کی گئی ہے اُس کا ذکر کرنا شاید اس موقع پر مناسب نہ ہوگا۔ پس میں اُس کی ماہیت بیان کرنے کی نسبت زیادہ تر اُس کے نتائج سے بحث کروں گا۔

اگر یہ بات سچ ہے کہ تمام انسان اصل میں ایک ہی درخت کی مختلف شاخیں اور

ایک ہی دریا کے مختلف شعبے ہیں تو ضرور ماننا پڑے گا کہ تمام انسان ایک دوسرے کی ہمدردی کے ذمہ دار ہیں، اور ہر شخص مصیبت کی حالت میں اپنے ہم جنسوں سے مدد لینے کا استحقاق رکھتا ہے۔ کون ہے جو اِس بات سے انکار کرے گا کہ بھائی کو بھائی سے ایک تعلق ہے جو ایک کو دوسرے کی ہمدردی پر مجبور کرتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اُن بھائیوں کی اولاد میں اُس ہمدردی کا کوئی حصہ باقی نہ رہے۔ بے شک جب تک کہ باپ کے خون کا قطرہ اولاد کی رگ و پے میں باقی ہے ہمدردی کا رشتہ کبھی منقطع نہیں ہوسکتا۔ ہمدردی اور حیوانات میں بھی پائی جاتی ہے۔ بچوں کو ایک مدت تک پرورش کرنا، اُن کے لیے غذا بہم پہنچانی، تا بہ مقدور ان کو دشمن کے حملہ سے بچانا سب جانوروں کی عام خصلت ہے۔ اس کے سوا عام ہمدردی بھی اُن میں دیکھی گئی ہے۔ جنگلی بطخوں کا غول جب کسی کھیت میں اُترتا ہے اور وہاں کسی طرح کا کھٹکا نہیں پاتا تو سب کے سب ایک صف باندھ کر دانہ چُگتے ہیں۔ مگر اُن میں سے ایک ایک بطخ نوبت بہ نوبت اپنے ہم جنسوں کی چوکسی کرتی ہے اور جب تک پہرا دیتی رہتی ہے ایک دانہ نہیں کھاتی۔ چیونٹا جب کہیں اناج کا ذخیرہ پاتا ہے تو کبھی تن پروری نہیں کرتا بلکہ اُسی وقت اپنے ہم جنسوں کو خبر کر دیتا ہے اور تھوڑی سی دیر میں لاکھوں چیونٹوں کو وہاں جمع دیتا ہے۔ اسی طرح اور مثالیں بھی پائی جاتی ہیں۔ اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں ایک یہ کہ ہمدردی انسان کی طبیعت میں بھی ضرور رکھی گئی ہے۔ کیوں کہ جو خوبیاں قدرت نے اور حیوانات کو عنایت کی ہیں انسان اُن کا زیادہ تر مستحق ہے۔ دوسرے یہ کہ ہمدردی ایک قدرتی خاصیت ہے جو بغیر تعلیم اور اکتساب کے انسان کی طبیعت میں خود بخود جوش مارتی ہے۔ کیوں کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو اور حیوانات میں جو عقلی تعلیم سے بالکل محروم ہیں اس کا وجود ہرگز نہ پایا جاتا۔

ہمدردی انسان میں اس لیے پیدا کی گئی ہے کہ کارخانۂ دُنیا کا انتظام برہم نہ ہونے پائے۔ کیوں کہ انسان اپنی ضروریات میں ایک دوسرے کے محتاج ہیں، ایک کی گاڑی دوسرے کی مدد کی بغیر نہیں چل سکتی۔ سب سے زیادہ حقیر حلال خور کی قوم سمجھی گئی ہے مگر وہ بھی ایسی ضروری جماعت ہے جس کے بغیر دُنیا کا کام نہیں چل سکتا۔ پس اگر انسانوں میں

ہمدردی نہ ہوتو یہ تمام کارخانہ درہم برہم ہوجائے۔

شاید یہاں یہ شبہ پیدا ہو کہ دُنیا میں جو کام اپنی ذاتی اغراض کے لیے کیے جاتے ہیں وہ ہمدردی میں کیوں کر داخل ہوسکتے ہیں۔مثلاً کسان زمین کے بونے جوتنے میں جو کوشش کرتا ہے اور بیوپاری جو مال بھر کر سیکڑوں کوس لے جاتا ہے اُس سے اگر چہ اوروں کو بھی فائدہ پہنچتا ہے مگر اُن کا اصل مقصود اپنا ذاتی فائدہ ہے پس اس کو ہمدردی کیوں کر کر سکتے ہیں۔اس کا جواب یہ ہے کہ جو خصلتیں انسان کو قدرت نے تعلیم کی ہیں وہ کبھی اُس کے فائدہ سے خالی نہیں ہوتیں۔ پس ہمدردی جو کہ آدمی کی قدرتی خاصیت ہے اُس کے فائدے سے خالی نہیں ہوسکتی۔ جو شخص کسی اپنے ہم جنسوں کو نفع پہنچاتا ہے وہ حقیقت میں اپنی آسائش کے کسی وسیلہ کو تر وتازہ کرتا ہے اور ایک یا چند واسطوں سے اپنی ذات کو فائدہ پہنچاتا ہے۔قدیم زمانہ میں ستھیاوالے جو کہ دریائے ڈینیوب اور ٹائبر کے درمیان بستے تھے جب اُن کے بڑے بوڑھے اپنے بال بچوں کو باہم ہنستے بولتے ،ایک دوسرے کے رنج وراحت میں شریک پاتے تھے تو یہ کہا کرتے تھے کہ نہایت عمدہ ترکہ جو ہم اپنی اولاد کے لیے چھوڑ جائیں گے وہ یہی ہمدردی ہے جس کے آثار ہماری اولاد میں پائے جاتے ہیں۔

ہمارے ہم وطن بھی ہمدردی کی اصل سے بے خبر نہیں ہیں۔کوئیں بنوانے، پیاؤ بٹھانی، سبیل لگانی، محتاجوں کی خبر لینی، بیواؤں کی مدد کرنی، بیاہ شادیوں میں شریک ہوکر ایک دوسرے کا کام بٹوانا، بیمار کی عیادت، میت کی تعزیت اور اسی طرح اور بہت سی باتیں ہمارے ملک میں بھی پائی جاتی ہیں۔بعض اوقات یہ قدرتی خصلت جس کا نام ہمدردی ہے مشق اور تعلیم سے تمام قوم میں پھیل جاتی ہے اور اس کا اثر کسی قدر تیز ہوجاتا ہے۔چناں چہ لائی کرگس اور سولن جو یونان کے دو بڑے مقنن گزرے ہیں، انھوں نے اسپارٹا اور ایتھنز والوں کی ترقی کے لیے جہاں اور بہت سی تجویزیں کی تھیں۔اُنھیں میں سے ایک تجویز یہ بھی تھی کہ لوگوں کو طرح طرح سے ہمدردی کی ترغیب دی جائے۔چناں چہ اسی خیال سے لائی کرگس نے اوّل اسپارٹا میں تمام اراضی برابر حصوں پر تقسیم کردی تاکہ رعایا میں دولت و افلاس کا فرق باقی نہ رہے اور ایسی صورت ہو جائے کہ جیسے ایک ماں جائے بھائی اپنے

مورث کے ترکہ میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ پھر یہ قاعدہ جاری کیا گیا کہ لوگ گھروں میں کھانا چھوڑ دیں بلکہ سب آپس میں مل جُل کر کھانا کھایا کریں اور ہر شخص یہ خیال رکھے کہ ساتھیوں میں سے کوئی بھوکا تو نہیں رہا۔

سولن نے ایتھنز میں یہ قاعدہ جاری کیا تھا کہ جب کوئی شخص کسی کو تکلیف پہنچائے تو دیکھنے والا مغلوب کی مدد کرے اور غالب کو سزا دلوا دے تاکہ لوگوں کو ایک دوسرے کے رنج وراحت میں شریک ہونے کی عادت پڑے اور ساری رعیّت ایک خاندان کے آدمی ہوں۔ اس کے سوا یہ بھی حکم تھا کہ جو لوگ رفاہِ ملک کے جلسوں میں شریک نہ ہوں اور اس بات کے منتظر رہیں کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے وہ جلاوطن کیے جائیں اور اُن کی جائداد ضبط کی جائے۔ ان تجویزوں سے لوگوں کے دلوں میں ہمدردی کا جوش بہت ہو گیا تھا اور ہر شخص یہ جانتا تھا کہ ہم سب ایک دوسرے کے رنج وراحت میں شریک ہیں۔

ہم کو بھی ہماری گورنمنٹ طرح طرح سے ہمدردی کی تعلیم دے رہی ہے۔ قومی ہمدردی کا بڑا سرچشمہ سررشتہ تعلیم ہے کیوں کہ اس کے سبب سے بے شمار لڑکوں کو ایک معقول مدت تک باہم میل جول رکھنا پڑتا ہے اور رفتہ رفتہ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت کا بیج بویا جاتا ہے۔ پس ضرور ہے کہ جب وہ مدرسہ چھوڑ کر ملک میں متفرق ہوں، ان کا تعلق اور رابطہ ہمیشہ برقرار رہے۔ اس کے سوا گورنمنٹ کا یہ اصول کہ جو چندہ علوم یا فنون کی تعلیم کے لیے رعایا کی طرف سے فراہم ہو اُسی کی برابر گورنمنٹ کی جانب سے امداد کی جائے، ہم کو زبردستی اس بات کی طرف کھینچتا ہے کہ تھوڑے بہت ہاتھ پاؤں ہلا کر گرانٹ اِن ایڈ کا استحقاق حاصل کریں اور اپنے ملک میں علم کی روشنی پھیلائیں۔

میونسپل کمیٹیاں جو سرکار نے جابجا شہروں اور قصبوں میں قائم کی ہیں، اگر پورا پورا اپنا فرض ادا کریں اور جس غرض کے لیے مقرر ہوئی ہیں۔ اُسی کو مدنظر رکھیں تو یہ بھی ہمدردی کے اچھے نمونے ہیں۔

علمی یا قومی سوسائٹیاں جن کی بنیاد صرف انگلش گورنمنٹ کے پرتو سے ہندوستان میں پڑی ہیں، اگر اُن میں کچھ جان ہو اور فقط دھوکے کی ٹٹیاں نہ ہوں تو وہ سرجیون چشمے ہیں

جن سے تمام ملک سیراب ہوسکتا ہے۔

زمانہ بھی طرح طرح سے ہم کو ہمدردی کی طرف مائل کررہا ہے۔ ایک اعلیٰ درجہ کی شائستہ قوم جو ہماری خوش قسمتی سے ہم پر حکمراں ہے، اُس کا چال چلن، اُس کے اخلاق، اُس کا طریقِ معاشرت، اُس کے علوم وفنون، اُس کی دانش مندی، اُس کی تہذیب، اُس کے نئے نئے ایجادات، جو ہر وقت ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں، جب ان باتوں کو اپنے ملک کی موجودہ صورت کے ساتھ مقابلہ کریں تو ضرور ہے کہ ہم کو اپنی اور اپنے ہم وطنوں کی نہایت وحشیانہ حالت پر افسوس آئے اور ہمدردی کا جوش ہمارے دلوں میں موجزن ہو۔

مذہب بھی ہم کو بہت زور سے ہمدردی کی طرف کھینچتا ہے۔ ہندو، مسلمان اگر اپنی مذہبی کتابیں دیکھیں گے تو اُن کو ہمدردی کی ترغیب سے مالا مال پائیں گے۔

یہ تمام تقریر جواب تک کی گئی ہے اس سے تین باتیں ثابت ہوئیں۔ ایک یہ کہ قادرِ مطلق نے اپنے ہم جنسوں کی ہمدردی انسان کی سرشت میں پیدا کی ہے۔ دوسرے یہ کہ ہمدردی کا عمل درآمد قدیم سے کسی نہ کسی قدر ہمارے ملک میں پایا جاتا ہے۔ تیسرے یہ کہ بہت سے اسباب ہمارے دائیں بائیں ایسے موجود ہیں جو ہر وقت ہم کو ہمدردی کی ترغیب دلاتے ہیں، پس ہمارے ہم وطنوں میں اعلیٰ درجہ کی ہمدردی پائی جانی چاہیے۔ لیکن اگر انصاف سے دیکھئے تو وہ بے سمجھ چیونٹا جو اپنی فتوحات سے ساری قوم کی پرورش کرتا ہے اور وہ نادان بطخ جو اپنے ساتھیوں کی نگہبانی میں گھڑیوں ایک ٹانگ سے کھڑی رہتی ہے ہم سے بہت زیادہ اس فخر کی مستحق ہے۔ ہمارے ملک میں تین قسم کے آدمی ہیں۔ ایک دولت مند، دوسرے تعلیم یافتہ، تیسرے وہ جو نہ دولت مند ہیں نہ تعلیم یافتہ۔ پچھلے گروہ سے ملک کو کوئی عام فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ مگر پہلے دونوں گروہوں کو ملک کی ترقی اور بہبودی میں اُسی قدر دخل ہے جیسے گورنمنٹ کو۔ بہت سے فائدے ایسے ہیں جو ملک کو بغیر اُن کی کوشش کے ہرگز نہیں پہنچ سکتے۔ مگر ہمارے وطن کے یہ دونوں معزز گروہ آج تک ملک کے حقوق سے کچھ بھی سبکدوش نہیں ہوئے۔ دولت مندوں میں اکثر بے پروائی سے اور بعضے اس خیال

سے کہ ہماری کوشش سے تمام ملک کی حالت کیوں کر بدل سکتی ہے۔ ہم وطنوں کی بھلائی کا خیال نہیں کرتے۔ اور جو لوگ بے پروائی سے اِدھر متوجہ نہیں ہوتے اُن سے ہم یہ پوچھتے ہیں کہ اگر ان کو اپنے ہم وطن بھائیوں کی پروا نہیں ہے تو اس بات کی بھی پروا نہیں ہے کہ اُن کی دولت کی ترقی ہو، اُن کی عزت گورنمنٹ میں زیادہ ہو، اُن کی اولاد علم اور لیاقت حاصل کرے، اُن کے خاندان کی عزت و آبرو ہمیشہ بنی رہے۔ اگر اُن کو یہ تمام خواہشیں ہیں تو میں سچ کہتا ہوں کہ بغیر قومی ترقی کے وہ ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے۔ جب تک تمام قوم کسی نہ کسی قدر عزت کا استحقاق حاصل نہیں کرتی۔ اُس قوم کے چند آدمی اصلی عزت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ جب تک تمام قوم میں علم کی روشنی نہیں پھیلتی علم کا سلسلہ کسی خاندان میں قائم نہیں رہ سکتا۔ جب تک تمام قوم کے اخلاق درست نہیں ہوتے کوئی شخص خاندان کے اخلاق کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ جب تک تمام قوم مرفہ الحال نہیں ہوتی کوئی شخص دولت و حشمت سے اصلی خوشی حاصل نہیں کر سکتا۔

قوم ایک درخت کی مثال رکھتی ہے جس کی ٹہنیاں اُس کے مختلف خاندان ہیں اور اُس کے پتّے ہر ایک خاندان کے مرد و عورت۔ جب تک درخت کی جڑ ہری ہے اُس کی ٹہنیاں اور پتّے بھی ہرے ہیں لیکن جب جڑ کو پانی نہ پہنچے گا ٹہنیاں اور پتّے سب سوکھ جائیں گے اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری کوشش سے تمام ملک کی حالت کیوں کر بدل سکتی ہے۔ ان کی خدمت میں یہ عرض کیا جاتا ہے کہ صرف دو خیال ہیں جنھوں نے دُنیا کے تنزل اور ترقی پر بہت کچھ اثر کیا۔ ایک یہ کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ دوسرے یہ کہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ پہلے خیال کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ نہ ہوا اور دوسرے خیال نے دُنیا میں بڑے بڑے عجائبات ظاہر کیے۔ کیمبرج یونی ورسٹی جس کی آج تمام دُنیا میں دھوم ہے۔ اُس کی بنیاد صرف اس طرح پڑی تھی کہ قصبہ کیمبرج میں جو کہ لندن سے قریب ساٹھ میل کے واقع ہے ایک باہمت پادری نے اپنے ہم وطنوں کی تعلیم کے لیے ایک چھوٹا سا مدرسہ قائم کیا تھا اور کسی قدر اپنی جائداد اُس کے خرچ میں لگا دی تھی۔ رفتہ رفتہ اُس میں ترقی ہوتی رہی، یہاں تک کہ اُس کی بدولت تمام برطانیہ میں علم کی روشنی پھیل گئی۔ اب وہاں بہت

بڑے بڑے سولہ کالج ہیں جن میں تقریباً تین ہزار آدمی، ہزار ہزار روپیہ ماہوار تک کے نوکر ہیں۔ اگر وہ جواں مرد پادری جس نے اس بڑے دارالعلم کی بنیاد ڈالی تھی یہ خیال کرتا کہ میری کوشش سے کیا ہوسکتا ہے تو کیمبرج جو آج تمام دُنیا میں مشہور ہے اُس کا کوئی نام بھی نہ جانتا اور لاکھوں آدمی جو اُس کی بدولت امیر کبیر ہوئے اور یا حکیم اور فلاسفر کہلائے اُن کا کوئی ذکر بھی نہ کرتا۔ اسی طرح بے شمار مثالیں ایسی پائی جاتی ہیں کہ ایک ایک آدمی کی کوشش سے ملک کے ملک سرسبز وشاداب ہوگئے ہیں۔ تعلیم یافتہ لوگ جو درحقیقت قومی ترقی کے ضروری آلات ہیں اور جن کی توجہ سے ہمارے عقدے بہت آسانی سے حل ہوسکتے ہیں اُنھوں نے بھی آج تک ملک کو کچھ ممنونِ احسان نہیں کیا۔ سُستی اور بے پروائی جو اس ملک کا خاصّہ ہے۔ اُن میں بھی ویسی ہی پائی جاتی ہے جیسے اُن کے عام ہم وطنوں میں۔ وہ اپنے نامہذب ہم وطنوں میں عیب نکالتے ہیں مگر اُن کے عیب دور کرنے میں کوشش نہیں کرتے۔ وہ اُن کو ہاف سولا یزڈ کہہ کر جتنا تعجب کرتے ہیں اتنا افسوس نہیں کرتے۔ اس قابلِ ادب جماعت میں بھی کئی قسم کے آدمی ہیں۔ ایک وہ جو تعلیم کو فقط نوکری کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور جب ان کو لیاقت کی سند حاصل ہو جاتی ہے، پھر علم اور کتاب سے کچھ سروکار نہیں رکھتے۔ ان لوگوں سے ہم وہ اُمید نہیں رکھ سکتے جو کہ ایک تعلیم یافتہ گروہ سے رکھنی چاہیے۔ کیوں کہ ان پر تعلیم کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ دوسرے وہ لوگ جنھوں نے واقعی علم کو علم ہی سمجھ کر سیکھا ہے، مگر وہ اپنے ذوق وشوق میں ایسے غرق ہوئے کہ انھوں نے صحت اور طاقت کا کچھ لحاظ نہ کیا اور اپنی حد سے بہت آگے بڑھ گئے۔ نتیجہ اُس کا یہ ہوا کہ دل و دماغ نے ان کو جواب دے دیا اور ان کو بہ مجبوری مطالعہ کتاب سے ہاتھ اُٹھانا پڑا۔ اُن سے بھی ہمارا کچھ کام نہیں چل سکتا، کیوں کہ وہ خود اپنے کام میں درماندہ ہیں۔ تیسرے وہ جنھوں نے علم کو علم بھی سمجھا اور اپنے قویٰ کو بھی محفوظ رکھا اور مدرسہ چھوڑنے کے بعد بھی کتاب کو ہاتھ سے نہیں ڈالا۔ یہ لوگ البتہ بہت کچھ کر سکتے ہیں مگر افسوس ہے کہ یہ بھی کچھ نہیں کرتے۔ جن باتوں کی آج ہندوستان میں ضرورت ہے اُن کے سامان انگریزی زبان میں ہماری ضرورت سے بہت زیادہ موجود ہیں۔ اور سردست ہم کو اس

بات کی حاجت نہیں معلوم ہوتی کہ ہمارے ملک میں بھی بیکن اور نیوٹن جیسے عالی دماغ پیدا ہوں۔ بلکہ اب صرف ان کی تحقیقات کو اپنی زبان میں لانا ہے، گویا خرمن بالکل تیار ہے اور اس کی تیاری میں جو مشکلیں پیش آنی تھیں وہ آ چکیں۔ خرمن کے مالکوں نے اُس کو سب لوگوں پر وقف کر دیا۔ اب جن کے پاس بار برداری کا سامان موجود ہے وہ اس کو بھریں اور قحط زدہ ملک میں پہنچائیں پس اگر ہمارے لائق و فائق ہم وطن کچھ بھی توجہ کریں تو اپنے ملک کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔

ہندوستانیوں سے عموماً دو قومیں مراد لی جاتی ہیں۔ ایک ہندو دوسرے مسلمان۔ یہ دونوں اپنے اپنے وقت شائستگی کے اعلیٰ درجہ کو پہنچ چکے ہیں۔ ہندوؤں کی شائستگی اُس وقت میں مانی گئی ہے جب کہ تمام دُنیا میں تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ہومؔر شاعر نے اُس زمانہ کے یونانیوں کا حال مفصل لکھا ہے، جب کہ منو کا مجموعہ تالیف ہوا۔ اُس زمانے میں جو حال ہندوستان اور یونان کا تھا اُس کے مقابلے سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندو اگرچہ ہمت اور دلاوری میں یونانیوں کے برابر نہ تھے مگر عام تہذیب اور شائستگی اور قوانین کی عمدگی اور انتظام کی خوش اسلوبی اور علم و ہنر کی ترقی میں یونانیوں سے بہت بڑھ کر تھے۔ مسلمانوں کی ترقی کے زمانے کو کچھ بہت عرصہ نہیں گذرا۔ یورپ کے اکثر مورخوں نے جو مسلمانوں کی ترقیات کا حال لکھا ہے۔ وہ ہماری موجودہ حالت سے اس قدر زیادہ ہے کہ اس زمانہ میں اس پر مشکل سے یقین آتا ہے اور ہم کو شرم آتی ہے کہ اس پستی اور تنزل کی حالت میں اپنے بڑوں کی ترقیات فخریہ بیان کریں۔ لیکن اس قدر کہنا شاید بے جا نہ ہوگا کہ زمانۂ متوسط میں صرف مسلمانوں ہی کی قوم ایسی تھی جو شائستگی اور روشن ضمیری اور اولوالعزمی میں دُنیا کی تمام قوموں سے افضل تھی۔ فرانس کا ایک نامی مورخ لکھتا ہے کہ ''خدا تعالیٰ نے عرب کی قوموں کو اس لیے پیدا کیا تھا کہ وہ علوم و فنون اور تہذیب و شائستگی کو ان مختلف قوموں تک پہنچائیں جو فرات کے کنارے سے لے کر ہسپانیہ کی وادئ کبیر تک پھیل رہی ہیں۔'' ہندو اور مسلمانوں کا یہ حال جو میں نے عرض کیا اس سے کچھ اپنی بڑائی ظاہر کرنی مقصود نہیں ہے بلکہ اپنے ہم وطنوں کو غیرت دلانی اور یہ جتانا منظور ہے کہ جن لوگوں کی وہ اولاد کہلاتے ہیں

وہ اپنے زمانے میں سب سے آگے تھے اور یہ سب سے پیچھے ہیں۔حالاں کہ جو امن و آزادی انگلش گورنمنٹ کی بدولت ان کو میسر ہے وہ ان کے بزرگوں کو کبھی میسر نہیں ہوئی۔ پس اگر اب بھی اُن سے کچھ نہ ہوا تو پھر کبھی کچھ نہ ہو سکے گا۔اس بات کا انکار نہیں ہو سکتا کہ ہمارے ملک میں کہیں کہیں وطن دوست آدمی کھڑے ہوئے ہیں اور اُنھوں نے عام ہمدردی کا حق پورا پورا ادا کیا ہے۔اُن کی کوششوں سے چندے جمع ہوئے ہیں اور قومی ترقی کے لیے مجلسیں قائم ہوئی ہیں، اُن کی سعی بھی کسی قدر بارور ہوئی ہے اور کچھ لوگ اُن کی بدولت خوابِ غفلت سے بیدار ہوئے ہیں۔مگر جب ہم اپنی اندرونی اور بیرونی خرابیوں کا اندازہ کرتے ہیں تو یہ تمام کوششیں اُن کے سامنے ایسی بے حقیقت معلوم ہوتی ہیں جیسے اندھیری رات کی تاریکی کے آگے جگنو کی چمک ہمارے اخلاق، ہمارا طریقِ معاشرت، ہمارے علوم و فنون، ہماری تجارت، ہماری دست کاری غرض ہمارے سب کام ایسی پستی کی حالت میں ہیں کہ اُن کے ابھارنے کے لیے نہایت زبردست طاقتیں درکار ہیں۔

جو باتیں ہماری ترقی کی مانع ہیں اُن پر میں نے کبھی کبھی غور کیا ہے اور میرا ارادہ ہے کہ کسی روز سب صاحبوں کے سامنے اُن کو مفصل بیان کروں۔مگر ایک امر جس کو میں مانع قومی سمجھتا ہوں، یہاں مختصر طور پر عرض کرتا ہوں۔اب تک جو تدبیریں ہماری ترقی کے لیے کی گئیں اور کی جاتی ہیں اگر چہ اُن کے ضروری ہونے میں کچھ کلام نہیں ہے اور وہ بے شک اس قابل ہیں کہ جب موقع ملے کوشش کی جائے، لیکن انگریزی رائیں غلط نہیں تو اکثر اُن میں سے ایسی ہیں جو بالفعل عام رایوں اور عام خواہشوں کے برخلاف معلوم ہوتی ہیں اور اسی سبب سے جن لوگوں کی بہبودی کے لیے وہ کی جاتی ہیں اکثر وہی اُن میں رخنہ انداز ہوتے اور تقریباً تمام قوم اُن میں مدد دینے سے انکار کرتی ہے۔ پس میرے نزدیک جو تدبیریں عام بہبودی کے لیے کی جائیں وہ تا بہ مقدور ضرور ایسی ہونی چاہئیں جن کے نتائج اور فوائد عام لوگوں کی سمجھ میں بآسانی آجائیں۔مثلاً بالفعل بہ نسبت اس کے کہ ایک مدرسہ فزیکل سائنس کی تعلیم کے لیے قائم کیا جائے، بہتر ہے کہ ایک تعلیم خانہ صنعت اور دست کاری کے لیے کھولا جائے۔ کیوں کہ پہلی صورت کی نسبت دوسری صورت عام خواہشوں کی

زیادہ پورا کرنے والی ہے۔ یا مثلاً پہلے اس سے کہ بیاہ شادیوں کی فضول خرچیاں بند کی جائیں بہتر ہے کہ موت اور غمی کے اخراجات موقوف کیے جائیں۔ کیوں کہ پچھلی تجویز عام رایوں کے موافق زیادہ کارگر معلوم ہوتی ہے۔اسی طرح اور بہت سے مثالیں ایسی ہیں جن کے ذکر کرنے کا یہ وقت نہیں ہے۔

ایڈریس باشندگانِ دہلی بحضور وائسرائے

(قلمی مسودہ سے نقل کیا گیا)

(یہ ایڈریس گورنمنٹ انگریزی کے افغانستان کی جنگ میں فتح پانے کے بعد ۱۸۷۹ء میں باشندگانِ دہلی کی طرف سے ہز ایکسلنسی رائٹ آنریبل اڈورڈ رابرٹ لٹن بلور لٹن بیرن لٹن آف نیب ورتھ جی. ایم. ایس. آئی گورنر جنرل ہند کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ مسودہ مولانا نے بنا کر دیا تھا۔)

اس بات کو بہت تھوڑا زمانہ گزرا ہے کہ ہم باشندگانِ دہلی وفادار رعایائے حضور ملکہ معظّمہ سلطنتِ برطانیہ عظمیٰ و قیصرِ ہند دام اقبالہا آپ کو بحیثیت نائب السلطنت ہونے کے ایک ایسے شان و شوکت اور تزک و احتشام کے ساتھ اورنگ قیصری پر جلوہ افروز دیکھ چکے ہیں جس کی نظیر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام عالم کی تاریخ میں مشکل سے مل سکتی ہے۔ ابھی وہ خوشی اور مسرت اور افتخار جو کہ ہم رعایائے دہلی کو دربارِ قیصری کے منعقد ہونے سے حاصل ہوا تھا ہمارے دل سے فراموش نہ ہونے پایا تھا کہ ہم نے حضور والا کو ایک ایسی فتحِ نمایاں کے بعد جس سے سراسر ہندوستان کی بہبودئ حال و مآل متصور ہے دیکھا۔ پس ایسے مبارک موقع پر جو بے انتہا شکرگزاری اور احسان مندی اور خیر خواہی اور خیر اندیشی کا جوش ہمارے دل میں خود بخود پیدا ہوا ہے اُس کا ظاہر کرنا بے محل نہ ہوگا۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ افغانستان کی مہم نہ خزانۂ سرکاری کی توقیر اور نہ محاصل ملکی کی افزائش کے واسطے اختیار کی گئی تھی بلکہ صرف اس لیے اختیار کی گئی تھی کہ ہندوستان کے امن وامان میں جو رخنے نظر آتے ہیں وہ مسدود کیے جائیں اور شمالی خدشوں کی روک ٹوک کے لیے ہندوستان کی سرحد کا استحکام دیا جائے۔ ہم کو

اس میں کچھ شک اور شبہ نہیں ہے کہ فوج سرکاری کو اس مہم کے اختتام تک جس قدر دقتیں اُٹھانی پڑی ہیں اور جلیل القدر افسروں کی بیش قیمت جانیں جو ایک وحشی قوم کی ناعاقبت اندیشی سے تلف ہوئی ہیں یہ سب کچھ ملک اور رعیت کی حفاظت اور نگہبانی کے لیے تھا۔ پس ہمارا ضروری اور نہایت ضروری فرض ہے کہ ہم دل سے، زبان سے اور بدن کے روئیں روئیں سے گورنمنٹ ہند کا شکریہ ادا کریں۔ اور جب اس بات کا خیال کیا جاتا ہے کہ گورنمنٹ ہند کو اپنی صائب پالیسی کے برقرار رکھنے میں کیسی کیسی سخت مزاحمتوں کا مقابلہ کرنا پڑا ہے تو یہ شکرگزاری اور احسان مندی دو چند بلکہ چہار چند ہو جاتی ہے۔

ہم کو معتبر وسیلوں سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جس وقت افغانستان سے انگریزی سفارت کی مزاحمت وقوع میں آئی اُس وقت خاص کابل میں ایسے سامان جمع تھے کہ اگر چند روز اس مہم میں اور توقف کیا جاتا تو شر و فساد کی بنیاد کسی قدر زیادہ پائدار ہو جاتی اور افواج قاہرہ کو اُس کے رفع دفع کرنے میں زیادہ کوشش کرنی پڑتی۔ لیکن گورنمنٹ ہند نے ایشیا کے اس مشہور قول پر ''کار امروز بفردا مگذار'' پورا پورا عمل کر کے ملک اور رعیت کو تاخیر و التوا کے مضر نتائج سے بالکل محفوظ کر دیا۔

افغانستان کی مہم جو کہ حضور کی دلیرانہ تدبیر سے عمل میں آئی ہے جس قدر گورنمنٹ انگلشیہ کی اولوالعزمی اور سطوت و جلالت پر گواہی دیتے ہیں اُس سے زیادہ اُس کی بُردباری، تحمل، چشم پوشی اور فراخ حوصلگی پر دلالت کرتی ہے۔ اور یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ انگلستان کی بہادر قوم نہ صرف اپنی اولوالعزمی اور شجاعت سے بلکہ زیادہ تر اپنے بے نظیر تحمل و استقلال اور بے مثل عدل و انصاف اور عجیب بُردباری اور حلم سے دُنیا کے پانچوں بّرِاعظموں پر حکمراں ہوئی ہے۔ وہ کسی پر ایک تنکا نہیں اُٹھاتی جب تک کوئی اُس پر شہ تیر نہ اٹھائے۔ وہ کسی پر ایک وار نہیں کرتی جب تک اس پر بہت سے وار نہ کیے جائیں ہم وفادار رعایائے حضور قیصر ہند آپ کو اس مبارک فتح کی بابت جو کہ آپ کی رائے صائب اور آپ کے معزز مشیروں کی اور آپ کے جلیل القدر سپہ سالاروں کی سرگرمی اور آپ کی افواج قاہرہ کی بہادری سے وقوع میں آئی اور جس کے نتائج بادشاہ اور رعیت دونوں کے حق میں بے

انتہا برکتوں سے معمور ہیں مبارک باد دیتے ہیں، اور نہایت خلوص سے اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ گورنمنٹ کے سایۂ عاطفت میں اس شہر کی تجارت اور صنعت روز بروز ترقی پکڑتی جاتی ہے۔ اور اگر چہ یہاں کی تعلیم کے وسائل کسی قدر کم ہو گئے ہیں لیکن یہاں کے عام باشندے خود اپنی تعلیم کا بوجھ اُٹھانے پر روز بروز آمادہ ہوتے جاتے ہیں۔

البتہ چند سال سے نامعلوم قدرتی اسباب ایسے پیدا ہوتے ہیں جن کی وجہ سے ہر سال موسم برسات اور موسم سرما میں یہاں بیماریوں اور اموات کا شمار حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ لیکن بالفعل میونسپل کمیٹی اس باب میں غور کر رہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو حفظان صحت کے کافی وسائل مہیا کیے جائیں۔ اُمید ہے کہ جو کام میونسپل کمیٹی کی طاقت سے باہر ہو گا وہ گورنمنٹ کی امداد اور اعانت سے سرانجام ہو جائے گا۔

تقریر جلسہ تعزیت حکیم محمود خاں

(منقول از رسالہ ''مرثیہ حکیم محمود خاں''، مطبوعہ ۱۸۹۲ء)

(حکیم محمود خاں مرحوم کے نام سے کون واقف نہیں۔ دہلی کے نہایت حاذق طبیب تھے اور سارے ہندوستان میں شہرت رکھتے تھے۔ اُن کے انتقال پر مولانا حالؔی نے نہایت پُر اثر اور پُر درد مرثیہ لکھا۔ یہ مرثیہ صرف حکیم محمود خاں کا نہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ دہلی اور سلطنت اسلامیہ کا مرثیہ ہے۔ دہلی کے رؤسا اور عمائدین اور حکیم صاحب مرحوم کے عقیدت مندوں نے پُر زور تحریک کی کہ ایک جلسۂ عام حکیم صاحب کی تعزیت میں منعقد کیا جائے اور اس میں خود مصنف محترم کی زبان سے یہ مرثیہ سنا جائے۔ لیکن اُسی زمانے میں مولانا بیمار ہو کر تبدیل آب وہوا کے لیے پہاڑ پر چلے گئے دو تین مہینے کے بعد جب سفر واپس آئے تو ۲۰/محرم ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۴/اگست ۱۸۹۲ء بروز یکشنبہ ایک جلسہ مفتی محمد صدر الدین خاں صاحب مرحوم کی کوٹھی پر منعقد کیا گیا، اور اس میں مولانا نے یہ مرثیہ پڑھا۔ جس سے اہل جلسہ بے انتہا متاثر ہوئے۔ مندرجہ ذیل تقریر وہ ہے جو مرثیہ پڑھنے سے پہلے ''مرثیہ لکھنے کی ضرورت'' پر مولانا نے فرمائی تھی۔)

مسلمانوں میں مرثیہ لکھنے کا رواج ابتدائے اسلام سے پایا جاتا ہے اور اسلام سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں بھی عزیزوں، دوستوں اور مشہور لوگوں کے مرثیے برابر لکھے جاتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جدّ بزرگوا عبدالمطلب کے بہت سے مرثیے اب

تک موجود ہیں۔ سچ یہ ہے کہ کسی شخص کی نیکی، بزرگی اور مقبولیت کا ثبوت جیسا کہ مرثیہ کے ذریعہ سے ہوسکتا ہے کسی اور ذریعہ سے نہیں ہوسکتا۔ جو تعریف کسی کے مرنے کے بعد کی جاتی ہے، اُس پر بناوٹ یا تصنع کا گمان ہرگز نہیں ہوسکتا۔ عرب کے شعرا کو جب دل سے کسی کی سچی اور بے ریا تعریف کرنی ہوتی تھی تو اس کے مرنے کے بعد مرثیہ لکھتے تھے۔ معن بن زائدہ شیبانی جو کہ خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں ایک نہایت فیاض اور شجاع سپہ سالار گزرا ہے، اُس کے بے شمار مرثیے لکھے گئے ہیں۔ ایک شاعر نے اُس کے مرثیے میں لکھ دیا تھا کہ فیاضی اُس کے ساتھ رخصت ہوگئی، اب کس سے فیاضی کی اُمید رکھیں۔ خلیفہ مہدی نے اس جرم میں اُس کو دربار سے نکلوا دیا اور امراء نے اس کو صلہ دینا موقوف کر دیا۔ مگر اس پر بھی شعرا معن کے مرثیے برابر لکھتے رہے۔ جعفر برمکی کو جب ہارون رشید نے قتل کروایا تو اُس کے مرثیے لکھنے پر بہت سے شاعروں کو موت کی سزا دی گئی، مگر پھر بھی لوگ اُس کے مرثیے لکھنے سے باز نہ آئے۔

فی الواقع کسی شخص کی شکر گزاری اور احسان مندی کے اظہار کا موقع اس سے بہتر نہیں ہوسکتا کہ اُس کے مرنے کے بعد اُس کی وفات پر افسوس کیا جائے اور اُس کا ذکرِ جمیل ملک میں پھیلایا جائے۔

اسلام میں بلکہ شاید تمام دُنیا میں کوئی واقعہ، واقعۂ کربلا سے زیادہ عالم آشوب اور درد ناک وقوع میں نہیں آیا۔ اور اسی لیے فی زماننا مسلمانوں میں مرثیہ کا اطلاق صرف جناب سید الشہدا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مرثیوں پر ہونے لگا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان مرثیوں کے سننے سے ہر مسلمان کا ایمان تازہ ہوتا ہے اور خاندانِ نبوت کی محبت جو کہ اسلام کی جڑ ہے دلوں میں موجزن ہوتی ہے اور شہدائے کربلا کے صبر و استقلال کی پیروی اور اتباع کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے، اور اسی لیے قوم کے اکثر بزرگواروں نے واقعۂ کربلا کے بیان میں اپنی عمریں تمام کر دی ہیں اور قوم کے رونے اور رُلانے کے لیے اس قدر ذخیرے چھوڑ گئے ہیں کہ اب کسی شخص کو ان مضامین کے دُہرانے کی ضرورت نہیں رہی۔ لیکن اس زمانہ میں کہ مسلمانوں کی قومی بندش ڈھیلی ہوگئی ہے اور تمام جماعتوں میں تفرقے پڑے

ہوئے ہیں، اُن میں ہمدردی کا بیج بونے اور قومیت کی روح پھونکنے کی از بس ضرورت ہے۔ جہاں اس کی اور بہت سی تدبیروں ہیں ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ قوم میں سے جب کوئی قوم کا محسن اور خدمت گزار گزر جائے تو اُس کی زندگی کے حالات قلم بند کیے جائیں، اُس کی خوبیاں اور اُس کے محاسن ملک میں شائع کیے جائیں اور شعرا جو کہ قوم کی زبان ہیں، تمام قوم کی طرف سے اُن کے مرثیے لکھیں تا کہ معلوم ہو کہ قوم اپنے محسنوں کی قدر کرتی ہے اور اُس میں ہمدردی کی رمق باقی ہے۔

اگر چہ میں اپنے تئیں اس عزت کا مستحق نہیں سمجھتا کہ مجھ کو قوم کی زبان سمجھا جائے، لیکن چوں کہ میں دیکھا کہ مرحوم حکیم محمود خاں کی وفات سے تمام ہندوستان عموماً اور دلّی میں خصوصاً ایک غیر معمولی رنج و افسوس پیدا ہوا ہے اور میرے اکثر احباب کو اس حادثہ سے سخت صدمہ پہنچا ہے، اس لیے میں نے چند بند بطور مرثیہ کے ترتیب دئے ہیں اور اس وقت میں اُن کے پڑھنے کی آپ صاحبوں سے اجازت چاہتا ہوں۔

تقریر بر موقعہ اجلاس اوّل ''ندوۃ العلماء''

(منقول از رپورٹ اجلاس سال اول ''ندوۃ العلماء'')

(ندوۃ العلماء کے پہلے اجلاس میں منعقدۂ ۱۵۔ ۱۶۔ ۱۷؍شوال ۱۳۱۱ھ مطابق ۲۲۔۲۳۔۲۴؍اپریل ۱۸۹۴ء میں جو شہر کان پور میں منعقد ہوا تھا، منجملہ دیگر تجاویز کے ایک تجویز یہ بھی پیش ہوئی تھی کہ چوں کہ قدیم طریقۂ درس موجودہ زمانے کے لیے کافی نہیں اور بہت کچھ ترمیم طلب ہے۔ لہٰذا اس میں ایسی معقول اصلاح اور ترمیم کرنی چاہیے کہ وہ زمانۂ حال کے موافق اور موجودہ ضروریات کو پورا کرنے والا ہو۔ شرکت اجلاس کی مولانا حالؔی کو بھی دعوت دی گئی اور بانیان جلسہ کی خواہش پر مولانا نے کان پور جانے اور اس بارہ میں اپنے خیالات علماء کے سامنے پیش کرنے کا ارادہ بھی کرلیا تھا۔ مگر بعض خانگی مکروہات کے باعث آپ کا جانا نہ ہوسکا۔ لیکن آپ نے مسئلہ زیر بحث کے متعلق اپنی رائے مفصل طور سے قلم بند کرکے داعیان جلسہ کو بھیج دی تھی جو جلسہ میں سنائی گئی۔)

ہم کو اس بات کے سُننے سے نہایت خوشی ہوئی کہ وسطِ ماہ شوال سنہ حال میں ایک مجلس علمائے اسلام کی بتقریب رسم دستار بندی طلبۂ مدرسہ فیضِ عام بمقام کان پور منعقد ہونے والی ہے جس میں علاوہ رسمِ دستار بندی کے مدارسِ اسلامیہ کے انتظام اور تعلیم وغیرہ پر بھی گفتگو کی جائے گی اور اس بات میں عام مسلمانوں کی رائے غور اور توجہ سے سنی جائے گی۔ چوں کہ راقم بعض خانگی ضرورتوں کی وجہ سے اُن تاریخوں میں وہاں نہیں پہنچ سکتا

ہے۔ اس لیے مدارسِ اسلامیہ کے سلسلۂ درس کے متعلق جو کچھ میرے رائے ہے اُس کو بذریعہ تحریر کے پیش کرتا ہوں۔

مدارسِ اسلامیہ جو ہندوستان کے اکثر قصبوں اور شہروں میں عالی ہمت مسلمانوں کی کوشش سے قائم ہوئے ہیں جس طرح اُن کا قائم کرنا نہایت ضروری تھا، اسی طرح یہ بھی نہایت ضرور ہے کہ اُن کو جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں کے حق میں زیادہ مفید اور اُن کی موجودہ حالت کے زیادہ مطابق بنانے کی کوشش کی جائے۔ اور سب سے مقدم اُن کے سلسلۂ کتب درسیہ کی اصلاح اور ترمیم ہے۔

اس بات کا کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ ہر ملک اور ہر زمانے میں ہمارا سلسلۂ درس یکساں نہیں رہا اور آج کل بھی مختلف ملکوں میں مختلف سلسلے مدارس اسلامیہ میں جاری ہیں، ہر ملک اور ہر زمانے کے علماء اپنے ملک اور زمانے کی حالت کے مطابق درسی کتابیں مقرر کرتے رہتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ دینیات میں صرف قرآن و حدیث کا درس ہوتا تھا۔ پھر فقہ بھی اُس میں شامل ہوگئی اور رفتہ رفتہ علم اصولِ فقہ اُس پر اضافہ کیا گیا۔ جب تک یونانی فلسفہ مسلمانوں میں شائع نہیں ہوا تھا۔ اُس وقت تک مدارسِ اسلامیہ میں معقولات کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ پھر جب یونانی فلسفہ درس میں داخل کیا گیا تو ایک مدت تک اس میں علم کلام کے شامل کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ہوئی۔ لیکن جب یونانی فلسفہ کی ممارست سے مسلمانوں کے عقائد متزلزل ہونے لگے اور اسلام میں نئے نئے فرقے پیدا ہونے لگے تو علمِ کلام مدوّن کرنے کی ضرورت ہوئی اور وہ بھی سلسلۂ درس میں شامل کیا گیا۔ علیٰ ہذا القیاس جیسی ضرورتیں پیش آتی گئیں۔ اُنھیں کے موافق سلسلۂ درس میں تغیر اور تبدل اور کمی بیشی ہوتی رہی۔

ظاہر ہے کہ پچھلے پچاس برس سے مسلمانوں کی حالت میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہوگیا ہے۔ اس کے سوا ملک کی حالت بھی بالکل بدل گئی ہے۔ مذاہب پر نہایت آزادی کے ساتھ نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ ایسی حالت میں وہ مدارس جو محض دین اسلام کی تقویت کے لیے قائم کیے گئے ہیں، اُن میں بعینہٖ وہی سلسلۂ درس قائم رکھنا جو قدیم زمانے سے چلا آتا

ہے۔اسلام کے حق میں مفید نہیں ہوسکتا۔پس ہمارے علماء کو چاہیے کہ بہ مشورہ وصلاحِ ہمد گر مدارسِ اسلامیہ کے سلسلۂ درس پر غور کر کے زمانہ کی ضرورتوں اور مصلحتوں کے موافق اس کو از سرِنو مرتّب کریں۔

نہایت خوشی کی بات ہے کہ بعض اسلامی مدارس کے مہتمموں کو جیسا کہ سنا گیا ہے کہ کتب درسیہ کے معمولی سلسلے میں کچھ ترمیم یا تبدیلی کرنے کا خیال پیدا ہوا ہے مگر میری رائے میں کوئی مفید تبدیلی یا ترمیم اُس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک کہ ہندوستان کے تمام یا اکثر مدارسِ اسلامیہ اس بات پر متفق نہ ہوجائیں کہ کتبِ درسیہ میں جو تبدیلی یا کمی بیشی کی جائے گی اُسی کے موافق تمام مدارس میں درس جاری کیا جائے گا کیوں کہ معمولی سلسلے کی کل کتابیں ہر جگہ بآسانی اور بہ کفایت مل جاتی ہیں اور اگر یہ سلسلہ بدلا گیا تو ممکن ہے کہ ایسی نئی کتابیں درس میں داخل کی جائیں جو ہندوستان میں بہم نہ پہنچیں بلکہ مصر یا بیروت وغیرہ سے منگوائی جائیں۔ یا بڑی بڑی کتابوں میں سے کچھ کچھ مفید ابواب و مضامین انتخاب کرنے پڑیں اور اُن مجموعوں کو بطور کتاب کے علیحدہ چھپوانا پڑے۔پس تا وقتیکہ تمام یا اکثر مدارسِ اسلامیہ ایک سلسلۂ درس پر اتفاق نہ کرلیں تب تک نئی کتب درسیہ کا مہیا ہونا مشکل ہے۔ کیوں کہ اہل مطابع صرف ایک دو مدرسے کے خرچ کے لیے نئی کتابیں جن کی ملک میں عام خریداری نہ ہو نہیں چھاپ سکتے اور نہ کسی مدرسہ کے مہتمم چھپوا سکتے ہیں۔

اب میں معمولی سلسلۂ درس کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کرتا ہوں۔اگر یہ بات تسلیم کرلی جائے کہ معمولی سلسلہ کتبِ درسیہ کا سراسر مناسب اور مفید ہے اور اس میں کسی قسم کی اصلاح و ترمیم کی ضرورت نہیں ہے تو بھی میرے نزدیک ضرور ہے کہ کبھی کبھی اس میں کچھ پُرانی کتابیں درس سے خارج اور اُن کی جگہ نئی کتابیں درس میں داخل ہوتی رہا کریں۔ اس سے دو فائدے متصور ہیں۔ایک یہ کہ ان متواتر تبدیلیوں سے اسلام کے بڑے بڑے نامور اور جلیل القدر مصنفوں کی کتابیں قوم میں شائع ہوتی رہیں گی اور اُن کا نام زندہ ہوتا رہے گا۔اول تو زمانے کے انقلاب سے مسلمانوں کے کتب خانے برباد ہوگئے۔ جو شہر مسلمانوں کے دارالعلم تھے اُن میں ایک بھی قدیم کتب خانہ باقی نہیں رہا اور اگر بالفرض وہ

سب کتب خانے قائم بھی رہتے یا اب ویسے ہی کتب خانے پھر قائم ہو جائیں تو بھی قدیم مصنفوں کا نام صرف کتب خانوں سے زندہ نہیں ہوتا بلکہ اُن کی تصنیفات کے درس و تدریس اور پڑھنے پڑھانے سے زندہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو علوم وفنون ہمارے سلسلۂ درس میں بالکل داخل نہ تھے اُن کی مستند کتابیں ہندوستان میں بہت کم پہنچیں۔ زیادہ تر وہی کتابیں شائع ہوئیں جو سلسلۂ درس میں شامل ہو گئی ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ہمارے علما جو مدارسِ اسلامیہ میں درس دیتے ہیں وہ معمولی کتابیں پڑھاتے پڑھاتے اُکتا جاتے ہیں اور اُن کو درس و تدریس کے مشغلے میں سلسلۂ درس کے علاوہ اور کتابیں مطالعہ کرنے کا موقع ملنا دشوار ہوتا ہے۔ اس ترمیم اور تبدیلی سے اُن کو ہمیشہ نئی نئی کتابیں دیکھنے کا موقع ملے گا اور اُن کے علم وفضل کو نہایت ترقی ہوگی۔

درسی کتابیں جیسا کہ سب اہلِ علم جانتے ہیں اس لیے ہرگز نہیں مقرر کی جاتیں کہ وہ تمام علوم وفنون پر حاوی ہوتی ہیں اور اُن کے پڑھنے کے بعد اور کسی کتاب کے مطالعہ کی ضرورت نہیں رہتی۔ بلکہ اس لیے مقرر کی جاتی ہیں کہ اُن کے پڑھ لینے سے طالب علم کو ہر علم کے ساتھ فی الجملہ مناسبت اور اُس کی طبیعت میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جائے جس کے سبب سے وہ ہر علم کی اعلیٰ سے اعلیٰ کتاب بغیر اُستاد کی اعانت کے سمجھ سکے۔

ہمارے ہاں جتنے طلبہ فارغ التحصیل ہوتے ہیں اگر تحصیل کے بعد اُن پر افکار دنیوی غالب نہ آئے اور اُن کو کتب بینی کا شوق باقی رہا تو اکثر یہی دیکھا جاتا ہے کہ وہ طلبہ کی تعلیم اور تدریس میں مشغول ہو جاتے ہیں اور اسی کو علمی ترقی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اگر ان کو درسی کتابوں کے علاوہ کسی نئی کتاب کے دیکھنے کا شوق بھی ہوتا ہے تو درس و تدریس کے مشاغل میں ان کو اتنی فرصت نہیں ملتی کہ کسی نئی کتاب کا مطالعہ کر سکیں۔ پس سوا اس کے کہ درسی کتابیں ان کو خوب ازبر ہو جاتی ہیں اور اُن کے تمام مالۂ و ماعلیہ پر عبور ہو جاتا ہے اور کسی قسم کی نئی اطلاعیں جو آج کل کے جدید تراجم اور مفید تصنیفات میں موجود ہیں ان کو حاصل نہیں ہوتیں۔ ہر علم اور ہر فن میں اُن کو صرف انھیں چند مصنفوں کی رائیں معلوم ہوتی ہیں جن کی کتابیں سلسلۂ درس میں قدیم سے چلی آتی ہیں۔ گویا ایک دریائے زخّار میں سے

چند قطروں پر قانع ہو جاتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس حالت سے کوئی فرد مستثنیٰ نہیں، بلکہ میرا یہ مطلب ہے کہ ہمارے اکثر فارغ التحصیل طلبہ کا انجام یہی ہوتا ہے۔ جب کہ یہ حال ہے تو سلسلۂ درس کا کبھی کبھی تبدیل ہونا خاص کر مدرسین کے حق میں نہایت مفید ہوگا، اور اُن کو نئی باتوں، نئے تجربوں، نئی رایوں اور نئی حالتوں پر اطلاع یابی کا موقع ملے گا۔

جو کچھ کہ اوپر بیان کیا گیا یہ تو اُس صورت میں ہے کہ معمولی سلسلۂ درس سراسر مناسب اور مفید ہو۔ پس درصورتیکہ سلسلۂ مذکور کا ایسا حال نہ ہو وہ بالضرور ترمیم اور اصلاح کا محتاج ہوگا۔ میرے نزدیک موجودہ سلسلۂ درس نہایت نامکمل اور غیر مفید ہے۔ میں اس وقت وہ تمام باتیں پیش کرنی نہیں چاہتا جو اصلاح طلب ہیں۔ چند باتیں اس موقع پر عرض کرتا ہوں۔ اگر اُن پر غور اور توجہ کی گئی تو اور مراتب بھی کسی دوسرے موقع پر عرض کیے جائیں گے۔

سب سے بڑا قصور ہمارے طریقہ درس و تدریس میں یہ ہے کہ صرف و نحو کے ساتھ عربی زبان کے بولنے اور لکھنے کی مشق نہیں کرائی جاتی۔ یہ بعینہٖ ایسی بات ہے کہ معمار اپنے شاگردوں کو معماری کے قاعدے زبانی یاد کرائے اور اُن سے کبھی تعمیر کا کام نہ لے۔ یا باورچی کھانا پکانے کی ترکیبیں زبانی یاد کرلے اور کبھی اپنے ہاتھ سے کھانا نہ پکائے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے اکثر فارغ التحصیل طلبہ معقول اور منقول کی اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کی درسی کتابیں نہایت عمدگی سے پڑھا سکتے ہیں، وہ عربی زبان کے بولنے اور عربی عبارت کے انشا کرنے سے بالکل عاجز ہوتے ہیں۔ اور چوں کہ اُن کو ابتدا سے لکھنے کی عادت نہیں ڈالی جاتی اس واسطے وہ جس طرح عربی عبارت کے انشا پر قادر نہیں ہوتے اُسی طرح فارسی بلکہ اُردو لکھنے پر بھی جیسا کہ چاہیے قدرت نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ جو طلبہ ہر سال اسلامی مدرسوں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں اُن میں کوئی مصنف یا مؤلف یا مترجم پیدا نہیں ہوتا۔ ہماری قوم میں جس قدر لائق مدّرسوں کی ضرورت ہے اُس سے زائد لائق مصنفوں کی ضرورت ہے۔ عربی سے اُردو میں ترجمہ کرنا عربی داں فاضل کا سب سے زیادہ سہل اور آسان کام معلوم ہوتا ہے مگر افسوس ہے کہ ایسا سہل کام بھی

اُن سے سرانجام نہیں ہوسکتا۔

قرآن مجید کا کوئی ترجمہ آج ایسا موجود نہیں ہے جس سے اُس کا مطلب صاف صاف ہر شخص کی سمجھ میں آسکے۔ صرف ایک ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا ہے جو اُس وقت کیا گیا تھا جب کہ اُردو زبان نہایت ابتدائی حالت میں تھی۔ اُس وقت کے سیکڑوں محاورے اور الفاظ متروک ہوگئے ہیں اور اس لیے اب وہ ترجمہ اکثر مقام سے سمجھ میں نہیں آتا۔ مگر فارغ التحصیل فاضلوں میں کوئی شخص ایسا نظر نہیں آتا جو اس ضروری کام کو سرانجام کرے اور قرآن مجید کا عام فہم اور خاص پسند ترجمہ کرکے مسلمانوں میں شائع کرے۔ یورپ میں کم سے کم بیس ترجمے قرآن مجید کے مختلف زبانوں میں اب تک ہو چکے ہیں اور ہمیشہ پانچ چار برس کے بعد ایک نیا ترجمہ شائع ہوتا ہے۔

عیسائی قومیں تو قرآنِ مجید کی طرف اس قدر متوجہ ہیں اور ہمارا یہ حال ہے کہ ایک ترجمہ جو اب سے سو برس پہلے ہوا تھا وہی آج تک چلا آتا ہے۔ اس کا سبب سوا اس کے اور کچھ نہیں کہ ہمارے اسلامی مدرسوں میں تصنیف اور تالیف اور ترجمہ کرنے کی لیاقت طالب علموں میں نہیں پیدا کی جاتی۔

پس میرے نزدیک ایک یہ ضروری بات ہے کہ چھوٹے چھوٹے رسالے عربی جملوں اور فقروں کے عربِ ادباء کے کلام سے انتخاب کرکے بنائے جائیں جو ابتدائے تعلیم سے صرف ونحو کے ساتھ پڑھائے جایا کریں۔ اور عربی بولنے اور لکھنے کی مشق طلبہ کو اول ہی سے شروع کرائی جائے تاکہ صرف ونحو کے قواعد بھی اُن کے دلوں پر نقش ہوں اور عربی زبان میں گفتگو کرنے اور عربی عبارت لکھنے کا ملکہ بھی اُن میں پیدا ہو۔ اور جب تک کتبِ درسی کا سلسلہ ختم نہ ہو ہر درجے میں اُس درجے کی حیثیت کے موافق ادب کی کتابوں کا برابر درس جاری رہے چوں کہ اس قسم کی کتابیں اور رسالے ہمارے معمولی سلسلۂ درس میں بالکل موجود نہیں ہیں اس واسطے ضرور ہے کہ ایسی کتابیں عرب ادباء کے کلام سے انتخاب کرکے چند علماء کے مشورے اور اتفاق سے ہر درجے کے موافق بنوائی جائیں۔

اب تک ہمارے ہاں ادب کی تعلیم کا یہ طریقہ رہا ہے کہ جب طالب علم منتہی ہونے

کے قریب پہنچتا ہے اُس وقت بعض اُستاد دفعتہً ادب کی نہایت مغلق اور مشکل کتابیں جیسے ''متنبّی''، ''حماسہ''، ''سبعۂ معلقہ''، ''مقاماتِ حریری'' وغیرہ پڑھانا شروع کر دیتے ہیں مگر لکھنے کی اب بھی مشق نہیں کرائی جاتی۔ چوں کہ طالب علم ابتدا سے عربیت سے اجنبی ہوتے ہیں جب دفعتہً ایک غریب و غیر مانوس نظم یا نثر اُن کے سامنے آتی ہے تو بعض اوقات ان کو یہ خیال ہوتا ہے کہ یا تو یہ عربی زبان نہیں اور یا جس زبان میں ہم نے اب تک کتابیں پڑھی ہیں وہ عربی زبان نہ تھی۔ خلاصہ یہ کہ ان کو ان عربی کتابوں سے کوئی معتد بہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ اگر کسی کو اس فن سے ایسی ہی مناسبت ہوئی تو اس کو صرف اُس وقت فائدہ ہوتا ہے کہ وہ اُن کتابوں کو اُسی طرح جس طرح کہ استاد نے اُس کو پڑھایا ہے اوروں کو پڑھانے کے قابل ہو جاتا ہے مگر انشا کرنے پر اُس کو کچھ قدرت حاصل نہیں ہوتی۔ (الّا ماشاءاللہ)

عربی ادب کی تعلیم کا ایک نہایت جلیل القدر فائدہ یہ ہے کہ جس قدر ادب سے زیادہ مناسبت پیدا ہوگی اُسی قدر قرآن و حدیث کے سمجھنے میں زیادہ آسانی ہوگی اور نظمِ قرآن کی عظمت اور جلالتِ شان نہ محض حسنِ عقیدت سے بلکہ اذعانِ قلب اور جزم و یقین کے ساتھ دل میں متمکن ہوگی اور قرآن کے وجوہِ اعجاز بیان کرنے پر قدرت حاصل ہوگی۔

دوسری بات جس سے اسلامی مدرسوں میں اب تک ابتدائی تعلیم کے متعلق غفلت کی گئی یہ ہے کہ فارسی یا اُردو کو سہل یا ذلیل سمجھ کر اُن کی طرف مطلق اعتنا نہیں کیا گیا۔ بعض مدارس میں صرف اس قدر انتظام ہے کہ جو طالب علم عربی پڑھنا نہیں چاہتے اُن کے لیے ایک آدھ مدرس فارسی سکھانے کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے۔ مگر جو طلبہ عربی زبان میں تحصیل کرتے ہیں اُن کو جہاں تک کہ میں واقف ہوں فارسی اور اُردو سے بالکل علیحدہ رکھا گیا ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ بڑی غلطی ہے۔ فارسی زبان کی اگر تکمیل نہ کرائی جائے تو کم سے کم فارسی کی ادنیٰ اور اوسط درجہ کی کتابیں ضرور سلسلۂ درس میں داخل کرنی چاہئیں۔ اور اُردو زبان میں اگر اور کچھ نہیں تو اس کی انشا اور املا کی ضرور مشق کرانی چاہیے۔

فارسی زبان کی تعلیم کو میں صرف اسی لیے ضروری نہیں کہتا کہ اُس سے اُردو زبان کی

تکمیل میں مدد ملتی ہے بلکہ اس لیے بھی اس کی ضرورت ہے کہ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کے بزرگوں کی نشانی ہے اوراس لیے اس کو قائم رکھنا اور اُس سے مناسبت پیدا کرنا ہمارا فرض ہے۔اس کے سوا ہماری اکثر مذہبی، تاریخی، اخلاقی اور علمی کتابیں فارسی زبان میں ہیں۔اس لیے بھی ہمارے فضلا کو مناسب نہیں ہے کہ اُس سے بالکل اجنبی اور نا آشنا رہیں۔

یہ خیال کرنا کہ عربی زبان سیکھنے سے فارسی اور اُردو دونوں پر قدرت حاصل ہو جاتی ہے صحیح نہیں ہے۔البتہ اگر انشا کرنے کی پوری پوری مشق طلبہ کو کرائی جائے تو ممکن ہے کہ اُن کو اُردو لکھنے میں کسی قدر مدد ملے۔لیکن اُردو انشا پردازی میں فاضلانہ لیاقت جس کی کہ ضرورت ہے ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی۔رہی فارسی، سو وہ خود ایک علیحدہ اور مستقل زبان ہے اور ہماری مادری زبان بھی مثل اُردو کے نہیں ہے۔وہ عربی سیکھنے سے کیوں کر آ سکتی ہے۔ اُردو زبان جس میں ہزاروں لفظ ہندی بھاشا کے ہیں، جب اُن کے جاننے سے ہم کو بھاشا نہیں آتی تو عربی جاننے سے فارسی (صرف اس وجہ سے کہ اُس میں بہت سے عربی الفاظ ملے ہوئے ہیں) کیوں کر آ سکتی ہے۔

تیسرا امر قابل غور یہ ہے کہ ہمارا معمولی سلسلۂ درس تاریخ اور جغرافیہ سے بالکل معرا ہے۔حالاں کہ تاریخ اور جغرافیہ اُن فنون میں سے ہیں جن کو تمام دُنیا کی قوموں میں سب سے اول مسلمانوں نے ترقی دی ہے اور اپنے زمانے کے موافق اُن کو کمال کے درجہ تک پہنچایا ہے۔تاریخ کے درس میں داخل نہ ہونے سے یہ نتیجہ پیدا ہوا ہے کہ مسلمانوں کو فن تاریخ سے بالکل مناسبت نہیں رہی۔یہاں بے علموں اور ان پڑھ آدمیوں کا ذکر نہیں ہے۔خود ہمارے اکثر علماء وفضلا اسلام کے اُن تمام مہتم بالشان واقعات سے بالکل بے خبر ہیں جن کو آج تک مغربی قومیں حیرت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔قطع نظر مسلمانوں کی ملکی فتوحات اور علمی ترقیات کے جو خلافتِ راشدہ میں یا اُس کے بعد ظہور میں آئیں، خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانِ برکت نشان کے حالات سے بہت ہی کم اطلاع رکھتے ہیں۔ علم انساب اور علم رجال صرف کتابوں میں رہ گیا ہے، جو قومیں آج اپنے تئیں تمام علوم وفنون میں ساری دُنیا سے افضل اور برتر سمجھتی ہیں وہ علانیہ اس بات کا اقرار کرتی ہیں کہ ہماری تمام

علمی و عملی ترقیات کا ماخذ مسلمانوں کے علوم وفنون تھے، مگر ہم کو مطلق خبر نہیں کہ ہم کیا چیز تھے اور ہمارے بزرگوں نے علم و حکمت کو کس درجہ تک پہنچایا تھا۔ جغرافیہ میں مسلمانوں کی تحقیقات کو آج تک غیر قومیں نہایت عزت کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ جغرافیہ میں اُن کی بے مثل تصنیفات اس قابل ہیں کہ اُن پر فخر کر سکتے ہیں اور یورپ کی قومیں ان کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر چھپواتی اور شائع کرتی ہیں۔ مگر ہمارے اسلامی مدرسوں میں ان کا نام تک کوئی نہیں جانتا۔ ہمارے علم ادب میں، حدیث میں، قرآن میں ہزاروں نام امصار وقریٰ و اماکن و مواضع کے آتے ہیں مگر طالب علموں کو سوا اس کے کہ کسی شہر یا مقام کا نام ہے۔ اُن کی نسبت اور کچھ نہیں بتایا جاتا۔ حالاں کہ بہت سے مقامات احادیث وغیرہ میں ایسے آجاتے ہیں کہ جب تک اُن کا محل اور موقع اور مفصل حال معلوم نہ ہو عبارت کا مطلب ہرگز ذہن نشین نہیں ہوسکتا۔ بہت سے مقامات قرآن، انجیل اور توریت میں ایسے ہیں کہ جب تک اُن کا موقع اور محل معین نہ کیا جائے تب تک مخالفینِ اسلام کے مقابلے میں اسلام کی تائید نہیں کی جاسکتی۔ اسی طرح جغرافیہ اور نیز تاریخ کے جاننے سے اور بے شمار فائدے متصور ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

ہمارے علما نے ظاہرا سلسلۂ درس کے مقرر کرنے میں اس بات کا بہت لحاظ رکھا تھا کہ جو فن نہایت آسان ہیں اور جن کو مستعد طالب العلم اپنی قوتِ مطالعہ سے نکال سکتے ہیں، اُن کو سلسلۂ درس میں داخل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور کچھ عجب نہیں کہ تاریخ اور جغرافیہ سے بھی اسی بنا پر قطع نظر کی گئی ہو لیکن فی الواقع یہ خیال صحیح نہیں تھا۔ اول تو آسان سے آسان مضمون جب اُس کی طرف توجہ نہیں کی جاتی تو نہایت مشکل مضمون ہو جاتا ہے اور مشکل سے مشکل مضمون پر جب زیادہ غور اور توجہ کی جاتی ہے تو آسان ہو جاتا ہے۔ گویا ذیل کے مشہور شعر میں اسی مضمون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

مشکل زتوجّہِ تو آساں
آساں زتغافلِ تو مشکل

لغت کی کتاب سے لغت نکالنا طالب العلم کا سب سے زیادہ آسان کام ہے مگر

ہمارے اکثر طلبہ عدم ممارست کے سبب صُراح وقاموس وغیرہ سے لغت بہت کم نکال سکتے ہیں۔ حساب کے ابتدائی قاعدوں کے سوالات انگریزی مدرسوں کے مبتدی نہایت آسانی سے نکال دیتے ہیں اور ہمارے اکثر فارغ التحصیل طلبہ ان کا منہ تکتے رہے جاتے ہیں۔ تاریخ اور جغرافیہ کو اگر فرض کر لیا جائے تو وہ فی الواقع نہایت آسان فن ہیں تو بھی اُن کی طرف سے بے اعتنائی کرنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہمارے علماء کو تاریخ اور جغرافیہ سے بالکل مناسبت نہیں رہی۔

دوسرے تاریخ کو یہ سمجھنا ہی غلطی ہے کہ وہ نہایت آسان فن ہے۔ بے شک مسلمانوں نے جب اول تاریخ لکھنی شروع کی تھی اُس وقت وہ نہایت ابتدائی حالت میں تھی اور اس لیے نہایت آسان معلوم ہوتی تھی۔ مگر اب وہ ایسا دقیق فن ہو گیا ہے کہ تاریخ اور فلسفہ دونوں ہم پلہ سمجھے جاتے ہیں۔ خود بعض مسلمان عالموں کی ایسی تاریخی تحقیقاتیں موجود ہیں جو کسی طرح فلسفہ سے کم رتبہ نہیں رکھتیں۔ منطق کے اصول انسان کی معمولی بول چال سے استنباط کیے گئے ہیں، گویا منطق کی ابتدائی حالت انسان کی معمولی بول چال تھی۔ لیکن اب وہ نظر اور فکر کے عمدہ نتائج کا ایک نہایت عمیق اور دقیق فن سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح تاریخ ابتدائی حالت میں کسی ہی آسان ہو لیکن اب وہ فلسفہ کے ساتھ پہلو بہ پہلو چلتی ہے۔ جغرافیہ کا حال بھی تاریخ ہی کے قریب قریب ہے۔ مسلمانوں نے صرف ملکی جغرافیہ لکھا تھا اور وہ فی الواقع نہایت آسان تھا لیکن اب جغرافیہ میں بعض قسمیں ایسی اضافہ ہوئی ہیں جو فلسفے اور حکمت میں داخل سمجھی جاتی ہیں۔

بہر حال میرے نزدیک کم سے کم ابتدائی جماعتوں کے لیے کسی قدر عربی جغرافیوں کا انتخاب اور کل جماعتوں کے لیے اُن کی استعداد اور لیاقت کے موافق عربی تاریخوں کے انتخابات بھی سلسلۂ درس میں ضرور اضافہ کرنے چاہئیں۔

تیسری بات جو سب سے زیادہ توجہ کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ ریاضی کو ہمارے سلسلۂ درس میں بہت ہی کم حصہ دیا گیا ہے۔ جبر و مقابلہ کو مسلمانوں کے ساتھ وہ خصوصیت ہے کہ بعضوں نے اُس کو خاص مسلمانوں ہی کی ایجاد قرار دیا ہے۔ ہندسہ جو آج تمام دُنیا

میں پھیلا ہوا ہے۔ وہ بالاتفاق تحریر اقلیدس کے اُس ترجمہ کی بدولت پھیلی ہے جو محقق طوسیٰ نے عربی زبان میں کیا تھا۔ اقلیدس کی یونانی تحریر دُنیا سے مفقود ہوگئی تھی۔ صرف محقق کا ترجمہ باقی تھا۔ اول اس کا ترجمہ لاطینی زبان میں ہوا اور پھر رفتہ تمام یورپ کی زبانوں میں لکھا گیا۔ ہیئت میں مسلمانوں کی ترقی کو تمام یورپ نے تسلیم کیا ہے۔ چناں چہ ستاروں کے بے شمار عربی نام آج تک یورپ کی زبانوں میں موجود ہیں۔ علم مناظر اور مرایا میں جو نہایت مہتم بالشان مسئلے مسلمانوں نے حل کیے تھے اُن میں سے ایک وہ تھا جس کی بنیاد پر زمانۂ حال میں عکسی تصویر کا حیرت انگیز فن ایجاد ہوا۔ جرثقیل میں جو آج کل بے انتہا ترقی ہوئی ہے اُس کے بڑے بڑے اصول مسلمانوں ہی کے قائم کیے ہوئے ہیں۔ غرض کہ ریاضی کی تمام فروع میں مسلمانوں نے اپنے زمانہ کے موافق انتہا درجے کی ترقی کی تھی۔ باوجود اس کے ہم نے ریاضی سے مطلق سروکار نہیں رکھا۔ یہاں تک کہ ریاضی سے مسلمانوں کی نامناسبت اس زمانے میں ضرب المثل ہوگئی ہے۔ جہاں تک کہ مجھ کو معلوم ہے اکثر اسلامی مدارس میں تو ریاضی کی ایک کتاب بھی نہیں پڑھائی جاتی۔ حساب، ہندسہ، جبر ومقابلہ ہیئت علم مثلث، مناظر ومرایا، غرض کہ کوئی فرع سلسلۂ درس میں داخل نہیں ہے مگر سنا جاتا ہے کہ بعض مدارس میں صرف ''خلاصۃ الحساب'' حساب میں ''تشریح الافلاک'' اور ''شرح چغمینی'' ہیئت میں اور کہیں کہیں چند مقالے تحریر اقلیدس کے ہندسے میں پڑھائے جاتے ہیں۔

جو لوگ مدارس اسلامیہ کو ترقی دینا اور مفید بنانا چاہتے ہیں اُن کا فرض ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سلسلۂ درس میں ریاضی کو جو نہایت ضروری فروع ہیں اُن کی مفید کتابیں علماء کے مشورہ سے داخل کریں اور ہیئت جدید کی کتابیں جو غالباً مصر میں ضرور لکھی اور چھاپی گئی ہوں گی۔ اگر بہم پہنچیں تو اُن کو بھی وہاں سے طلب کر کے درس میں شامل کریں تا کہ دونوں ہیئتوں کے مقابلہ کرنے کا موقع ملے اور اُن میں سے جو ہیئت غلط ثابت ہو اُس کو ترک کریں اور ہیئت صحیح ہو اُس پر اپنے علم کی بنیاد رکھیں۔

ہیئت جدید کو یہ سمجھ کر کہ وہ نصوصِ قرآنی کے خلاف ہے ترک کرنا اور اُس سے دین

میں فتنہ پیدا ہونے کا اندیشہ کرنا گویا اس بات کا تسلیم کر لینا ہے کہ دین اسلام اُس کے حملے کی تاب نہیں لاسکتا۔ جو لوگ دین اسلام کو دین برحق اور خدا کا بھیجا ہوا دین سمجھتے ہیں اُن کا یہ اعتقاد ہونا چاہیے کہ اگر ہیئت جدید سچی ہے تو یقیناً وہ اصول اسلام کے خلاف نہیں ہوسکتی، اور اگر وہ اصول اسلام کے خلاف ہے تو یقیناً جھوٹی ہے اور ہم ضرور اُس کی غلطی اور جھوٹ ثابت کر سکیں گے۔ لیکن اس بات کے دریافت کرنے کے لیے کہ وہ غلط ہے یا صحیح یا اصول اسلام کے خلاف ہے یا نہیں، ضرور ہے کہ اول اُس کا علم حاصل کیا جائے۔ حکمت یونانیہ جو صدہا سال سے ہمارے ہاں درس میں داخل چلی آتی ہے اُس میں بہت سے مسئلے اب تک ایسے موجود ہیں جو عقائد اہلِ اسلام کے خلاف سمجھے جاتے ہیں۔ باوجود اس کے اُس کو درس میں داخل رکھا گیا ہے۔ کیوں کہ جب وہ مسائل اور اُن کے جوابات جو ہمارے علمائے متکلمین نے دئے ہیں، ساتھ ساتھ پڑھائے جاتے ہیں تو اُن مسائل کی غلطی طلبہ کے خوب ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ہیئت جدید کو بھی درس میں داخل کرنا چاہیے، تاکہ اگر وہ فی الواقع اصول اسلام کے خلاف ہو تو ہمارے علماء کو اُس کے رد کرنے کا موقع ملے۔

یہ چند باتیں جو اوپر لکھی گئی ہیں ان کے لکھنے سے یہ غرض نہیں کہ خواہ نخواہ ان کے موافق عمل درآمد کیا جائے بلکہ یہ غرض ہے کہ اُن کو غور سے سنا جائے اور اگر کوئی بات تسلیم کرنے کے قابل ہو تو اُس کے موافق یا اُس میں کمی بیشی کرنے کے بعد عمل درآمد کیا جائے۔

علی گڑھ کالج میں ایک تقریر

(قلمی مسودہ سے نقل کی گئی)

(یہ تقریر مولانا نے طلبائے مدرستہ العلوم مسلمانوں علی گڑھ کے سامنے اس موضوع پر فرمائی تھی کہ تعلیم سے فراغت پانے کے بعد طلبہ کو کیا کرنا چاہیے اور اپنی معاش کس طرح حاصل کرنی چاہیے۔)

صاحبو! میں نے آپ کو اس ہال میں جمع ہونے کی آج اس لیے تکلیف دی ہے کہ تعلیم ختم کرنے کے بعد فکرِ معاش کا دشوار گزار مرحلہ جو آپ کو درپیش ہے اس کے متعلق آپ کو چند مشورے ایسے دوں جن کو میں اپنے نزدیک آپ کے حق میں بہتر سمجھتا ہوں۔

اے میرے عزیزو! اگرچہ اس بات کا انکار نہیں ہوسکتا کہ ہماری قوم میں تعلیم کا خیال روز بروز زیادہ ہوتا جاتا ہے اور مذہبی خیالات جو تعلیم کے مانع سمجھے جاتے تھے ان کی مزاحمت کم ہوتی جاتی ہے مگر میری رائے جس کو شاید تم بھی تسلیم کروگے اب تک اس باب میں یہ ہے کہ مسلمانوں نے ابھی تعلیم کو بطوع و رغبت قبول نہیں کیا۔ بلکہ جس طرح اضطرار کی حالت میں مکروہ اور حرام چیزیں بھی حلال سمجھ لی جاتی ہیں اسی طرح مسلمانوں نے انگریزی تعلیم کو بہ مجبوری گوارا کرلیا ہے۔ کیوں کہ رئیس اور دولت مند مسلمان جو فکرِ معاش سے فارغ البال ہیں جب تک ان کو اپنی اولاد کی تعلیم کا خیال اور شوق پیدا نہ ہو تب تک یہ ہرگز نہیں سمجھا جاسکتا کہ مسلمان بطوع و رغبت تعلیم کی طرف مائل ہوگئے ہیں بلکہ صاف پایا جاتا ہے کہ جن کو معاش کا کچھ سہارا نہیں ہے یا جو اپنے بعد اولاد کے لیے کوئی جائداد یا آمدنی چھوڑنے والے نہیں ہیں، وہ انگریزی تعلیم کو محض ایک ذریعہ معاش یا نوکری کا سمجھ کر

اولاد کو بہ کراہت و مجبوری تعلیم دلواتے ہیں۔

پس اگر میرا یہ خیال صحیح ہے اور فی الواقع تعلیم کے خواہاں حالتِ موجودہ میں صرف وہی لوگ ہیں جو معاش کی طرف سے فارغ البال نہیں تو آپ میں سے ہر شخص کو تعلیم ختم کرنے سے پہلے اس بات کا فیصلہ کر لینا ضرور ہے کہ ہم تعلیم ختم کرنے کے بعد فلاں پیشہ اختیار کریں گے یا فلاں ذریعہ سے معاش بہم پہنچائیں گے۔ تاکہ ابھی سے آہستہ آہستہ اس پیشہ کے لیے تیار ہونے اور اس کی لیاقت بہم پہنچانے کا موقع ملے اور مدرسہ چھوڑنے کے بعد اندھا دھند دائیں بائیں ہاتھ مارنے کی ضرورت نہ پڑے، بلکہ جو امر پہلے سے ٹھان لیا گیا ہو اس کو مضبوط پکڑ لیا جائے۔

اگرچہ قوم کو تم سے بڑی بڑی امیدیں ہیں اور اگر خدا کو منظور ہے تو وہ زمانہ عنقریب آنے والا ہے کہ تمھیں میں سے بہت سے ایسے روشن ضمیر پیدا ہوں گے جو اپنے علم کے ذریعہ سے ملک اور قوم میں روشنی پھیلائیں گے اور علم کو علم ہی کے واسطے پڑھیں گے، مگر حالتِ موجودہ میں تم سے یہ امید رکھنی قبل از وقت ہوگی۔ بالفعل تمہاری تعلیم کا اشرف و اعلیٰ مقصد یہ ہونا چاہیے کہ تم تعلیم کے ذریعہ سے معاش پیدا کرو اور جہاں تک ہو جائز دسائل سے روپیہ پیدا کر کے اپنے اپنے خاندان کو تقویت دو۔ اور جس امید پر تمہارے بزرگوں نے تمہاری تعلیم کے اخراجات اپنے حوصلہ اور بساط سے بڑھ کر برداشت کیے ہیں، ان کی اس امید کو پورا کر کے دکھاؤ۔

مگر اے عزیزو! تمہاری راہ میں بہت سی رکاوٹیں ایسی نظر آتی ہیں کہ جب تک وہ دور نہ کی جائیں گی، اُس وقت تک تمہارا منزل مقصود تک پہنچنا نہایت دشوار معلوم ہوتا ہے۔ تمہارے آبا و اجداد نے وہ زمانہ دیکھا تھا جب مسلمانوں کی سلطنت قائم تھی اور شاہی ملازمت میں سب سے زیادہ مسلمانوں کا حصہ تھا، تمام فوجی اور ملکی خدمات کا دروازہ ان کے لیے کھلا ہوا تھا۔ پس ان کے لیے وجہ معاش کا کوئی ذریعہ نوکری سے زیادہ آسان اور سہل الوصول نہ تھا۔ مگر تم جانتے ہو کہ اب وہ زمانہ نہیں ہے۔ اب وہ شاہی ملازمت جس میں مسلمانوں کا سب سے زیادہ حصہ تھا اُس کے مستحق اُن انگلستان کے چار کروڑ باشندے اور

اُن کے بعد ہندوستان کے پچیس کروڑ باشندے ہیں۔ اب کسی طرح ممکن نہیں کہ چھ کروڑ مسلمان جو ہندوستان میں آباد ہیں، وہ اب بھی اپنے آبا واجداد کی طرح معاش کو نوکری میں منحصر سمجھیں۔ اور نوکری کے سوا معاش کے اور ذریعوں سے اسی طرح الگ تھلک رہیں جس طرح اُن کے آبا واجداد رہتے تھے۔ گورنمنٹ میں نہ یہ طاقت ہے کہ وہ ہندوستان کی تمام رعایا پر ترجیح دے کر کل خدمات ومناصب انھیں کے حوالے کر دے۔ پھر کیوں کہ ہوسکتا ہے کہ ہندوستان کے کل مسلمان یا کم سے کم تعلیم یافتہ مسلمان جن کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے تمام پیشوں سے قطع نظر کر کے صرف سرکاری نوکری پر قناعت کر بیٹھیں۔

شاید کسی کے دل میں یہ خیال گزرے کہ جس قوم میں پشہتا پشت سے برابر نوکری پیشہ ہوتے چلے آئے ہیں اور جن کے بڑوں نے کبھی تجارت یا زراعت یا صنعت ودست کاری کے ذریعہ سے معاش پیدا نہیں کی وہ نوکری کے سوا کسی اور ذریعہ سے کیوں کر معاش پیدا کر سکتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ خیال بالکل صحیح ہے۔ کیوں کہ جس قوم یا خاندان کی چند پشتیں کسی خاص پیشہ میں گزر جاتی ہیں اس کی آئندہ نسلوں میں اس خاص پیشہ کے سوا کسی دوسرے پیشہ کی قابلیت باقی نہیں رہتی۔ تجارت پیشہ قوم کی اولاد ماں کے پیٹ سے تاجر پیدا ہوتی ہے اور زراعت پیشہ قوم کی نسل میں فطرۃً زراعت کی قابلیت ہوتی ہے۔ اسی طرح جو خاندان کئی پشت سے نوکری پیشہ چلا آتا ہے اس کی اولاد میں نوکری کے سوا کسی چیز کی قابلیت نہیں ہوتی۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں میں جس طرح تجارت وزراعت وغیرہ کی قابلیت نہیں ہے اسی طرح حالت موجودہ میں وہ نوکری کی قابلیت بھی نہیں رکھتے۔ کیوں کہ جس طرح اُن کے بزرگوں نے تجارت وزراعت وغیرہ کے ذریعہ سے کبھی معاش پیدا نہیں کی، اسی طرح کسی فارن گورنمنٹ میں ملازمت کرنے کا بھی ان کو کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ وہ ہمیشہ مسلمانوں کے عہد میں آسانی سے عہدے اور منصب پاتے رہے اور اس لیے نہ کبھی ان کو وہ تدبیریں اور کوششیں کرنی پڑیں جن کے بغیر کسی فارن گورنمنٹ میں رسائی ہونی ناممکن ہے اور نہ اپنے تئیں وہ لیاقتیں پیدا کرنے کی ضرورت ہوئی جو ایک فارن گورنمنٹ میں رسوخ اور تقرب حاصل کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ پس جو مشکلات کہ

مسلمان نوجوانوں کو تجارت و زراعت اختیار کرنے میں نظر آتی ہیں وہی مشکلات حالتِ موجودہ میں نوکری پر عائد ہوتی ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ ایسے پیشے جو خود ہمارے اختیار میں ہیں ان کو چھوڑ کر ایسا کام اختیار کیا جائے جو ہمارے اختیار میں نہیں بلکہ گورنمنٹ کے اختیار میں ہے اور جس کا استحقاق پیدا کرنا اور اس کو گورنمنٹ پر ظاہر کرنا خاص کر اس زمانے میں سخت دشوار ہے۔

شاید میرا کہنا کہ مسلمانوں میں فارن گورنمنٹ کی نوکری کرنے کی لیاقت عام طور پر ایسی جیسی کہ ہندوستان کی دیگر اقوام میں ہے نہیں پائی جاتی، آپ کو ناگوار گزرا ہوگا فی الحقیقتہ یہ کوئی بُرا ماننے کی بات نہیں ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کوئی مسلمان اس قاعدہ کلیّہ سے مستثنٰی نہیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ زیادہ تر مسلمانوں کا ایسا ہی حال ہے جیسا کہ میں نے بیان کیا۔ اور انصاف یہ ہے کہ اُن کا ایسا ہی حال ہونا چاہیے تھا مسلمانوں کے سوا ہندوستان کی تمام قومیں ہزار برس سے غیر قوم کی محکوم چلی آتی تھیں، اس لیے صبر وتحمل فرمانبرداری، زمانہ سازی، فروتنی، رفق و مدارات اور دیگر صفات جن پر ایک محکوم قوم کی کامیابی بلکہ سلامتی اور زندگی منحصر ہے۔ طول عہد کے سبب ان کی قومی خصلتیں بن گئی تھیں اور جو لیاقتیں ایک فارن گورنمنٹ میں رسوخ وتقرب حاصل کرنے کے لیے درکار ہیں اُن کی جبلت میں داخل ہوگئی تھیں۔ یہی سبب تھا کہ جو قومیں ان میں روزگار پیشہ تھیں وہ جس طرح فارسی زبان آسانی سے سیکھ لیتی تھیں اسی طرح انگریزی سیکھنے میں کوئی مشکل معلوم نہیں ہوئی اور جس طرح وہ مسلمانوں کے عہد میں تمام دفتروں پر حاوی تھے اسی طرح انگریزوں کے عہد میں تمام دفتر اور آفس ان سے معمور ہوگئے۔

تقریر متعلق اصلاح وترقی مسلمانانِ پانی پت

(قلمی مسودہ سے نقل کی گئی)

(یہ تقریر مولانا نے باشندگانِ قصبہ پانی پت کے ایک جلسہ میں اپنے اہل
وطن کی معاشرتی اصلاح اور انسدادِ رسومِ قبیحہ کے متعلق فرمائی تھی۔)

جناب چیئرمین اور تمام حاضرین جلسہ!

پہلے اس سے کہ اصل مطلب کے متعلق کچھ بیان کیا جائے اوّل حضور ملکہ معظّمہ قیصر ہند کی مادرانہ شفقت اور مہربانی کا جنھوں نے ہندوستان کی بہبودی کے لیے منصف اور خدا ترس حاکم مقرر کیے ہیں اور پھر اپنے صوبہ کے لیفٹیننٹ گورنر سرڈینس فٹز پیٹرک کی عنایت کا جو ہماری بہبودی کا خیال ہم سے بہت زیادہ رکھتے ہیں اور خاص کر اپنے ضلع کے نیک دل اور ہر دلعزیز ڈپٹی کمشنر مسٹر آگنیو کا جو صرف ہمارے فائدے کے لیے کرنال سے یہاں تشریف لائے ہیں، شکریہ ادا کرنا ضرور ہے۔

جس کام کے لیے ہم سب لوگ آج اس مقام پر جمع ہوئے ہیں وہ ایسا ضروری کام ہے کہ ہم کو بغیر اس کے کہ اپنے حاکموں کو اس کے لیے تکلیف دیتے خود اس کے سرانجام کرنے کی فکر کرنی چاہیے تھی۔ اگر چہ جس قدر قومیں اس قصبہ میں آباد ہیں ہم کو اُن سب کے ساتھ ہمدردی ہے اور ہماری آرزو ہے کہ سب مل جل کر اپنی حالت درست کریں۔ مگر میں اس موقع پر خاص کر چاروں طرفوں کے مسلمان بسوہ داروں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جن سے میری مراد انصاری، مخدوم زادے، راجپوت اور پٹھان ہیں اور جن کا حال روز بروز نہایت سقیم ہوتا جاتا ہے۔

چاروں قوموں میں چند مستثنیٰ آدمیوں کے سوا جو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں، کوئی شخص آسودہ اور خوش حال نظر نہیں آتا۔ اُن کی حقیت نصف سے زیادہ بیع اور رہن کے ذریعہ سے غیر بسوہ داروں کے پاس منتقل ہو چکی ہے اور جو باقی ہے وہ برابر منتقل ہوتی چلی جاتی ہے۔ ناداری اور افلاس کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ سیکڑوں آدمی اپنی اولاد کو صرف اس وجہ سے تعلیم نہیں دلوا سکتے کہ مدرسہ کی فیس اور کتابوں کی قیمت ادا کرنے کا فی الواقع مقدور نہیں رکھتے۔ چاروں قوموں میں آدمیوں کی تعداد دن بدن گھٹتی جاتی ہے۔ نسلیں برابر منقطع ہوتی جاتی ہیں۔ پچھلے چالیس پینتالیس برس کے عرصہ میں اکثر خاندانوں کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ بہت سے خاندان چراغِ سحری ہیں، نااتفاقی اور پھوٹ اور قصے جھگڑے جو ادبار کی نشانیاں ہیں کم وبیش چاروں قوموں میں پھیل رہے ہیں۔ اگر ان تمام خرابیوں کا سبب پوچھا جائے تو ہمارے بھائیوں کے پاس صرف ایک جواب ہے۔ وہ کبھی اپنا قصور نہیں بتاتے بلکہ ہمیشہ خدا کو الزام دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا کی مرضی یہی ہے۔ حالاں کہ خدا نے جیسا کہ خود قرآن میں فرماتا ہے: ''کسی قوم کو جب تک وہ آپ نہیں بگڑی کبھی بگاڑا۔'' درحقیقت یہ ہماری نالائقی ہے کہ جو خرابیاں خود ہمارے سبب سے ہم پر آ رہی ہیں اُن کو ہم خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اپنے تئیں بےقصور قرار دیتے ہیں۔ ہم کو چاہیے کہ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں اور سوچیں کہ ہماری یہ حالت خود بخود ایسی ہوتی چلی جاتی ہے یا ہم اپنے کرتوتوں سے اپنے تئیں آپ برباد کر رہے ہیں۔

ہمارے بزرگوں نے جو رسمیں آسودگی کے زمانے میں مقرر کی تھیں ہم اُن رسموں کو بےمقدوری اور ناداری کے زمانے میں جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ مونڈن، ختنہ، بسم اللہ، منگنی اور بیاہ وغیرہ میں اپنے بساط سے زیادہ خرچ کرتے ہیں۔ جن کے پاس خرچ کرنے کو کچھ نقدی یا زیور ہوتا ہے وہ انجام کا خیال بالکل نہیں کرتے اور محض فضول اور بے جا تقریبوں میں سب خرچ کر کے بیٹھ رہتے ہیں۔ جن کے پاس زیور یا نقدی نہیں ہوتی وہ گھر بار بیچ کر یا رہن رکھ کر بڑوں کی ریت پوری کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ تجارت ہم نہیں کرتے، دُکان داری اور صنعت و حرفت کو عیب سمجھتے ہیں، نوکری کرنے کی لیاقت پیدا نہیں کرتے۔

صرف زمین کی آمدنی پر ہم لوگوں کا گزارہ ہے اور اسی پر ہماری عزت و آبرو کا انحصار ہے۔ ایسی عزیز چیز کو ذرا ذرا سی فضول اور بے ہودہ تقریبوں میں بیچ یا رہن کر کے اپنی اور اپنی اولاد کی زندگی ہمیشہ کے لیے تلخ کر دیتے ہیں۔ وہی لوگ جن کو مدرسہ کی فیس دینی سخت دشوار ہے اور اس لیے اپنی اولاد کو تعلیم نہیں دلواتے وہی شادی اور غمی کی بے ہودہ رسموں میں گھر بار بیچ کر پانچ پانچ سو ہزار ہزار روپیہ خرچ کر دیتے ہیں۔ اولاد کی تعلیم جس سے زیادہ کوئی ضروری کام نہیں ہوسکتا اس کو تو اس بہانے سے ٹال دیتے ہیں کہ تعلیم کا خرچ ہم سے نہیں اُٹھ سکتا اور اُن بے ہودہ رسموں میں جن کو نہ عقل جائز رکھتی ہے اور نہ شرع، اپنی روزی کا آسرا فروخت یا رہن کر کے ہاتھ سے کھو بیٹھتے ہیں۔ رسموں کی پابندی نے یہاں تک مجبور کر رکھا ہے کہ صرف شادیوں ہی میں یہ فضولیاں نہیں ہوتیں بلکہ میّت میں بھی اسی طرح آنکھیں بند کر کے خرچ کیا جاتا ہے۔ باپ مر گیا ہے، بیوی اور چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ گیا ہے، اُس کی جائداد اور آمدنی بجائے اس کے کہ اُن صغیر سن بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں خرچ ہو یا اُس کے کنبے کے رزق کا سہارا ہو برس روز تک برابر برادری کی مہمان داری میں صرف ہوتی ہے۔ سویم اور دسویں، بیسویں، چالیسویں، چھ ماہی اور برسی میں سیکڑوں روپیہ خرچ ہو جاتا ہے۔ بہت سے بھائی عدالت کے جھگڑوں میں اپنا بنا بنایا گھر بگاڑ دیتے ہیں۔ دس دس بیس بیس روپیہ کی حقیّت کے واسطے سینکڑوں ہزاروں روپیہ برباد کر دیتے ہیں۔ برادری کی پنچایت کے فیصلوں سے جن میں ایک کوڑی خرچ نہیں ہوتی اور دونوں فریقوں کو کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے کبھی راضی نہیں ہوتے۔ اور عدالت میں سیکڑوں ہزاروں خرچ کر کے ہار اور جیت دونوں صورتوں میں تباہ ہو جاتے ہیں۔

یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے اسباب ہیں جن سے ہماری حالت روز بروز ابتر ہوتی جاتی ہے۔ افلاس بڑھتا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساری خوبیاں گھٹتی جاتی ہیں۔ ہم میں بہت سے ایسے ہیں جو ان سب باتوں کو سمجھتے ہیں اور ان تمام رسموں کو لغو اور اپنی تباہی و بربادی کا ایک بہت بڑا ذریعہ جانتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کسی طرح یہ رسمیں موقوف ہو جائیں، مگر وہ خود ایک رسم بھی موقوف نہیں کر سکتے۔ ان کو شریعت کی باندھی ہوئی حدیں

توڑنی آسان ہیں مگر رسم و رواج کی کوئی قید ان سے نہیں ٹوٹ سکتی۔

بہ ظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوگی کہ لوگ جن رسموں کو اپنے حق میں مضر جانتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ کسی طرح موقوف ہو جائیں اُن کو خود موقوف نہیں کر سکتے۔ مگر در حقیقت یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ برٹش گورنمنٹ کی حکومت سے پہلے ہندوستان میں ہزاروں برس سے ڈسپاٹک گورنمنٹ یعنی شخصی حکومت چلی آتی تھی جس میں رعیت کی بھلائی اور بہبودی کا ہر ایک کام بادشاہ کے اختیار میں ہوتا تھا۔ رعیت جس طرح ملکی معاملات میں کچھ دخل نہ رکھتی تھی اسی طرح قومی رفاہ اور فلاح کے کاموں سے اس کو کچھ سروکار نہ ہوتا تھا۔ نہ صرف ہندوستان کی بلکہ تمام ایشیا کی تاریخ میں ایک نظیر بھی ایسی نہیں دیکھی گئی کہ کسی قوم نے بغیر مداخلت سلطنت کے صرف اتفاق باہمی سے کوئی مدرسہ قائم کیا ہو یا کوئی شفاخانہ جاری کیا ہو یا کوئی سوشل رفارم یعنی طریقِ معاشرت کی اصلاح کی ہو یا کوئی اور کام تمام قوم کی بھلائی کا کیا ہو۔ البتہ خاص خاص اشخاص بڑے بڑے مفید کام کرتے تھے کسی وزیر نے تمام قوم کی تعلیم کے لیے مدرسہ قائم کر دیا کسی امیر نے کوئی شفاخانہ جاری کر دیا۔ کسی سردار نے پل بندھوا دیا، کنواں کُھدوا دیا، سرائے بنوادی، اور اسی طرح کے اور مفید کام خاص خاص شخص کرتے رہتے تھے لیکن تمام قوم نے متفق ہو کر کبھی کوئی رفاہ عام کا کام نہیں کیا۔ قوموں کی ہر قسم کی بھلائی یا بُرائی ہمیشہ سلطنت کے قبضہ میں رہی۔ اور وہ ہمیشہ اپنے تئیں سلطنت کے ہاتھ میں ایسا سمجھتے رہے جیسا مردہ غسّال کے قبضہ میں ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ تمام رعایا بے حس و حرکت ہوگئی اور ایکٹوٹی یعنی عملی طاقت اُن میں بالکل مفقود ہوگئی۔ اور یہ خصلت اُن کی اولاد میں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی چلی آئی۔

اگرچہ ہم برٹش گورنمنٹ کے نہایت شکر گزار ہیں کہ اُس نے ہم کو برخلاف شاہانِ سلف کے ہر طرح کی آزادی دی ہے۔ ہم اپنی ترقی اور اصلاح کی ہر طرح کی تدبیریں عمل میں لاسکتے ہیں۔ جس طرح ہم اپنی تعلیم و تربیت کا سامان بغیر مداخلت گورنمنٹ کے کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ہر قسم کی سوشل اصلاحیں بغیر گورنمنٹ کی دست اندازی کے کر سکتے ہیں۔ مگر ایشیائی خود مختاری جو ہزار ہا سال سے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ابتدائے آفرینش سے ایک

حالت پر چلی آتی تھی اور جس نے ایشیا کی تمام قوموں کو بے حس وحرکت کر دیا تھا، اس کا اثر ابھی تک ہماری رگوں اور پٹھوں میں موجود ہے۔ اس لیے ہم آزادی کی نعمت سے جو گورنمنٹ نے ہم کو بخشی ہے حالتِ موجودہ میں فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ ہم خاص اپنی بھلائی کا کوئی کام بغیر گورنمنٹ کی امداد کے نہیں کر سکتے۔ گورنمنٹ نے ستی اور دختر کشی کی رسم خود موقوف کی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو ہندوستان کا دامن شاید اب تک ان گناہوں سے پاک نہ ہوتا۔ اسی طرح گورنمنٹ نے بیسیوں قانون ہماری صحت کے متعلق، ہمارے رسم و رواج کے متعلق، ہماری اخلاقی اور دماغی تربیت کے متعلق ایسے بنائے ہیں جن سے خاص ہمارے ذاتی فائدے کے سوا گورنمنٹ کی کوئی غرض متعلق نہیں ہے۔ اگر ہے تو صرف اس قدر ہے کہ سلطنت کی خوبی یہی ہے کہ اس رعیت ہر طرح آسودہ اور خوش حال ہو۔

ہم گورنمنٹ کی اس خاص عنایت کا نہایت سچے دل سے اقرار کرتے ہیں اور اُس کے شکر گزار ہیں کہ اُس نے ہماری شادی اور غمی کے اخراجات کے انتظام کی طرف توجہ فرمائی ہے۔ اور ہمارے ضلع کے نیک دل اور غریب پرور ڈپٹی کمشنر اسی غرض کے لیے ہمارے قصبہ میں تشریف لائے ہیں۔ مگر میں نہایت افسوس کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس قسم کی تحریکیں پہلے بھی ہو چکی ہیں مگر اُن سے کوئی عمدہ نتیجہ پیدا نہیں ہوا۔ اور اگر میری رائے غلط نہ ہو تو ہرگز امید نہیں کہ اس تحریک سے بھی بغیر سرکاری دباؤ کے کوئی عمدہ نتیجہ پیدا ہوگا۔

تقریر متعلق مجوزہ مسلم یونی ورسٹی

(منقول از رپورٹ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس متعلق اجلاس دوازدہم ۱۸۹۹ء، صفحہ: ۱۴۸ تا ۱۷۰)

(محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا بارھواں اجلاس جو لاہور میں دسمبر ۱۸۹۹ء میں منعقد ہوا تھا ہمیشہ اس بات کے لیے مشہور رہے کہ موجودہ ''مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ'' قائم کرنے کی سب سے پہلی تجویز کانفرنس کے اس اجلاس میں پیش کی گئی۔ یہ اجلاس کانفرنس کا نہایت اہم اجلاس تھا۔ اور بڑے بڑے لوگوں نے یونی ورسٹی کے قیام اور اجرا کے متعلق اس میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اور جو لوگ کسی وجہ سے شامل اجلاس نہیں ہو سکے انھوں نے خطوط کے ذریعہ اپنی رائیں اس مسئلہ کے متعلق سکریٹری کانفرنس کو لکھ بھیجیں۔ اس اجلاس میں سب سے پہلے مسٹر مارین پرنسپل علی گڑھ کالج نے اس مضمون کا ریزولیوشن پیش کیا تھا کہ ''اس کانفرنس کی رائے میں مسلمانوں کی ایک علیحدہ یونی ورسٹی کا قائم ہونا مستحسن ہے۔'' اس ریزولیوشن کی تائید میں جس قدر تقریریں ہوئیں اور جس قدر تحریرات اور خطوط وغیرہ اس کے متعلق دفتر کانفرنس میں آئے۔ کانفرنس نے وہ سب اُسی زمانہ میں چھاپ کر شائع کر دئے تھے۔

نواب محسن الملک نے مولانا حالیؔ کو بھی اس اجلاس میں شرکت کی دعوت دی تھی اور نہایت آرزو ظاہر کی تھی کہ تشریف لا کر اس مسئلہ کے متعلق اپنی زبان سے اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔ مولانا کا بھی مصمم ارادہ تھا کہ خود لاہور جائیں مگر بیمار ہو جانے کے سبب اُن کا یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔

جب مولانا کے شریک اجلاس ہونے کی کوئی توقع نہ رہی تو ناچار محسن الملک نے نہایت اصرار سے آپ کی خدمت میں لکھا کہ اب جب کہ آپ کی بذات خود شمولیت کی کوئی امید نہیں رہی تو اپنی تقریر ہی لکھ کر یا لکھوا کر بھیج دیں۔ جس سے آپ کے قیمتی خیالات اس مسئلہ کے متعلق حاضرین معلوم کرلیں چناں چہ یہ وہی تقریر ہے جو مولانا نے لکھ کر نواب محسن الملک کو بھیجی تھی اور محسن الملک نے اُس کو ۳۱ر دسمبر ۱۸۹۹ء کے اجلاس میں پڑھ کر سنایا تھا۔)

صاحبو! یہ ریزولیوشن جس کی تحریک کرنے کی مجھے عزت دی گئی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس سے زیادہ ضروری کوئی ریزولیوشن آج تک کانفرنس کے کسی اجلاس میں پیش نہیں ہوا۔ غالبًا آپ صاحبوں کو معلوم ہوگا کہ سر سید مرحوم نے جب ولایت سے واپس آ کر مسلمانوں کی تعلیم کی بنیاد ڈالنی چاہی تھی، اُس وقت اُن کا ارادہ بجائے محمڈن کالج کے جو اُنھوں نے قائم کیا، درحقیقت ایک محمڈن یونی ورسٹی قائم کرنے کا تھا۔ چناں چہ جو اسکیم آنریبل سید محمود نے ۱۰ر فروری ۱۸۷۳ء کو کالج فنڈ کمیٹی میں پیش کی تھی، اُس میں انھوں نے صاف اس بات کی تصریح کی تھی کہ غرض صرف ایک مدرسہ یا کالج ہی قائم کرنا نہیں ہے بلکہ ایک یونی ورسٹی قائم کرنی ہے۔ اور اس اسکیم کی جو کاپی گورنمنٹ میں بھیجی گئی تھی اُس میں بھی یونی ورسٹی کا لفظ لکھا گیا تھا۔ مگر گورنمنٹ شمال مغرب نے اس لحاظ سے کہ اس وقت کمیٹی کی ابتدائی حالت تھی اور اُس کی آئندہ کارروائیوں پر کسی طرح اطمینان نہیں ہوسکتا تھا، کمیٹی کو یہ جواب دیا تھا کہ اگر وہ محمڈن یونی ورسٹی قائم کرنا چاہتی ہے تو گورنمنٹ اُس میں گرانٹ ایڈ نہیں دے گی۔ باوجود اس کے بھی سر سید کا ارادہ مدت تک یہی رہا کہ محمڈن یونی ورسٹی قائم کی جائے اور گورنمنٹ کی امداد سے بالکل قطع نظر کی جاوے۔ مگر بغیر گورنمنٹ کی منظوری کے یونی ورسٹی قائم کرنے میں بے شمار مشکلات کا سامنا تھا اس لیے اُنھوں نے آخرکار محمڈن کالج قائم کرنے پر قناعت کی۔ مگر ۲۶ر برس کے عرصہ میں محمڈن کالج نے توقع سے

زیادہ ترقی کی ہے اور گورنمنٹ کی نظر میں بہت کچھ اعتبار کرلیا ہے۔ اس لیے جیسا کہ تھیوڈر ماریسن اسکوائر نے ایک موقع پر پچھلے دنوں میں اپنا خیال ظاہر کیا تھا کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ گورنمنٹ مسلمانوں کو جو اپنی تعلیم کا کام اپنے ہاتھ میں لینا اور گورنمنٹ کو اس بوجھ سے سبکدوش کرنا چاہتے ہیں، مجوزہ یونی ورسٹی قائم کرنے سے مانع آئے گی۔

پس جو ریزولیوشن اس وقت پیش ہوا ہے اگر مسلمانوں کو متفقہ کوشش سے یہ تجویز پوری ہوگئی تو اُن کو ایک ایسی عظیم الشان کامیابی حاصل ہوگی جو اُن کے بزرگ لیڈر سرسید مرحوم کو باوجود چالیس برس کی لگاتار کوشش کے اپنی زندگی میں حاصل نہیں ہوئی یہاں تک کہ اس تمنا کو وہ اپنے ساتھ قبر میں لے گئے۔ اور دُنیا پر روشن ہو جائے گا کہ اُس مرحوم نے جو بیج مسلمانوں میں فوقیت کا بویا تھا وہ اکارت نہیں کیا گیا۔

مگر میں اس ریزولیوشن کو صرف اسی وجہ سے ضروری نہیں سمجھتا بلکہ میں زیادہ تر اس سبب سے اُس کو ضروری خیال کرتا ہوں کہ اُس میں محمڈن یونی ورسٹی اُس شخص کی یادگار میں قائم کرنی تجویز ہوئی ہے جو چند روز میں ہم کو اس قابل بنا گیا ہے کہ اپنے قومی کالج کو یونی ورسٹی بنانے کا حوصلہ ہم میں پیدا ہوا ہے۔

صاحبو! یہ کچھ کم تعجب انگیز بات نہیں ہے کہ جو قوم بیس پچیس برس پہلے انگریزی تعلیم کو برہمزنِ دین و مذہب خیال کرتی تھی، اُس کی اشاعت کے لیے چندہ دینے کو گناہ و معصیت جانتی تھی اور اُس کے حامیوں کا کافر و ملحد قرار دیتی تھی، اُس قوم میں ایک بارُعب جماعت ایسی پیدا ہو جائے جو انگریزی تعلیم کے لیے یونی ورسٹی قائم کرنے کا ارادہ رکھتی ہو۔ پُرانے خیالات اور خاص کر وہ خیالات جو مذہبی رنگ میں رنگے ہوئے ہوں، اُن کا بدلنا ایسا ہی مشکل ہے جیسا پہاڑ کا اپنی جگہ سے مٹ جانا پس وہ کیسی زبردست قوت ہوگی جس نے اس قدر جلد مسلمانوں کے خیالات میں تبدیلی کردی۔

اے زندہ ولان پنجاب! آپ بڑے خوش قسمت ہیں کہ آپ نے آنکھ کھول کر روشنی ہی روشنی دیکھی ہے۔ اور اس لیے تعصّبات کی وہ گھنگھور گھٹا جو دلّی سے لکھنؤ تک تمام مسلمانوں پر چھائی ہوئی تھی اور بہت کچھ اب تک چھائی ہوئی ہے اُس کا شاید پورا پورا

اندازہ آپ نہیں کر سکتے۔ ہم نے وہ تعصّبات اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں اور اب تک دیکھتے ہیں اور خود ہم نے اُنھیں تعصّبات کے بھونرے میں نشو ونما پائی ہے جو بلا مبالغہ اس آیت کے مضمون کا مصداق تھا او کظلمتٍ فی بحرلجی یغشاہ موج من فوقہٖ موج من فوقہٖ سحاب، ظلمات بعضھافوق بعض. مگر کسی بزرگ کا قول ہے کم نکبۃٍ للّٰہِ فیھا رحمۃ. (یعنی اکثر بد بختیوں میں خدا کی رحمت چھپی ہوئی ہوتی ہے۔) وہی تاریکی جو ہم پر چھائی ہوئی تھی ہمارے لیے روشنی کا فرشتہ بن گئی۔ وہی دارالخلافہ جو مسلمانوں کے ادبار اور تنزل کا مرکز اور مذہبی تعصّبات کا سرچشمہ تھا، اُس کی خاک سے ایک شخص اُٹھا جس نے چالیس برس برابر تعصب اور جہالت کا مقابلہ کیا۔ اور آخر وہ فتح نمایاں حاصل کی جس کا ظہور ہم اس وقت اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں کہ جس تعلیم کے نام سے ہم سوسو کوس بھاگتے تھے آج اُسی تعلیم کے لیے یونی ورسٹی قائم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اور جس شخص کو کافر و ملحد کہتے تھے اُس کی شکر گزاری میں یادگار قائم کرنا چاہتے ہیں۔

صاحبو! یہ انقلاب عظیم جو ہمارے خیالات میں پیدا ہوا ہے اور ہماری تمام آئندہ ترقیات کی جڑ ہے، اس کو سرسری نظر سے نہ دیکھنا چاہیے۔ ایک لڑکا جو راہ سے بے راہ ہو جاتا ہے، اُس کے خیالات کی اصلاح میں والدین کی تمام عمر گزر جاتی ہے اور وہ ہرگز راہ پر نہیں آتا۔ پھر جس شخص نے بیس پچیس برس کے عرصہ میں لاکھوں کے خیالات بدل دئے اور کروڑوں کو چوکنا کر دیا۔ اُس کو دیکھنا چاہیے کہ اس منزل میں کیا کیا دشواریاں پیش آئی ہوں گی اور کیسے کیسے سخت مرحلے طے کرنے پڑے ہوں گے۔ وہ کس دل و دماغ کا انسان ہوگا اور اس کی ہمت اور اُس کا استقلال کس درجہ کا ہوگا۔

افسوس ہے کہ وقت میں اتنی گنجائش نہیں پاتا کہ سرسید کی زندگی کے واقعات مختصر طور پر بھی اس جلسہ میں بیان کر سکوں۔ اور چوں کہ اُن کی لائف عنقریب پبلک میں شائع ہونے والی ہے اس لیے میں اس کی چنداں ضرورت بھی نہیں سمجھتا۔

لیکن اے صاحبو! اگر آپ مجھ کو اجازت دیں تو میں اس موقع پر چند نتائج اُن کی ملکی اور قومی خدمات کے بیان کروں جس سے کسی قدر اس بات کا اندازہ ہو سکے کہ اس مرحوم کی

کوششوں سے ہم نے کیا کیا فائدے اُٹھائے ہیں اور کہاں تک اُس کی شکر گزاری ہمارے ذمہ واجب ہے۔

صاحبو! اگر چہ ہماری قوم کا میلان ایک عرصہ دراز سے روز بروز پستی کی طرف ہوتا جاتا تھا۔ اُن کی تمام خوبیاں آہستہ آہستہ مٹتی جاتی تھیں۔ علم میں، دولت میں، اخلاق میں، درجہ میں وہ اپنی ہم وطن قوموں سے گرتے جاتے تھے مگر یہ پستی اور تنزل بہ ظاہر چنداں محسوس نہ ہوتا تھا۔ دفعتاً ۱۸۵۷ء غدر کی آندھی اُٹھی جس نے اُس ٹمٹماتے چراغ کو بالکل بجھا دیا۔ یکا یک مسلمانوں کی حالت دگرگوں ہوگئی۔ چند گھرانے جو کسی قدر نام ونمود رکھتے تھے ہمیشہ کے لیے معدوم ہوگئے۔ اور ہزاروں معرکۂ بغاوت میں مارے گئے۔ اور ہزاروں جانیں دوسروں کے لیے عبرت کا سبق دینے میں کام آئیں۔ ہزاروں اپنا وطن اور شہر و دیار چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں روپوش ہوگئے اور جو باقی رہے اُن کا یہ حال تھا کہ روٹی ہے تو کپڑا نہیں اور کپڑا ہے تو روٹی نہیں۔ ہزاروں عورتیں بیوہ ہوگئیں۔ ہزاروں بچے یتیم ہوگئے۔ گھر چھن گئے، جائدادیں ضبط ہوگئیں، بڑے بڑے عالی خاندان فقیر ہو کر تکیوں میں جا بیٹھے۔ بہت سے بھیک مانگتے پھرتے تھے، باورچی گری اور خدمت گاری کرتے تھے، مشکیں اُٹھاتے تھے، گاڑیاں ہانکتے تھے۔

خیر یہ مصیبتیں تو ہمیشہ تھیں، کہ ہمیشہ لڑائی کے ہنگاموں کے بعد اہل ملک کو بھگتنی پڑتی ہیں۔ مگر مسلمانوں کو سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ جہاں تک نگاہ اُٹھا کر دیکھتے تھے اُن کو مایوسی ہی مایوسی نظر آتی تھی۔ وہ اپنی موجودہ حالت سے زمانۂ مستقبل کو زیادہ خوف ناک پاتے تھے۔ اُن کو ہندوستان میں رہنا ایسا ہی مشکل ہوگیا تھا جیسے دریا میں رہنا اور مگر مچھ سے بیر۔ مسلمان عموماً بہ حیثیتِ قومی و مذہبی انگلش گورنمنٹ کے مخالف سمجھ لیے گئے تھے، حکام کی نظر میں ان کا اعتبار ہی نہیں جاتا رہا تھا بلکہ وہ سلطنت کے حق میں اور ملک کے امن اور انتظام کے حق میں ایک خطرناک فرقہ سمجھا جاتا تھا۔ مسلمانوں کی بدبختی ہندوستان کی اور قوموں کے لیے پناہ بن گئی تھی اور بقول سرسید کے وہ ہر ایک جرم اور ہر ایک الزام کا بوجھ اس بدنام قوم کے سر پر دھرا جاتا تھا۔ غرض کہ حکام بدظنی اور نفرت کی کوئی حد باقی نہ رہی

تھی، کسی شخص کا صرف مسلمان ہونا ہی اُس کو بدتر سے بدتر جرم کا مرتکب ٹھہرانے کے لیے کافی سمجھا جاتا تھا اور یہ نفرت اور بدظنی تمام انگلش نیشن میں سرایت کر گئی تھی۔ تمام اینگلو انڈین اخبار اور ولایت کے اخبار مسلمانوں کے برخلاف اشتعال پیدا کرنے والے آرٹیکل لکھتے تھے اور انگریزوں کے دل میں عموماً عداوت اور نفرت کا بیج بوتے تھے، گویا مسلمانوں کو نہ ان انگریزوں سے جو ہندوستان میں حکمران تھے اور نہ اُن سے جو ہر سال ولایت سے مختلف خدمات پر مامور ہو کر آتے تھے کوئی امید باقی نہ رہی تھی اور اُن کے حال پر یہ شعر صادق آتا تھا۔ شعر

اکنوں اگر فرشتہ نکو گویدت چہ سود
در شہر صد حکایتِ بدنامیٔ تو رفت

اگرچہ انگریزوں کی یہ نفرت اور بدگمانی جیسا کہ سرسید مرحوم نے رسالہ ''اسبابِ بغاوت'' اور ڈاکٹر ہنٹر کے جواب میں ثابت کیا ہے اور جس کو بڑے بڑے مدیرانِ سلطنت نے آخر کار تسلیم کر لیا ہے محض غلط فہمیوں کا نتیجہ تھا۔ مگر بدقسمتی سے ایسے اسباب جمع ہو گئے تھے کہ ان غلط فہمیوں کا ہونا نہایت قرین قیاس تھا۔ انگریز ہندوستانیوں کی عادت طبیعت، اُن کی حالت اور اُن کے طرزِ خیالات سے ناواقف تھے۔ ملک کی حکومت اُنھوں نے مسلمانوں سے لی تھی اور اُن ہی کو وہ اپنا حریف اور سلطنت کا دعویدار سمجھتے تھے اور بقول سر سید کے اُن کے اس خیال کی تائید کے لیے ''بھس بھری ہوئی مردہ کھال دلّی کے قلعہ میں موجود تھی۔'' مسلمانوں کے مذہبی تعصّبات کی دھوم تھی اور اُن میں سے بعض جاہل اور ناعاقبت اندیش لوگ اپنی وحشیانہ حرکتوں سے ان تعصّبات کا کافی ثبوت دے چکے تھے اور چند مچھلیاں سارے تالاب کو گندہ کر چکی تھیں۔ ان باتوں کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ تمام مسلمان من حیث القوم انگریزوں کی غلط فہمی کا شکار ہو جائیں۔

پس کیا انگریز کیا ہندو اور کیا مسلمان کسی سے اس نازک وقت میں یہ امید نہ تھی کہ اس پانچ کروڑ مخلوق کے بیڑے کو اس طوفان عظیم کے صدمہ سے بچائے۔ مگر خدا مسلمانوں کے ساتھ تھا۔ اُس نے جہاں کوئی بیماری پیدا کی ہے وہیں اُس کی دوا بھی پیدا کی ہے۔ وہی

مغضوب ومعتوب شہر جہاں کے مسلمان سب سے زیادہ موردِ آفات تھے اور جس پر اگر خدا کا رحم لارڈ لارنس مرحوم کے قالب میں ظہور نہ کرتا تو اُس کا نام ونشان صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا، اسی شہر کے مسلمانوں میں سے ایک شخص اٹھا جس نے نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ ہندوستان کی تمام رعایا کو عام بغاوت اور عام سازش اور گورنمنٹ کی عام مخالفت کے الزام سے بری کیا۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے مدیرانِ سلطنت نے تسلیم کرلیا کہ ۱۸۵۷ء کا غدر کسی ملکی سازش یا عام بغاوت پر مبنی نہ تھا بلکہ صرف سپاہ کی جہالت اور مذہبی توہمات کا نتیجہ تھا جس کی نسبت لارڈ لارنس مرحوم نے آخر کار فیصلہ کردیا کہ (محض کارتوس کی بدولت ایک سپاہیوں کا ہنگامہ) اور سر ولیم کے انڈر سکریٹری وزیر ہند کے نہایت انصاف سے (جیسا کہ سرسید بیان کرتے تھے) اُس کو سپاہی وار سے تعبیر کرتے تھے نہ ملکی بغاوت سے۔ مگر باوجود اس کے بھی مسلمانوں کی طرف سے انگریزوں کے دل صاف نہ ہوئے اور وہ اُن کو بدستور انگلش گورنمنٹ کا بدخواہ اور انتظام کا دشمن خیال کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۸۷۱ء میں یعنی غدر کے زمانے سے پندرہ برس بعد ڈاکٹر ہنٹر صاحب نے اپنی کتاب ''آور انڈین مسلمانز'' میں صاف لکھا تھا کہ ''ہندوستان کے مسلمان اب بھی ہندوستان میں گورنمنٹ انگریزی کے لیے موجب خطر ہیں جیسے کہ ایک مدت سے موجب خطر چلے آتے ہیں۔''

صاحبو! میں اس موقع پر سرسید کی ان کوششوں کی تفصیل بیان کرنی نہیں چاہتا جو انھوں نے مسلمانوں پر سے اس داغ کے چھٹانے میں کی ہیں۔ کیوں کہ وہ ۱۸۵۷ء سے لے کر آخری وقت تک جو اکتالیس برس کا زمانہ ہوتا ہے برابر اسی دھن میں لگے رہے ہیں کہ قوم کی پولیٹکل حالت درست ہو، گورنمنٹ میں اُن کا اعتبار زیادہ ہو، انگریزوں میں اور اُن میں ربط واتحاد کو ترقی ہو اور وہ اپنی ہم وطن قوموں سے عزت میں مرتبہ میں اور گورنمنٹ کا معتمد علیہ ہونے میں کسی طرح پیچھے نہ رہیں۔ اس غرض سے جو جو کام اور جو جو کوششیں اُنھوں نے اس اکتالیس برس کے عرصہ میں کی ہیں اُن کی تفصیل بہت طولانی ہے۔ یہاں تک میرے نزدیک ایک شخص کا ہرگز کام نہیں کہ اُن کی قومی خدمات کو بالاستیعات اُن کی لائف میں بیان کرسکے۔ مگر جہاں تک کہ امکان میں تھا ان خدمات کا مفصل ذکر اُن کی

لائف میں کیا گیا ہے جو عنقریب پبلک کی نظر سے گزرنے والی ہے۔ پس میں اس ذکر کو چھوڑ کر صرف ان نتائج کو بیان کرنا چاہتا ہوں جو اس مرحوم کی کوششوں سے ملک اور قوم کے حق میں مترتب ہوئے۔

صاحبو! جس کام کا بیڑا سرسید نے اٹھایا تھا وہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ مسلمانوں کا سیدھے رستے پر ڈالنا ایسا ہی مشکل تھا جیسا دریا کا بہاؤ کی سمت سے دوسری طرف رخ پھیر دینا۔ اور انگریزوں کو اس بے اعتباری اور بدگمانی کے بعد جس کا غدر کے واقعات نے اُن کے دل میں نقش بٹھا دیا تھا مسلمانوں کی طرف سے صاف کرنا اس سے بھی زیادہ مشکل تھا۔ ایک طرف سے سرسید کو یہ آواز آتی تھی کہ ''جبل گردد جبلی نہ گردد'' اور دوسری طرف سے ان کو یہ جواب ملتا تھا کہ ''آزمودہ را آزمودن جہل است''۔ مگر اس کو وہ وقار شخص نے کبھی ہمت نہ ہاری، یہاں تک کہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوا۔ اس نے ایک جماعت کثیر مسلمانوں میں ایسی پیدا کر دی جو انگلش گورنمنٹ کی برکتوں کی دل سے قدر کرتی ہے، اس کو ہندوستان کے حق میں اور خاص کر مسلمانوں کے حق میں خدا کی مہربانی سمجھتی ہے اور اس بات کا یقین رکھتی ہے کہ اگر ہندوستان میں انگریزوں کا قدم نہ آتا تو مسلمانوں کو وہی روز سیاہ دیکھنا پڑتا جو اسپین کے مسلمانوں کو اُن کی سلطنت کے زوال کے بعد دیکھنا پڑا تھا۔ وہ اپنی سلامتی بلکہ اپنا وجود ہندوستان میں محض انگریزی حکومت کی بدولت جانتے ہیں، ان کو اپنے اسلاف کی اقبال مندی کے خواب نظر آنے موقوف ہو گئے ہیں، وہ اپنی حالت اور حیثیت کو خوب سمجھ گئے ہیں، اُنھوں نے برٹش گورنمنٹ کی طاقت اور اقتدار کا بخوبی اندازہ کر لیا ہے، ان کو یقین ہے کہ ہندوستان میں کوئی قوم انگریزوں کے سوا حکومت نہیں کر سکتی اور اس لیے وہ اپنی خیر اسی میں سمجھتے ہیں کہ ہندوستان میں گورنمنٹ کی وفادار اور خیر خواہ رعایا بن کر رہیں۔

سرسید نے صرف یہی نہیں کیا کہ اپنی پرزور تحریروں اور تقریروں سے مسلمانوں کی ایک جماعت کے خیالات کی اصلاح کر دی ہو بلکہ وہ اپنی قوم میں وفاداری اخلاص اور اطاعت کا ہمیشہ کے لیے بیج بو گیا ہے۔ وہ اُن کی آئندہ نسلوں کے لیے ایک ایسا بارآور درخت لگا گیا ہے جس کا پھل انگلش نیشن کی محبت اور انگلش گورنمنٹ کی وفاداری اور

فرمانبرداری ہے ؎

کوہ ہا کندست تا ایں جوئے شیر آوردہ است
گوکہ آبِ رفتہ در جوئے شما آید زسر

جس طرح اُس نے قوم کے خیالات کی اصلاح کی اور اُن میں ہمیشہ کے لیے وفاداری اور اخلاص کی بنیاد ڈالی اسی طرح اُس نے حکمراں قوم کی نظر میں جہاں تک کہ ممکن تھا اُن کا اعتبار بڑھانے میں کوشش کی اور وہ تمام شکوک وشبہات جو انگریزوں کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے پیدا ہوگئے تھے اور جو بظاہر کسی طرح مٹنے والے نہ تھے ان کو مٹایا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر ہنٹر نے جو کچھ اپنی کتاب ''آور انڈین مسلمانز'' میں مسلمانوں کے برخلاف لکھا تھا بڑے بڑے جلیل القدر حاکموں نے اس کی تردید کی۔ ''پایونیر'' میں ایک بڑے لائق عربی داں انگریز کا بہت مبسوط آرٹیکل، جس کی نسبت یقین کیا گیا تھا کہ سر ولیم میور لیفٹیننٹ گورنر اضلاع شمال مغرب کا لکھا ہوا تھا، انھیں دنوں میں شائع ہوا۔ اس میں صاف لکھا تھا کہ وہابیوں کو یہ کہنا کہ وہ ہمیشہ در پردہ تخریبِ سلطنت کی فکر میں رہتے ہیں اور چپکے چپکے منصوبے باندھا کرتے ہیں اور غدر و بغاوت کی تحریک کرتے ہیں (جیسا کہ ڈاکٹر ہنٹر نے لکھا تھا) محض تہمت ہے۔'' سر ایلفر ڈ لائل نے اپنے ایک ایسے میں جو تھیالوجیکل ریویو میں لکھا کہ ''اُس مصنف کو مبالغہ کا جن بسا اوقات نہایت پریشان کردیتا ہے اور بہتر ہوتا اگر وہ اس جن کو اُتار دیتا''۔ ''انڈین آبزرور'' کے ایڈیٹر نے جو خود انگلش مین تھا اور اس کا اخبار تمام اینگلو انڈین افسروں کے رائے کا آئینہ تھا، جب سرسید کا ریویو کتاب مذکور کے برخلاف شائع ہوا تو ایک نہایت زبردست آرٹیکل سرسید کی تائید میں لکھا، جس میں درحقیقت ڈاکٹر ممدوح کی کتاب دھجیاں اُڑائی تھیں اور جس کا پہلا فقرہ یہ تھا کہ ''ہم سمجھتے ہیں کہ دُنیا کے لوگوں نے یا دُنیا میں سے اس گردہ کے لوگوں نے جو اس قسم کی باتوں سے سروکار رکھتے ہیں ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب متعلقہ مسلمانان ہندوستان کی قدر ومنزلت کی بابت بلکہ ٹھیک ٹھیک یہ کہنا اچھا ہے کہ اُس کے لچر وپوچ ہونے کی بابت تصفیہ کردیا ہے۔ جہاں تک کہ ہم کو لٹریچر میں مداخلت ہے اس کے اعتبار سے ہم ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کو لاثانی سمجھتے

ہیں، کیوں کہ ہم نہیں جانتے کہ کسی مصنف نے دیدہ دوانستہ ایسے مضمون پر کتاب چھاپی ہو جس سے وہ بالکل ناواقف ہو۔

سرسید کی ریویو کا اثر جو کچھ کہ گورنمنٹ پر ہوا اُس کا اندازہ جیسا کہ معتبر ذریعہ سے سنا گیا ہے اس بات سے ہوسکتا ہے کہ اس ریویو کے شائع ہونے کے بعد پھر کوئی وہابی گرفتار نہیں ہوا، حالاں کہ کئی برس سے ان کی گرفتاری برابر جاری تھی۔ خود ڈاکٹر ممدوح کے خیالات جہاں تک کہ قیاس ہوسکتا ہے سرسید کا ریویو دیکھنے کے بعد بدل گئے تھے اور ان کی مسلمانوں کے ساتھ یقیناً بڑی ہمدردی پیدا ہوگئی تھی۔ جیسا کہ ان کو اس برتاؤ سے، جو اس واقعہ کے بعد سرسید اور مسلمانوں کے ساتھ ان سے ظہور میں آیا، ثابت ہوتا ہے۔ انھوں نے مدرستہ العلوم کی پختہ بارک میں ایک کمرہ بنانے کے لیے ڈیڑھ ہزار روپیہ اپنی جیب خاص سے دیا اور ۱۸۸۲ء میں جب کہ وہ ایجوکیشن کمیشن کے پریزیڈنٹ تھے کمیشن کے دورہ کے وقت اضلاع شمال مغرب میں پہلا اجلاس علی گڑھ میں کیا اور اپنی آخری اسپیچ محمڈن کالج میں آکر دی جس میں نہایت بشاشت اور کشادہ دلی کے ساتھ سرسید اور اُن کی کوششوں کی بے انتہا تعریف کی اور کالج کے سرسبز ہونے کی تمنا ظاہر کی۔

سرسید کی کوشش سے جو اعتبار حکمرانِ قوم کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے پیدا ہوا ہے اُس کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ انگلستان کے مشہور اخبار ''رپال مال گزٹ'' مورخہ ۲۹ر مارچ ۹۸ء میں سرسید کی وفات پر یہ فقرہ لکھا تھا کہ ''سرکار انگریزی اور باشندگانِ ہند کے تعلقات کی کتاب میں کوئی باب ایسا نہیں ہے جس پر ہم دل سے اپنے تئیں مبارک باد دے سکیں جس قدر سرسید احمد خاں کی زندگی پر دے سکتے ہیں۔ وہ ابتدائے عمر سے آخر دم تک انگریزی راج کا پکا دوست رہا اور جو اُس نے خدمتیں کیں اُن کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا مشکل ہوگا۔''

اسی طرح سر آکلینڈ کالون نے جیسا کہ مسٹر تھیوڈور بیک نے سرسید کے ماتمی جلسہ میں بیان کیا تھا۔ لیفٹیننٹ گورنری کے زمانہ میں اس مرحوم کی نسبت یہ فرمایا تھا کہ ''کسی زندہ شخص نے عام اس سے کہ وہ انگریز ہو یا ہندوستانی برٹش گورنمنٹ کے استحکام سلطنت

ہندوستان کے بارہ میں اس قدر کوشش نہیں کی ہے جس قدر کہ سرسید نے کی ہے۔''

ظاہر ہے کہ سرسید نے نہ کسی ملکی معاملہ میں کوئی سفارت کی خدمت انجام دی تھی، نہ کوئی ملک فتح کیا تھا، نہ کوئی کالونی آباد کی تھی، نہ کسی صوبہ کا بندوبست کیا تھا۔ پھر وہ کونسی خدمت اور کونسی کوشش سرسید نے کی تھی جس کا ذکر انگلستان کے اس نامور اخبار نے اور ہندوستان کے اس جلیل القدر مدیر نے کیا ہے؟ وہ یہی خدمت اور یہی کوشش تھی کہ جس قوم سے انگریزوں نے سلطنت لی تھی، جس کو وہ اپنا حریف جانتے تھے، جو مذہبی تعصّبات میں شہرۂ روزگار تھی اور گورنمنٹ کے حق میں سخت خطرہ کی چیز سمجھی جاتی تھی، اس میں صرف اسی شخص نے اپنے زبردست ہاتھوں سے لائلٹی اور وفاداری کا بیج بویا ہے اور حکمران قوم کو کم سے کم اس بات کا یقین دلا دیا ہے کہ ہماری حکومت کو مسلمانوں کی طرف سے کچھ خطرہ نہیں ہے۔ کرنل گریہم سرسید کی لائف میں لکھتے ہیں:

> ''غدر کے زمانے میں اور بہت مدت بعد تک مسلمانوں پر ایک بدلی چھائی ہوئی تھی۔ اس خوف ناک زمانہ کے تمام مکروہات ان کی طرف منسوب کیے جاتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ یہ تعصب زیادہ تر بے جا تھا۔ مسلمانوں کو اس کا بہت رنج تھا اور یہ بات اُن کو بُری معلوم ہوتی تھی۔ ظاہرا کسی شخص نے ان کی حمایت کی حامی نہیں بھری۔ سید احمد خاں نے یہ مشکل کام اپنے ذمہ لیا اور جہاں تک اُن کی قدرت میں تھا، انھوں نے مسلمانوں کی بگڑی ہوئی بات کو پھر درست کیا۔''

ایک اور نہایت لائق اور شریف انگریز نے سرسید کی وفات کے بعد جو ان کی پولیٹکل خدمات پر ایک آرٹیکل لکھا تھا، اس میں بھی اسی کے قریب قریب لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''غدر سے پہلے اور اس کے چند سال بعد تک تقریباً تمام انگریز مسلمانوں کو بدگمانی کی نظر سے دیکھتے تھے اور اعتبار کے اعلیٰ عہدوں پر ان کو ترقی دینے اور ان کی خواہشوں کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرنے پر کسی طرح رضامند نہیں ہوتے تھے۔ نہایت نمایاں انقلاب جو حال میں اینگلو انڈینز کے خیالات میں ظاہر ہوا ہے، یہ صرف سرسید کی تلقین کا نتیجہ ہے اس

نے مسلمانوں کے دل میں جہاں پہلے نفرت اور بدگمانی ہوتی تھی وہاں اعتماد اور وفاداری کا درخت لگا دیا اور انگریزوں کو یقین دلا دیا کہ مسلمان وفادار ہیں۔''

صاحبو! یہ بہت بڑا احسان سرسید کا اپنی قوم پر تھا۔ عربی میں یہ مثل مشہور ہے ثبت **العرش ثم نقش** (یعنی پہلے چھت قائم کرلو پھر نقش و نگاہ قائم کرنا)۔ اسی طرح ایک قوم کے خیر خواہ کا سب سے مقدم کام یہ تھا کہ وہ اپنی قوم کی پولیٹکل حالت درست کرے، قوم کو گورنمنٹ کا خیر خواہ بنائے، اور گورنمنٹ کو اس پر مہربان کرے۔ اگر چہ بظاہر سرسید کی اس کوشش میں بہ نسبت قوم کی خدمت کے گورنمنٹ کی خدمت کا پہلو غالب ہوتا ہے لیکن اگر ذرا غور کر کے دیکھا جائے تو یہ سراسر قوم کی خدمت اور خیر خواہی کا کام تھا۔ مسلمانوں اور انگریزوں کی مثال چھری اور خربوزے کی تھی۔ پس مسلمانوں کے تعلقات اگر برٹش گورنمنٹ کے ساتھ خدانخواستہ ویسے ہی رہتے جیسے کہ غدر کے بعد ہو گئے تھے تو گورنمنٹ کو اس سے زیادہ تکلیف نہ ہوتی جتنی کہ چھری کو خربوزہ کاٹنے میں ہوتی ہے۔ مگر خربوزے کا کام تمام ہو جاتا۔

بے شک یہ کام سب سے مقدم اور سب سے زیادہ مشکل تھا۔ مگر اے صاحبو یہ نہ سمجھنا کہ سرسید نے مسلمانوں کو صرف یہی فائدہ پہنچایا ہے یا مسلمانوں کے سوا ہندوستان کی اور قوموں کو اس سے کچھ فائدہ نہیں پہنچا۔ اُس کے احسانات جو ملک اور قوم پر ہیں، وہ حصہ اور شمار کے اندازہ سے باہر ہیں۔ اُسی نے سب سے پہلے گورنمنٹ اور پارلیمنٹ کو سمجھایا کہ جب تک دیسی لوگ لیجس لیٹو کونسل میں ممبر نہ ہوں گے، اس وقت تک رعایا اور گورنمنٹ کی غلط فہمیاں جن کا یہ نتیجہ ۱۸۵۷ء کا غدر تھا رفع نہ ہوں گی، چناں چہ نے ان کی صلاح کے موافق عمل کیا۔ رسالہ ''اسبابِ بغاوت'' جس میں یہ صلاح دی گئی تھی۔ ۱۸۶۰ء میں پیش ہوا اور ۱۸۶۱ء میں تین ہندوستانی رئیس پہلی ہی بار کونسل کی ممبر پر نامزد کیے گئے۔

اسی نے رسالہ مذکور میں سب سے پہلے یہ شکایت کی تھی کہ ہندوستانیوں کو بڑے بڑے ذمہ داری کے عہدے نہیں دئے جاتے۔ اس شکایت کا دفعیہ بھی گورنمنٹ نے بہت جلد کیا۔ کتاب مذکور کے پیش ہونے سے ایک برس بعد یعنی ۱۸۶۲ء میں پہلی ہی بار پنڈت

شمبھو ناتھ ہائی کورٹ کلکتہ کے جج مقرر ہوئے اور اس کے بعد رفتہ رفتہ اکثر اعلیٰ عہدے جو پہلے کبھی ہندوستانیوں کو نصیب نہیں ہوئے تھے، ملنے لگے۔

اُسی نے شمالی ہندوستان میں سوسائٹیاں اور انجمنیں اور سبھائیں قائم کرنی لوگوں کو بتلائیں۔ سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ سے پہلے جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے کہ کوئی قومی مجلس یا سوسائٹی اودھ، اضلاع شمال مغرب اور پنجاب میں ایسی نہیں تھی جو مسلمانوں یا ہندوؤں نے ملک یا قوم کی بھلائی کے لیے قائم کی ہو۔ خصوصاً مسلمانوں میں ایک مجلس کے سوا جو کلکتہ میں ''مجلس مذاکرۂ علمیہ'' کے نام سے قائم تھی اُس وقت تک کوئی مجلس ہندوستان کے کسی صوبہ میں قائم نہیں ہوئی تھی۔

اُسی نے دیسی اخباروں کو جن میں جھوٹی سچی خبروں کے سوا اور کچھ نہ ہوتا تھا پولیٹکل، سوشل اور علمی و اخلاقی مضامین کا مخزن بنایا اور بجائے اس کے کہ وہ محض لوگوں کے دل بہلانے کے اوزار تھے ان کو اس قابل بنا دیا کہ گورنمنٹ اُن کی آواز پر کان لگانے لگی۔

اُسی نے اُردو لٹریچر اور اُردو زبان کو ایک قطرہ سے دریا بنا دیا۔ قطع نظر اُس بے بہا امداد کے جو سرسید کے لٹریری ورکس سے اُردو لٹریچر کو پہنچی اور قطع نظر گرانقدر کوششوں کے جو انھوں نے اُردو زبان کی حمایت میں اخیر دم تک برابر جاری رکھیں، اگر سچ پوچھو تو ۱۸۶۸ء سے اب تک جو اُردو زبان نے غیر معمولی ترقی کی ہے وہ اُسی مرحوم کی تحریکوں کا نتیجہ تھا۔ سوسائٹی کی طرف سے جو ایڈریس انھوں نے سنہ مذکور میں بحضور سر ولیم میور لیفٹیننٹ گورنر اضلاع شمال مغرب علی گڑھ میں پیش کیا تھا اُس ایڈریس کے جواب سوسائٹی کی درخواست کے موافق ہز آنر نے وعدہ کیا تھا کہ جو کتابیں دیسی زبان میں تصنیف و تالیف یا ترجمہ کی جائیں گی، اُن میں گورنمنٹ ضرور امداد دے گی۔ چناں چہ ۲۶/ اگست ۱۸۶۸ء کو یعنی ایڈریس کے پیش ہونے سے ساڑھے تین مہینے بعد سر ولیم میور کی گورنمنٹ نے وہ انعامی اشتہار جاری کیا جس کا ہندوستان پر ہمیشہ احسان رہے گا اور جس نے تیس برس کے عرصہ میں تمام ملک کو دیسی زبان کی تصنیفات سے مالا مال کر دیا۔ اگر چہ گورنمنٹ کے انعام سے جو محض ترغیب کے لیے مقرر کیا گیا تھا کچھ زیادہ لوگ مستفید نہیں ہوئے اور اشتہار کی میعاد

چند سال بعد گزر گئی، لیکن اس اشتہار کا اثر اُس تمام جماعت میں جو دیسی زبانوں میں تصنیف و تالیف کی لیاقت رکھتی تھی برقی قوت کی طرح دوڑ گیا۔ انھوں نے اپنی تصنیفات سے ملک کو بھی فائدہ عظیم پہنچایا اور خود بھی حق تصنیف سے فائدہ اُٹھانا سیکھ گئے اور اس طرح خاص کر اُردو لٹریچر چند برسوں میں اس قدر ترقی کر گیا جس کی صدیوں تک امید نہ تھی۔

اُسی کی چیخ پکار اور اُسی کی ریس سے اطرافِ ہندوستان میں متعدد پرائیویٹ کالج قائم ہو گئے۔ اُسی نے سب سے پہلے ہندوستانیوں کو سلف ہیلپ کا سبق پڑھایا۔ اُسی نے ان کو اپنے قومی کاموں میں بغیر کسی دباؤ کے چندہ دینا سکھایا۔ اُسی نے اولاد کی تعلیم میں لوگوں کو بے دریغ روپیہ خرچ کرنا بتایا۔ اُسی نے ان کو یہ گُر سوجھایا کہ نالائق اور بے تربیت اولاد کے لیے جائداد خرید کر چھوڑ جانا ان کو دین دُنیا سے کھو دینا ہے اور بڑا سلوک اولاد کے ساتھ یہی ہے کہ جو کچھ ہو سکے اُن کی تعلیم و تربیت میں خرچ کیا جائے۔ اُسی نے خاص کر شمالی ہندوستان میں اولاد کو تعلیم کے لیے بھیجنے کی راہ نکالی۔ اور ایک بہت بڑا گروہ ولایت کے تعلیم یافتہ ہندو اور مسلمانوں کا ملک میں پیدا کر دیا۔

صاحبو! یہ شاعرانہ مبالغے نہیں ہیں بلکہ بالکل صحیح واقعات ہیں جن کا کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا اور اگر کسی کو شبہ ہو تو اس کو چاہیے کہ ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' اور ''تہذیب الاخلاق'' کی جلدیں اول سے لے کر آخر تک دیکھے تا کہ اُس کو معلوم ہو کہ سرسید نے ملک اور قوم کی بھلائی کا کوئی کام جواب تک ہوا ہے ایسا نہیں ہے جس میں اُس مرحوم نے حصہ نہ لیا ہو۔ سب سے بڑی ملک اور قوم کی ہمدرد جماعت آج کل انڈین نیشنل کانگریس سمجھی جاتی ہے۔ اگر چہ سرسید اُس کے طرزِ عمل کو ناپسند کرتے تھے اور اُس اجٹیشین کو بہت بُرا جانتے تھے جو اُس کے بانیوں نے اول اول ہندوستان میں پھیلایا تھا۔ مگر جس اصول پر اُس کی بنیاد رکھی گئی تھی وہ وہی اصول تھا جو سرسید نے ''اسبابِ بغاوت'' کے بیان کرنے میں سب سے پہلے اختیار کیا تھا۔ اور پھر برٹش انڈین ایسوسی ایشن اُسی اصول پر علی گڑھ میں قائم کی تھی۔ میرے ایک عزیز دوست جو ولایت سے ابھی تعلیم پا کر آئے ہیں اُن کا بیان ہے کہ مسٹر ہیوم بانی نیشنل کانگریس نے ولایت میں اُن سے ذکر کیا کہ مجھ کو جو ہندوستان میں

کانگریس قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا وہ صرف سرسید احمد خاں کی کتاب ''اسبابِ بغاوت'' کے دیکھنے سے پیدا ہوا تھا۔ مگر میں نہیں جانتا کہ اب سرسید کی رائے کیوں کر اپنی قدیم رائے کے برخلاف ہوگئی۔

ہم اس موقع پر اس سوال کے متعلق زیادہ بحث کرنی نہیں چاہتے۔ مگر ولایت کے مشہور اخبار ''سینٹ جیمس بجٹ'' میں جو رسالہ ''اسبابِ بغاوت'' پر ریمارک کیا گیا تھا، اُس میں سے ذیل کا فقرہ نقل کرتے ہیں۔ جس سے حاضرین اندازہ کر سکتے ہیں کہ سرسید کے طریقہ میں جو انھوں نے رسالہ ''اسبابِ بغاوت'' میں اختیار کیا تھا اور نیشنل کانگریس کے طرزِ عمل میں کیا فرق تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ

> ''ہمارے نزدیک سید احمد خاں کی شکایتوں کا اثر بہت جلد اور بہت وسعت کے ساتھ پھیلا ہے، بہ نسبت اُن شکایتوں کے جو لال موہن گھوس اور اُس کے اسکول کے نوجوان آدمی نہایت فصاحت کے ساتھ کرتے ہیں۔''

نیز ہوم نیوز نے اسی کتاب کی نسبت لکھا تھا کہ ''سید احمد خاں نے جو غدر کے اسباب تحریر کیے تھے، اُن میں بعض نہایت قیمتی اور عمل درآمد کے قابل تجویزیں پیش کی تھیں جو حکام ہندوستان نے کسی اور ذریعہ سے حاصل نہیں کیں۔ اُس نے نہایت دلیری کے ساتھ اپنی رائے اس معاملہ پر ظاہر کی۔ یہ بات محتاج بیان نہیں ہے کہ حکمران گروہ میں اُس کی رائے نے نہایت اثر پیدا کیا۔ وہ ان اسباب کے بیان کرنے سے خائف نہیں ہوا جن کی طرف غدر کی بخوبی منسوب کیا جاسکتا ہے اور جن کی صحت تجربہ سے پورے طور پر ثابت ہو چکی ہے۔''

مذکورہ بالا ریمارکس سے ظاہر ہے کہ جو اثر صرف ایک شخص کی تحریر نے ایسے غیظ و غضب کے زمانہ میں جیسا کہ غدر کے بعد کا زمانہ تھا گورنمنٹ اور پارلیمنٹ کے خیالات پر اس قدر جلد کیا تھا ویسا اثر نیشنل کانگریس نے جو ہندوستان کے لائق ترین اشخاص کا مجمع ہے اپنی پندرہ برس کی چیخ پکار اور شور وغل سے نہیں کیا۔ اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ سرسید نے اپنی شکایتوں سے گورنمنٹ اور پارلیمنٹ کے سوا کیا ہندوستانی اور انگریز کسی متنفس کو مطلع نہیں

کیا۔ اور کانگریس کے ممبران نے پچاس ہزار رسالے جن میں گورنمنٹ کی سرتاپا شکایتیں درج تھیں، ہندوستان کی بارہ زبانوں میں ترجمہ کرا کر ملک میں عام طور پر تقسیم کیے جن کی نسبت لارڈ ڈفرن نے ایک اسپیچ میں کہا تھا کہ ''کانگریس کے ممبر لاکھوں ناواقف اور زود اعتقاد شخصوں میں اُن رسالوں کے تقسیم کرنے کے جواب دہ ہوئے جو نہایت مشتبہ نیت کے ساتھ لکھے گئے تھے اور جن کا مقصد صریح سرکاری افسروں کے برخلاف لوگوں کی عداوت کا برانگیختہ کرنا تھا۔''

بہرحال اگر بالفرض نیشنل کانگریس کے مقاصد اور اُس کی خواہشوں کو سراسر واجبی اور ملک کے حق میں مفید تسلیم کرلیا جائے تو بھی اُس نے اب تک سرسید کے ایک نفس واحد سے کوئی زیادہ بات اس کے سوا نہیں کی کہ جس گرہ کو سرسید نے ہاتھوں سے کھولا تھا اُس کو کانگریس نے دانتوں سے کھولنے کا ارادہ کیا اور اسی لیے اس کو بہت ہی کم کامیابی ہوئی۔

برٹش انڈین ایسوسی ایشن جو سرسید نے ۱۸٦٦ء میں بمقام علی گڑھ آ کر قائم کی تھی، اُس کا مقصد بھی یہی تھا کہ ہندوستانی اپنے حقوق کی خواہش اور اپنے درد دل اور اپنی شکایتوں کے اظہار کے لیے براہ راست پارلیمنٹ اور گورنمنٹ ہند سے تعلق پیدا کریں۔ مگر چوں کہ ملک میں اُس کے چلانے کی قابلت نہ تھی اس لیے سرسید نے آخر کار اس کا خیال چھوڑ دیا اور اپنے دل میں یہ فیصلہ کرلیا کہ جب تک ہندوستانیوں میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم نہ پھیلے گی اُس وقت تک یہ تمام سوسائٹیاں اور انجمنیں اور ایسوسی ایشن بے سود ثابت ہوں گی۔ چناں چہ ولایت سے واپس آ کر اُنھوں نے تعلیم کی بنیاد ڈالی اور اُس کی ترقی میں فوق العادۃ کوششیں کیں، جن سے آپ سب صاحبان بخوبی واقف ہیں اور جو اُن کی زندگی کا ایک بہت بڑا عظیم الشان کام ہے جس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ مگر ایک دلچسپ فقرہ جو ''ٹائمز آف لندن'' میں اُن کی وفات کے بعد اُن کی تعلیمی کوششوں کے متعلق چھپا تھا اُس کا اس موقع پر نقل کرنا غیر مناسب نہ ہوگا۔ اُس میں سرسید کے بڑے بڑے کاموں کی تفصیل بیان کرنے کے بعد لکھا تھا کہ اس شخص نے ہندوستان کے مسلمانوں کے بیدار کرنے اور ان کو اپنے تنزل اور خاص کر تعلیم کے ضروری معاملہ کا خیال دلوانے میں بہت

محنت اور جاں فشانی فرمائی اور فی الحقیقت جب اس معاملہ میں ان کی عمر بھر کی لگا تار کوششوں اور تعجب انگیز کامیابیوں کو دیکھا جاتا ہے۔ تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ہندوستان کے مسلمانوں میں تعلیم کا پیغمبر کہا جائے۔

صاحبو! یہ جو کچھ میں نے بیان کیا یہ اُس مرحوم کی ملکی اور قومی خدمات کا ایک نہایت مختصر بیان تھا جو محض بطور نمونہ کے حاضرین کی خدمت میں عرض کیا گیا۔ مگر اب تک میں نے اُن کی مذہبی خدمات کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ اُن کی مذہبی خدمات کی میرے دل میں کچھ عظمت نہیں ہے۔ میرے نزدیک اُن کی زندگی کا سب سے بڑا کام ''خطبات احمدیہ'' اور ''تفسیر القرآن'' کا لکھنا ہے۔ مگر اے صاحبو! ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ اُن کی مذہبی خدمات کی جیسی کہ چاہیے مسلمانوں میں قدر ہو۔ مذہبی خیالات کا یقین جس طرح کسی دلیل سے انسان کے دل میں نہیں بیٹھتا بلکہ محض اگلوں کی تقلید سے بیٹھتا ہے۔ اسی طرح اُن کا یقین کسی دلیل سے زائل بھی نہیں ہوسکتا۔ پس سرسید کی مذہبی تصنیفات کی ضرورت اور اُن کی وقعت کیسی ہی پختہ اور مضبوط دلیلوں سے ثابت کی جائے، موجودہ حالت میں ہرگز امید نہیں کہ لوگ اس کو تسلیم کریں۔ مگر میرے نزدیک وہ زمانہ کچھ بہت دور نہیں ہے جب کہ سرسید کی مذہبی خدمات کی پوری پوری قدر کی جائے اور گو اُن کی بعض رائیں اور خیالات قابلِ اعتراض سمجھے جائیں۔ مگر بہت بڑا حصہ اُن کی تحقیقات کا آبِ زر سے لکھنے کے قابل سمجھا جائے گا۔ سرسید نے خود ایک موقع پر اپنی تفسیر کی نسبت کہا تھا کہ ''اگر زمانہ کی ضرورت مجھ کو مجبور نہ کرتی تو میں کبھی ان خیالات کو ظاہر نہ کرتا بلکہ لکھ کر اور ایک لوہے کے صندوق میں بند کر کے چھوڑ جاتا اور یہ لکھ جاتا کہ جب تک ایسا زمانہ نہ آئے اُس کو کوئی کھول کر نہ دیکھے۔ اور اب بھی میں اس کو بہت کم چھپواتا ہوں۔ اور گراں بیچتا ہوں تا کہ صرف خاص خاص لوگ اس کو دیکھ سکیں۔ سر دست عام لوگوں میں اس کا شائع ہونا اچھا نہیں۔''

چوں کہ اس مرحوم کا اپنی تفسیر کی نسبت یہ خیال تھا اس لیے میں مناسب نہیں سمجھتا کہ مسلمانوں کے اس عام مجمع میں ان کی مذہبی خدمات کا ذکر کروں۔ اور اُن کے احسانات کے ضمن میں ایک ایسی دوا کا بیان کردوں جس کی کرواہٹ سر دست محسوس ہوتی ہے۔ اور

اُس کے فوائد ابھی تک نامعلوم ہیں۔ البتہ سرسید کی سرکاری خدمات جن کی بدولت انھوں نے ملک اور قوم کو بے انتہا فائدے پہنچائے اور ہماری آئندہ نسلوں کے لیے ایک عمدہ ترین نمونہ حسن خدمت کا ہیں، بلاشبہ اس قابل ہیں کہ ہر مسلمان کو اُن کا احسان مند اور شکر گزار ہونا چاہیے۔ مگر افسوس ہے کہ اُن کی سرکاری خدمات بھی اس وقت تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کی جاسکتیں۔ اس لیے میں صرف ''پال مال گزٹ'' اور ''سرآ کلینڈ کالون'' کے مذکورۂ بالا فقروں کا پھر اعادہ کرتا ہوں کہ ''جو خدمتیں اُس نے کیں اُن کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا مشکل ہوگا۔'' ''اور کسی زندہ شخص نے عام اس سے کہ وہ انگریز ہو یا ہندوستانی برٹش گورنمنٹ کے استحکام سلطنت ہندوستان کے بارہ میں اس قدر کوشش نہیں کی ہے جیسی کہ سرسید نے کی ہے۔''

ایام غدر کی خدمات کے متعلق صرف جان اسٹریچی کے یہ مختصر الفاظ لکھنے کافی ہیں کہ ''کسی شخص نے اُس نے زیادہ شریفانہ طور پر دلیری اور وفاداری کا ثبوت برٹش گورنمنٹ کے ساتھ نہیں دیا جیسا کہ ۱۸۵۷ء میں سید احمد خاں نے دیا۔ میں کوئی لفظ بھی ایسا استعمال نہیں کرسکتا جس سے اُس کی جاں نثاری کا کافی طور پر اظہار ہوسکے۔''

اب میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ ایسے شخص کی یادگار قائم کرنی جس کے احسانات میں ہمارا بال بال جکڑا ہوا ہے، ہم سب مسلمانوں کا قومی فرض ہے۔ بلکہ سچ پوچھو تو خود اپنے اوپر احسان کرنا ہے کہ جو یونی ورسٹی اُن کی یادگار میں قائم ہونی تجویز ہوئی ہے، وہ ہماری آئندہ نسلوں کے لیے ایک سرجیون چشمہ ہوگی اور ہماری قوم کی سوکھی ہوئی کھیتی کو پھر سرسبز و شاداب کرے گی اور ہماری اولاد کو ہمیشہ اُس شخص کے احسانات یاد دلائے گی، جو اُن عنقا صفت لوگوں میں سے تھا جن کی نسبت کہا گیا ہے ؎

بنی نوع کے ہر مصیبت میں یاور   ہوا خواہِ ملت، بہ اندیشِ کشور
شدائد کے دریائے خوں میں شناور   جہاں کی پُر آشوب کشتی کے لنگر
ہر اک قوم کی ہست و بود ان سے ہے یہاں
سب اس انجمن کی نمود ان سے ہے یہاں

کسی پر ہو سختی، صعوبت ہے ان پر   کسی پر ہو غم، رنج و کلفت ہے ان پر
کہیں ہو فلاکت، مصیبت ہے ان پر   کہیں آئے آفت، قیامت ہے ان پر

کسی پر چلیں تیر، آماج یہ ہیں
لُٹے کوئی رہ گیر، تاراج یہ ہیں

یہ ہیں حشر تک بات پر اُڑنے والے   یہ پیماں کو میخوں سے ہیں جڑنے والے
یہ فوجِ حوادث سے ہیں لڑنے والے   یہ غیروں کی ہیں آگ میں پڑنے والے

اُمنڈتا ہے رُکنے سے اور ان کا دریا
جنوں سے زیادہ ہے کچھ ان کا سودا

جماتے ہیں جب پاؤں، ہٹتے نہیں یہ   بڑھا کر قدم پھر پلٹتے نہیں یہ
گئے پھیل جب، پھر سمٹتے نہیں یہ   جہاں بڑھ گئے، بڑھ کے گھٹتے نہیں یہ

مہم بن کیے سَر، نہیں بیٹھتے یہ
جب اُٹھتے ہیں اُٹھ کر نہیں بیٹھتے یہ

خدا نے عطا کی ہے جو اِن کو قوت   سمائی ہے دل میں بہت اُس کی عظمت
نہیں پھیرتی اُن کا منہ کوئی زحمت   نہیں کرتی زیر اُن کو کوئی صعوبت

بھروسے پہ اپنے دل و دست و پا کے
سمجھتے ہیں ساتھ اپنے لشکر خدا کے

نہیں مرحلہ کوئی دشوار اُن کو   ہر اک راہ ملتی ہے ہموار اُن کو
گلستاں ہے صحرائے پُرخار اُن کو   برابر ہے میدان و کہسار اُن کو

نہیں حائل اُن کے کوئی رہ گزر میں
سمندر ہے پایاب اُن کی نظر میں

زمیں سب خدا کی ہے گلزار انھیں سے   زمانہ کا ہے گرم بازار اُنھیں سے
ملے ہیں سعادت کے آثار انھیں سے   کھلے ہیں خدائی کے اسرار انھیں سے

انھیں پر ہے کچھ فخر ہے گر کسی کو
انھیں سے سے گر ہے شرف آدمی کو

انھیں سے ہے آباد ہر ملک و دولت انھیں سے ہے سرسبز ہر قوم و ملّت
انھیں پر ہے موقوف قوموں کی عزت انھیں کی ہے سب ربعِ مسکوں میں برکت
دم ان کا ہے دُنیا میں رحمت خدا کی
انھیں کو ہے پھبتی خلافت خدا کی
انھیں کا اُجالا ہے ہر رہ گزر میں انھیں کی ہے یہ روشنی دشت و در میں
انھیں کا ظہورا ہے سب خشک و تر میں انھیں کے کرشمے ہیں سب بحر و بر میں
انھیں سے یہ رتبہ تھا آدم نے پایا
کہ سر اُس سے روحانیوں نے جُھکایا

تقریر متعلق وکٹوریا میموریل لائبریری پانی پت

(قلمی مسودہ سے نقل کیا گیا)

(ملکۂ وکٹوریا آنجہانی کے انتقال پر باشندگانِ پانی پت نے کچھ روپیہ ملکہ کی کسی یادگار کے قائم کرنے کے لیے جمع کیا تھا۔ مولانا کی تحریک سے ایک پبلک لائبریری پانی پت میں اُس روپے سے قائم کی گئی اور مولانا اُس کے سکریٹری بنائے گئے۔ یہ تقریر اُسی لائبریری کے متعلق مولانا نے باشندگانِ پانی پت کے ایک عام جلسہ میں فرمائی تھی۔)

جناب صدر انجمن و جملہ حاضرین جلسہ!

آپ سب صاحبوں کو آج اس جلسہ میں ایک ایسے کام کے لیے تکلیف دی گئی ہے جو تمام قصبہ کی بھلائی سے علاقہ رکھتا ہے۔ اور قصبہ کا ہر ایک باشندہ اس میں رائے دینے کا حق رکھتا ہے۔ آپ صاحبوں کو معلوم ہے کہ حضور ملکہ معظّمہ مرحومہ کی وفات پر شہر کے تمام باشندوں نے نہایت جوش وفاداری سے اُس نیک دل ملکہ کی (جس کی نیکی تمام دُنیا میں مشہور ہے) ایک علمی یادگار قائم کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ چناں چہ اس کام کے لیے عام چندہ کی فہرست کھولی گئی اور شہر کے عام باشندوں نے نہایت کشادہ پیشانی سے اس میں اپنی اپنی حیثیت اور مقدور کے موافق چندہ دیا۔ یہاں تک کہ چندہ کی تعداد کچھ اوپر تین ہزار تک پہنچ گئی۔ اولاً سب کی یہ رائے تھی کہ قصبہ میں جو مڈل اسکول ہے اس کو بیادگار ملکہ مرحومہ دو جماعتیں اور اضافہ کر کے ہائی اسکول بنا دیا جائے۔ مگر چوں کہ میونسپل کمیٹی کی امداد بغیر ہائی اسکول قائم ہونا ممکن نہ تھا اور کمیٹی میں اُس وقت روپے کی کمی تھی، اس لیے وہ تجویز پوری نہ

ہوسکی۔ آخر یہ رائے قرار پائی کہ چندہ کے روپے سے ایک کتب خانہ شہر میں قائم کیا جائے جس سے تمام باشندے برابر فائدہ اٹھاسکیں۔ اس رائے کو جناب ٹامسن صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر اور جناب آغا سید جلال شاہ صاحب تحصیل دار نے بھی پسند کیا۔ اور چوں کہ سنہ[1] میں ڈریمنڈ صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر سابق کی تجویز سے کتب خانہ کے واسطے یہ مکان کئی ہزار کی لاگت سے تیار ہو چکا تھا اور اس تیاری میں بھی پبلک ہی کا روپیہ جو جوبلی کے اخراجات سے بچ رہا تھا خرچ ہوا تھا اس لیے ۱۹۰۵ء میں یہ کتب خانہ اس مکان میں قائم کیا گیا۔ چوں کہ اس قصبہ میں ایک عام کتب خانہ کا قائم ہونا جس سے ہر پڑھا لکھا آدمی فائدہ اٹھا سکے بالکل ایک نئی بات ہے اس لیے اصل مطلب بیان کرنے سے پہلے میں کتب خانہ کے فوائد کے متعلق چند الفاظ آپ کے سامنے بیان کرنا چاہتا ہوں۔

آپ کو معلوم ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ صرف اس قدر ہوتی ہے کہ طالب علم اپنی تعلیم پوری کرنے کے بعد اگر کسی علمی یا فن میں کمال حاصل کرنا چاہے تو کتابوں کے مطالعہ سے بغیر استاد کی مدد کے کمال حاصل کرسکتا ہے۔ لیکن جب تک کتابوں کا معقول ذخیرہ موجود نہ ہو کسی علم کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔ اِسی واسطے یورپ میں کوئی چھوٹے سے چھوٹا گاؤں بھی ایسا نہیں پایا جاتا جس میں کم سے کم ایک یا دو عام کتب خانے موجود نہ ہوں۔ یہ کتب خانے لوگوں کے عام چندہ سے قائم کیے جاتے ہیں اور بستی کا ہر ایک باشندہ اُن سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ ایسے کتب خانہ کو پبلک لائبریری کہتے ہیں۔ یورپ میں جو ہمیشہ بڑے بڑے عالم اور مصنف اور موجد اور صنّاع پیدا ہوتے رہتے ہیں اور وہاں کے تمام ملکوں میں علم کا دریا بہتا نظر آتا ہے وہ اُنھیں پبلک لائبریریوں کا صدقہ ہے۔ ہمارے قصبہ کے اکثر اصحاب اس لائبریری کو بالکل بے سود اور نکمّی چیز سمجھتے ہیں اور کتابوں کے خریدنے میں جو روپیہ صرف ہوتا ہے اُس کو روپیہ کا ضائع کرنا جانتے ہیں۔ سبب یہ ہے کہ نیا کام کیسا ہی مفید ہو اول اول لوگ اس سے ہمیشہ وحشت اور نفرت کیا

---

[1] مولانا کے اپنے لکھے ہوئے جس مسودہ سے یہ تقریر نقل کی گئی ہے۔ افسوس ہے کہ اس میں سنہ کی جگہ چھوٹی ہوئی تھی۔

کرتے ہیں۔ سنا ہے کہ یورپ میں جب گھنٹہ ایجاد ہوا تو جس شخص نے سب سے پہلے اس کو خرید کر اپنے کمرے میں رکھا اُس کو تمام رات گھنٹے کی کھٹ کھٹ سے نیند نہ آئی۔ مگر رفتہ رفتہ وہ اس کی آواز سے ایسا مانوس ہو گیا کہ اُس کے بغیر اس کو نیند نہ آتی تھی۔ جب پانی پت میں اول ہی اول مدرسہ قائم ہوا تو بہت ہی کم لوگ اس میں اپنی اولاد کو تعلیم کے لیے بھیجتے تھے مگر اب ہر شخص کی یہ آرزو ہے کہ یہاں بجائے مڈل اسکول کے ہائی اسکول قائم ہو جائے۔ اسی طرح اول اول شفاخانہ میں بہت ہی کم لوگ علاج کے لیے جاتے تھے مگر اب لوگ یہ چاہتے ہیں کہ شہر میں دو شفاخانے جاری ہو جائیں اور بڑے شفاخانہ میں ہوسپٹل اسسٹنٹ کی جگہ اسسٹنٹ سرجن مقرر کیا جائے۔ امید ہے کہ اسی طرح ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ لوگ اس لائبریری کو شہر کے حق میں ایک چشمۂ فیض سمجھیں گے اور گو اُس وقت ہم نہ ہوں گے مگر جن لوگوں کی کوششوں سے یہ لائبریری قائم ہوئی ہے ہمارے بعد اُن کی دل سے قدر کریں گے اور اُن کو شہر کا خیر خواہ سمجھیں گے۔

اب میں اصل مطلب جس کے لیے آپ کو یہاں آنے کی تکلیف دی گئی ہے بیان کرتا ہوں۔ ایک روبکار محکمۂ صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر سے بنام صاحب پریزیڈنٹ میونسپل کمیٹی مورخہ ۲۴رمئی ۱۹۰۶ء اس مضمون کی صادر ہوئی ہے کہ چوں کہ لائبریری کی ذمہ داری ممبران میونسپل کمیٹی کے سپرد کی گئی ہے ان کو چاہیے کہ کمیٹی اول لائبریری کا چارج لے لے اور پھر ایک سب کمیٹی مقرر کرے جس میں ۳ یا ۵ ممبران لائبریری کے لیے مقرر کیے جائیں۔ اسی روبکار میں کمیٹی سے ایک ایسا نقشہ طلب کیا گیا ہے جس سے ظاہر ہو کہ خرچ کرنے کا اور فنڈ اور لائبریری کے انتظام کا کس طرح بندوبست کیا جائے گا۔

اس روبکار کا منشا جیسا کہ ظاہر ہے صاف یہ پایا جاتا ہے کہ لائبریری اور اُس کے انتظام کو میونسپل کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے۔ لیکن ہم کو اس حکم کی تعمیل میں چند عذرات ہیں اور ہم کو امید ہے کہ جناب صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر ان عذرات پر ضرور لحاظ فرمائیں گے۔

(۱) یہ لائبریری پبلک کے چندہ سے حضور ملکہ معظّمہ کی یادگار میں قائم ہوئی ہے۔ اور اس لیے بغیر مرضی چندہ دہندگان کے میونسپل کمیٹی کے سپرد نہیں ہو سکتی۔

(۲) شہر کے عام باشندے میونسپل کمیٹی کو ایک سرکاری محکمہ سمجھتے ہیں پس اگر لائبریری میونسپل کمیٹی کے سپرد کی گئی تو سب لوگ اس کو ایک سرکاری کتب خانہ سمجھیں گے اور ان کو اس کے ساتھ بالکل دلچسپی باقی نہ رہے گی۔

(۳) بعض ممبران نے بیس پچیس روپیہ کی کتابیں اپنی طرف سے لائبریری کی نظر کی ہیں اور کچھ اوپر سو روپیہ کی عربی کی نایاب کتابیں سکریٹری حیدرآباد سے پبلک لائبریری کے لیے اپنے ساتھ لایا ہے جو سرکار نظام کے مطبع سے ہماری لائبریری کو مفت عطا ہوئی ہیں اور کچھ اور کتابیں عنقریب آنے والی ہیں۔ ظاہر ہے کہ لائبریری کو اس قسم کی امداد اسی صورت میں مل سکتی ہے کہ وہ پبلک لائبریری سمجھی جائے اور اس کی ترقی میں لوگ اسی حالت میں کوشش کریں گے کہ اس کو شہر کے عام باشندوں کا کتب خانہ سمجھیں۔ لیکن اگر وہ ایک سرکاری کتب خانہ تصور کیا گیا تو پبلک کا شوق سرد پڑ جائے گا اور لوگوں کی آمد و رفت کتابوں اور اخباروں کے مطالعہ کے لیے بند ہو جائے گی اور اس طرح لائبریری کا چند روز میں خاتمہ ہو جائے گا۔

(۴) یہ لائبریری اُس چندہ سے قائم کی گئی ہے جو شہر کے عام باشندوں نے حضور ملکہ معظّمہ کی یادگار قائم کرنے کے لیے بغیر کسی حاکم یا افسر کے دباؤ کے بڑے شوق سے ادا کیا ہے۔ ایسی لائبریری کو پبلک کے ہاتھ سے نکال کر میونسپل کمیٹی کے ہاتھ میں دے دینا یقیناً اُن کی دل شکنی کا باعث ہوگا۔

(۵) لائبریری ابھی بالکل ابتدائی حالت میں ہے اور ہمارے یہ آرزو ہے کہ اس کو اس درجہ تک ترقی دے جائے جو حضور ملکہ معظّمہ کی یادگار کے شایاں ہو لیکن میونسپل کمیٹی کے ہاتھ میں جانے کے بعد ہم کو امید نہیں ہے کہ ہماری یہ آرزو پوری ہو سکے۔ میونسپل کمیٹی کے ذمہ پہلے ہی رفاہ عام کے بہت سے کام ہیں، وہ زیادہ سے زیادہ لائبریری کو اپنی نگرانی میں حالتِ موجودہ پر قائم رکھ سکتی ہے لیکن اس کو ترقی دینا اور اس کے لیے ہر علم و فن اور ہر زبان کی کتابیں مہیا کرنا اور بک سیلروں سے خط و کتابت کرنا اور اُس کا حساب کتاب صاف رکھنا اور اُس کی جانچ پڑتال کرنا اُس

کی طاقت سے باہر ہے۔

(۶) بے شک ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ایک ایسے پبلک فنڈ کی طرف سے جیسا کہ وکٹوریا میموریل فنڈ ہے ضلع کے حاکم اعلیٰ کو مطمئن کرنا اور اُس کا حساب کتاب ہر وقت صاف رکھنا کمیٹی لائبریری کا فرض ہے۔ چناں چہ ایسی خیال سے ہم نے صاحبان ڈپٹی کمشنر کو (جو کوئی) لائبریری کا پیٹرن یعنی مربی وسرپرست ہمیشہ کے لیے قرار دیا ہے اور اس کی اطلاع ہم جناب ٹامس صاحب بہادر کو گزشتہ موسم سرما میں دے چکے ہیں اور انھوں نے بخوشی پیٹرن ہونا منظور کرلیا ہے۔ اور اب ان کی عدم موجودگی میں جناب آس بورن صاحب بہادر قائم مقام ڈپٹی کمشنر ہماری کمیٹی کے پیٹرن ہیں۔ اس کے سوا تحصیل دار صاحب اور آٹھ ممبر میونسپل کمیٹی کے ہماری کمیٹی کے بھی ممبر ہیں۔ اور ہیڈ ماسٹر صاحب بورڈ اسکول جو کہ ایک معزز عہدہ دار سرکاری ہیں اور سکریٹری میونسپل کمیٹی دونوں ہماری کمیٹی میں سکریٹری شپ کا کام انجام دیتے ہیں۔ مذکورہ بالا تمام عہدے دار اور شہر کا ہر فرد بشر جس نے میموریل فنڈ میں کم یا زیادہ چندہ دیا ہے ہر وقت اختیار رکھتا ہے کہ لائبریری کے انتظام کو آکر دیکھے، اس کے رجسٹروں کو ملاحظہ کرے، جو غلطی ہو اس کی اصلاح کرے اور جو بات لائبریری کے حق میں مفید ہو اس کے لیے سکریٹری یا محرر کو ہدایت کرے۔ اس سے زیادہ لائبریری کی طرف سے صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر اور نیز پبلک کا اور کیا اطمینان ہوسکتا ہے۔

ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ لائبریری کا انتظام ابھی ابتدائی حالت میں ہے اور بہت کچھ اصلاح طلب ہے، اس کے قواعد بھی ابھی تک مکمل نہیں ہوئے مگر زیادہ تر اس کا سبب یہ ہے کہ سکریٹری ایک نہایت ضروری کام کے لیے چھ مہینے تک لائبریری سے غیر حاضر رہا اور اس کی عدم موجودگی میں بہت سے کام بند رہے یہاں تک کہ کتابوں کی خریداری بالکل موقوف ہوگئی۔ مگر اب امید ہے کہ قواعد بھی مکمل ہو جائیں گے اور کتابوں کی خریداری بھی جاری ہو جائے گی۔

تقریر صدارت

(از علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مورخہ ۴؍جنوری ۱۹۰۸ء)

(دسمبر ۱۹۰۷ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا جو سالانہ اجلاس کراچی میں منعقد ہوا تھا۔ مولانا اس کے پریسیڈنٹ تھے۔ نیچے وہ تقریر درج کی جاتی ہے جو آپ نے اس موقع پر صدارتی حیثیت سے فرمائی۔)

حضرات! جو عزت کہ آج مجھ کو آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کا پریسیڈنٹ بنانے سے دی گئی ہے جہاں تک غور کیا جاتا ہے اس کی کوئی معقول وجہ اس کے سوا خیال میں نہیں آتی کہ چوں کہ سندھ میں انگریزی تعلیم گویا بالکل مفقود ہے اس لیے شاید یہ مناسب سمجھا گیا ہے کہ اس موقع پر صدر انجمن ایک ایسے شخص کو بنایا جائے جو انگریزی کا ایک حرف نہ جانتا ہو ورنہ میں اپنے تئیں ہرگز اس جلیل القدر منصب کے لائق نہیں سمجھتا۔ اس کے بعد ہر حال میں اس عزت افزائی کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ اس کے بعد میں نہایت ادب سے تمام حاضرین کی خدمت میں التماس کرتا ہوں کہ اس عظیم الشان خدمت کے ادا کرنے میں میری کم لیاقتی کے سبب جو فروگزاشت یا کوتاہی ظہور میں آئے اُس سے درگزر فرمائی جائے اور آج کی صدارت کو اُن عالی درجہ اور عالی مقام بزرگوں کی صدارت کے پیمانہ سے نہ جانچا جائے۔ جو گزشتہ اجلاسوں میں اس معزز کرسی پر جلوس فرما چکے ہیں۔

صاحبو! پہلے اس سے کہ کانفرنس کے اصلی مقصد کے متعلق کچھ بیان کیا جائے میں چند الفاظ اُس دردناک واقعہ کی نسبت عرض کرنا چاہتا ہوں جس سے نہ صرف ہماری قوم کو بلکہ خاص کر محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کو بھی نہایت سخت صدمہ پہنچا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ

سرسید احمد خاں مرحوم نے ۱۸۸۶ء میں بعد قیام مدرستہ العلوم علی گڑھ کے اس کانفرنس کی بنیاد اس لیے ڈالی تھی کہ اس کے ذریعہ سے تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں تعلیم کی منادی کی جائے۔ چناں چہ اُس قوم کے فدائی نے باوجود کبرسن اور طرح طرح کے موانع اور معذوریوں کے جس طرح اول کالج کے لیے لمبے لمبے سفر کیے۔ اسی طرح پبلک کے مختلف مقامات میں خود پہنچ کر کانفرنس کے اجلاس منعقد کرائے اور ایک حد تک تعلیم کی منادی اطراف و جوانب میں کر کے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا۔ لیکن اس مرحوم کی زندگی میں کانفرنس کا دورہ صرف پنجاب اور ممالک متحدہ کے چند خاص خاص شہروں میں محدود رہا۔ ان کی وفات کے بعد جب کہ تمام قوم پر مایوسی چھائی ہوئی تھی اور کالج اور کانفرنس ملکہ تمام قومی کاموں کی طرف سے مختلف قسم کے تردد آمیز خیالات دلوں میں موج زن تھے، خدائے تعالیٰ نے اپنی رحمتِ کاملہ سے قوم کی کشتی بانی کے لیے ایک ایسے شخص کو کھڑا کر دیا جس نے کالج اور کانفرنس دونوں کے حق میں فی الحقیقت مسیحائی کا کام دیا اور قوم کے مردہ اور افسردہ دلوں میں از سر نو جان ڈال دی اور پانچ سو برس کے بعد لسان الغیب کی یہ بشارت پوری ہوئی کہ

فیض روح القدس ازباز مدد فرماید
دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا میکرد

آپ سب صاحب سمجھ گئے ہوں گے کہ اس قوم کے مسیحا سے میری کیا مراد ہے۔ خدائے تعالیٰ نواب محسن الملک کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے، انھوں نے کالج اور کانفرنس کو سرسید رحمتہ اللہ علیہ کے بعد صرف اپنی قدیم حالت ہی پر قائم نہیں رکھا بلکہ چند سال کے عرصہ میں دونوں کی بالکل کایا پلٹ دی اور اُن کو اس درجہ تک پہنچا دیا جو امید و توقع اور وہم و گمان سے بالاتر تھا۔ نواب محسن الملک کے عہد میں جو غیر مترقبہ ترقیات کالج کو نصیب ہوئیں اُن کی تفصیل بہت طولانی ہے جس کے بیان کرنے کا یہ محل نہیں ہے مگر جو وسعت اور عام قبولیت کانفرنس کو اُن کی بدولت حاصل ہوئی وہ بھی ایک کارنامہ ہے جو مسلمانوں میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ ہندوستان کا کوئی حصہ (الاماشاء اللہ) ایسا باقی نہیں رہا جہاں اس

جواں مرد کہن سال کی کوشش اور حسن تدبیر سے کانفرنس کا قدم نہیں پہنچا۔ کلکتہ، مدراس، بمبئی اور ڈھاکہ جیسے دور دست مقامات میں پہنچ کر اُس نے کانفرنس کے اجلاس نہایت دھوم دھام اور تزک و احتشام کے ساتھ منعقد کیے اور مسلمانوں کی موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لیے عالی ہمتی اور جفا کشی کی ایک مثال قائم کر دی۔

مدراس میں سوتوں کو جگایا جا کر
غل علم کا برہما میں مچایا جا کر
چھائی ہوئی مردنی جہاں قوم میں تھی
وہاں آبِ حیات ان کو پلایا جا کر

افسوس ہے کہ اس وقت وہ ہم میں موجود نہیں ہے مگر اُس کی جدائی کا داغ بطور قائم مقام کے ہمارے دل میں موجود ہے اور اُس کی یاد نشتر کی طرح ہمارے سینے میں کھٹک رہی ہے۔ کئی سال سے نواب محسن الملک کی صحت نہایت نازک چلی آتی تھی اور نہایت شدید امراض نے اُن کو مغلوب کر لیا تھا مگر وہ ہر حالت میں برابر قوم کی خدمت کرتے رہے اور بیماریوں سے ہمیشہ لڑتے رہے۔ یہاں تک کہ اُن کا وقت آ پہنچا اور قوم اُن کی جلیل القدر خدمات سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

جس وقت کا کھٹکا تھا وہ وقت آ گیا آخر
یاروں پہ مصیبت کا سماں چھا گیا آخر
وہ ملک کا محسن وہ مسلمانوں کا غم خوار
سر کر کے مہم قوم کی کام آ گیا آخر
سید کا بدل قوم کو مشکل سے ملا تھا
اس کو بھی وہی قوم کا غم کھا گیا آخر
رہنا تھا زبس قوم کی تقدیر میں بے کس
لکھا ہوا تقدیر کا پیش آ گیا آخر
نکبت کا پتہ ڈھونڈتا پھرتا تھا مقدر
نکبت کا مقدر کو پتہ پا گیا آخر

جتیا تھا تو لوگوں کو گماں اس پہ تھے کیا کیا
پر مرکے خلوص اپنا وہ منوا گیا آخر

جو خندہ زنی کرتے تھے ہر کام پہ اُس کے
وہ خون کے آنسو اُنھیں رُلوا گیا آخر

یوں جیتے ہیں یوں مرتے ہیں قوموں کے فدائی
دُنیا کو تماشا یہ وہ دکھلا گیا آخر

مہدی کے لیے قوم عزادار ہے ساری
کہرام ہے کشمیر سے تا راس کماری

صاحبو! فی الواقع نواب محسن الملک کا اس وقت دُنیا سے اُٹھ جانا ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے عموماً اور اس کانفرنس کے لیے خصوصاً ایک ایسا صدمہ تھا کہ اگر خدا کی مہربانی ہمارے شامل حال نہ ہوتی تو اُس کی تلافی امکان سے خارج تھی۔ مگر میں تمام ممبران کانفرنس کو مبارک باد دیتا ہوں کہ قوم نے بالاتفاق نواب مرحوم کا جانشین ایک ایسے معزز و محترم شخص کو منتخب کیا ہے جس کی ذات سے مرحوم کے بعد مسلمانوں کو وہی امیدیں ہیں جو سرسید کے بعد نواب محسن الملک کی ذات سے تھیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہندوستان کے تمام اسلامی اخبار، تمام اسلامی انجمنیں اور تمام ٹرسٹیان محمڈن کالج بغیر کسی استثنا کے اس بات پر متفق ہو گئے کہ بجائے نواب مرحوم کے محمڈن کالج اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا آنریری سکریٹری نواب وقار الملک بہادر انتصار جنگ مولوی مشتاق حسین صاحب کو بنایا جائے اور یہ اتفاق اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ یہ انتخاب قوم کے حق میں کالج کے حق میں اور اس کانفرنس کے حق میں خدا کی رحمت ثابت ہوگا۔ کیوں کہ مخبر صادق علیہ وآلہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ **ماراٰہ المسلمون حسناً فھو عنداللّٰہ حسن**. یعنی ''جس بات کو تمام مسلمان بہتر سمجھیں وہی خدا کے نزدیک بھی بہتر ہے۔'' نواب محسن الملک کی وفات اور اُن کے بعد نواب وقارالملک کی جانشینی پر بالکل اس شعر کا مضمون صادق آتا ہے:

عیش رمضاں آمد و ماہ رمضاں رفت
صد شکر کہ ایں آمد و صد حیف کہ آں رفت

صاحبو! اس ناگزیر تمہید کے بعد میں اصل مطلب کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ واضح ہو کہ آج کا اجلاس جو ملک سندھ کے اس مشہور بندرگاہ میں منعقد ہوا ہے ہماری کانفرنس کا اکیسواں اجلاس ہے لیکن جو خصوصیت کہ ملک سندھ کو اسلام کے ساتھ ہے اس کے لحاظ سے یہ ملک اس بات کا مستحق تھا کہ اہل اسلام کی کانفرنس کا سب سے پہلا اجلاس اس ملک میں ہوتا۔ عربی لٹریچر میں جس کثرت سے سندھ کا نام آتا ہے۔ ہندوستان کے کسی دوسرے حصے کا نام نہیں آتا کیوں کہ ہندوستان میں جس حصہ سے عرب کو سب سے پہلے واقفیت ہوئی وہ یہی ملک سندھ تھا۔ یہی وہ خطہ ہے جس کو سب سے پہلے محمد بن قاسم ثقفی نے پہلی صدی ہجری کے اخیر میں فتح کر کے یہاں بنی امیہ کی سلطنت کا جھنڈا گاڑا اور گویا کہ مسلمان کشور کشاؤں کے لیے ہندوستان کی آئندہ فتوحات کا دروازہ کھول دیا۔ یہی ملک ہے جہاں ہندوستان میں سب سے پہلے علمائے اسلام کے حلقۂ درس قائم ہوئے اور فتح کے بعد ایک صدی میں تمام خطہ محدثین وفقہا کی کثرت سے عراق وشام کو نمونہ بن گیا۔ یہی وہ سرزمین تھی جس کو عرب اپنے اصلی وطن سے زیادہ عزیز سمجھنے لگے تھے۔ محمد بن قاسم کے حسن انتظام اور عمدگی قوانین کی وجہ سے یہ ملک نہ صرف ریگستان ہونے کے لحاظ سے بلکہ دین و مذہب، مذاق و عادت اور اوضاع و اطوار کی حیثیت سے بھی سرزمین عرب کی سچی تصویر بن گیا تھا اور جیسا کہ حال کے ایک مشہور مصنف نے لکھا ہے اس نوجوان فاتح کی چند روز کی حکمرانی نے جو گہرا اور پائدار نقش اہل سندھ کے دلوں پر جما دیا تھا ایسا نقش پٹھانوں اور مغلوں کی سلطنتیں پانچ سو برس میں بھی نہیں جما سکیں۔ مگر افسوس ہے کہ جو حال ہندوستان کے عام مسلمانوں کی غفلت اور بے پرواہی کا زمانۂ حال کی تعلیم کی طرف سے دیکھا جاتا ہے ویسا ہی بلکہ اُس سے بہت زیادہ سندھ کے مسلمانوں کا حال نظر آتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ابتدائے قیام کانفرنس سے لے کر اب تک جس کو بیس اکیس برس کا عرصہ گزر چکا ہے کوئی تحریک ملک سندھ کی طرف سے کانفرنس کے مدعو کرنے کے لیے نہیں ہوئی۔ سب سے پہلے سالِ گزشتہ

میں آنریبل سردار محمد یعقوب خاں مرحوم نے اس باب میں سلسلۂ جنبانی کی تھی اور ایک مختصر رپورٹ مسلمانان سندھ کی تعلیمی حالت کے متعلق قلم بند کر کے آنریری سکریٹری کانفرنس کے پاس بھیجی تھی۔ مگر افسوس ہے کہ اُن کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ اپنی زندگی میں کانفرنس کو یہاں نہ بلا سکے۔ لیکن ان کی وفات کے بعد اُن کے معزز جانشین جناب آنریبل خان بہادر شیخ صادق علی وزیر حال ریاست خیر پور سندھ نے اس منصوبے کو جو سردار صاحب مرحوم نے باندھا تھا بہ سرپرستی ہز ہائنس میر صاحب خیر پور سندھ بوجہ احسن پورا کیا ہے جس کا نتیجہ اس وقت ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

حضرات! اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی اطلاع کے لیے سردار صاحب مرحوم کی مذکورۂ بالا رپورٹ اور نیز بعض دیگر بہی خواہانِ قوم کے بیان کا خلاصہ نہایت مختصر الفاظ میں آپ کے سامنے بیان کروں، جس سے آپ سندھ کے مسلمانوں کی ترقی یا تنزل کا کسی قدر اندازہ کر سکیں۔ مذکورہ بالا ذریعوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سندھ میں مسلمانوں کی آبادی بمقابلہ دیگر اقوام کے بہت زیادہ ہے۔ یعنی منجملہ ۳۲ لاکھ دس ہزار نوسو دس نفوس کے جو کہ سندھ میں آباد ہیں۔ ۲۴ لاکھ ۴۶ ہزار ۴ سو ۸۹۔ یعنی تین چوتھائی سے زیادہ ہیں۔ ۱۸۴۳ء میں جب کہ یہ ملک آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضہ میں آیا اُس وقت گیارہ سو برس سے زیادہ زمانہ اُس کے مسلمانوں کے تحت حکومت رہتے گزر چکا تھا۔ اب بھی تمام کاشت کار اور تمام جاگیر دار مسلمان ہیں اور انگریزی عمل داری سے پہلے تمام اراضی کے مالک مسلمان تھے۔ مسلمانوں کے سوا کسی قوم کے پاس ایک ایکڑ زمین بھی نہ تھی۔ البتہ اب مہاجنوں اور دیگر اقوام نے مختلف طریقوں سے زمین کا بہت سا حصہ حاصل کر لیا ہے۔ لیکن اب بھی زمین داری کا بہت بڑا حصہ مسلمانوں ہی کے قبضہ میں ہے، یعنی تین چوتھائی سے زیادہ زمین مزروعہ مسلمانوں کی ملکیت میں ہے۔ مگر باوجود ان تمام فوقیتوں کے جو سندھ کے مسلمانوں کو اب تک حاصل ہیں جب ان کا حال اس معیار سے دیکھا جاتا ہے جو آج کل قوموں کی پستی اور عروج کا معیار ہے تو نہایت مایوسی ہوتی ہے۔ تعلیم، تجارت، صنعت و حرفت اور سرکاری ملازمت یہی وہ چیزیں ہیں جو کسی قوم کی

ترقی یا تنزل کی خبر دیتی ہیں۔ مگر سندھ کے عام مسلمان ان میں سے ہر ایک حیثیت کے لحاظ سے نہایت پست حالت میں ہیں۔ اگرچہ اہل اسلام کی حالت تعلیم کے لحاظ سے تمام ہندوستان میں بمقابلہ دیگر ابنائے وطن کے عموماً قابل افسوس ہے مگر سردار صاحب رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ کسی صوبے کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت اس قدر ابتر نہ ہوگی جیسی کہ یہاں کے مسلمانوں کی حالت ہے۔ بی.اے پاس مسلمانوں کی تعداد انھوں نے بمقابلہ دوسو ہندو گریجویٹس کے تمام سندھ میں صرف دس لکھی ہے۔ مگر میں نے سنا ہے کہ ان دس میں ایک آدھ کے سوا سب کراچی کے غیر سندھی باشندے ہیں جو تجارت کی غرض سے یہاں بود و باش رکھتے ہیں۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ڈاکٹری، سائنس اور انجینئرنگ میں بمقابلہ ۲۰ ہندوؤں کے صرف ایک مسلمان ڈگری یافتہ ہے۔ بیرسٹروں اور ایل ایل بی پلیڈر اس صوبہ میں دوسو سے زاید ہیں، جن میں مسلمان صرف بیس ہیں۔ اور منجملہ ایک سو بیس طلبہ کے جو گزشتہ سال انٹرنس کے امتحان میں کامیاب ہوئے صرف ۱۲ مسلمان تھے۔ مجھے معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ سندھ کے مسلمانوں میں صرف انگریزی تعلیم ہی کی کمی نہیں ہے بلکہ عربی، فارسی یہاں تک کہ سندھی زبان میں بھی اُن کی تعلیم کا تقریباً ایسا ہی حال ہے۔ فیصدی ایک دو سے زیادہ نوشت و خواند نہیں کرسکتے۔ برخلاف اس کے ہندوؤں میں نہ صرف انگریزی تعلیم کی ترقی ہے بلکہ فارسی تعلیم بھی قدیم زمانے سے اُن میں چلی آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملازمت سرکاری گویا ہندوؤں کا حصہ ہوگئی ہے سردار صاحب لکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں تعلیم کی کمی کے سبب اُن کے ہاتھ سے ہر قسم کی سرکاری نوکریاں نکل گئی ہیں اور یہی حال پیشہ اور صنعت و حرفت کا ہے۔ سندھ میں ایک ہندو صاحب سشن جج اور ایک اسٹنٹ جج ہیں مگر اس درجے کا کوئی عہدہ کسی مسلمان کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ بیس سب ججوں میں صرف ایک شخص مسلمان ہے اور محکمۂ مال میں منجملہ بیس ڈپٹی کلکٹروں کے صرف تین مسلمان ہیں اور باقی سب ہندو اور منجملہ ۲۷ تحصیل داروں کے صرف ۲۲ مسلمان اور باقی سب ہندو ہیں۔

۵۔ ۱۹۰۶ء میں صیغۂ اصلاح تمدن کے کسی ممبر نے دو مضمون سندھ کی تمدنی اور

تعلیمی حالت پر نہایت تفصیل کے ساتھ لکھے تھے جن میں ثابت کیا گیا تھا کہ سندھ کے مسلمانوں کی تمدنی اور تعلیمی حالت ہندوستان کے تمام صوبوں سے گئی گزری ہے۔مگر خدا کا شکر ہے کہ زمانہ آہستہ آہستہ اہل سندھ کو ترقی کی طرف مائل کرتا جاتا ہے۔اُن کو اپنی پستی اور تنزل کا احساس ہونے لگا ہے۔گورنمنٹ بھی اُن کے معروضات پر زیادہ توجہ اور اُن کے حقوق پر زیادہ لحاظ فرمانے لگی ہے، کراچی کا اسلامی مدرسہ جو مرحوم خان بہادر حسن علی صاحب کی مساعیِ جمیلہ کا نتیجہ ہے ترقی کرتا جاتا ہے۔خصوصاً جب سے کہ مسٹر وائنس اس مدرسہ کے پرنسپل مقرر ہوئے ہیں، اُس کے نتائج خاطر خواہ ظہور میں آ رہے ہیں۔ لڑکانہ میں وہاں کے زمین داروں کی کوشش اور مسٹر پڑ آئی سی. ایس کلکٹر لڑکانہ کی خاص توجہ سے ایک مدرسہ جس میں انگریزی کی پانچوں جماعت تک تعلیم دی جاتی ہے قائم ہو گیا ہے جس کے ساتھ ایک بورڈنگ ہاؤس بھی ہے۔۱۹۰۲ء میں جو مسٹر علی محمد خاں دہلوی بیرسٹر ایٹ لا کی کوشش سے لوکل محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ منعقد ہوا تھا اُس کے نتائج خاطر خواہ ظہور میں آئے ہیں۔گورنمنٹ نے کانفرنس کی کارروائی پر نہایت شفقت آمیز رزولیوشن پاس کیا اور ایک کمیٹی موسوم بہ محمڈن ایجوکیشنل کمیٹی مقرر فرمائی جس کی تجویز سے ایک چھوٹا سا رزیڈنشل مدرسہ ضلع حیدرآباد کے شمال میں کھولا گیا اور جیسا کہ سردار صاحب مرحوم کی رپورٹ میں درج ہے دوسرا مدرسہ ضلع حیدرآباد کے جنوب میں کھلنے والا تھا اور تیسرا کلرک آباد میں اور چوتھا ان سب مدرسوں کی نسبت بڑے پیمانے پر ضلع تھار اور پا گڑھ کے مقام بتپار میں، جس کی عمارت تیار ہو چکی ہے، جاری ہونے والا ہے۔پانچواں سکھر میں کھولا جانا تجویز ہوا ہے جس کا کچھ سرمایہ جمع بھی ہو گیا ہے اور جس کی عمارت کے واسطے زمین لے لی گئی ہے۔اسی طرح سندھ کے کل اضلاع میں ایک ایک مدرسہ جاری کرنے کا سامان ہو چکا ہے اور خاص کر حیدرآباد میں دو مدرسے قائم کرنے کا ارادہ ہے۔مگر سردار صاحب مرحوم کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورۂ بالا مجوزہ مدارس کے لیے روپیہ کی بہت ضرورت ہے۔ صرف مدرسہ کراچی کا بورڈنگ ہاؤس بڑھانے کے لیے جس میں زیادہ طلبہ کی گنجائش نہیں معلوم ہوتی پچاس ہزار روپیہ کی ضرورت ہے جس میں سے چھ ہزار روپیہ ریاست خیر پور

نے عطا کیا ہے اور بیس ہزار روپیہ عام مسلمانوں کے چندہ سے وصول کیا گیا ہے۔

بہرحال اس میں شک نہیں کہ سندھ کے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم سے مستفید ہونے کا خیال شروع ہوگیا اور قدیم تعصّبات جو انگریزی تعلیم سے مانع آتے تھے سندھ میں بھی مثل اور صوبوں کے روز بروز کم ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن بڑی مشکل یہ ہے کہ اور صوبوں کی طرح یہاں بھی بغیر امدادی وظائف کے مسلمانوں کا تعلیم پانا نہایت دشوار ہے۔ جو لوگ تعلیم پانے کی استطاعت رکھتے ہیں وہ تعلیم سے بھاگتے ہیں اور جو تعلیم کے خواہاں ہیں وہ استطاعت نہیں رکھتے۔ اگرچہ مسلمانوں کی خوش قسمتی سے گورنمنٹ اُن کی تعلیم کی طرف نہایت متوجہ پائی جاتی ہے اور ریاست خیرپور سے بھی اُن کو بہت کچھ امداد کی توقع ہے لیکن پھر بھی سندھ کے مسلمانوں میں تعلیم کا پھیلنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ جس قوم کی حالت تعلیم سے اس قدر بعید ہو کہ اپنی مادری زبان میں بھی نوشت و خواند کرنے والے نہایت کمیاب ہوں اُن کو انگریزی تعلیم سے مانوس کرنا ایک نہایت دشوار گزار مرحلہ ہے۔ جب تک قوم میں ایسے بہت سے جواں مرد صاحب استقلال اور قوم کے ہمدرد پیدا نہ ہوں گے جیسے کہ مرحوم خان بہادر حسن علی آئی مدرسۂ کراچی تھے یا جیسے مسٹر دہلوی بیرسٹرایٹ لا اب موجود ہیں اُس وقت تک صرف گورنمنٹ کی توجہ اور ہز ہائنس میر خیرپور کی امداد سے کام نہیں چل سکتا۔

سرسید احمد خاں مرحوم نے جب علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کرنے کا ارادہ کیا تھا سب سے پہلے اُنھوں نے اس بات کے دریافت کرنے کے لیے کہ مسلمان کیوں اپنی اولاد کو سرکاری مدارس میں تعلیم کے لیے نہیں بھیجتے، ایک انعامی اشتہار جاری کیا تھا تاکہ بہت سے لائق آدمی اس مضمون پر اپنی اپنی رائے ظاہر کریں۔ چناں چہ (۳۲) مضمون مختلف لوگوں کے اُن کے پاس پہنچے جن کا ماحصل یہ تھا کہ سرکاری طریقۂ تعلیم جس کو سرکار کسی خاص فرقہ کی حالت کے موافق بدل نہیں سکتی۔ مسلمانوں کی ضرورتوں کے لیے کافی نہیں ہے اور مسلمانوں کو اپنے علوم قدیمہ کے محفوظ رکھنے، علوم جدیدہ سے مستفید ہونے اور اپنی تمام ضرورتوں کے موافق اپنی اولاد کو تعلیم و تربیت کرنے کے لیے اس کے سوا

کچھ چارہ نہیں کہ اپنی تعلیم کی فکر آپ کریں۔
صاحبو! میں سمجھتا ہوں کہ جو مشکلات سندھ کے مسلمانوں کی تعلیم کی سدراہ ہیں اگرچہ ان میں سے بہت سی ایسی ہیں جو گورنمنٹ کی توجہ سے رفع ہوسکتی ہیں لیکن بعض ایسی بھی ہیں کہ جب تک خود قوم کے لیڈر اُن کے حل کرنے کی طرف متوجہ نہ ہوں، ہرگز رفع نہیں ہوسکتیں۔ یہاں میں چند مشکلات کا جو معتبر ذریعوں سے مجھے معلوم ہوئے ہیں، ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ اوّلاً سندھ کے مسلمانوں میں تعلیم کے عام نہ ہونے کی بڑی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اب تک لوکل سس فنڈ سے ابتدائی مدارس زیادہ تر ایسے مقامات میں قائم ہوتے رہے ہیں جہاں ہندوؤں کی آبادی زیادہ ہے اور مسلمان آسانی سے وہاں اپنی اولاد کو تعلیم کے لیے نہیں بھیج سکتے۔ اس کے سوا مدارس میں اُستاد اکثر ہندو ہیں جن کی نسبت یہ شکایت سننے میں آتی ہے کہ اُن کا برتاؤ مسلمان طلبہ کے ساتھ ہمدردانہ اور مشفقانہ جیسا کہ اُستادوں کا برتاؤ شاگردوں کے ساتھ ہونا چاہیے نہیں کہہ سکتا کہ یہ شکایت کہاں تک صحیح ہے۔ لیکن تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ ابتدا میں مسلمانوں کی اولاد کو تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں کہ اُن کی تعلیم کے لیے زیادہ تر مسلمان اُستاد مقرر کیے جائیں۔ دلّی میں انگریزی تعلیم مدت دراز سے جاری تھی مگر ۱۸۵۷ء سے پہلے وہاں کے مسلمان تعلیم سے ہمیشہ متنفر رہے حالاں کہ وہاں کے ایک مسلمان نواب نے ایک لاکھ ستر ہزار روپیہ اہل دہلی کی تعلیم کے لیے گورنمنٹ کے سپرد اس لیے کیا تھا کہ اُس کے منافع سے دہلی کے طلبہ کو وظائف دیئے جایا کریں، باوجود اس کے کہ فنڈ سے مسلمانوں نے بہت ہی کم فائدہ اُٹھایا۔ لیکن غدر کے بعد گورنمنٹ نے اس فنڈ کی آمدنی سے ایک علیحدہ مدرسہ بنام اینگلو عربک اسکول خاص مسلمانوں کے لیے قائم کردیا اور اُس میں یہ شرط لگادی کہ یہاں کل استاد مسلمان رکھے جائیں۔ اس تدبیر سے چند روز میں دہلی کے مسلمان یک قلم تعلیم کی طرف متوجہ ہوگئے، یہاں تک کہ ایک عرصہ کے بعد مدرسہ مذکور مڈل اسکول سے ہائی اسکول بنادیا گیا۔ اس وقت دہلی میں جس قدر گریجویٹ، انڈر گریجویٹ اور انٹرنس پاس مسلمان پائے جاتے ہیں، سب اسی مدرسہ سے ابتدائی تعلیم پاکر نکلے ہوئے ہیں۔ اس قسم کی اور بھی بہت

سی مثالیں دی جاسکتی ہیں جن میں سب سے بڑی اور بدیہی مثال ایم.اے.او کالج علی گڑھ ہے، جہاں ابتدائی تعلیم زیادہ تر مسلمان اُستاد دیتے ہیں۔ پس سب سے پہلے یہاں کہ مسلمانوں میں تعلیم پھیلانے کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ مجوزہ مدارس جو سندھ میں ہر ایک ضلع میں قائم ہونے قرار پائے ہیں جہاں تک ممکن ہو وہ ایسے مقامات میں قائم کیے جائیں جہاں مسلمانوں کی اولاد آسانی سے تعلیم کے لیے جاسکے اور گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ اُن مدرسوں میں ہندو اور مسلمان اُستاد اُسی نسبت سے مقرر کیے جائیں جس نسبت سے کہ ہندو اور مسلمان طلبہ اُن میں داخل ہوں۔ اول اول سندھ میں مسلمان اُستاد بلاشبہ مشکل سے مل سکیں گے لیکن موجودہ حالت میں علی گڑھ کالج یا لاہور کے اسلامیہ کالج سے کسی قدر زیادہ تنخواہ پر بلائے جاسکتے ہیں۔ جس طرح مسلمان استادوں کے مقرر کرنے کی ضرورت ہے اُسی طرح معائنہ کرنے والے افسروں میں بھی مسلمانوں کا ہونا کچھ کم ضروری نہیں ہے۔

دوسری مشکل جو مسلمانوں کی تعلیم میں درپیش ہے وہ سرکاری مدارس میں مذہبی تعلیم کا نہ ہونا ہے اور یہ ایسی مشکل ہے جس کا حل کرنا خود ہمارے ہاتھ میں ہے نہ کہ گورنمنٹ کے ہاتھ میں۔ کیوں کہ گورنمنٹ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ہندوستان کی بے شمار قوموں میں سے کسی خاص قوم کی مذہبی تعلیم یہاں تک کہ عیسائی مذہب کی تعلیم بھی اپنے مدارس میں جاری نہیں کرسکتی۔ پس ضرور ہے کہ جو ابتدائی مدارس سندھ کے اضلاع میں قائم کیے جائیں اُن میں مذہبی تعلیم کا انتظام خود قوم کی طرف سے کیا جائے۔ میں سنتا ہوں کہ سندھ میں جس طرح دنیوی تعلیم مفقود ہے اسی طرح مذہبی تعلیم کی طرف سے بھی یہاں انتہا درجہ کی غفلت اور بے پرواہی پائی جاتی ہے۔ مجھے میرے ایک ثقہ دوست نے بیان کیا کہ سندھ میں ایک موقع پر تین نوجوان مسلمان موجود تھے۔ میں نے اسلامی روایات سے اُن کی حد سے زیادہ ناواقفیت دیکھی تو امتحاناً اُن سے یہ سوال ''کیا تم یہ بھی جانتے ہو کہ تمہارا نبیؐ کون ہے؟'' ایک نے کہا: ''امام حسین (چیرز)'' دوسرے نے کہا: ''فیض محمد خاں میر پور (چیرز)'' اور تیسرے نے کہا: ''پیر بگھارا (چیرز)'' اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ سندھ میں مذہبی تعلیم کا کیا حال ہے۔ جو

لوگ کراچی یا حیدرآباد میں رہتے ہیں وہ اس حکایت کوسن کر بلاشبہ تعجب کریں گے مگر جولوگ دیہات کی حالت سے خبردار ہیں ان کواس سے کچھ بھی تعجب نہیں ہوتا۔

تیسری مشکل اور سب سے بڑی اور سخت مشکل وظائف کے لیے سرمایہ مہیا کرنا اور قوم کے ہونہار بے استطاعت لڑکوں کو امدادی وظائف دے کر مختلف مدرسوں اور کالجوں میں تعلیم کے لیے بھیجنا ہے۔ بالفعل کراچی کا اسلامیہ اسکول اور لڑکانہ کا مدرسہ اور حیدرآباد و سکھر وغیرہ کے مجوزہ مدارس بشرطیکہ وہ بہمہ وجوہ مکمل ہو جائیں سیکنڈری تعلیم تک کافی ہیں اور اعلیٰ تعلیم کے لیے کراچی میں گورنمنٹ کالج موجود ہے اور اگر کافی امداد طلبہ کو دی جائے تو لاہور کے اسلامیہ کالج اور علی گڑھ کے محمڈن کالج میں بھی اُن کو بھیجا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کی نسبت یہ بات مشہور ہے کہ اُن سے تعلیم کے لیے چندہ وصول کرنا نہایت مشکل ہے، مگر تجربہ سے ثابت ہو گیا ہے کہ اگر چندہ وصول کرنے والے ہوں تو چندہ دینے والوں کی کمی نہیں ہے۔ ہاں اس میں شک نہیں ہے کہ چندہ مانگنے والے جس قدر زیادہ ذی وجاہت، زیادہ ذی رتبہ اور زیادہ اعتبار والے ہوں گے، اُسی قدر چندہ فراہم کرتے میں زیادہ کامیابی ہوگی۔ پس جب تک کہ قوم کے ممتاز لوگ اس کام کے لیے کھڑے نہ ہوں گے اور جب تک کہ وہ قوم کے لیے گداگری کرنے کو بجائے ننگ و عار سمجھنے کے ذریعۂ فخر و مباہات نہ سمجھیں گے روپیہ تحصیل کرنا سخت مشکل ہے۔ تعلیم روز بروز گراں ہوتی جاتی ہے اور بے مقدور لوگوں کے لیے جو سب سے زیادہ تعلیم کے خواہاں ہیں، اُس کا میدان تنگ ہوتا جاتا ہے۔ پس نہایت ضرورت اس بات کی ہے کہ یا تو ذی مقدور لوگوں میں ایسے بہت سے عالی ہمت اشخاص پیدا ہوں جو اپنی دولت کا ایک حصہ قوم کی تعلیم میں صرف کریں اور اپنی ہم وطن قوموں کے اہل ہمت سے سبق حاصل کریں جو لاکھوں روپیہ اور لاکھوں کی جائداد قوم کی بھلائی کے لیے وقف کر رہے ہیں۔ یا چند جواں مرد کمر ہمت باندھ کر اور جھولی گلے میں ڈال کر کھڑے ہو جائیں اور قوم کے بچوں کے لیے گداگری اختیار کریں۔ سرسید کی کامیابی کا بھید زیادہ تر اسی گداگری میں چھپا ہوا ہے۔ ان کے ایک دوست کے پوتا پیدا ہوا تھا۔ اُن سے پوتے کے ہونے کی خواہش میں چراغی کے پانچ روپے طلب کیے جس پر اُن

کے دوست نے ایک معقول رقم چراغی کے نام سے نذر کی۔ ایک اور دوست کے قبائل دور دراز سفر سے علی گڑھ میں آئے۔ آپ سیادت کے دعوے سے اُن کے ہاں امام ضامن کا روپیہ مانگنے کے لیے پہنچے۔ وہاں سے ایک اشرفی اور کچھ روپے لے کر آئے۔ نمائش گاہ علی گڑھ میں انھوں نے کتابوں کی دوکان لگائی اور خود کتابیں بیچنے کو دوکان پر بیٹھے۔ نیشنل والنٹیر بن کر گلے میں جھولی ڈالی، چنی ریڈنگ کا جلسہ کیا اور خود اسٹیج پر کھڑے ہو کر غزلیں گائیں۔ انھوں نے چندہ مانگنے میں کبھی اس بات کا خیال نہیں کیا کہ میں کون ہوں، کس سے مانگتا ہوں اور کس طرح مانگتا ہوں۔

صاحبو! آپ کے سامنے اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ دُنیا میں تعلیم نے کیسا انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ قوموں میں وہی نسبت نظر آتی ہے جو آدمی اور جانور میں ہونے چاہیے۔ جو قومیں غفلت یا تعصب سے ابتدا میں مغربی تعلیم کی طرف متوجہ نہیں ہوئیں وہ اپنی نادانی پر کفِ افسوس ملتی ہیں اور گو ترقی کا موقع اُن کے ہاتھ سے اب بہت دور جا پڑا ہے مگر چار و ناچار اُن کو بھی آخر کار اُسی مغربی تعلیم کے سایہ میں پناہ لینی پڑی ہے۔ جس کے نام سے وہ سو سو کوس دور بھاگتی تھیں۔ خصوصاً مسلمان جو سب سے زیادہ تعلیم کے مخالف تھے اُن کی بھی اب بہت دیر کے بعد آنکھیں کھلی ہیں اور انھوں نے بھی اُس مسافر کی طرح جو قافلے سے بچھڑ بہت پیچھے رہ گیا ہو نہایت پشیمانی کے ساتھ اُفتاں و خیزاں قافلے کے پیچھے دوڑنا شروع کیا ہے۔ مصر، ترکی، ایران اور افغانستان میں تعلیم کا خیال روز بروز ترقی کرتا جاتا ہے۔ جہاں مسلمانوں کی حکومت نہیں ہے وہاں کے مسلمانوں نے بھی اپنی قومی ہستی ترقی تعلیم پر منحصر سمجھی ہے چناں چہ روس کے ذی مقدور مسلمان اپنے عطیات سے اور متوسط الحال لوگ قوتی چندوں کے ذریعہ سے اپنے ملک کے اہل اسلام میں تعلیم پھیلا رہے ہیں۔ جو لیکچر روس کے مشہور اسلامی اخبار ''ترجمان'' کے ایڈیٹر نے یکم نومبر سنہ حال کو قاہرہ میں دیا تھا اُس میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ ''اخیر چوتھائی صدی میں روس کے مسلمانوں میں ترقی کے خیالات کثرت سے پھیلنے لگے ہیں۔ انھیں خیالات کا اثر ہے کہ اخیر زمانے میں اُن کی توجہ مدارس کی اصلاح پر مائل ہوئی ہے اور مفید

کتابیں علوم جدیدہ اور ترکی لٹریچر کی شائع کرنے لگے ہیں اور جدید طرز کے مدارس کھولتے جاتے ہیں اور اُنھوں نے علوم جدیدہ اور علوم عربیہ وادبیہ کی تحصیل کے لیے اپنے اپنے طلبہ کو روس کے مدارس عالیہ اور یورپ، ٹرکی اور مصر کے مدارس میں بھیجنا شروع کر دیا ہے۔ ابتدائی اسلامی مدارس جن کے طریقۂ تعلیم کی اصلاح ہوگئی ہے تعداد میں ایک ہزار کے قریب ہیں۔ مذہبی مدارس میں سے جن کی اصلاح ہوچکی ہے، ایک مدرسہ کازان میں، ایک اورن برگ میں اور ایک اوفا میں ہے۔ ان مدرسوں میں ریاضیات، طبیعات، جغرافیہ اور تاریخ کی تعلیم دی جاتی ہے اور علوم عربیہ اور علوم دینیہ کی کتابیں بھی حسبِ معمول پڑھائی جاتی ہیں۔''

اس کے بعد انھوں نے بیان کیا کہ ''حسن اتفاق سے روسی مسلمانوں میں ایسے فیاض دولت مند پیدا ہوگئے جنھوں نے اپنی دولت، علم کی اشاعت اور قوم کی اصلاح و ترقی میں بے دریغ صرف کی۔ اُن میں سے خاص کر ذکر کرنے کے لائق مرحوم حاجی نعمت اللہ قرامیشف ہیں جنھوں نے ایک سو مدرسوں اور ایک سو مسجدوں کی اپنے روپئے سے بنیاد ڈالی اور ایک عالی شان کتب خانہ قائم کیا جس میں نہایت عمدہ اور نادر کتابیں جمع کی گئی ہیں۔ کازان کے نامور مسلمان تاجر مرحوم احمد حسینی نے بھی مدرسوں کی بنیاد ڈالنے اور علوم جدیدہ کے پھیلانے میں تین لاکھ روبل (یعنی سات لاکھ ساڑھے بارہ ہزار روپیہ) صرف کیا۔ مرحوم احمد حسینی کے بھائی عبدالغنی حسینی نے بھی دوسو ابتدائی اسکول نئے طریقۂ تعلیم کے قائم کیے اور اسکولوں کی اصلاح کے خیالات کو انھوں نے روس کے اندرونی صوبوں ہی میں نہیں بلکہ اُن دور و دراز صوبوں میں بھی پھیلایا ہے جو چین کی آسمانی سلطنت کی حدود پر واقع ہیں۔''

اس کے بعد انھوں نے کہا کہ ''منجملہ ان فیاض دولت مند مسلمانوں کے ایک حاجی زین العابدین ناقیف ہیں جو باکو کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے علم کو پھیلانے اور محتاج اور غریب مسلمانوں کی امداد کرنے میں سب سے زیادہ کوشش کی ہے۔ اس فیاض شخص نے داغستان میں ایک سو مسجدیں اور ایک سو ابتدائی مدرسے قائم کیے۔ باکو کے نواح میں عام زراعت کے جدید اصولوں کے مطابق ایک وسیع خطۂ زمین بطور نمونے کے مخصوص کیا تا کہ

جدید طریقۂ کاشت کاری کو مسلمان سیکھیں اور اس کی تقلید کریں۔ روسی زبان اور ترکی زبان میں کئی اخبار شائع کرائے جن سے مقصد یہ تھا کہ مسلمانانِ روس کے حقوق کی حفاظت کی جائے اور مسلمانوں کے ملکی اور سیاسی خیالات کا اُن کے ذریعہ سے اظہار کیا جائے۔ اس کے سوا انھوں نے لاکھوں روپیہ یورپ اور روس کی یونی ورسٹیوں میں مسلمان طلبہ کو تعلیم دلانے میں صرف کیا۔ روس میں آج کل نامور مسلمان ڈاکٹر، وکیل اور انجینئر ہیں وہ سب اس فیاض دولت مند مسلمان کے شرمندۂ احسان ہیں۔ انھوں نے مسلمان لڑکیوں کو بھی فراموش نہیں کیا۔ چناں چہ باکو میں مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کے لیے جس عالی شان مدرسہ کی بنیاد انھوں نے ڈالی ہے صرف اس کی تعمیر پر تین لاکھ یا بیس ہزار پونڈ کی رقم صرف ہوئی ہے۔ اسی مدرسہ کے اخراجات کے لیے انھوں نے ایک جائداد وقف کی ہے جس کی سالانہ آمدنی تیس ہزار پونڈ یا ساڑھے چار لاکھ روپیہ ہے۔''

اس کے بعد انھوں نے مسلمانونِ مصر کو مخاطب کر کے کہا کہ ''اے معزز و محترم مسلمانونِ مصر! آپ لوگ ہمارے ساتھ اس دعا میں شریک ہوں کہ خداوند عالم اس فیاض ہمدردِ قوم کو مدت دراز تک زندہ و سلامت رکھے۔'' پھر کہا: ''ایسے مسلمان دولت مند جنھوں نے ایک یا دو ابتدائی یا متوسط درجہ کے مدرسے روس میں قائم کیے اُن کی تعداد تو اس قدر زیادہ ہے کہ میں اُن کا کوئی شمار نہیں بتا سکتا۔ اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ ہم روس کے مسلمانوں نے ترقی کے میدان میں جو قدم بڑھایا ہے وہ انھیں مدرسوں کی بدولت ہے۔''

صاحبو! اس فاضل لیکچرار کے بیان میں یہ بات غور کے قابل ہے کہ اُس نے اپنے طول طویل لیکچر میں جس کے چند فقرے یہاں نقل کیے گئے ہیں کہیں ایسا اشارہ نہیں کیا جس سے پایا جائے کہ روس کے مسلمانوں کے ان پرائیوٹ اسکولوں میں گورنمنٹ روس نے بھی کچھ امداد دی ہے یا نہیں۔ بلکہ برخلاف اس کے صاف صاف اس بات کا اظہار کیا ہے کہ روس کے مسلمانوں نے جو کچھ تعلیم میں اب تک ترقی کی ہے وہ محض اپنی قوم کی امداد سے کی ہے۔ ظاہر ہے کہ برٹش گورنمنٹ کی رعایا کا حال اس باب میں گورنمنٹ روس کی رعایا سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں گورنمنٹ ان قوموں کو جو تعلیم میں اپنے دیگر ہم وطنوں

سے نہایت پست حالت میں ہے طرح طرح سے تعلیم کی طرف متوجہ کرتی ہے اور جہاں تک ممکن ہے اُن کی تعلیم میں آسانیاں پیدا کرتی ہے اور اُن کے پرائیویٹ اسکولوں میں امداد دیتی ہے اور اگر اُن کی کوشش سے کوئی بڑا قومی انسٹی ٹیوشن قائم ہوتا ہے تو اُس کی خود سرپرست بنتی ہے۔ پس ہم مسلمانوں کو بمقابلہ روس کے مسلمانوں کے تعلیم میں ترقی کرنا نہایت آسان ہے بشرطیکہ ہم اپنی تعلیم دار و مدار محض گورنمنٹ کی امداد پر نہ رکھیں، بلکہ گورنمنٹ کو رفتہ رفتہ اپنی تعلیم کے بوجھ سے سبکدوش کرتے جائیں۔ گورنمنٹ کا کام صرف اس قدر ہے کہ رعایا میں تعلیم کا مذاق اور اُس کی ضرورت کا احساس پیدا کردے۔ اس کے بعد یہ کام خود رعایا کا ہے کہ وہ آگے قدم بڑھائے اور جو پود گورنمنٹ نے اپنے پُرزور ہاتھ سے لگادی ہے اُس کو اپنی ذاتی کوشش اور محنت سے پروان چڑھائے اور ملک اور قوم کو اُس سے فائدہ پہنچائے۔

صاحبو! سندھ کے مسلمانوں کی حالت نہایت افسوس ناک ہے۔ آج کل تمام ترقیات کا مدار محض تعلیم پر ہے۔ جب سندھ میں تعلیم ہی نہیں تو جاننا چاہیے کہ کچھ بھی نہیں۔ جو لوگ زمین داری پر نازاں ہیں، اگر انھوں نے تعلیم کی طرف توجہ نہ کی تو زمین داری کوئی دن کی مہمان ہے کیوں کہ جو لوگ ملک میں تعلیم یافتہ ہیں وہ رفتہ رفتہ اُن کی زمینوں پر قابض ہوتے جاتے ہیں اور جس طرح سرکاری ملازمت سے مسلمان خارج ہوگئے ہیں اسی طرح زمین داری سے بھی آخر کار اُن کو دست بردار ہونا پڑے گا۔ جس طرح بدنِ انسان میں خون کی کمی تمام بیماریوں کی جڑ ہے اسی طرح تعلیم کی کمی قومی مصائب کی جڑ ہے۔ بغیر تعلیم کے اب دُنیا میں عزت سے رہنا ناممکن ہوگیا ہے۔ اس وقت دور دور سے مسلمان اسی غرض سے کراچی میں آئے ہوئے ہیں کہ سندھ کے مسلمانوں کو تعلیم کی متوجہ کریں۔ ہز ہائنس میر صاحب خیر پور اور اُن کے روشن ضمیر وزیر نے ان کو اسی لیے مدعو کیا ہے کہ اس ملک کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت پر غور کریں اور ایسی تجویزیں پیش کریں جن سے اُن کی تعلیم میں آسانیاں پیدا ہوں، سرکاری افسر تہ دل سے ترقی تعلیم مسلمانان سندھ کی حمایت کرنے پر آمادہ ہیں۔ مسٹر جائلز ڈائرکٹر جنرل تعلیمات ہند جو پہلے ایک مدت تک اس صوبہ

میں ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم رہ چکے ہیں وہ عنقریب تشریف لانے والے ہیں اور امید ہے کہ اپنی تشریف آوری سے اس کانفرنس کو عزت بخشیں گے۔ اب وقت ہے کہ سندھ کے مسلمان خواب غفلت سے بیدار ہوں اور اُن کی ترغیب کے جو اسباب اس وقت جمع ہو گئے ہیں اُن کو غنیمت سمجھیں اور اُن سے فائدہ اٹھائیں۔

زمانہ دیر سے چلا رہا ہے اے مسلمانو!
کہ ہے گردش میں میرے غیب کی آواز پہچا نو
وہ ناصح اور ہوں گے جن کا کہنا ٹل بھی جاتا ہے
اگر میری نہ مانو گے، تو پچتاؤ گے نادانو!
میری بازی کا منصوبہ گیا کب کا پلٹ یارو!
خبر تم کو بھی ہے کچھ اے میرے چالوں سے بے گانو!
گئے وہ دن کہ ثروت باپ دادا چھوڑ جاتے تھے
بس اب ثروت ہے مزدوروں کا حصہ اے تن آسانو!
گئے وہ دن کہ لاکھوں بے ہنر یہاں عیش کرتے تھے
ہوا ہے بے ہنر جینا بھی اب مشکل میری جانو!
نصیحت میری مانو، اب بھی اپنی ہٹ سے باز آؤ
پھری جس وقت دیکھو میری چتون، تم بھی پھر جاؤ

گیا دورہ حکومت کا، بس اب حکمت کی ہے باری
جہاں میں چار سو علم و عمل کی ہے عمل داری
جنھیں دُنیا میں رہنا ہے، رہے معلوم یہ ان کو
کہ ہیں اب جہل و نادانی کے معنی ذلت و خواری
ضرورت علم و دانش کی ہے ہر فن اور صناعت میں
نہ چل سکتی ہے اب بے علم نہ جاری نہ معماری

جہاں علمِ تجارت میں نہ ماہر ہوں گے سوداگر
تجارت کی نہ ہوگی تاقیامت گرم بازاری
نہ آئے گی پسند اُن نوکروں کی خدمت و طاعت
جنھیں پائیں گے آقا زیور تعلیم سے عاری
کوئی پیشہ نہیں اب معتبر بے تربیت ہرگز
نہ فصادی، نہ جراحی، نہ کحالی، نہ عطاری
جہاں تک دیکھئے، تعلیم کی فرماں روائی ہے
جو سچ پوچھو تو نیچے علم ہے اوپر خدائی ہے

گئے وہ دن کہ تھا علم و ہنر انساں کا اک زیور
ہوئی ہے زندگی اب منحصر خود علم و دانش پر
کوئی بے علم روٹی سیر ہوکر کھا نہیں سکتا
نہ زرگر اور نہ آہن گر، نہ بازی گر، نہ سوداگر
مہندس چاہیے مزدور اب اور راج اقلیدس
بس اب دُنیا میں بےعلموں کا ہے اللہ ہی یاور
گئے وہ دن کہ تھے محدود کام انسان کے سارے
برابر تھا بئے کا گھونسلا اور آدمی کا گھر
یہ دورہ ہے نبی آدم کی روز افزوں ترقی کا
جو آج ایک کام ہے اعلیٰ تو کل ہے اُس سے اعلیٰ تر
نہ تھا غیر از ترقی فرق کچھ انسان و حیواں میں
دیا ہے امتیاز انساں کو یہ تعلیم نے آکر
زمانہ نام ہے میرا تو میں سب کو دکھادوں گا
کہ جو تعلیم سے بھاگیں گے، نام اُن کا مٹا دوں گا

صاحبو! یہاں تک جو کچھ آپ کے سامنے بیان کیا گیا وہ خاص کر سندھ کر موجودہ تعلیمی حالت سے علاقہ رکھتا تھا۔ اب میں چند الفاظ عام مسلمانانِ ہند کی تعلیم کے متعلق عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ اس کے متعلق پہلے اس قدر کہا جاچکا ہے کہ میں کوئی بات اس سے زیادہ نہیں بیان کرسکتا۔

سرسید مرحوم جنھوں نے مسلمانوں میں تعلیم کی بنیاد ڈالی ہے ابتدا سے اُن کا خیال مسلمان تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نسبت یہ تھا کہ جب وہ تعلیم پاکر کالجوں سے نکلیں گے تو ان میں ایسا ملکہ پیدا ہو جائے گا کہ جو ذریعۂ معاش وہ اپنی طبیعت کے مناسب اور اپنی حالت کے موافق دیکھیں گے۔ اس کو خود اختیار کرلیں گے۔ کیوں کہ تعلیم اُن کی خودرہ نمائی کرے گی اور اُن کو اُسی رستے پر ڈال دے گی جس کی قابلیت اُن کی فطرت میں موجود ہوگی۔ پس یونی ورسٹی کی موجودہ تعلیم کے سوا اُن کو کسی خاص پیشے یا صنعت کی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں جہاں تک دیکھا جاتا ہے، اب تک اس خیال کا ظہور نہیں ہوا اور جو امیدیں اُن سے کی گئی تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں۔ تعلیم کے زمانے میں ہر مسلمان نوجوان محض سرکاری یا غیر سرکاری ملازمت ہی کو اپنی منزلِ مقصود جانتا ہے اور تعلیم کے بعد اسی کی تلاش میں دائیں بائیں ہاتھ مارتا پھرتا ہے اور اگر حسبِ دل خواہ اُس کو ملازمت نہیں ملتی تو یہ خیال کرتا ہے کہ تعلیم میں جو کوشش اور محنت کی گئی تھی وہ سب رایگاں گئی۔ ڈاکٹر یا انجینئری بھی وہ ملازمت کی غرض سے سیکھتا ہے۔ صرف قانون ایک ایسی چیز ہے۔ جس کے ذریعہ سے معدودے چند مسلمان جب تک کہ اُن کو کوئی سرکاری عہدہ نہیں ملتا، البتہ کسی قدر آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس کے سوا کسی آزاد پیشے کے اختیار کرنے کی اُن میں جرأت نہیں پائی جاتی۔

سرسید مرحوم نے اپنے خیال کی تائید میں ایک موقع پر یہ حکایت لکھی ہے کہ ''ایک دہقان کے بیٹے نے بہت اضطراب کے ساتھ اپنے باپ سے کہا کہ گاؤں کے تالاب میں پانی چلا آتا ہے، جب تالاب بھر جائے گا تو پانی کہاں جائے گا۔'' اُس کے باپ نے کہا: ''بیٹا اندیشہ مت کر۔ جب تالاب بھر جائے گا تو پانی اپنے نکاس کا رستہ آپ نکال لے گا۔''

اس حکایت کونقل کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ''یہی حال مسلمان تعلیم یافتہ نوجوانوں کا ہے۔ابھی اُن کی ایسی قلت ہے کہ وہ کوئی رستہ آئندہ زندگی کے لیے نہیں نکال سکتے۔جب وہ کثرت سے ہوں گے تو کوئی رستہ نکال لیں گے۔رستوں کی کمی نہیں ہے، مگر ابھی تالاب بھرا نہیں ہے، لیکن اے صاحبو! جس رفتار سے مسلمانوں میں تعلیم چل رہی ہے۔اُس رفتار سے تالاب کے بھرنے میں بہت دیر معلوم ہوتی ہے۔مگر رستہ نکالنے کی ضرورت روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور اگر میرا قیاس غلط نہ ہو تو تالاب کے بھر جانے کے بعد بھی خاص کر شمالی ہندوستان کے مسلمانوں سے یہ امید نہیں ہے کہ وہ ملازمت کے سوا کوئی دوسرا رستہ آئندہ زندگی کے لیے نکال سکیں۔ ہندوستان کے اس خاص حصے میں جس میں کہ لکھنؤ، آگرہ، دہلی اور لاہور کے قدیم دارالحکومت شامل ہیں، زیادہ تر عرب، ایران اور ترکستان وغیرہ کی نسلیں آباد ہیں جن کے آبا واجداد ہمیشہ یا تو خدمات سلطانی پر مامور رہے یا معافیات و جاگیرات کے بھروسے پر اُن کو کسی قسم کے آزاد پیشے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ قانون وراثت طبیعی کے موافق رفتہ رفتہ تجارت اور صنعت وغیرہ قابلیت اُن کی نسلوں میں بالکل مفقود ہوگئی اور آزاد پیشوں کی جرأت کرنے کا ان میں بالکل حوصلہ باقی نہیں رہا۔اُن کی یہ خاصیت اس درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ نہ تعلیم سے اُن میں حس وحرکت پیدا ہوتی ہے نہ اپنی ہم وطن قوموں کی کاروباری زندگی دیکھ کر اُن کی ریس کرنے کا خیال اُن میں پیدا ہوتا ہے اور نہ یورپ کی عالمگیر تجارت وصنعت کا سیلاب اُن کی آنکھیں کھولتا ہے۔اول اول جو مسلمان شرفا دست کاری یا دکانداری کو اپنی شان کے خلاف جانتے تھے وہ خیال بھی روز بروز کافور ہوتا جاتا ہے لیکن اُن کی جھجک جو آزاد پیشوں کی طرف سے اُن کے دل میں بیٹھی ہوئی ہے وہ کسی طرح نہیں جاتی۔بعض تعلیم یافتہ نوجوان جو بڑی جرأت کر کے کوئی کام شروع کرتے ہیں تو اکثر بہ سبب ناتجربہ کاری اور عدم واقفیت کے اُس میں کامیاب نہیں ہوتے اور آخر کار کسی قدر نقصان اُٹھا کر اس سے دست بردار ہو جاتے ہیں اور جب اُس کے دیگر ہم چشم جو کاروباری دُنیا میں قدم رکھنا چاہتے تھے اپنی آنکھ سے اُن کی ناکامی دیکھتے ہیں تو اُس کے حوصلے بھی پست ہو جاتے ہیں اور اُن کو بھی ہمیشہ کے لیے اپنی آزادی سے دست بردار ہونا

اور وہی غلامی یعنی ملازمت کا طوق گلے میں ڈالنا پڑتا ہے۔

یہ حالت تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں کی نہایت مایوس کرنے والی اور تعلیم اولاد سے مسلمانوں کا دل اچاٹ کرنے والی ہے۔ اب تک ہندوستان کے مسلمانوں میں جس قدر تعلیم کا خیال پیدا ہوا ہے، اُس کی بنیاد صرف اس بات پر ہے کہ وہ تعلیم کو ایک ذریعہ حصول معاش کا سمجھتے ہیں۔ لیکن جب اُن کی اولاد تعلیم پانے کے بعد معاش کی طرف سے فارغ البال نہ ہوگی تو سوائے اس کے کہ وہ تعلیم کا خیال چھوڑ دیں اُس کا اور کیا انجام ہوسکتا ہے۔ سرکاری ملازمتیں نہایت محدود ہیں اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ پس ممکن نہیں کہ ہر تعلیم یافتہ نوجوان مسلمان کے لیے حسبِ دل خواہ سرکاری ملازمت مل سکے۔ البتہ صنعت وحرفت کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ جس قدر تعلیم یافتہ لوگ بڑھتے جائیں گے اُسی قدر اُن کی مانگ زیادہ ہوتی جائے گی۔

یورپ کے ایک روشن خیال مصنف کا قول ہے کہ جس ملک یا قوم کا دار و مدار ملازمت پر ہوتا ہے وہ کبھی مرفہ الحال نہیں ہوسکتی۔ اُن کی قدرتی قوتیں ہمیشہ پژمردہ رہتی ہیں اور رفتہ رفتہ بالکل فنا ہو جاتی ہیں۔ لیکن جہاں صنعتوں اور حرفتوں کا دروازہ کھل جاتا ہے وہاں یہ سمجھنا چاہیے کہ قومی زندگی کی بنیاد پڑ گئی ہے اور وہ زمانہ قریب ہے کہ تازگی اور رونق تمام ملک پر چھا جائے گی۔ وہ کہتا ہے کہ یورپ کے جن شہروں میں لوگ ملازمت کرنے کے عادی ہیں وہاں تمام کوچوں اور بازاروں پر ہر وقت آفسردگی اور اُداسی برستی ہے۔ لیکن جہاں صنعت وحرفت کا بازار گرم ہے وہاں پر ہر شخص کے چہرے شگفتگی اور زندہ دلی کے آثار نمایاں نظر آتے ہیں۔

صاحبو! صنعت وحرفت کی ضرورت ہندوستان میں عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے۔ جب سے سودیشی تحریک شروع ہوئی ہے ہمارے معزز ہم وطن اُس کی طرف بھی جلد جلد قدم بڑھا رہے ہیں۔ گورنمنٹ نے بھی تسلیم کر لیا ہے کہ اُس ملک کی مالی مشکلات جس میں وہ اکثر مبتلا ہوتا رہتا ہے، اُن سے نجات پانا محض صنعت وحرفت کی ترقی پر منحصر ہے۔ ممالک متحدہ میں اسی مقصد کے لیے انڈسٹریل کانفرنس قائم کی گئی ہے۔ اور صوبوں میں بھی

اس طرف توجہ ہوتی جاتی ہے۔ اگر چہ مسلمان بھی اس کی ضرورت سے انکار نہیں کرتے لیکن عملی طور پر وہ اب تک اُس سے بالکل الگ رہے ہیں اور نہایت اندیشہ ہے کہ جس طرح وہ ابتدا میں انگریزی تعلیم سے نفرت کرنے کے سبب اپنی تمام ہم وطن قوموں سے پیچھے رہ گئے ہیں اور اب کسی طرح اُن کی برابری نہیں کر سکتے اسی طرح صنعت وحرفت سے بھی اس وقت تک اُن کی غفلت کا وہی انجام نہ ہو۔ میں صنعت وحرفت کی تعلیم کے متعلق آپ صاحبوں کے سامنے کوئی نئی بات نہیں کہتا بلکہ جو کچھ پہلے کہا جا چکا ہے اُسی کو دہراتا ہوں اور قوم کے لیڈروں کو یاد دلاتا ہوں کہ وہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو صنعت وحرفت کی طرف متوجہ کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہر سال ہر درجہ کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو صنعت وحرفت کی تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کی غرض سے اُن کی حیثیت کے موافق کسی قدر معقول وظیفے دئے جایا کریں تو امید ہے کہ چند سال میں ایسے کثیر التعداد نوجوان پیدا ہو جائیں گے جو اپنے ہم چشموں کو آزاد پیشوں پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت دلا سکیں گے اور اگر قوم کے دولت مندوں کو خدا ایسی توفیق دے کہ وہ بی اے پاس نوجوانوں کو وقتاً فوقتاً صنعت وحرفت کی تعلیم کے لیے معقول وظیفے دے کر یورپ یا جاپان بھیجتے رہیں تو امید ہے کہ تھوڑے عرصہ میں ہماری قوم کے دن پھر جائیں گے۔ جس زمانے میں سرسید مرحوم نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ولایت بھیجنے کے لیے سول سروس فنڈ کے نام سے سرمایہ جمع کرنے کا ارادہ کیا تھا وہ ایک ایسا زمانہ تھا کہ لوگ قومی ہمدردی کے نام سے بالکل بے خبر تھے اور اسی لیے اُس وقت سرسید کو اس منصوبے میں کچھ کامیابی نہیں ہوئی۔ مگر اب ہماری قوم کے دولت مندوں میں روز بروز ایسی مثالیں قائم ہوتی جاتی ہیں کہ اگر کوئی ایسا فنڈ قائم کیا جائے جس کے ذریعہ سے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو صنعت وحرفت کی تعلیم کے لیے غیر ملکوں میں بھیجا جائے تو اس مقصد میں کامیابی ہونی ناممکن نہیں ہے۔

جس طرح صنعت وحرفت کی تعلیم کا قوم میں پھیلنا ضروری ہے اسی قدر بلکہ اس سے بہت زیادہ ہمارے نوجوانوں کو نئے طریقۂ زراعت کی تعلیم دلانی ضروری ہے۔ خصوصاً ایسے صوبے میں جیسا کہ سندھ ہے اور جہاں اسّی فی صدی کے قریب مسلمان کاشت کار اور

زمین دار ہیں، بجائے صنعت وحرفت کے زراعتی اسکولوں میں تعلیم دلانا زیادہ بہتر ہے، تاکہ جولوگ زراعتی اسکولوں سے تعلیم پاکرنکلیں وہ زراعت کے عمدہ عمدہ فارم قائم کرکے عملی طور پر اپنے بھائیوں کو دکھائیں کہ زمانۂ حال میں زراعت نے کس قدر ترقی کی ہے کہ جس زمین سے قدیم طریقہ کے موافق مثلاً پانچ روپیہ بیگہ منافع ہوسکتا تھا اب نئے طریقہ سے کم وبیش دس روپیہ منافع بہ آسانی ہوسکتا ہے۔

بہرحال مسلمانوں کی ترقی کے لیے محض یونی ورسٹی کی موجودہ تعلیم کافی نہیں ہے۔ بلکہ ضرور ہے کہ وہ تعلیم کے ہر شعبہ میں دست گاہ حاصل کریں اور اُس دوڑ میں جس میں اُن کے ہم وطن اُن سے بہت دور آگے نکل گئے ہیں جہاں تک ممکن ہو شریک ہوں۔ ورنہ وہ زمانہ قریب ہے کہ اُن کو نہ صرف اپنی عزت اور توقیر سے بلکہ اپنی بقا اور اپنی ہستی سے بھی ہمیشہ کے لیے دست بردار ہونا پڑے گا۔

جو اپنے ضعف کا کچھ کرتیں نہیں تدارک
قومیں وہ چند روزہ دُنیا میں میہماں ہیں

گھڑیال اور مگرچھ ہیں ان کو نگلے جاتے
دریا میں مچھلیاں جو کمزور و ناتواں ہیں

سنبھلو! وگر نہ رہنا یہاں اس طرح پڑے گا
بھیل اور گونڈ جیسے گمنام و بے نشاں ہیں

سرسید مرحوم

(سرسید کی وفات کے بعد کئی سال تک حیدرآباد دکن میں ہر سال سرسید کی برسی کا جلسہ ہوتا رہا، جس میں مرحوم کی زندگی اور اُن کے کارناموں پر تقریریں ہوتیں اور مضمون پڑھے جاتے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں حسنِ اتفاق سے مولانا حالی مرحوم حیدرآباد میں تشریف فرما تھے۔ برسی کے موقع پر اُن سے ایک مضمون پڑھنے کی درخواست کی گئی جسے انھوں نے بہ طیبِ خاطر قبول فرمایا۔ یہ وہی مضمون ہے اور اُس وقت رسالہ ''زمانہ'' کان پور میں شائع ہوا تھا۔)

جس رسم کے ادا کرنے کے لیے آج سب لوگ یہاں جمع ہوئے ہیں۔ یہ اُس شخص کی برسی کی تقریب ہے جس نے پچاس برس مسلسل ملک اور قوم کی خیرخواہی اور اسلام کی خدمت گزاری میں بسر کیے اور باوجود سخت مخالفتوں کے جو مسلمانوں کی طرف سے اخیر دم تک اس کو پیش آتی رہیں وہ اپنے ارادوں میں نہایت استقلال کے ساتھ ثابت قدم رہا۔ خود مسلمانوں نے جن کی خیرخواہی میں اس نے اپنی دو تہائی زندگی صرف کی، اُس کو کافر، ملحد، نیچری، دجّال سب کچھ کہا۔ اُس کے کفر پر سیکڑوں فتوے لکھائے گئے۔ اُس پر اور اُس کے کاموں پر طرح طرح کی تہمتیں لگائی گئیں۔ اس کو قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔ اس کے برخلاف ملک کے ہر گوشے سے نئے نئے اخبار اور رسالے برابر جاری ہوتے رہے، مگر اُس نے کبھی ہمت نہ ہاری اور جو منصوبہ مسلمانوں کی بھلائی اور خیراندیشی کا ابتدا سے باندھا تھا اس کو دمِ واپسیں تک پورا کرتا رہا۔ میری مراد اُس شخص سے سرسید احمد مرحوم ہیں جن کی

وفات کو آج پورے آٹھ برس گزرے ہیں۔

کیا خدا کی قدرت ہے کہ جس شخص کو چند روز پہلے کافر و ملحد کہا جاتا تھا اب ملک کے اطراف و جوانب میں ہر سال اُس کی برسی کی جاتی ہے اور اُس کے احسانات جو اُس نے قوم پر کیے ہیں یاد کیے جاتے ہیں اور امید ہے کہ جس قدر زمانہ گزرتا جائے گا اُس کی قدر روز بروز زیادہ ہوتی جائے گی۔ جس طرح ماں باپ کا غصہ اور خفگی اولاد کو بچپنے میں ناگوار گزرتی ہے مگر بڑے ہو کر اُس غصے اور خفگی کی قدر ہوتی ہے اسی طرح جو لوگ تاریکی اور جہالت کے زمانے میں اپنی قوم کو اُن کی آئندہ بھلائی کا رستہ بتاتے ہیں گو اُس وقت اُن کی باتیں سب کو ناگوار معلوم ہوتی ہیں مگر جوں جوں لوگوں کی آنکھیں کھلتی جاتی ہیں اُن پر ظاہر ہوتا جاتا ہے کہ جن باتوں کو ہم زہر سمجھتے تھے وہ درحقیقت ہمارے حق میں تریاق تھیں۔

یورپ میں اُن لوگوں کی یادگاریں، جنھوں نے اپنے ملک اور قوم کی بھلائی کا کوئی بڑا یا چھوٹا کام اپنی زندگی میں انجام دیا ہے، طرح طرح سے قائم کی جاتی ہیں اُن کے نام کی عظیم الشان عمارتیں بنائی جاتی ہیں، اُن کے مجسّمے گزرگاہوں اور شاہراہوں پر نصب کیے جاتے ہیں، اُن کی سوانح عمریاں لکھی جاتی ہیں، اُن کے کارنامے اولاد کو پڑھائے جاتے ہیں، تاکہ آئندہ نسلوں کو اُن کی ریس کرنے اور اُن کے قدم بہ قدم چلنے کا شوق پیدا ہو۔

یورپ کا ایک مصری مسلمان سیاح، جس نے اٹلی میں وہاں کے نامور لوگوں کی یادگاریں اور اسٹیچوا پنے زمانۂ سیاحت میں دیکھے، لکھتا ہے کہ ’’میں نے اٹلی کے خواص اور عوام سب کو اُن لوگوں کے کارناموں سے بخوبی مطلع اور باخبر پایا جن کی تصویریں اور مورتیں تمام شاہی محلوں، درباروں اور گزرگاہوں میں نصب کی گئی ہیں۔ اور کچھ شک نہیں کہ اٹیلین قوم جو روز افزوں ترقی کر رہی ہے اور طرح طرح کے عظیم الشان کارخانے کھول رہی ہے اور بڑی بڑی کمپنیاں قائم کر رہی ہے اس کی مُحرِک وہی نامور لوگوں کی یادگاریں ہیں جو ہر وقت اُن کے پیش نظر رہتی ہیں اور جن کو دیکھ دیکھ کر ترقی کرنے کا خیال اور یورپ کے دولِ عظام کا مقابلہ کرنے کا جوش ہر وقت اُن کے دل میں موجزن رہتا ہے۔‘‘

ہم مسلمانوں میں آبا و اجداد کی برسی یا مشائخ و اولیاء اللہ کا عُرس کرنے کا دستور ہے

یہ بھی درحقیقت اُن کی یادگار قائم کرنے کا ایک طریقہ ہے اور اگر ان مواقع پر اُن بزرگوں کے بڑے بڑے کارناموں کا بھی ذکر ہوا کرے تو یہ بھی ایک عمدہ یادگار ہوسکتی ہے۔ اگرچہ جس قسم کی یادگاریں یورپ میں قائم کی جاتی ہیں اُن سے سلف کی یاد ہر وقت تازہ ہوتی رہتی ہے اور برسی کے ذریعے سے سال بھر میں صرف ایک دفعہ اُن بزرگوں کا خیال آتا ہے لیکن موجودہ حالت میں اگر برسویں دن بھی یہ رسم برابر ادا ہوتی ہے اور برسی والے بزرگ کا ذکرِ خیر مجمع عام میں کیا جایا کرے تو اِس سے بھی قوم کو بہت کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

اب میں آپ صاحبوں سے اس بات کی اجازت چاہتا ہوں کہ سرسید مرحوم کے بڑے بڑے کاموں میں سے چند باتیں جو نہایت جلدی میں اُن کی لائف سے میں انتخاب کرسکا ہوں آپ کے سامنے عرض کروں مگر میرے اِس بیان کو سرسید کی پوری لائف سے ایسی ہی نسبت سمجھنی چاہیے جیسی ایک نامکمل فہرست کو پوری کتاب سے ہوتی ہے۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد انگلش گورنمنٹ، کے سخت انتقام اور سخت سزاؤں کو دیکھ کر جو غدر کے بعد خاص کر مسلمانوں کے حق میں آئیں، اُس کے رحم اور مہربانی سے بالکل مایوس ہوگئے تھے۔ جن غلط فہمیوں کے مسلمان شکار ہوگئے تھے اُن کے اسباب بدستور موجود تھے۔ جہالت اور تعصب اُن کے سر پر سوار تھا۔ تمام حکمران قوم مسلمانوں کو دشمنی کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ انگریزی اخباروں میں برابر مسلمانوں کے برخلاف آرٹیکل لکھے جاتے تھے جن سے انگریزوں کا دل مسلمانوں سے روز بروز زیادہ پھٹتا جاتا تھا۔ کچہریاں اور دفتر مسلمانوں سے خالی ہوتے جاتے تھے، فوج میں اُن کی بھرتی موقوف ہوگئی تھی، وہ درباروں میں بہت ہی کم بُلائے جاتے تھے، غرض کہ تمام علامتیں اس بات کی موجود تھیں کہ اب مسلمانوں کا عزت اور اعتبار کے ساتھ ہندوستان میں رہنا غیر ممکن ہے۔

ان تمام باتوں پر نظر کر کے اول اول تو سرسید کا جی چھوٹ گیا تھا۔ یہاں تک کہ انھوں نے ہندوستان سے کسی دوسرے اسلامی ملک میں جا کر بود و باش اختیار کرنے کا پختہ ارادہ کرلیا تھا مگر آخرکار اُن کو وہ ارادہ فسخ کرنا اور قوم کی آگ میں کودنا پڑا۔ علاوہ اور تدبیروں کے جو انھوں نے ملک اور قوم کی بھلائی کے لیے اختیار کیں انھوں نے سب سے

زیادہ ضروری اِس بات کو سمجھا کہ گورنمنٹ نے بغاوت کے اسباب سمجھنے میں جو غلطی کی ہے اس کو نہایت دلیری سے گورنمنٹ پر ظاہر کردیں۔ مگر یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ وہ وقت نہایت نازک تھا۔ خصوصاً مسلمانوں کو بغاوت کے الزام سے بری کرنا سب سے زیادہ مشکل کام تھا۔ گورنمنٹ کو غصہ خاص کر مسلمانوں کے حال پر سب سے زیادہ تھا۔ یہاں تک کہ اُس وقت مسلمان ہونا ہی ایک بڑا سخت جُرم سمجھا جاتا تھا۔ خیالات ظاہر کرنے کی آزادی بالکل نہ تھی۔ مارشل لا کا دور دورہ تھا اور حاکموں کی زبان ہی قانون تھی۔ جو شخص گورنمنٹ کا خیرخواہ اور وفادار تسلیم کرلیا گیا ہو اُس کو ایسی قوم کی حمایت کرنی جس کو گورنمنٹ اپنا بدخواہ سمجھتی ہو اور بھی زیادہ دشوار تھا۔

الغرض انھوں نے خدا پر بھروسہ کر کے مرادآباد میں ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' پر ایک رسالہ لکھا جس میں رعایائے ہندوستان کو اور خاص کر مسلمانوں کو بغاوت کے الزام سے بری کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ انھوں نے ایسے نازک وقت میں وہ تمام الزامات جو لوگوں کے نزدیک خود گورنمنٹ پر عائد ہوتے تھے نہایت دلیری اور آزادی کے ساتھ بیان کیے اور جو اسباب کہ عموماً انگریزوں کے ذہن میں تہہ نشین تھے اُن کی تردید کی اور اُن کو غلط بتایا۔

جب یہ رسالہ چھپ کر اُن کے پاس پہنچا اور اُن کے بعض دوستوں کو معلوم ہوا کہ وہ اس کو پارلیمنٹ اور گورنمنٹ انڈیا بھیجنا چاہتے ہیں تو انھوں نے نہایت اصرار کے ساتھ سرسید سے کہا کہ ''خدا کے واسطے ان کتابوں کو جلا دو۔'' مگر جب انھوں نے نہ مانا تو رائے شنکر داس جو مرادآباد میں منصف اور سرسید کے نہایت دوست تھے آبدیدہ ہو کر خاموش ہو رہے۔

گورنمنٹ انڈیا میں جب یہ کتاب پہنچی اور انگریزی میں ترجمہ ہو کر کونسل میں پیش ہوئی تو کونسل کے ایک معزز ممبر مسٹر سسل بیڈن فارن سکریٹری گورنمنٹ ہند نے اُس کی نسبت یہ رائے ظاہر کی کہ اس شخص نے نہایت باغیانہ مضمون لکھا ہے اس سے حسب ضابطہ بازپُرس ہونی چاہیے اور اگر کوئی معقول جواب نہ دے سکے تو سزا دینی چاہیے۔ مگر چوں کہ اور کوئی ممبر اُن کا ہم زبان نہ تھا اس لیے اُن کی رائے پر کچھ لحاظ نہیں کیا گیا۔ مگر کچھ دنوں بعد جب لارڈ کیننگ نے فرخ آباد میں دربار کیا اور سرسید بھی اُس دربار میں بلائے گئے تو وہاں

ایک موقع پر مسٹر سسل بیڈن نے سرسید سے تلخ لہجہ میں کہا کہ ''اگر تم گورنمنٹ کی خیرخواہی کے لیے یہ مضمون لکھتے تو ہرگز اس کو چھپوا کر ملک میں شائع نہ کرتے بلکہ صرف گورنمنٹ پر اپنے یا رعایا کے خیالات ظاہر کرتے۔'' سرسید نے کہا: ''میں نے اس کتاب کی کل پانچ سو جلدیں چھپوائی تھیں جن میں سے چند جلدیں میرے پاس موجود ہیں اور ایک گورنمنٹ میں بھیجی ہے اور کچھ کم پانچ سو جلدیں ممبران پارلیمنٹ کے ملاحظے کے لیے ولایت روانہ کی ہیں جن کی رسید میرے پاس موجود ہے۔ میں جانتا تھا کہ آج کل بہ سبب غیظ و غضب کے حاکموں کی رائے میں سلامتی نہیں رہی اور اس لیے وہ سیدھی باتوں کو بھی الٹی سمجھتے ہیں۔ پس جس طرح اُس کو میں نے ہندوستان میں شائع نہیں کیا اسی طرح میں نے انگریزوں کو بھی نہیں دکھایا صرف ایک کتاب گورنمنٹ میں بھیجی ہے اگر اس کے سوا ایک بھی جلد کہیں ہندوستان میں مل جائے تو میں فی جلد ایک ہزار روپیہ دوں گا۔'' یہ سن کر مسٹر بیڈن سرسید سے بالکل صاف ہو گئے اور پھر ہمیشہ اُن کے دوست رہے۔

انگلستان کے مشہور اخبار ''ہوم نیوز'' نے اس کتاب کی نسبت لکھا تھا کہ ''سید احمد خاں نے جو غدر کے اسباب تحریر کیے تھے اُن میں بعض نہایت قیمتی اور عمل درآمد کے قابل تجویزیں پیش کی تھیں جو حکامِ ہندوستان نے کسی اور ذریعے سے حاصل نہیں کیں۔ اُس نے نہایت دلیری کے ساتھ اپنی رائے اس مضمون پر ظاہر کی۔ یہ بات محتاج بیان نہیں ہے کہ حکمران گروہ میں اُس کی رائے نے نہایت اثر پیدا کیا۔ وہ اُن اسباب کے بیان کرنے سے خائف نہیں ہوا جن کی طرف غدر کو بخوبی منسوب کیا جاسکتا ہے اور جن کی صحت تجربہ سے پورے طور پر ثابت ہو چکی ہے۔

اخبار ''سینٹ جیمس بجٹ'' نے اُن نتائج کے بیان کرنے کے بعد جو اس کتاب سے مرتب ہوئے اُس پر یہ ریمارک کیا تھا کہ ''ہمارے نزدیک سید احمد خاں کی شکایتوں کا اثر بہ نسبت اُن شکایتوں کے جو لال موہن گھوس اور اُس کے اسکول کے نوجوان آدمی نہایت فصاحت کے ساتھ کرتے ہیں، بہت جلد اور بہت وسعت کے ساتھ پھیلا ہے۔''

اگرچہ ممکن ہے کہ کچھ انگریز ایسے ہوں جو اس رسالے کے مضامین کو بالکل تسلیم نہ

کرتے ہوں یا اُس کے بعض مضامین سے اختلاف رکھتے ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ گورنمنٹ نے جیسا کہ مذکورۂ بالا انگریزی اخباروں کی رائے سے ظاہر ہوتا ہے سرسید کی بہت سی تجویزوں کے موافق عمل درآمد اور اکثر شکایتوں کا تدارک کیا۔ مثلاً سب سے بڑی چیز جس کو سرسید نے کتاب مذکور میں بغاوت کا اصلی سبب قرار دیا تھا وہ ہندوستانیوں کا قانونی کونسل میں شریک نہ ہونا تھا جس کی وجہ سے گورنمنٹ کے خیالات رعایا پر اور رعایا کے خیالات گورنمنٹ پر ظاہر نہ ہونے پاتے تھے۔ گورنمنٹ نے فوراً اس شکایت کا تدارک کیا یعنی ۱۸۶۰ء میں یہ رسالہ گورنمنٹ میں پیش ہوا اور ۱۸۶۱ء میں ہندوستانی رئیس لیجس لیٹو کونسل کی ممبری پر نامزد کیے گئے۔ چناں چہ جنوری ۱۸۶۲ء کے اجلاس کونسل میں پہلی ہی بار مہاراجہ نرندر سنگھ رئیس پٹیالہ، راجہ دیونراین سنگھ رئیس بنارس اور راجہ ڈنکر راؤ دیوان ریاست گوالیار شریک ہوئے۔ اگرچہ اُس وقت ہندوستانیوں کا کونسل میں شریک ہونا محض برائے نام تھا مگر سرسید نے درحقیقت یہ بیج بویا تھا اُس پودے کا جواب کسی قدر بارآور ہونے لگا اور اُن کا یہ احسان تمام ملک پر ہمیشہ رہے گا۔

یا مثلاً کتاب مذکور میں یہ بھی شکایت کی گئی تھی کہ ہندوستانیوں کو بڑی بڑی ذمہ داریوں کے عہدوں پر مقرر نہیں کیا جاتا۔ اس شکایت کا دفعیہ بھی گورنمنٹ نے بہت جلد کیا۔ کتابِ مذکور کے پیش ہونے سے ایک برس یعنی ۱۸۶۲ء میں پہلی ہی دفعہ پنڈت شمبھو ناتھ ہائی کورٹ کلکتہ کے جج مقرر ہوئے اور اُس کے بعد رفتہ رفتہ اکثر اعلیٰ عہدے، جو پہلے کبھی ہندوستانیوں کو نصیب نہیں ہوئے تھے، ملنے لگے۔

مرادآباد ہی میں سرسید نے خاص کر مسلمانوں کی بھلائی کے لیے ایک اور مفید کام کی بنیاد ڈالی۔ بغاوت پر جتنے آرٹیکل، رسالے اور کتابیں انگریز لکھتے تھے اُن میں سے اکثر میں مسلمانوں کے برخلاف رائیں ظاہر کی جاتی تھیں۔ کہیں ان پر یہ الزام لگایا جاتا تھا کہ اُن کو اپنے مذہب کے بموجب عیسائیوں سے عداوت ہے، کوئی یہ کہتا تھا کہ شاہ نعمت اللہ ولی کی پیشین گوئی سے تمام مسلمانوں کو یہ یقین تھا کہ اب عیسائیوں کی عمل داری نہیں رہنے کی اور سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ مسلمانوں کے مذہب کی رو سے انگریزوں پر جہاد کرنا

واجب تھا اور اسی لیے سب سے زیادہ بغاوت کے مرتکب ہوئے سرسید نے ان خیالات کی تردید کے لیے ایک رسالہ نکالنا شروع کیا جس نام ''لائل محمڈنز آف انڈیا'' تھا اور جس میں اس بات کی شہادتیں پیش کی جاتی تھیں کہ جس قدر گورنمنٹ کی خیر خواہی میں جاں بازی اور جاں نثاری کے کام غدر کے موقع پر مسلمانوں سے ظہور میں آئے وہ تمام ملک میں کسی قوم سے ظاہر نہیں ہوئے۔

اس کے بعد اُن کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جو بدگمانیاں مذہب اسلام کی نسبت قدیم سے یورپ میں چلی آتی ہیں اور جن کی وجہ سے ہندوستان کی حکمران قوم یہاں کے مسلمانوں کو گورنمنٹ کے حق میں نہایت خوف ناک جماعت سمجھتی ہے اُن کے رفع کرنے اور اسلام کی اصل حقیقت ظاہر کرنے کے لیے بائبل کی تفسیر لکھی جائے۔ اور جہاں تک اسلام کے اصول اہل کتاب کے اصول سے مطابق ہوں اُن میں تطبیق کی جائے اور جہاں جہاں اختلاف پایا جائے وہاں اختلاف کے وجوہات بیان کیے جائیں اور اس طرح جو بدگمانیاں عیسائیوں کو اسلام کی نسبت ہیں وہ رفع کی جائیں نیز مسلمان جو موجودہ بائبل کو بالکل محرف سمجھتے ہیں اور اسلام اور عیسائیت کے درمیان ایک وسیع سمندر کو حائل جانتے ہیں اُن کی اس غلطی کو بھی دور کیا جائے اور اس طرح دونوں قوموں میں اتحاد پیدا کیا جائے۔ چناں چہ غازی پور میں انھوں نے بائبل کی تفسیر بہت بڑے پیمانے پر لکھنی شروع کی اور اپنا ہزار ہا روپیہ اس کام میں صرف کیا، عربی اور عبرانی کے جاننے والے عالم نوکر رکھے اور کئی ہزار روپیہ کا پریس تفسیر چھاپنے کے لیے خریدا، اور سرکاری کام سے جو وقت بچا وہ سب اُس کے ترتیب دینے میں صرف کیا اور بڑی بڑی جلدیں بڑے اہتمام کے ساتھ چھپوا کر شائع کیں۔ لیکن اس وجہ سے کہ یہ ایک بہت بڑا کام تھا جس کا سرانجام کرنا سرسید کی طاقت اور مقدور سے باہر تھے اور نیز مسلمان پبلک نے اُس کی قدر نہیں کی آخر کار سرسید کو اس کام سے دست بردار ہونا پڑا۔

۱۸۷۱ء میں ڈاکٹر ہنٹر نے، جو ہندوستان کے مدبرانِ سلطنت میں شمار ہوتے تھے، ایک کتاب مسلمانوں کے مذہبی خیالات پر انگریزی میں لکھ کر شائع کی جس میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ مسلمان ایک ایسی قوم ہے کہ جو گورنمنٹ سے لڑنا اور جہاد کرنا اپنا مذہبی

فرض سمجھتی ہے اور گورنمنٹ کی کسی طرح خیر خواہ نہیں بن سکتی نیز وہابیت اور بغاوت دو ہم معنی الفاظ ہیں، پس گورنمنٹ کو اُن کی طرف سے مطمئن اور بے فکر نہیں رہنا چاہیے۔ وہ اب بھی ہندوستان میں گورنمنٹ انگریزی کے لیے ویسے ہی موجب خطر ہیں جیسے کہ ایک مدت سے موجب خطر چلے آتے ہیں۔

جس زمانے میں یہ کتاب شائع ہوئی یہ وہ زمانہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کا غدر انگریزوں کو ابھی تک فراموش نہیں ہوا تھا۔ دوسرے بنگالے کے وہابیوں کے مقدمات کا سلسلہ جاری تھا۔ تیسرے انھیں دنوں میں مسٹر نارمن چیف جسٹس بنگال کا ایک مسلمان کے ہاتھ سے قتل ہونا اُس پر اور طرہ ہو گیا تھا۔ ایسے وقت میں ظاہر ہے کہ ڈاکٹر ہنٹر جیسے معزز شخص کی کتاب نے انگریزوں کے دل پر کیسا اثر پیدا کیا ہوگا اور مسلمانوں کی طرف سے ان کی بدگمانی کو کس حد تک پہنچا دیا ہوگا۔

جس وقت یہ کتاب شائع ہوئی اُس وقت سر سید پر مختلف قسم کے سرکاری اور قومی کاموں کا اس قدر ہجوم تھا کہ اُن کو سر کھجانے کی فرصت نہ تھی۔ باوجود اس کے کہ انھوں نے سب کام چھوڑ کر اس کتاب پر ریویو لکھنا شروع کیا جو ''پایونیر'' کے متعدد پرچوں میں برابر شائع ہوتا رہا۔ انھوں نے اس ریویو میں بہت صاف اور روشن شہادتوں سے ڈاکٹر ہنٹر کی غلطیاں ظاہر کیں اور وہابیوں کی مختصر تاریخ اول سے آخر تک مشرح بیان کی اور اس بات کا اقرار کیا کہ میں خود وہابی ہوں اور وہابی ہونا جرم نہیں ہے بلکہ گورنمنٹ کی بدخواہی اور بغاوت جرم ہے جو شخص اس جرم کا مرتکب ہوگا خواہ وہ وہابی ہو یا عیسائی، ہندو ہو یا مسلمان یا اور کوئی مذہب والا، بلا خیال مذہب کے مجرم قرار پائے گا۔ انھوں نے جہاد کے مسئلے کی حقیقت اور جو غلط فہمیاں اُس کی نسبت تھیں اُن کو اچھی طرح ظاہر کیا اور بتایا کہ جو مسلمان انگریزی گورنمنٹ کی پناہ میں ہیں اور اپنے فرائض مذہبی بلا مزاحمت ادا کرتے ہیں اُن کو انگریزی گورنمنٹ کے زیر حکومت اُسی اطاعت و فرماں برداری سے رہنا از روئے اسلام واجب ہے جیسا کہ ہجرت اولیٰ میں مسلمان حبش میں جا کر عیسائی بادشاہ نجاشی کے زیر حکومت رہے تھے۔

سرسید کے ریویو نے انگریزی حکام کے دل پر اور نیز انگلستان کے لوگوں پر نہایت عمدہ اثر کیا۔ اُن کے ایک دوست لندن میں موجود تھے اور ان کو معلوم تھا کہ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب سے لندن میں نہایت جوش اور مسلمانوں کی نسبت بہت زہریلے خیالات پھیل گئے ہیں۔ انھوں نے سرسید کا تمام ریویو فوراً ''پایونیر'' کے پرچوں سے نقل کرا کے جدا بطور پمفلٹ کے چھپوا دیا اور لندن میں جا بجا تقسیم کرا دیا۔ اس ریویو کے شائع ہونے سے لندن میں لوگوں کی طبیعتوں کا یہ حال ہوا جیسے کہ جلتی اور بھڑکتی آگ پر کوئی پانی ڈال دے۔ جو شخص اس کو پڑھتا تھا ڈاکٹر ہنٹر کی تحریر پر ہنستا تھا اور جو کچھ انھوں نے مسلمانوں یا وہابیوں کی نسبت لکھا تھا اس کا اعتبار لوگوں کے دلوں سے جاتا رہا۔

۱۶ر مارچ ۱۸۷۲ء کے ''انڈین آبزرور'' میں خود اُس کے یورپین ایڈیٹر کا ایک زبردست آرٹیکل ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب اور سرسید کے ریویو پر نکلا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے سرسید کے ریویو نے ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کا اعتبار انگریزوں کے دل سے بالکل محو کر دیا تھا۔ اسی آرٹیکل میں ایک جگہ ڈاکٹر موصوف کی نسبت لکھا تھا کہ ''غالباً ڈاکٹر ہنٹر ابھی زندہ رہیں گے اور بہت سی کتابیں لکھیں گے جن کی عبارت بہت سے لوگوں کے دل لبھائے گی مگر سرسید کے ریویو نے اصلی واقعات کے محقق ہونے کی نام وری اُن کے ہاتھ سے ایسی کھودی ہے کہ پھر کبھی میسر نہ ہوگی۔ کتابیں پڑھنے والے ان کی کتابوں کو بغیر اس کے کہ کھول کر دیکھیں طاق پر رکھ دیں گے اور یہ سمجھیں گے کہ قصے کی دلچسپ کتابوں کی مانند ہیں جو اپنے طرز میں نہایت دلفریب ہوتی ہیں مگر کسی کام کی نہیں ہوتیں۔''

ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی کتاب میں ایک جگہ لکھا تھا کہ ''مجھ کو ہندوستان کے مسلمانوں سے اس سے زیادہ توقع نہیں ہے کہ وہ حکومتِ انگریز کے قبول کرنے میں ضرور سرد مہری کریں گے۔'' سرسید نے اس کا مفصل جواب دینے کے بعد لکھا کہ ''وہ بات مشہور ہے کہ جیسا کوئی کرتا ہے ویسا ہی اس کو نتیجہ ملتا ہے۔ پس اگر مسلمان بجز سرد مہری کے قومِ حکمران کی جانب سے اور کچھ سلوک نہیں دیکھتے تو مسلمانوں کی سرد مہری سے کچھ تعجب نہیں کرنا چاہیے۔'' ہم دونوں قوموں یعنی عیسائی اور مسلمانوں کو عیسیٰ مسیح کا یہ قول یاد رکھنا چاہیے کہ

''جس سلوک کے تم اوروں سے متوقع ہو تم کو بھی وہی سلوک اُن کے ساتھ کرنا چاہیے۔''
اس ریویو کا اخیر نتیجہ یہ ہوا کہ گورنمنٹ جو وہابی مذہب کے مسلمانوں سے خصوصیت کے ساتھ بدگمان تھی اور اُن کو برٹش حکومت کا بدخواہ سمجھتی تھی وہ بدگمانی اب بالکل جاتی رہی ہے اور یہ بات سب کو معلوم ہوگئی ہے کہ وہابیوں کے اصولِ مذہب کی ناواقفیت کے سبب سے یہ تمام بدگمانیاں پیدا ہوئی تھیں۔

الغرض غدر کے بعد ایک مدت دراز تک سرسید برابر ایسی تدبیریں کرتے رہے جن سے انگریزوں کے دل جو اس واقعے کے سبب ہندوستانیوں سے مکدر ہو گئے ہیں کسی طرح اُن کی کدورت رفع ہو اور خاص کر جو بدگمانیاں مسلمانوں کی طرف سے عام طور پر اُن میں پھیل گئی ہیں اُن کو دور کیا جائے اسی غرض سے انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ میں قائم کی جس کا بڑا مقصد یہ تھا کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں میں میل جول اور ربط و اتحاد پیدا ہو اور علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کی جائیں اور بذریعہ ترجموں کے ملک میں علم کی روشنی پھیلائی جائے اور سوسائٹی سے ایک ایسا اخبار اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں جاری کیا جائے جس سے ہندوستانیوں کے خیالات انگریزوں پر اور انگریزوں کے خیالات ہندوستانیوں پر ظاہر ہوتے رہیں۔

پھر جب اُن کی تبدیلی غازی پوری میں ہوگئی تو وہاں جاکر انھوں نے انگریزی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا جس کے انتظام کے لیے ہندو مسلمانوں کی متعدد کمیٹیاں مقرر کی گئیں اور انگریزی کے سوا اُردو، فارسی، عربی اور سنسکرت کی تعلیم کا بھی اُس میں انتظام کیا گیا۔ یہ مدرسہ آج تک ''وکٹوریہ اسکول'' کے نام سے جاری ہے اور ہائی اسکول تک کی پڑھائی اُس میں ہوتی ہے۔

جب غازی پور سے سرسید کی تبدیلی پھر علی گڑھ ہوگئی تو یہاں آکر انھوں نے ایک اور انجمن ۱۸۶۶ء میں قائم کی جس کا نام ''برٹش انڈین ایسوسی ایشن'' تھا اور جس کا مقصد یہ تھا کہ ایسوسی ایشن کے ذریعے سے ہندوستان کے حالات اور معاملات کی اطلاع پارلیمنٹ تک پہنچتی رہے اور جس طرح اینگلو انڈینز نے اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے ایک ایسوسی

ایشن انگلستان میں قائم کی ہے اسی طرح تمام اضلاعِ شمال ومغرب کی جانب سے ہندوستانی بھی ایک ایسوسی ایشن اپنے ملک میں قائم کریں اور اُس کے ذریعے سے اپنے تمام مقاصد گورنمنٹ اور پارلیمنٹ تک پہنچاتے رہیں۔

۱۸۶۶ء ہی میں انھوں نے صوبۂ مذکور میں تعلیمی کمیٹیاں قائم ہونے کی تحریک گورنمنٹ میں کی اور زمین دارانِ علی گڑھ کی طرف سے ایک درخواست گورنمنٹ میں اس غرض سے بھجوائی کہ تعلیم کے انتظام اور نگرانی اور اخراجات میں ہم لوگوں کو بھی، کہ علاوہ جمع مال گزاری کے ایک روپیہ سیکڑہ ہم سے لیا جاتا ہے، دخل دیا جائے اور ہر ضلع میں ایک تعلیمی کمیٹی قائم ہو جس میں حکامِ ضلع اور افسران سررشتۂ تعلیم کے علاوہ ضلع کے رئیس اور زمین دار بھی شامل ہوں۔ چناں چہ اول ضلع علی گڑھ اور اٹاوہ میں امتحاناً تعلیمی کمیٹیاں مقرر کی گئیں اور آخرکار تمام اضلاعِ شمال مغرب میں اُن کا تقرر منظور کیا گیا۔

۱۸۶۷ء میں انھوں نے ''برٹش انڈین ایسوی ایشن'' کی طرف سے گورنمنٹ ہند میں اس مضمون کی درخواست بھیجی کہ اضلاعِ شمال مغرب میں ایک ورنیکلر یونی ورسٹی قائم کی جائے جس میں بڑے بڑے علوم وفنون کی تعلیم دیسی زبان میں ہوا کرے بشرطیکہ[1] ہائی ایجوکیشن کو، جو بذریعہ کلکتہ یونی ورسٹی کے اس صوبہ میں جاری ہے، کچھ صدمہ نہ پہنچے۔ مگر جب انھوں نے دیکھا کہ ورنیکلر یونی ورسٹی سے انگلش ہائی ایجوکیشن کو ضرور صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہے تو انھوں نے یہ خیال بالکل چھوڑ دیا۔

انھیں دنوں میں سرسید نے انگریزوں اور مسلمانوں میں ربط اور اتحاد بڑھانے کی غرض سے ایک رسالہ اہلِ کتاب کے ساتھ کھانے پینے کے جواز پر لکھ کر شائع کیا جس میں اُن تمام شبہات کا جواب جو ہندوستان کے علما مواکلتِ اہلِ کتاب پر کرتے تھے اور مسلمانوں کو انگریزوں کے ساتھ کھانے پینے سے منع کرتے تھے، آیتوں اور حدیثوں اور فقہ کی کتابوں سے مدلل کر کے لکھا تھا۔ اس رسالے کا جو اثر ہندوستان میں ہوا اُس کے بیان کرنے کی زیادہ ضرورت نہیں ہے کیوں کہ انگریزوں کے ساتھ کھانا پینا اب ہندوستان میں

---

[1] انگریزی کی اعلیٰ تعلیم۔۱۲

ایسا عام ہو گیا ہے کہ جن لوگوں کی انگریزوں تک رسائی ہے اور جو اُن سے ملتے جلتے ہیں وہ عموماً اُن کے ساتھ کھانے پینے سے اجتناب نہیں کرتے۔

غرض کہ ۱۸۵۸ء سے لے کر ۱۸۶۸ء تک وہ برابر اُن تدبیروں میں سرگرم رہے جن سے ملک اور قوم کی بھلائی متصور تھی۔ مگر وہ خوب جانتے تھے کہ جب تک مسلمانوں میں مغربی تعلیم نہ پھیلے گی اُس وقت تک اُن کا پنپنا اور ہندوستان میں عزت سے رہنا ممکن نہیں۔ اس منصوبے کے پورا کرنے کے لیے انھوں نے نہایت ضروری سمجھا کہ چند روز انگلستان میں جا کر قیام کریں اور وہاں کے طریقۂ تعلیم و تربیت کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور پھر ہندوستان پہنچ کر جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں کی تعلیم کی بنیاد ڈالیں۔ اس کے سوا انھیں دنوں میں سر ولیم میور لیفٹیننٹ گورنر اضلاعِ شمال و مغرب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کی زندگی کا حال چار جلدوں میں شائع کیا تھا جس میں اسلام اور بانیِ اسلام پر دل کھول کر نکتہ چینی کی گئی تھی۔ جس وقت سے وہ کتاب شائع ہوئی تھی سر سید کو اُس کی تردید لکھنے کے خیال نے بے چین کر رکھا تھا۔ مگر اُس کی تردید لکھنے کے لیے جن کتابوں اور نوشتوں کی ضرورت تھی وہ ہندوستان میں نایاب تھے اور صرف ''برٹش میوزیم'' یا ''انڈیا آفس'' کے کتب خانوں میں مل سکتے تھے۔

لیکن سر سید احمد خاں جیسے بے سرمایہ آدمی کا ولایت جانا اور وہاں جا کر ایک جنٹلمین کی حیثیت سے قیام کرنا بظاہر ناممکن ہوتا تھا مگر وہ جو مشہور ہے کہ ہمت کا حامی خدا ہوتا ہے، حسنِ اتفاق سے انھیں دنوں میں گورنمنٹ ہند نے ہندوستانیوں کو تعلیم کی غرض سے ولایت بھیجنے کے لیے علاوہ تین تین ہزار روپیہ خرچۂ آمد و رفت کے چھ چھ ہزار سالانہ کے نو وظیفے چند صوبوں کے واسطے منظور کر لیے اور صوبۂ اضلاع شمال و مغرب کا وظیفہ سید محمود مرحوم کو مل گیا۔ اگر چہ یہ روپیہ صرف سید محمود کے بھیجے کے لیے بھی کافی نہ تھا مگر گورنمنٹ کی اس امداد سے سر سید کے ارادے کو بہت تقویت ہوئی۔ الغرض انھوں نے اس غرض کے لیے گورنمنٹ سے رخصت کی درخواست کی اور بعد منظوری رخصت کے اپنی کتابیں اور اثاث البیت بیچ کر اور گھر اور کوٹھی کو رہن رکھ کر مع سید حامد اور سید محمود کے یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو بنارس سے

انگلستان روانہ ہو گئے۔

سرسید کے اس سفر کا مفصل حال بہت طول طویل ہے اس لیے اُن کے ایک معزز دوست کی تحریر سے جو اُن کے سفر انگلستان کے متعلق لکھی گئی تھی، ہم ذیل کی چند سطریں اس مقام پر نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

وہ لکھتے ہیں کہ ''سید احمد خاں ولایت گئے مگر اس مطلب سے کہ اپنی آنکھ سے اُس قوم کو، جو اس وقت تمام اقوام روئے زمین پر شرف رکھتی ہے، انھیں کے ملک اور انھیں کے گھروں میں دیکھیں اور جو کچھ وہاں دیکھا ہے واپس آ کر اپنی قوم میں پھیلائیں۔ لوگ ولایت میں جا کر تماشا گاہ تھیٹر، پارک، میوزیم اور عمارات کی سیر کرتے ہیں اور یہ حامی دینِ اسلام کتب خانے میں بیٹھا ہوا سر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھنے میں منہمک تھا اور کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے انتظام پر غور کر رہا تھا۔ اس شخص کا ولایت جانا قوم کے واسطے تھا، رہنا قوم کے واسطے اور واپس آنا قوم کے واسطے۔''

سرسید نے ولایت میں سترہ مہینے قیام کیا۔ اس عرصے میں انھوں نے اُس مشکل سبق کے علاوہ جو مسلمانوں میں تعلیم و تربیت پھیلانے کا وہاں رہ کر سیکھا تھا، سر ولیم میور کی کتاب کا جواب بڑی محنت اور جاں فشانی سے لکھا اور اس کا ترجمہ انگریزی میں کرا کر انگلستان ہی میں شائع کیا۔ ایک انگریز ''جان ڈیون پورٹ'' نام جس نے مسلمانوں کی حمایت میں عیسائیوں کے برخلاف ایک کتاب موسوم بہ ''اپالوجی'' لکھی تھی اور اُس کے چھپوانے کی استطاعت نہ رکھتا تھا اس کو ہندوستان سے سرسید نے چندہ جمع کرا کے چھپوایا۔ اور چند اسی قسم کی کتابیں جو انیسویں صدی کے شروع میں بعض منصف مزاج انگریزوں نے اسلام کی حمایت میں لکھی تھیں اور اب نایاب ہو گئی تھیں اُن کو بڑی جستجو سے بہم پہنچایا اور اس میں سے بعض کا ہندوستان میں ترجمہ کرا کر شائع کیا۔

سر ولیم میور کی کتاب کا جواب جس کا نام ''خطباتِ احمدیہ'' ہے اُس پر مفصل ریویو کرنا اور اُس کی خوبیاں آپ صاحبوں کے سامنے اس وقت بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ مگر چند لائق انگریزوں نے جو اس کتاب کی نسبت عمدہ رائیں لکھی ہیں ان کا مختصر طور پر یہاں

ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

اخبار ''انکوائرر'' نے اُسی زمانے میں ''خطباتِ احمدیہ'' پر ایک مبسوط آرٹیکل لکھا تھا جس میں اُس نے اقرار کیا تھا کہ مصنف نے لٹریچر کے مردِ میدان ہونے کا حق بخوبی ثابت کر دیا ہے۔ وہ ایک موقع پر، جہاں سرسید نے ثابت کیا ہے کہ اسلام عیسائیوں کے لیے رحمت تھا، لکھتا ہے کہ ''بے شک ہیئت اور طب یہ دونوں علم اور پروٹسٹنٹ اور یونی ٹیرین یہ دونوں مذہبت اُن فوائد میں سے ہیں جو اسلام نے عیسائی مذہب کو عطا کیے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ عیسائی قومیں کافی طور پر شکرگزار ہوں گی۔ ان فوائد میں سے ہر ایک فائدے کے تھے اور سب فائدوں کے تھے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ جو زبردست تحریک یورپ میں اندلس کے مسلمانوں سے پیدا ہوئی وہ مذکورۂ بالا فوائد میں منحصر نہیں ہے بلکہ فن تعمیر، شاعری، معاشرت اور آداب سب پر اُس کا کافی اثر پہنچا ہے۔''

اسی کتاب میں ایک جگہ عیسائیوں کے اس طعن کا جواب دیتے وقت کہ، اسلام کی بنیاد محض عیسائی اور یہودی مذہب پر رکھی گئی ہے، سرسید نے لکھا تھا کہ مسلمان اپنی سب سے بڑی عزت یہ سمجھتے ہیں کہ وہ سچے اور ایماندار پیرو ہیں ہر ایک سچے اور خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر کے۔ اس پر ریویونگارِ مذکور لکھتا ہے کہ ''یہ الفاظ ہم کو ایک شریف قول معلوم ہوتے ہیں اور ایسے ہیں جو بالکل تسلیم کیے جائے کے قابل ہیں۔ ان پر فی الحقیقت کیتھولسٹی کے سچے اصول کی مہر ہے۔ فی الواقع اگر کوئی جامع اصول مختلف مذہبوں میں مصالحت پیدا کرسکتا ہے تو وہ صرف یہی اصول ہے اور بس۔''

ریورنڈ ہوپر جو ایک زمانے میں لاہور ڈیوینٹی کالج میں پرنسپل تھے انھوں نے اسی کتاب کے متعلق میرے ایک دہلوی دوست سے کہا تھا کہ ''ہمارے نزدیک جو کام سید احمد خاں نے اسلام کی حمایت کا کیا ہے وہ آج تک کسی مسلمان سے بن نہیں آیا ہے۔ جب کہ مسلمان اسلام کے سوا سب مذہبوں کو باطل سمجھتے ہیں اور اسلام کا ماننا تمام نبی آدم پر فرض جانتے ہیں تو اُن کا فرض تھا کہ جن کو وہ گمراہ سمجھتے ہیں اُن پر اسلام کی خوبی ظاہر کرتے، اُن کے ملکوں میں جا کر انھیں کی زبان میں وعظ کہتے یا انھیں کی زبان میں اسلام کے حق ہونے

پر کتابیں لکھتے۔ میں نہیں جانتا کہ تیرہ سو برس میں سید احمد خاں سے پہلے کسی ایک مسلمان نے بھی ایسا کام کیا ہو۔''

کرنل گریہم سر سید کی لائف میں ''خطباتِ احمدیہ'' کی نسبت لکھتے ہیں کہ ''اس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کا غیر معمولی تعمق نظر، غیر مذہبوں سے بے تعصبی اور اصلی عیسائیت کے سچے اصول کا ادب...... جو لوگ مذہبی باتوں سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کو چاہیے کہ اس کتاب کو غور سے پڑھیں۔ دین محمدی فی زمانناانگریزوں کے نزدیک بالکل ایک غیر معقول اور سخت متہم دین ہے اور وہ اُس کو ایک روحانی آفت خیال کرتے ہیں جیسے کہ ہمارے بزرگ اس صدی کے شروع میں بونا پارٹ کو ایک جسمانی آفت خیال کرتے تھے۔ وہ عموماً ایک تلوار کا مذہب خیال کیا جاتا ہے اور اُس میں ہر ایک چیز تعصب، مغائرت اور تنگ دلی کی خیال کی جاتی ہے۔ لیکن ہمارے ناظرین کتاب جو اس غلطی میں مبتلا ہیں۔ جب سید احمد خاں کے ''خطباتِ احمدیہ'' کو غور سے پڑھیں گے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ بالکل دوسرے خیالات لے کر اٹھیں گے۔ سید احمد خاں نے اپنے دلی دوست سر ولیم کی کتاب کا جواب لکھا ہے جس میں مصنف پر خوب لے دے کی ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ بے تعصب اور سمجھ دار ناظرینِ کتاب بہت سی باتوں میں سر ولیم میور کے خلاف فیصلہ دینے میں اتفاق کریں گے۔''

مذکورۂ بالا رایوں سے ہر شخص بخوبی اندازہ کرسکتا ہے کہ ''خطباتِ احمدیہ'' نے انگریزوں کے دل پر کیسا عمدہ اثر کیا تھا اور جو کتابیں قدیم مخاصمانہ طریقہ کے برخلاف شائستگی اور بے تعصبی کے ساتھ لکھی جاتی ہیں وہ کسی قدر مفید اور فریقِ ثانی کو کس قدر انصاف پر مائل کرنے والی ہوتی ہیں۔

سر سید نے ولایت سے ہندوستان میں آ کر جو سب سے بڑا اور عظیم الشان کام مسلمانوں کی حقیقی اور اصلی بھلائی کا کیا اور جس سے میری مراد علی گڑھ میں ''محمڈن اینگلو اورینٹل کالج'' کا قائم کرنا ہے، اُس کی عظمت اور بڑائی سے سب لوگ واقف ہیں اور اُس کی نسبت زیادہ تفصیل بیان کرنے کی اس موقع پر ضرورت نہیں ہے۔ مگر ہم نہایت مختصر طور

پر اُس کی ابتدا اور جس حد تک اُس نے اب تک ترقی کی ہے اُس کا ایک خاکہ کھینچ کر حاضرین کو دکھانا چاہتے ہیں۔

ولایت جانے سے پہلے سرسید احمد خاں نے اپنے ایک معزز بزرگ سے برسبیل تذکرہ یہ الفاظ کہے تھے کہ ''اگر مسلمانوں کی تعلیم کا سامان مہیا کرنے کے لیے مسلمانوں سے چندہ جمع کیا جائے تو آپ کے نزدیک دس لاکھ روپیہ جمع ہوسکتا ہے یا نہیں۔'' وہ یہ الفاظ سن کر بے اختیار ہنس پڑے اور کہا کہ ''یہ تمہارے ویسے ہی شیخ چلی کے سے منصوبے میں جو تم ہمیشہ باندھا کرتے ہو۔ میرے نزدیک تو مسلمانوں سے اس کام کے لیے بجائے دس لاکھ کے دس روپے کے ملنے کی بھی امید نہیں ہے۔''

صاحبو! یہ کچھ کم تعجب کی بات نہیں ہے کہ جس درس گار کے لیے ۱۸۶۸ء میں چھ کروڑ مسلمانوں سے دس لاکھ روپے وصول ہونا محال سمجھا جاتا تھا آج اُس کی شہرت اور مقبولیت اس درجے کو پہنچ گئی ہے کہ بمبئی کے ایک مسلمان تاجر نے انھیں دنوں میں اُس کے لیے ایک لاکھ دس ہزار روپیہ دیا ہے اور اس کا سالانہ خرچ ایک لاکھ روپیہ تک پہنچ گیا ہے اور صرف اُس کی عمارات پر دس لاکھ سے بہت زیادہ اب تک خرچ ہو چکا ہے اور جس مدرسے کا ۱۸۷۵ء میں قوم کی مخالفت کے سبب ہائی اسکول کے درجے تک پہنچنا غیر ممکن معلوم ہوتا تھا اب وہی قوم اُس کو یونی ورسٹی بنانے کی تدبیریں کر رہی ہے۔ جس مدرسے میں کوئی دہلی یا علی گڑھ کا مسلمان بھی اپنے لڑکے کو بھیجنا نہیں چاہتا تھا آج اُسی میں پنجاب، ممالکِ متحدہ بنگال، مدراس، برہما، آسام، گجرات، بلوچستان، افغانستان اور ایران تک کے سات سو مسلمان بورڈر تعلیم و تربیت پاتے ہیں۔

علی گڑھ محمڈن کالج سے جس قدر مسلمانوں نے اب تک تعلیم میں ترقی کی ہے اُس کو اعداد کے ذریعے سے ہم اس وقت ٹھیک ٹھیک بیان نہیں کر سکتے۔ ہم کو اس امر کی نسبت صرف اس قدر معلوم ہے کہ جب سے کلکتہ، بمبئی اور مدراس یونی ورسٹیاں قائم ہوئی تھیں اُس وقت سے لے کر ۱۸۸۱ء تک یعنی اُس وقت تک کہ علی گڑھ کالج کے طالب علم یونی ورسٹی کے اعلیٰ امتحانوں میں شریک ہونے لگے تمام ہندوستان میں مسلمان گریجوئٹس کی

تعداد صرف ۴۳ تک پہنچی تھی مگر ۱۸۸۲ء سے ۱۸۹۳ء یعنی صرف ۱۲ سال میں تمام ہندوستان کے گریجوئٹس کی تعداد ۴۳ سے بڑھ کر ۳۹۹ تک پہنچ گئی۔

سرکاری ملازمت میں جو پست حالت مسلمانوں کی تھی اُس کا کسی قدر اندازہ ''پایونیر'' مورخہ ۱۸۷۰ء کے فقرہ سے ہوسکتا ہے جو اُس نے صوبۂ بنگال کی نسبت لکھا تھا کہ ''تمام بنگال میں چند مسلمان عہدے دار ہیں جو جلد پنشن لینے والے ہیں اور اُن کی جگہ پر یقینی کوئی مسلمان نہیں ہونے کا اور آئندہ بجز چپراسی اور دفتری کے کوئی مسلمان معزز عہدے پر نظر نہ آئے گا۔'' اگرچہ ''پایونیر'' نے یہ فقرہ بنگال کی نسبت لکھا تھا لیکن اگر سرسید کی چیخ پکار سے شمالی ہندوستان میں تعلیم کا چرچا نہ پھیل جاتا تو یہی حال پنجاب اور اضلاعِ شمال ومغرب میں مسلمانوں کی سرکاری ملازمت کا ہونے والا تھا۔ لیکن جب سے علی گڑھ کالج کی اعلیٰ امتحانوں کے نتیجے نکلنے لگے ہیں اُس وقت سے مسلمان ملازموں کی تعداد معزز عہدوں پر روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور مسلمان بیرسٹروں اور وکیلوں کا شمار بھی روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ اس کالج کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نسبت سرآکلینڈ کالون نے، جب کہ وہ اضلاع شمال ومغرب کے لیفٹیننٹ گورنر تھے، کہا تھا کہ ''جو شخص اُن نوجوانوں سے واقف ہے جو اس کالج سے پاس ہوکر نکلتے ہیں۔ وہ غالباً اس امر میں مجھ سے اتفاق کرے گا کہ وہ اپنی تعلیم وتربیت کی علامتیں ایسی ہی صاف صاف ظاہر کرتے ہیں جیسی کہ انگلستان میں ہمارے پبلک اسکولوں اور یونی ورسٹیوں کے گریجوئنس ظاہر کرتے ہیں۔ علی گڑھ کالج کا طالب علم فیاضانہ خیالات اور ترقی یافتہ تعلیم وتربیت اور آزادانہ خصلت رکھنے والا شخص خیال کیا جاتا ہے۔''

سرسید نے مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کے لیے صرف محمڈن کالج ہی کے قائم کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ''محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس'' اسی غرض سے ۱۸۸۶ء میں قائم کی جس نے تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں تعلیم کا غُل ڈال دیا۔ انھوں نے ایک دوسری ایسوسی ایشن ''محمڈن سول سروس فنڈ'' کے نام سے اس لیے قائم کی کہ قومی چندے سے مسلمان طالب علموں کو سول سروس کے امتحان میں شریک ہونے کے لیے انگلستان بھیجا جائے۔ انھوں نے جب دیکھا کہ گورنمنٹ کا ارادہ ہائی ایجوکیشن کو گھٹا کر مشرقی تعلیم کو ترقی دینے کا ہے اور

لارڈ رپن کی ایک اسپیچ سے جو لاہور میں اہل پنجاب کے ایڈریس کے جواب میں انھوں نے دی تھی، اُن کو یقین ہو گیا کہ اگر پنجاب یونی ورسٹی کالج کو یونی ورسٹی کے اختیارات مل گئے تو پنجاب میں اعلیٰ تعلیم کا نام ونشان باقی نہ رہے گا تو انھوں نے نہایت جوش وخروش کے ساتھ پے در پے تین آرٹیکل پنجاب یونی ورسٹی کے خلاف لکھ کر شائع کیے جن کا تمام پنجاب میں غل پڑ گیا اور اہل پنجاب میں سے جو لوگ انگریزی تعلیم کی جگہ مشرقی تعلیم پر پنجاب یونی ورسٹی کی بنیاد رکھنی چاہتے تھے اُن کے خیالات بالکل بدل گئے۔ پھر جب ۱۸۸۹ء میں الہ آباد یونی ورسٹی اُسی اصول پر قائم ہونے لگی جس پر پنجاب یونی ورسٹی کے قائم ہونے کا گمان تھا اور سرسید کو معلوم ہوا کہ سر ولیم میور سابق لیفٹیننٹ گورنر جو مشرقی علوم کے بڑے قدردان تھے اُن کی پُرانی تجویز کے موافق یہ یونی ورسٹی بھی اسی غرض سے قائم ہونے والی ہے کہ مشرقی علوم اور مشرقی زبانوں کو ترقی دی جائے، تو انھوں نے الہ آباد یونی ورسٹی کی بھی اُسی شد و مد کے ساتھ مخالفت کی جیسی کہ پنجاب یونی ورسٹی کی کی تھی، جو زبردست آرٹیکل انھوں نے الہ آباد یونی ورسٹی پر لکھا تھا اُس میں انھوں نے صاف صاف لفظوں میں تحریر کیا کہ ''اگر بالفرض یہ یونی ورسٹی مغربی تعلیم کی سدِّ راہ ہو تم ہم گورنمنٹ کی پالیسی کی کچھ پروانہ کرنی چاہیے اور خود اپنے لیے انگلش ہائی ایجوکیشن کے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اور اگر ہم میں سلف رسپکٹ کا کچھ اثر باقی ہے تو گورنمنٹ کو دکھا دینا چاہیے کہ اُس کو بلاشبہ لوگوں کی جانوں پر اختیار ہے مگر اُن کی رایوں پر نہیں۔''

اگرچہ بالیقین نہیں کہا جاسکتا کہ گورنمنٹ فی الواقع انگلش ہائی ایجوکیشن کو گھٹانا چاہتی ہے اور سرسید کی تحریروں نے گورنمنٹ کی پالیسی پر کچھ اثر کیا یا نہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ شمالی ہندوستان کے تعلیم یافتہ لوگ جو دونوں یونی ورسٹیوں کی نسبت یہ خیال کرتے تھے کہ وہ اعلیٰ مغربی تعلیم کی جڑ کاٹنے والی ہوگی ویسا ظہور میں نہیں آیا۔ دونوں یونی ورسٹیوں نے اب تک کوئی ایسا قاعدہ مقرر نہیں کیا جو انگلش ہائی ایجوکیشن کی گاڑی میں روڑا اٹکانے والا ہو۔

سرسید نے مسلمانوں میں صرف انگریزی تعلیم کے پھیلانے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ

مغربی علوم سے جو مضر نتیجے مذہبی دُنیا میں عموماً پھیل رہے ہیں اور روز بروز پھیلتے جاتے ہیں اُن کے انسداد میں بھی انھوں نے کوئی دقیقہ سعی و کوشش کا فروگزاشت نہیں کیا۔ اُن کو معلوم تھا کہ جو لوگ انگریزی تعلیم پاتے ہیں خواہ ہندو ہوں، خواہ مسلمان، خواہ عیسائی اُن کے دل میں مستثنیٰ صورتوں کے سوا عموماً مذہب کی وقعت باقی نہیں رہتی۔ وہ مذہبی باتوں کا بھی ویسا ہی ثبوت چاہنے لگتے ہیں جیسا مدرسے میں ریاضی اور سائنس کے ہر ایک مسئلے کا ثبوت اُن کو ملتا رہتا ہے۔ اُن کے عقیدے نبوت اور معاد بلکہ الوہیت کی طرف سے بھی متزلزل ہو جاتے ہیں اور مذہبی احکام کی حقارت اُن کے دلوں میں بیٹھ جاتی ہے۔ سر سید کو معلوم تھا کہ مغربی علوم اور مغربی لٹریچر کی بدولت یورپ کے اکثر ملکوں میں روز بروز دہریت اور الحاد پھیلتا اور عیسائی مذہب کمزور ہوتا جاتا ہے، اس لیے انھوں نے اس خیال سے کہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے کا باعث میں خود ہوا ہوں اُس کی مضرتوں کا انسداد کرنا بھی اپنا فرض سمجھا۔ وہ ابتدا سے وقتاً فوقتاً ''تہذیب الاخلاق'' میں اُن شبہات کے جواب برابر لکھتے رہے جو سائنس کی رو سے اصول اسلام پر وارد ہونے ممکن تھے۔ انھوں نے اسی غرض سے قرآن مجید کی تفسیر لکھنی شروع کی جس کو باوجود طرح طرح کے موانع اور ہجوم مشاغل کے وہ برابر اوقاتِ فرصت میں لکھتے رہے اور نصف سے زیادہ قرآن کی تفسیر سات جلدوں میں لکھ کر چھوڑ گئے۔

صاحبو! میں اُس مرحوم کی کس کس بات کو بیان کروں۔ اُس کی پچاس برس کی کوشش سے جو عظیم الشان فائدے ملک اور قوم کو پہنچے ہیں اور جو جلیل القدر خدمتیں دین اسلام کی اُس سے ظہور میں آئی ہیں اُن کا ان چند سطروں میں آپ کے روبرو بیان کرنا میرے لیے بلا مبالغہ ایسا ہی مشکل کام ہے جیسے دریا کا کوزے میں بند کرنا۔ شمالی ہندوستان میں جس قدر انجمنیں، سوسائٹیاں، سبھائیں اور کانفرنسیں قائم ہوئی ہیں، جس قدر ہندو اور مسلمان نے ملک کے اطراف و جوانب میں مذہبی اور علمی درس گاہیں قائم کی ہیں، اور جس قدر اُردو، ہندی اور سنسکرت میں ۲۶ برس کے عرصے میں تالیفات اور تصنیفات اور تراجم میں شائع ہوئے ہیں؛ اور جس قدر اُردو اور ہندی اخبارات اور رسالے ملک کے ہر گوشے

میں جاری ہوئے ہیں، اگر غور کر کے دیکھا جائے تو یہ سب اُسی ایک انسان ضعیف البنیان کی تحریک کے کرشمے ثابت ہوں گے۔ اگر میرے ان تمام دعوؤں کا ثبوت کسی صاحب کو درکار ہو تو وہ ''حیاتِ جاوید'' (سرسید کی لائف) کو ملاحظہ کریں۔ مگر مثال کے طور پر میں یہاں صرف اُردو لٹریچر کی ترقی کا ذکر کرتا ہوں۔

جو لوگ اُردو لٹریچر اور اُس کی ترقی سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ ضرور اس بات کو تسلیم کریں گے کہ اُردو لٹریچر کی ترقی اُس انعامی اشتہار کے اجراء کی تاریخ سے شروع ہوتی ہے جو ۲۶/اگست ۱۸۶۸ء کو گورنمنٹ شمال و مغرب نے جاری کیا تھا اور جس نے ۳۶ برس کے عرصے میں ملک کو اس سرے سے اُس سرے تک نہ صرف اُردو بلکہ اکثر دیسی زبانوں کی تصنیفات سے مالا مال کر دیا۔ اگرچہ انعام سے کچھ زیادہ آدمی مستفید نہیں ہوئے اور اشتہار کی معیاد چند سال بعد گزر گئی لیکن اس اشتہار کا اثر اُس تمام گروہ میں، جو دیسی زبانوں میں تصنیف و تالیف کی کم و بیش لیاقت رکھتا تھا مگر اُس لیاقت کو کام میں لانا نہیں جانتا تھا، برقی فوت کی طرح دوڑ گیا۔ اُن لوگوں نے اپنی تصنیفات سے ملک کو بھی فائدہ پہنچایا اور وہ خود بھی حق تصنیف سے فائدہ اٹھانا سیکھ گئے۔ آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اس لٹریری ترقی کا باعث بھی وہی مرحوم تھا۔ سرسید نے سائنٹفک سوسائٹی کی طرف سے بمقام علی گڑھ سر ولیم میور لیفٹیننٹ گورنر کے حضور میں جو ایڈریس ۹/مئی ۱۸۶۸ء کو پیش کیا تھا اُس میں درخواست کی تھی کہ جو کتابیں ایسی زبانوں میں تصنیف و تالیف یا ترجمہ کی جائیں اُن کی گورنمنٹ کی طرف سے قدردانی ہونی چاہیے۔ اور ہز آنر نے ایڈریس کے جواب میں وعدہ کیا تھا کہ اِس درخواست پر ضرور لحاظ لیا جائے گا۔ چناں چہ ۲۶/اگست ۱۸۶۸ء کو یعنی ایڈریس پیش ہونے سے ساڑھے تین مہینے بعد گورنمنٹِ ممدوح نے مذکورۂ بالا انعامی اشتہار جاری کیا جس کا ہندوستان پر ہمیشہ احسان رہے گا۔ یہ تو اُردو کی عام اور سطحی ترقی کا حال تھا مگر اُس کی اصلی اور حقیقی ترقی کی بنیاد خود سرسید نے اپنے پرزور ہاتھوں سے ڈالی ہے جو ''علی گڑھ گزٹ''، ''تہذیب الاخلاق'' اور سرسید اور اُن کے دوستوں کی تحریرات کے ذریعے سے ظاہر ہوئی ہے۔

اگرچہ سرسید کی مخالفت اب ملک اور قوم میں بہت کم ہوگئی ہے مگر اب بھی کسی قدر اُن کے مخالف نہ صرف عوام میں بلکہ خواص میں بھی ایسے موجود ہیں جو نہ صرف سرسید کی تصنیفات پر بلکہ اُن کے اخلاق و عادات پر بھی نکتہ چینی کرتے ہیں۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ مخالفوں کی نکتہ چینی بالکل درست ہے تو بھی کوئی مسلمان جس کے دل کی آنکھ میں بصیرت کا نور باقی ہے سرسید کے ان تمام کاموں پر جو روزِ روشن کی طرح تمام عالم پر ظاہر ہیں، خاک نہیں ڈال سکتا۔ نواب عماد الملک نے نظام کلب کے جلسۂ دعوت میں جو ۱۸۹۱ء میں سرسید کے لیے منعقد ہوا تھا اُن لوگوں کے جواب میں جو سرسید کے ہر ایک کام کو حبّ جاہ اور نام وری و شہرت کی خواہش پر محمول کرتے ہیں، نہایت عمدہ بات کہی تھی کہ ''کاش مسلمانوں میں سید احمد خاں جیسا کوئی دوسرا شخص ایسا ہی پیدا ہو جائے جو اپنی نام وری اور شہرت کے خیال سے قوم کے لیے ایسے ہی مفید کام کر کے دکھا دے جیسے کہ اس شخص کے ہاتھ سرانجام ہوئے ہیں۔''

احمد زکی آفندی نے جو ۱۸۹۲ء میں یورپ کا سفر کیا ہے اس کے ذکر میں یورپ کے اکثر محبانِ وطن مثل گیری بالڈی، نیلسن گیمبٹا اور ملکۂ کیتھرائن وغیرہ کا حال اور اُن کے اخلاقی عیوب بیان کر کے لکھتا ہے کہ ''اہل یورپ اپنے اپنے ملک کے محبانِ وطن اور خادمانِ قوم کے شخصی اور خانگی کاموں کو خواہ وہ اچھے ہوں یا برے کبھی نہیں دیکھتے اور کبھی بھول کر بھی اُن کی بُرائیوں کا ذکر زبان پر نہیں لاتے بلکہ ہمیشہ اُن کے عام اور مفید کاموں کو دیکھتے ہیں جو انھوں نے اپنی کوشش سے اپنے ملک کو پہنچائے ہیں، طرح طرح سے ان کا نام زندہ کرتے ہیں اور اُن کا ذکر خیر اعلیٰ علیین تک پہنچاتے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جس نے اٹلی، فرانس اور انگلستان کو آسمان تک پہنچا دیا ہے اور اُن کے رُعب و داب کے آگے دُنیا بھر کا سر جھکا دیا ہے۔''

مگر افسوس ہے کہ ہماری قوم میں ایک محبّ وطن اور خادم قوم کی یہ قدر کی جاتی ہے کہ جب اس میں بظاہر کوئی اخلاقی عیب یا کمزوری نظر نہیں آتی تو اُس کی نیت اور اس کے دل کو ٹٹولتے ہیں اور وہاں پہنچ کر ڈنک مارتے ہیں اور گویا یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہمارے پاس

وحی آئی ہے کہ یہ شخص بظاہر جتنے کام قوم کی بھلائی کے کرتا ہے اُن سے اُس کی غرض اپنی نام وری اور شہرت بڑھانے اور گورنمنٹ میں اپنا اعزاز زیادہ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دُنیا میں ذلیل وخوار ہیں اور ہم میں ایسے لوگ پیدا ہونے موقوف ہو گئے ہیں جو اپنی کوشش سے ملک اور قوم کو فائدہ پہنچائیں۔ برخلاف اس کے ہم ہندوستان کی دیگر ہمسر قوموں میں برابر دیکھتے ہیں کہ ان میں ایسے جواں مرد اور محبِ وطن بکثرت پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں کیوں کہ اُن کی قوم کی عزت کرتی ہے اور اُن کے قدموں کے تلے آنکھیں بچھاتی ہے، اور ہرگز اپنے صوبے کے گورنر کی بھی ایسی تعظیم وتکریم نہیں کرتی جیسی اپنے ملک اور قوم کے ایک ادنیٰ خادم کی عزت کرتی ہے۔

اب میں اس بیان کو ختم کرتا ہوں اور خاتمے پر ایک بند سرسید کے مرثیہ کا پڑھتا ہوں جس کے مضمون پر غور کرنا، امید ہے کہ میرے ہم قوموں اور ہم وطنوں کے حق میں مفید ہوگا:-

میتواں درفضل و دانش شہرۂ دوراں شدن
درفصاحت ہمچو سحباں در خرد لقماں شدن
میتواں در جاہ و ثروت گوئی از قارون بُرد
میتواں در زہد و طاعت غیرتِ صنعاں شدن
میتواں در ملک و دولت خسرو پرویز گشت
میتواں در زور و طاقت رستمِ دستاں شدن
میتواں قطبِ زماں شدمیتواں شدغوثِ وقت
ہر چہ خواہی میتوانی شد بجز انساں شدن
چیست انسانی طپیدن ازتپِ ہمسائگاں
از سمومِ نجد در باغِ عدن پژماں شدن
خوار دیدن خویش را از خواریٔ ابنائے جنس
درشبستان تنگ دل از محنتِ زنداں شدن

آتشِ قحطے کہ درکنعاں بسوزد باغ و کشِت
برفرازِ تختِ مصر از تابِ آں بریاں شدن
زیستن در فکرِ قوم و مُردن اندر فکرِ قوم
گر توانی میتوانی سید احمد خاں شدن
میتواں مقبولِ عالم گشت امّا ہمچو شیخ
بہرِ سودِ خلق مرد و در جہاں نتواں شدن
جور اخواں دیدن و درعشقِ اخواں زیستن
زخمِ پیکاں خوردن و مشتاقِ پیکاں زیستن

اجلاس کراچی کی آخری تقریر

(از علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مورخہ ۱۵؍جنوری ۱۹۰۸ء)
(ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کراچی کی وہ تقریر جو مولانا نے جلسہ ختم کرتے ہوئے فرمائی۔)

حضرات! الحمدللہ ثم الحمدللہ کہ ہماری کانفرنس کا اکیسواں اجلاس فضل الٰہی سے بخیر وخوبی اور توقع سے زیادہ کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچا اور اس کی طلائی زنجیر میں ایک اور کڑی کا اضافہ ہوا۔ اس سال کانفرنس کے اجلاس کی طرف سے طرح طرح کے خدشے لوگوں کے دلوں میں گشت کر رہے تھے۔ (اولاً) نواب محسن الملک مرحوم کی وفات سے کانفرنس کو سخت صدمہ پہنچتا معلوم ہوتا تھا۔ (دوسرے) کراچی کے بعد مسافت کی وجہ سے بہت ہی کم ڈیلیگیٹوں کے آنے کی امید تھی۔ (تیسرے) ملک سندھ بلحاظ تعلیم کے ہندوستان کے تقریباً تمام حصوں سے زیادہ پست حالت میں سمجھا جاتا تھا اور اہل سندھ کو تعلیم سے متنفر بلکہ اس کا مخالف خیال کیا جاتا تھا اور اس لیے خیال تھا کہ دیکھئے جس مقصد کے لیے اس صوبہ میں کانفرنس منعقد ہوئی ہے اُس میں کہاں تک لوگ توجہ ظاہر کرتے ہیں۔ مگر خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اُس نے اپنے فضل و کرم سے وہ تمام خدشے رفع کر دیئے۔ نواب محسن الملک مرحوم کے جانشین نواب وقار الملک بہادر اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں سکریٹری ''سینٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کانفرنس'' نے جس سرگرمی اور عرق ریزی سے اپنے فرائض ادا کیے ہیں اُس کا شکریہ ادا کرنا ہماری طاقت سے باہر ہے۔ انھوں نے اُس نقصان کی پوری تلافی کی ہے جو نواب صاحب مرحوم کی وفات سے قوم کو پہنچا تھا۔ پھر جس قدر

ڈیلیگیٹ ہندوستانی کے اطراف و جوانب اور دور و دراز مقامات سے تشریف لا کر اجلاس میں شریک ہوئے۔ اُن سے نصف کے آنے کا بھی کسی کو گمان نہ تھا اور یہ نہایت بین ثبوت اس بات کا ہے کہ جو عام غفلت اور بے پرواہی اور قومی کاموں کی طرف سے بے اعتنائی مسلمانوں میں پائی جاتی ہے وہ روز بروز کم ہوتی جاتی ہے اور لوگ نہایت شوق اور امنگ سے قومی تقریبوں میں شریک ہونے لگے ہیں۔ اہل سندھ کی طرف سے جو بے توجہی کا گمان تھا خدا کا شکر ہے کہ وہ بالکل غلط نکلا۔ جس ذوق و شوق سے عام مسلمانان سندھ کانفرنس کے اجلاسوں میں برابر شریک ہوتے رہے ہیں اور جو دلچسپی انھوں نے اس موقع پر ظاہر کی ہے وہ نہایت روشن ثبوت اس بات کا ہے کہ خدا کے فضل سے اُن میں اپنے تنزل کا احساس اور ترقی کا میلان بوجہ احسن پیدا ہو گیا ہے اور وہ اپنی بُرائی بھلائی اور زمانے کی ضرورتوں کو اچھی طرح سمجھنے لگے ہیں اور اپنے خیر خواہوں کی قدر کرنے لگے ہیں۔ بعض نہایت ضروری اور حد سے زیادہ مفید رزولیوشن جو اُن کی عام رضا مندی سے پاس ہوئے ہیں وہ اُن کے جوہر قابل ہونے پر دلالت کرتے ہیں اور امید دلاتے ہیں کہ چراغ میں تیل اور بتی سب کچھ موجود ہے صرف روشنی کرنے کی دیر ہے۔

مگر اے صاحبو! اگر بہ نظر غور دیکھا جائے تو یہ سب امید افزا علامتیں (اولاً) افسران سرکاری اور خاص کر جناب ینگ ہسبنڈ صاحب کمشنر سندھ کی توجہ اور (ثانیاً) جناب آنریبل خان بہادر وزیر خیر پورا اور مسٹر دہلوی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہیں۔ اگر ایسے ہمدرد قوم جیسے کہ وزیر صاحب اور مسٹر دہلوی ہیں، سندھ میں دو چار اور پیدا ہو جائیں تو امید ہے کہ بہت جلد سندھ کے دن پھر جائیں گے۔ جس کام کا بیڑا انھوں نے اُٹھایا ہے وہ ایک نہایت عظیم الشان کام ہے اور ایسا دشوار گزار مرحلہ ہے کہ جب تک اُن کے بہت سے ایسے مددگار اس صوبے میں پیدا نہ ہوں گے جو اپنے دم، قدم، درم سے، قلم سے ان کی امداد نہ کریں اور اُن کی ہمت نہ بندھائیں، اس مرحلے کا طے ہونا نہایت دشوار ہے۔ خدا کی ذات مسبب الاسباب ہے۔ جب تک اسباب مہّیا نہیں ہوتے کوئی چیز عدم سے وجود میں نہیں آتی۔ چوں کہ مشکلات کا حل ہونا قوم کی متفقہ ہمدردی و دلسوزی پر موقوف ہے اس لیے جب تک بہت سے

قوم کے ہمدرد پیدا نہ ہوں گے۔ اس مقصد میں کامیابی ناممکن ہے۔

عاشق کہ شد کہ یار بہ حالش نظر نہ کرد

اے خواجہ! درد نیست و گر نہ طبیب ہست

صاحبو! سب سے بڑی کامیابی اس سال کی کانفرنس میں یہ ہوئی ہے کہ جس قدر رزولیوشن پاس ہوئے ہیں اُن میں سے اکثر عملی اور نتیجہ خیز ہیں اور گورنمنٹ کی توجہ اور قومی لیڈروں کی کوشش سے امید ہے کہ اُن پر بہت جلد عمل درآمد ہوگا۔ اب میں اس تقریر کو ختم کرتا ہوں اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ کراچی کا اجلاس قوم کے حق میں اور خاص کر اہل سندھ کے حق میں مثمر برکات و منتج حسنات ہو۔ **و آخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العالمین۔**

تقریر بر موقعہ عطائے خطاب حکیم اجمل خاں

(از علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مورخہ ۱۵؍جنوری ۱۹۰۸ء)

(۱۹۰۸ء کے شروع میں جب حکیم محمد اجمل خاں صاحب (مرحوم) کو گورنمنٹ نے ''حاذق الملک'' کا خطاب مرحمت فرمایا تو حکیم صاحب کو مبارک باد دینے اور گورنمنٹ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ۷؍جنوری ۱۹۰۸ء کو باشندگانِ دہلی کا ایک عظیم الشان جلسہ کمپنی باغ کے ٹاؤن ہال میں نواب امیر الدین احمد خاں صاحب والیِ ریاست لوہارو کی زیر صدارت منعقد ہوا تھا۔ مولانا اُس وقت اتفاقاً دہلی میں تشریف رکھتے تھے۔ چناں چہ آپ نے بھی جلسہ میں شرکت فرمائی۔ مولانا نے یہ تقریر اُسی جلسے میں فرمائی تھی۔)

صاحبو! آج ہم ایک ایسی خوشی کے اظہار کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں جس میں امید ہے کہ ہر قوم اور ہر مذہب کے لوگ دل سے شریک ہوں گے۔ جس میں بناوٹ اور ظاہر داری کا کچھ لگاؤ نہیں معلوم ہوتا اور جو بعینہٖ ایسی ہی خوشی ہے جیسی مسلمانوں کو عید، بقرعید میں، ہندوؤں کو ہولی، دیوالی میں اور بڑے دن کی تعطیل میں ہر ایک قوم کو اپنی اپنی کانفرنس یا کانگریس کی خوشی ہوتی ہے۔

جو معزز خطاب گورنمنٹ ہند نے جناب رئیس الاطبا حکیم محمد اجمل خاص صاحب کو حال میں عطا کیا ہے وہ نہ صرف اہل دہلی و نواح دہلی کے بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے ہر حصہ اور صوبہ کے لوگوں کو خوشی کا باعث ہوا ہے۔ حکیم صاحب جس نامور اور شہرۂ

آفاق خاندان کے ممبر ہیں اُس کی نام وری اور شہرت ہندوستان کی حدود سے گزر کر ایشیا کے اکثر حصوں تک پہنچ گئی ہے۔ اس خاندان نے صرف علم طب، حذاقت اور دست شفا ہی میں نام نہیں پیدا کیا بلکہ جس فیاضی، فراخ حوصلگی اور سیر چشمی کا برتاؤ ہر ادنیٰ اعلیٰ مقیم مسافر اور دور ونزدیک کے ساتھ اس خاندان میں دیکھا گیا ہے اس کی مثال نہ صرف ہندوستان میں بلکہ شاید تمام دُنیا کے طبیبوں اور ڈاکٹروں میں اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس گھرانے کی طرف لوگوں کے دل خود بخود کھنچتے ہیں، دور دور کے باشندے بیماروں کو لے کر یہاں علاج کے لیے آتے ہیں اور اُن کی عقیدت اور محبت کا نقش دلوں میں لے کر جاتے ہیں۔

صاحبو! ہمارے معزز محترم ہیرو جن کے خطاب ملنے کی خوشی میں ہم آج یہاں جمع ہوئے ہیں، آپ سن چکے ہیں کہ وہ اسی معزز خاندان کے رکن ہیں۔ ہم گورنمنٹ کے دل سے شکر گزار ہیں کہ اُس نے ان کا خاندانی خطاب، خاندانی مطب کی مسند پر بیٹھنے کے چند ہی روز بعد ان کو عنایت فرمایا ہے۔ بلا شبہ یہ خطاب چوں کہ ان کا خاندانی خطاب اور سلطانِ وقت کا عطیہ ہے جس قدر اُس کی عظمت کی جائے تھوڑی ہے۔ لیکن اے صاحبو! حاذق الملک ایک ایسا خطاب ہے جو عام خطابات کی طرح صاحبِ خطاب کی ایک خاص حیثیت پر دلالت کرتا ہے۔ مگر ہمارے محترم ہیرو میں اور بہت سی ایسی حیثیتیں موجود ہیں جو خاص کر جماعت اطبا میں بہت کم جمع ہوتی ہیں۔ وہ عربی اور فارسی لٹریچر سے خاص مناسبت رکھتے ہیں، دونوں زبانوں میں مثل اہل زبان کے تکلم کر سکتے ہیں۔ طب میں بہت سی مفید کتابوں کے مصنف ہیں، قومی خدمات سے بہت دلچسپی رکھتے ہیں، حسن اخلاق کے لحاظ سے میں ان کو ایک غیر معمولی انسان خیال کرتا ہوں۔ میں اُن کے اخلاقی فضائل کا زیادہ ذکر کرتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ اُن کی زیادہ مدح وثنا کہیں اُن کو وسعت اخلاق میں زیادہ ترقی کرنے پر آمادہ نہ کرے۔ اُن کے اخلاق اب اس درجہ کو پہنچ گئے ہیں کہ انھوں نے ابنائے جنس کی خدمت پر اپنے ضروری آرام وآسائش کو جس کے بغیر انسان کی صحت قائم نہیں رہ سکتی قربان کر دیا ہے۔

بہرحال جناب حکیم محمد اجمل خاں صاحب کو جو خطاب گورنمنٹ ہند نے عنایت فرمایا ہے۔ ایک ایسا موزوں اور چسپاں خطاب ہے کہ اس سے زیادہ مفید اور چسپاں خطاب نہیں ہوسکتا۔ اور اس خطاب سے صرف حکیم صاحب ہی کا خاندان گورنمنٹ کا شکر گزار نہیں ہوا بلکہ ہندوستان کے عام باشندے ہمیشہ اُس کے احسان مند رہیں گے۔

(اس کے بعد مولانا نے فرما کہ) ''میں نے اس موقع کے لیے ایک قطعہ بھی لکھا ہے جس میں، میں نے حکیم صاحب سے خطاب کیا ہے۔ چوں کہ حکیم صاحب اس وقت تشریف فرما نہیں ہیں، اس لیے میں نواب فیض احمد خاں صاحب ہی کو حکیم صاحب کا قائم مقام فرض کر لیتا ہوں:-

حاذق الملک! اس خطابِ فرخ و مسعود پر
ایک عالم آپ کو دیتا مبارک باد ہے
پر یہ ہے کیسی مبارک باد، ہم حیران ہیں؟
گو کہ دل ہر اپنے بیگا نیکا اس سے شاد ہے
سعی و کوشش آپ نے کی تھی کبھی بہرِ خطاب؟
یا کوئی درخواست دی تھی آپ نے کچھ یاد ہے؟
یہ تو یاروں کی دعاؤں کا ہے بس سال ظہور
غیب سے یہ اُن دعاؤں کی ہوئی امداد ہے
پس مبارک باد یہ جو دے رہے ہیں خاص و عام
مستحق ہیں اس کے ہم یا آپ، کیا ارشاد ہے؟

تقاریظ

تاریخِ ہندوستان

(از علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۱۸۷۵ء، صفحہ: ۳۸۲)

(خان بہادر شمس العلما مولانا ذکاء اللہ مرحوم نے منجملہ سینکڑوں کتابوں کے ایک ہندوستان کی نہایت مفصل تاریخ بھی لکھی ہے جو ۱۶ ضخیم جلدوں اور تین علیحدہ علیحدہ حصوں پر منقسم ہے۔ مولانا کا یہ ریویو تاریخ مذکور کے حصۂ دوم متعلق بہ عہد مسلمانان پر ہے۔)

عنوان پر جو نام کتاب کے ساتھ اُس کے نام گرامی مصنف دام بقائہٗ کا نام نامی ثبت کیا گیا ہے، اس سے ناظرین باتمکین سمجھ گئے ہوں گے کہ کتاب کی عظمت وجلالت کس درجہ کی ہوگی، اور ملک میں اُس کی مقبولیت کس حد تک پہنچنے والی ہے۔ کیوں کہ مصنفِ ممدوح اور اس کی بے شمار کتابوں نے جو شہرت اور نیک نامی تمام اقطاع ہندوستان میں حاصل کی ہے۔ اُس سے یہ بات خوب ثابت ہوگئی ہے کہ اس واجب التعظیم آدمی کی تصنیفات آج کل ملک کے حق میں اکسیر اعظم کا حکم رکھتی ہے۔ یہ کتاب اصل میں تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں ہندوؤں کے قدیم زمانہ کا حال ہے۔ اور یہ حصہ منطبع ہو کر ۱۸۷۳ء میں شائع ہو چکا ہے۔ دوسرے حصے میں مسلمانوں کی سلطنت کا حال ہے۔ یہ ابھی چھپ کر تیار ہوا ہے اور ہمارا ریویو زیادہ تر اسی حصے سے تعلق رکھتا ہے۔ تیسرے حصے میں سلطنت انگلشیہ کا بیان ہے، یہ حصہ ابھی اختتام کو نہیں پہنچا مگر امید ہے کہ شروع ۱۸۷۶ء میں چھپ کر شائع ہو جائے گا۔

اس کتاب سے پہلے کوئی تاریخ کسی مشرقی زبان میں ایسی نہیں لکھی گئی جو

ہندوستان کی تمام سلطنتوں پر حاوی ہو، بلکہ الفنسٹن کے سوا کوئی ایسا ترجمہ بھی دیسی زبان میں نہیں ہوا۔ پس اس ضروری تصنیف سے ہمارے ملک کی کتابوں کی صرف مقدار ہی نہیں بڑھی بلکہ ہماری ایک ایسی شدید ضرورت رفع ہوئی ہے جس کا رفع کرنا مصنف جیسے روشن ضمیر اور جواں مرد آدمی کے سوا اوروں سے سخت دشوار تھا۔ اگرچہ فارسی زبان میں بعض تاریخیں مثل ''تاریخِ فرشتہ'' اور ''سیر المتاخرین'' وغیرہ کے ایسی بھی لکھی گئی ہیں جو بہ نسبت اور کتابوں کے کسی قدر جامعیت رکھتی ہیں، مگر اس زمانہ کا ایک شائستہ محقق اُن کے مطالعہ سے ہرگز اپنی پیاس نہیں بجھا سکتا۔ ہندوؤں کے قدیم زمانہ کے واقعات حال ہی میں یورپ کے البیلے مورخوں نے ایسے ذریعوں سے دریافت کیے ہیں جو قدر و قیمت میں ایشیا کے کشف و کرامات سے زیادہ گراں بہا ہیں۔ مثلاً آثارِ قدیمہ، پُرانے کتبے، پُرانے سکے، حملہ آوروں کی تحقیقات، ہندوؤں کی مذہبی کتابیں، علم تطابق السنہ، مختلف قوموں کے خط و خال کی مطابقت وغیرہ۔

جو مراتب ان گراں وزن وسائل سے منکشف ہوئے ہیں اور جن کی بدولت ہندوؤں کی قدیم زمانہ کی تاریکی بہت کچھ رفع ہوئی ہے، اُن سے فارسی تاریخیں بالکل معرّا تھیں اور اس کے سوا عہد انگلشیہ کی تاریخ آج تک کسی دیسی زبان میں نہیں لکھی گئی۔ پس یہ کتاب ان دونوں فائدوں کے لحاظ سے ہمارے ملک کی تاریخوں میں عدیم النظیر ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اسلامی سلطنتوں کا حال جو اس مفید کتاب میں لکھا گیا ہے اُس کا عام ماخذ فارسی اور عربی کی بے شمار تاریخیں آدمیوں نے مختلف سلطنتوں کے حال میں قلم بند کی ہیں، لیکن قطع نظر اس کے کہ مصنف نے اُن سب کی تلخیص کر کے اپنے ہم وطنوں کی سینکڑوں کتابوں کے مطالعہ سے مستغنی کر دیا، بڑی فوقیت اس کتاب میں یہ ہے کہ ہزاروں نکمّی اور فضول باتیں جو مورخ کے ذہن کو جلا کرنے کی جگہ اور زنگ آلودہ کرتی تھیں اور عام تاریخ سے اصلا لگاؤ نہ رکھتی تھیں، جیسے اہل کاروں کا تقرر و تبدل، اُن کی ترقی، اُن کا تنزل، بادشاہوں کے حضور میں اہل دربار کی طرف سے پیش کش گزرانے، اہل دربار کو بادشاہوں کی طرف سے خلعت اور انعام یا القاب و خطاب ملنا، جشنوں کی تیاریاں، سیر و شکار کے

سامان، شاعروں کی مدح سرائی، بھاٹوں کی بھٹائی، شہزادوں کی ولادت، شادیوں کی دھوم دھام، نجومیوں کا نیک ساعت بتانا، یازائچہ اور پترابنانا، جوگیوں کے ڈھکوسلے، نقیبوں کی لن ترانیاں، چھوٹے چھوٹے زمین داروں کی سرکشی، سینکڑوں قصے اورافسانے خلاف قیاس وغیرہ۔ ان سب باتوں سے یہ کتاب بالکل پاک وصاف ہے۔ اور وہ بے بہا اور گراں قدر نتائج جو عام تاریخ کی جان ہیں اور جن سے ایشیائی تاریخیں قطعاً بے نصیب تھیں، اُن کے لحاظ سے مشرقی تاریخوں میں یہ پہلی ہی کتاب ہے، جس میں یورپ کے روشن ضمیر مورخوں کا پورا پورا تتبع کیا گیا ہے۔

ہر ایک سلطنت کا اثر جو ملک پر یا ملک کا اثر جو سلطنت پر ہوا، اُس کا بیان، ہر ایک سلطنت کے زوال یا ترقی کے اسباب، ہر ایک بادشاہ کی خصلتیں اور اُس کا چلن وروّیہ، ہر موقع پر بہ حسبِ ضرورت رائے لگانی اور اس میں تعصب اور طرف داری کو دخل نہ دینا، اس کتاب کی اُن خصوصیات میں سے ہے جن کی چھینٹ تک ہمارے ملک کی تاریخی کتابوں پر نہیں پڑی۔ تاریخی واقعات کو مصنف مدظلہ نے جس دلچسپ پیرایہ میں ادا کیا ہے اور پھر باوجود اس کے کہیں افراط وتفریط کو دخل نہیں دیا، یہ بات اگر محال نہیں تو تعجب انگیز ضرور ہے۔ ایک روشن ضمیر عالی دماغ آدمی نے اس کتاب کی نسبت یہ رائے دی ہے کہ اس میں ہر جگہ دو چار صفحوں کے بعد دس پانچ سطریں ایسی دلچسپ اور دلکش آتی ہیں جن کو پڑھ کر بامذاق آدمی سر دھننے لگتا ہے۔ میں نے بھی اس کتاب کو جس قدر پڑھا اُس میں بے شک یہ صفت پائی۔ بعض جگہ بے اختیار میرا جی بھر آیا اور بعض جگہ میرے دل میں جوشِ محبت پیدا ہوا، بعض جگہ اُس کے خلاف اثر ظاہر ہوا، بعضے مقام پر میری کسی قدیم رائے میں تذبذب واقع ہوگیا، اور بعضے موقع پر میری کسی رائے کو تقویت حاصل ہوئی۔ یہ باتیں اس امر کی دلیل ہیں کہ مصنف نے جو کچھ لکھا ہے وہ تہ دل سے لکھا ہے، کسی کی تقلید یا مخالفت سے اپنے دلی خیالات کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ کیوں کہ جو بات اور کے جی سے لکھی جاتی ہے وہ ایسی دلنشیں اور دل آویز ہرگز نہیں ہوسکتی۔ جن بادشاہوں کو یورپ کے تمام مورخوں نے ہدف تیر ملامت بنا رکھا ہے اور جوشِ تعصب میں اُن کے محاسن اور فضائل پر پانی پھیر دیا۔

اس بے تعصب مصنف نے ان کی واقعی خوبیاں بیان کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ اگر کچھ ان پر اعتراض کیے ہیں تو کسی قدر اُن کی خوبیاں بھی تسلیم کی ہیں۔ اور جن بادشاہوں کو ہمارے بھولے بھالے سادہ لوح ہم وطن ملکی خصائل سمجھے ہوئے تھے، اُن کے واقعی عیب بیان کرنے میں کسی کی نکتہ گیری کا اندیشہ نہیں کیا۔ ہماری دیسی زبان کی تاریخوں میں صرف الفنسٹن کا ترجمہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کس سے ہمارے عام ہم وطن اس تاریخ کے سے فوائد حاصل کر سکیں۔ لیکن اگر یہ مان لیا جائے کہ آنریبل الفنسٹن صاحب نے جو مضامین مشرقی زبان سے اخذ کیے ہیں اور انگریزی میں پورے پورے ادا ہو گئے، اور سائنٹفک سوسائٹی نے جو اس کا ترجمہ اُردو میں کیا وہ بے کم دکاست لکھا گیا، (حالاں کہ یہ دونوں باتیں مشکل سے تسلیم کی جاتی ہیں) تو بھی وہ ترجمہ اس کتاب کی برابری نہیں کر سکتا۔ اول تو یقیناً اس میں صدہا واقعات مندرج ہیں جن کا الفنسٹن میں کہیں پتہ اور نشان نہیں، حالاں کہ مورخوں کے نزدیک جس نئی تاریخ میں تواریخ ماضیہ کی نسبت دو چار باتیں بھی نئی حاصل ہو سکیں وہ بے انتہا قدر کرنے کے لائق ہوتی ہے۔ دوسرے جب کوئی شخص کسی غیر قوم یا غیر ملک کی تاریخ اپنی مادری زبان میں لکھتا ہے تو اپنی کی رعایت سے اس کو بالضرور مطلب نگاری میں ایسی روش اختیار کرنی پڑتی ہے جو غیر زبان والوں کو ہرگز مطبوع نہیں ہو سکتی۔ اور جب اس کا ترجمہ کسی تیسری زبان میں ہوتا ہے تو اس کی مثال بعینہٖ ایسی ہو جاتی ہے۔ جیسے ایک یورپین آدمی جس کا باپ یورپین اور ماں ہندوستانی اور دودھ پلانے والی امریکن ہو۔ نہ اُس میں اصل زبان کی خوبی باقی رہتی ہے نہ دوسری اور تیسری زبان کا رنگ قائم رہتا ہے۔ تیسرے الفنسٹن صاحب کی کتاب پر جو تعصب کا الزام لگایا گیا ہے۔ وہ ہم کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ ہم تاریخ ہندوستان کی واقفیت کا ذریعہ کسی ایسی کتاب کو ٹھہرائیں جس کا مصنف تعصب سے بالکل مبّرا ہو۔ پس ہم اپنے ہم وطنوں کو مبارک باد دیتے ہیں کہ اُن کے ایک ہمدرد اور خیر خواہِ وطن نے اُن کے ملک کی قدیم اور جدید اور درمیانی زمانوں کے تاریخی حالات نہایت راستی اور درستی کے ساتھ تحریر کر کے اُن کے لیے ایک ایسا سرمایہ مہیّا کیا ہے جس کے وہ سخت ہی حاجت مند تھے۔ خاتمِ آلِ تیمور کی نسبت جو مصنف نے

اپنی عادت کے موافق آزادانہ گفتگو کی ہے اور مناقبت کے ساتھ کسی قدر معائب بھی بیان کیے ہیں، اس میں شک نہیں کہ اُس نے واقع میں اپنا فرض ادا کیا ہے۔ مگر مجھ کو امید نہیں کہ ہمارے دیرینہ سال یا دیرینہ خیال ہم وطن ایسی آزادانہ تحریر کو پسند کریں۔ ہمارے ملک پر ابھی آزادی کا پرچھاواں نہیں پڑا۔ ہم لوگ ہرگز نہیں چاہتے کہ جس شخص کو ہم میں سے سو پچاس آدمی کسی نیک صفت کے ساتھ متصف جانتے ہوں، اُس کی کوئی برائی واقعی یا غیرواقعی ہمارے سامنے بیان کی جائے۔ مثلاً جو شاعر ہمارے نزدیک مسلم الثبوت ہے ضرور ہے کہ ہم اُس کے تمام کلام کو الہامی کلام کی طرح تمام عیوب سے پاک سمجھیں۔ اور مثلاً جس بادشاہ میں ایک رحم دلی کی صفت ہے، ضرور ہے کہ ہم اُس کو بلاتشبیہ انبیاء کی طرح معصوم جانیں۔ لیکن ہم مصنف کی طرف سے ایک جواب دیتے ہیں جس کو شاید پُرانی طبیعت کے لوگ بھی رد نہ کریں گے۔

ناظرین کا فرض ہے کہ اگر سب نہیں تو صرف سلاطین مغلیہ کا حال بابر سے لے کر بہادر شاہ تک، اول انگریزی تاریخوں میں دیکھیں، پھر اس کتاب کو ملاحظہ فرمائیں اور پھر انصاف کریں کہ اُن کے معزز ہم وطن نے اپنے ملک کے اگلے بادشاہوں کو اہل یورپ کے مطاعن سے کس قدر بچایا ہے۔ اور جس قدر اُن کی برائیاں اُس نے تسلیم کی ہیں اُن کا تسلیم نہ کرنا اپنے تئیں مورخینِ صداقت آئین کے زمرہ سے خارج کر دینا تھا یا نہیں۔ ہم کو یاد رکھنا چاہیے کہ ہندوستان کی تاریخ اب ہندوستانیوں کے ہاتھ میں نہیں آئی کہ جس کو وہ چاہیں آسمان پر چڑھائیں اور جس کو چاہیں تحت الثریٰ تک پہنچا دیں۔ اب اس تاریخ کی مالک وہ قوم ہے جس کے آگے بغیر حجت و دلیل کے کسی کی تعریف یا تنقیص پیش نہ چل سکتی۔ جس شخص کے لیے اُنھوں نے پچاس عیب ثابت کیے ہیں ہم اُس کی کیسی ہی طرف داری کریں مگر اُس کے دس پندرہ عیب بے شک ماننے پڑیں گے، ورنہ ہم کو راستی سے ضرور ہاتھ اُٹھانا پڑے گا۔

اقوامُ المسالک

(از علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۱۸۷۵ء، صفحہ: ۶۳۵)

(یہ یورپ کی ایک مختصر تاریخ ہے جو دربار ٹیونس کے وزیر خیرالدین نے عربی میں لکھی تھی اور مولوی محمد اسماعیل نے اس کا اُردو ترجمہ کیا تھا مگر آج کل یہ ترجمہ نایاب ہے۔)

عرب سرائے کی علمی سوسائٹی نے مجھ کو اس بات پر مجبور کیا ہے کہ میں اس مفید کتاب کو اوّل سے آخر تک دیکھ کر اُس کی نسبت اپنی ناچیز رائے ظاہر کروں اور یہ بھی لکھوں کہ اس کتاب کا ترجمہ کرانا اور اس کو چھپوا کر شائع کرنا ہندوستان کے حق میں کس قسم اور کس درجہ کے فائدے رکھتا ہے۔ اور اس پر کیا کیا نتائج مترتب ہونے کی امید ہے۔ ''اقوامُ المسالک'' کا مصنف عالی مقام ایک روشن ضمیر اور مدبّر عالم سید خیرالدین احمد وزیرِ سلطنت ٹیونس ہے۔ جو علم و فضل اور عقل و دانش اور حدسِ صائب اور رائے سلیم کے سوا قومی ہمدردی کے نشے میں چُور معلوم ہوتا ہے اور جس نے بنی نوعِ بشر کی خیر خواہی میں اپنی گراں بہا عمر کا ایک بڑا حصہ نہایت مفید طور پر صرف کیا ہے۔

ٹیونس افریقہ میں ملک بَربَر کے چار مختلف صوبوں میں ایک صوبہ ہے جس کا دارالسلطنت خاص شہر ٹیونس ہے۔ اس شہر میں تقریباً ایک لاکھ آدمی رہتے ہیں جس میں چالیس ہزار یہودی اور باقی مسلمان عرب وغیرہ آباد ہیں۔ یہ صوبہ ممالک بربر میں بہت بڑی تجارت گاہ ہے۔ یہاں کے باشندے عموماً صاحب لیاقت اور شائستہ ہوتے ہیں۔ اور یہاں کا بادشاہ اپنے ملک میں اقتدارِ مطلق رکھتا ہے۔

یہ کتاب ایک نہایت طولانی مقدمہ اور دوحصوں پر مشتمل ہے۔ یہ طولانی مقدمہ ساری کتاب کی جان ہے اوراس سے جس قدر مصنف کی روشن ضمیری اور بالغ نظری ثابت ہوتی ہے اُس کا اندازہ کرنا میری طاقت سے باہر ہے۔ ہمارے ہم وطنوں کے لیے عموماً اور ہمارے بھائی مسلمانوں کے لیے خصوصاً اس مقدمہ کا ایک ایک جملہ ناصح مشدق اور ہادی برحق کا کام دیتا ہے۔ اس میں نہایت خوبی کے ساتھ یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ جب کسی غیر مذہب قوم میں کوئی اچھی خصلت یا مفید بات پائی جائے اور لسانِ شرعی اُس کی تقبیح سے ساکت ہوتو ہم کو صرف اس خیال سے کہ ہمارے غیر مذہب والوں میں یہ بات پائی جاتی ہے اُس کے اخذ کرنے میں ہرگز تامل کرنا نہیں چاہیے۔ اس بات کی تائید کے لیے بہت سی عقلی اور نقلی دلیلیں پیش کی ہیں جن کے دیکھنے سے منصف مزاج آدمی کا شک بالکل زائل ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر وہ روایت بھی ذکر کی گئی ہے جس سے ثابت ہے کہ غزوۂ احزاب میں جو ہمارے نبیؐ برحق نے خندق کھودنے کا حکم دیا تھا وہ اہلِ فارس کا اتباع تھا اوراسی موقع کے مناسب کتاب ''سنن المہتدین'' نے ایک نہایت شافی قول نقل کیا ہے اور ''حاشیہ دُرِّمختار'' میں جو علامہ عصر شیخ محمد بن عابد حنفی نے تصریح فرمائی ہے، وہ بھی نقل کی گئی ہے۔ یعنی یہ کہ ''جن باتوں میں مخلوقِ خدا کی بہتری اور ترقی ہو اگر اُن کے کرنے میں ہم کسی غیر ملّت قوم کے ساتھ مشبہ ہو جائیں تو کچھ خرابی نہیں ہے۔'' اس کے بعد مصنف عالی مقام نے ایک نہایت لطیف بات لکھی ہے جس کو یہاں نقل کیے بغیر میں ہرگز نہیں رہ سکتا۔ یعنی یہ کہ ''بڑے تعجب کی بات ہے کہ جو لوگ فرنگیوں کی باتوں کے اتباع سے سخت انکار کرتے ہیں، وہ اپنی بھلائی کی باتوں میں تو انکار کرتے ہیں اور جو باتیں اُن کے حق میں مضر ہیں اُن میں اُن کی مشابہت سے کچھ ان کو انکار نہیں۔ مثلاً وہ لوگ صریح فرنگیوں کا بنا ہوا کپڑا پہن کر خوش ہوتے ہیں اور انھیں کا بنا ہوا اسباب گھروں میں رکھتے ہیں اور انھیں کے بنائے ہوئے ہتھیار اور ضرورت کی چیزیں استعمال میں لاتے ہیں، مگر اُن چیزوں کو خود تیار کر کے کام میں لانے سے بڑا پرہیز کرتے ہیں۔ حالاں کہ اس سے پرہیز کرنے میں اُن کے ملکی انتظام اور ملکی ترقی دونوں میں بڑا نقصان اور خرابی پڑتی ہے۔''

اس مضمون سے ہماری قوم (بشرطیکہ اُس کے ادبار کے دن پورے ہو گئے ہوں) بہت کچھ عبرت حاصل کرسکتی ہے کیوں کہ جس تعصب نے اُن کو یہ روز سیاہ دکھایا ہے اور اس پستی اور تنزل کی حالت کو پہنچایا ہے، یہ مضمون اُس کی جڑ کاٹنے والا ہے۔ اس کے بعد خود مختاری اور شخصی حکومت کے بُرے نتیجے اور جمہوری اور محدود الاختیار سلطنتوں کی خرابیاں اس شرح و بسط اور لطف و خوبی اور حجت و برہان کے ساتھ بیان کی ہیں کہ اب سے پہلے کسی مشرقی زبان کی کتاب میں نہیں لکھی گئیں۔ چوں کہ تمام اشیاء کی کما ہی حقیقت اُن کی اضداد کے مقابلہ سے معلوم ہوتی ہے۔ اور ہمارے ہم وطنوں نے آنکھ کھول کر ایک آزاد گورنمنٹ کے سوا کچھ نہیں دیکھا اور شخصی حکومتوں کے جور نہیں اُٹھائے، اس لیے امید کی جاتی ہے کہ وہ اس مضمون کو دیکھ کر انگریزی گورنمنٹ کی قدر کما حقہ پہچانیں گے اور جو دولت (یعنی آزادی) خدا تعالیٰ نے اُن کو بن مانگے دے رکھی ہے، اُس کا شکریہ تہ دل سے ادا کریں گے۔ اس کے بعد مسلمانوں کو جو ثروت اور شان و شوکت اور علمی و عملی فوقیت زمانۂ سابق میں تمام دُنیا کی قوموں کی شہادتوں سے ثابت کیا ہے۔ گویا غیرت مند مسلمانوں کو اس بات کی غیرت دلائی ہے کہ افسوس وصد ہزار افسوس جس اولوالعزم قوم نے مشرق سے مغرب تک علم و حکمت کی روشنی پھیلائی اور جنھوں نے حسب شہادت وزیر اعظم فرانس اہل یورپ کو جہالت کی تاریکی اور ظلمت سے نکالا اور جن کی بدولت بغداد و بصرہ سے لے کر مصر اور فارس تک اور سمرقند سے لے کر غرناطہ اور قرطبہ تک اکثر بلاد یورپ و ایشیا و افریقی مرکز علوم و فنون قرار پائے اور جن کی استادی اور حق تربیت کو آج تک یورپ کے مصنف مزاج مورخ مانتے چلے آتے ہیں، اُن کی اولاد ایسی وحشت اور تاریکی کے گڑھے میں اتر جائے جس میں سے نہ آپ اُبھر سکے نہ کسی کی مدد سے ابھرنے کا ارادہ کرے۔

اس کے بعد اہل یورپ کی تحقیقات اور ایجادات کا بیان اور فرانس میں تعلیم اور تعلیم کے طریقے، وہاں کے کتب خانوں کی کثرت اور اُن کے عمدہ انتظام، امیر زادوں کی تعلیم اور انواع و اقسام فنون میں اُن کا ترقی کرنا، لفظ آزادی کی شرح، یورپ میں موجد اور مخترع لوگوں کے حقوق کا بیان اور ان کے سوا اور بے شمار مضامین نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ

بیان کیے ہیں۔ جن کو دیکھ کر ہمارے ہم وطن اپنے یورپ کے حالات کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اور اگر انصاف کو ہاتھ سے نہ دیں تو اس بات کا اقرار کر سکتے ہیں کہ فی الحقیقت ہماری موجودہ حالت اہل یورپ کی حالت کے ساتھ وہ نسبت رکھتی ہے جو ڈھور اور ڈانگروں کو انسان کے ساتھ ہے۔

اس کے بعد پہلا حصہ شروع ہوتا ہے، جس کے بیس (۲۰) باب ہیں اور ہر ایک باب میں یورپ کی ایک ایک سلطنت کا حال مندرج ہے۔ ہر سلطنت کی تاریخ اور اُس کی وسعت و حدود اور اُس کے اصول وقوانین اور طریقۂ سیاست اور طرز انتظام اور رعایا کی حالت اور ہر ایک کی مالی اور جنگی قوتیں اور محاصل کے ذریعے، مثل زراعت اور نباتات اور معدنیات اور حیوانات اور تجارت اور ضائع وغیرہ اور بعض ابواب میں ان کے سوا اور خصوصیاتِ ملک کا نہایت کافی طور پر بیان کیا گیا ہے۔

دوسرا حصہ جغرافیہ ارض اور اقسام کرۂ زمین کے بیان میں ہے۔ اور اخیر میں ایک جدول ہجری اور عیسوی سنوں کی مطابقت دریافت کرنے کے لیے لکھی گئی ہے۔ یہ دونوں حصے بھی عام ہندوستانیوں کے حق میں جنھوں نے انگریزی تعلیم نہیں پائی ایک خزانۂ غیبی کا حکم رکھتے ہیں۔ کیوں کہ آج تک کوئی کتاب ہماری دیسی زبانوں میں ایسی نہیں لکھی گئی ہے جس میں یورپ کی تمام سلطنتوں اور اقسام کرۂ زمین کا حال مجملاً یا مفصلاً لکھا گیا ہے۔

اس کتاب کی تعریف میں بالا جمال صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ یہ پہلی کتاب ہے جس نے ہمارے ملک اور ہماری قوم پر شائستگی کا دروازہ کھولا ہے۔ اور اگر ہماری افسردہ طبیعتوں میں کسی قدر قابلیت کا مادہ ابھی تک باقی ہے تو یہی کتاب ہماری شائستگی کی از سرنو بنیاد ڈالنے کے لیے کافی دوانی ہے۔ ہم کو سب سے پہلے مصنفِ عالی مقام کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ جس نے ہمارے اور ہمارے تمام بنی نوع کے لیے ایسی شمع ہدایت روشن کی۔ من بعد جناب مستطاب نواب ضیاء الدین احمد خاں صاحب بہادر رئیس لوہارو کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ جنھوں نے کلکتہ کے سفر میں یہ گراں مایہ جواہر بہم پہنچا کر ''مجلس خزنیۃ البضاعۃ'' میں ہدیۂ پیش کیا۔ بعد ازاں اُس ہوا خواہِ ملک اور جاں نثارِ قوم کا شکریہ بھی بقدرِ طاقت ادا کرنا

ضرور ہے۔ جس کے احسانات سے ہمارا بال بال جکڑا ہوا ہے۔ یعنی سید القوم اور خادم القوم جناب مولوی سید احمد خان بہادر سکریٹری ''مجلس خزنیۃ البضاعۃ'' جنھوں نے اس کتاب کو قوم کے حق میں نافع سمجھ کر اپنے اخبار ''گوہر بار'' کے ذریعہ سے بار بار اس کی خوبیاں جتائیں اور قوم کے دلول کو اس کے مطالعہ یا اشاعت کی طرف مائل کیا۔ اور سب سے زیادہ ہمارے شکر کا استحقاق اُس ذات فیض آیات کو ہے۔ جنھیں نے محض رفاہِ قوم کے لیے اپنی جیب خاص سے ایک گراں مقدار رقم صرف کرکے اُس کے ترجمہ کرانے اور چھپوانے اور رواج دینے میں کوشش بلیغ مبذول فرمائی اور ایک چراغ سے ہزاروں چراغ روشن کردئے۔ یعنی جناب خلیفہ سید محمد حسن خاں صاحب وزیر اعظیم ریاست پٹیالہ جنھوں نے قوم کی ہمدردی کا بیڑا اٹھا کر بہت کچھ کر دکھایا اور ابھی قوم کو اُن سے بہت کچھ امیدیں باقی ہیں۔

یہاں تک جس قدر میں نے لکھا وہ اصل کتاب ''اقوامُ المسالک'' سے تعلق رکھتا تھا۔ ''نظم الممالک'' ترجمہ ''اقوامُ المسالک'' کی نسبت ابھی میں نے کچھ نہیں لکھا۔ یہ ترجمہ جناب خلیفہ صاحب ممدوح کے ارشاد سے جناب مولوی محمد اسماعیل صاحب اڈیٹر اخبار ''سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ'' نے عربی سے زبان اُردو میں تحریر فرمایا ہے۔ مولوی صاحب ممدوح کی لیاقت۔ اور علم و فضل اور سلیقۂ وقائع نگاری اور متانت اور سنجیدگی کمال شہرت اور بلند آوازگی کے سبب کسی کی تعریف کی محتاج نہیں ہے۔ اس ترجمہ کے حق میں کوئی ستائش کا کلمہ اس سے زیادہ نہیں ہوسکتا کہ اس کا لکھنے والا وہ ذی لیاقت شخص ہے جس کے حسنِ اہتمام ''سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ'' کا عدیم النظیر اخبار نکلتا ہے۔ اگرچہ ''اقوام المسالک'' جو عربی زبان میں ہے وہ آج تک ہماری نظر سے نہیں گزری اور کسی ترجمہ کی نسب صحیح صحیح رائے اسی وقت دی جاسکتی ہے جب کہ اصل کتاب پیش نظر ہو، مگر جو مراحلِ دشوار گزار اس واجب التعظیم مترجم کو طے کرنے پڑے ہوں گے اُن کو میرا ہی دل خوب جانتا ہے۔ عربی قدیم کا ترجمہ اُردو میں کرنا کچھ مشکل بات نہیں ہے اور اسی طرح انگریزی کا ترجمہ کرنا بھی چنداں دشوار نہیں معلوم ہوتا۔ کیوں کہ عربی قدیم کی متعدد فرہنگیں اور انگریزی کی بے شمار

ڈکشنریاں موجود ہیں۔ ہاں مگر زمانۂ حال کی عربی کا ترجمہ کرنا ایک ایسا دشوار کام ہے جس سے عہدہ برا ہونا محال معلوم ہوتا ہے، علی الخصوص جب کہ زمانۂ حال کی عربی میں کوئی ایسی کتاب لکھی جائے جو سرتاپا مغربی خیالات سے بھری ہوئی ہو۔ زمانۂ حال کی عربی میں ہزاروں لغات مولّدہ ایسے شامل ہوگئے ہیں جن کا صحاح و قاموس وصراح میں کہیں پتا نہیں۔ اس کے سوا ترکی الفاظ عربیٔ حال میں اس قدر مخلوط ہیں جیسے اُردو میں عربی یا فارسی الفاظ ملے ہوئے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ دِقّت واقع ہوئی ہے کہ ہزاروں الفاظ انگریزی اور فرانسیسی اور لاطینی اور یونانی زبان کے اہل مصر اور اہل روم نے معرّب کرکے اپنی زبان میں داخل کرلیے ہیں۔ ان الفاظ کی صورت اپنی اصلی ہیئت سے اس قدر متجاوز ہوگئی ہے کہ اُن کا سراغ لگانا سخت دشوار ہے، نہ عربی لغات میں ان کا وجود ہے، نہ انگریزی ڈکشنریوں میں ان کا نشان ہے۔ ان تمام وجوہ سے اُس دِقّت کا اندازہ ہوسکتا ہے جو ''اقوام المسالک'' کے ترجمہ میں مترجم صاحب کو پیش آئی ہوگی۔ بایں ہمہ عام ترجمہ کمال خوبی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اگرچہ ظاہرا بعض مضامین میں ایک نوع کی پیچیدگی اور فی الجملہ الجھاؤ پایا جاتا ہے، مگر غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ مضامین فی نفسہ دقیق اور پیچیدہ ہیں جن کے پورا پورا ادا کرنے سے ہمارے ملک کی ادھوری زبان قاصر ہے۔ بعض مقام پر جو جناب مولوی سید احمد خاں بہادر نے اپنے قلم سے حواشی تحریر فرمائے ہیں، وہ نہایت گراں قیمت ہیں۔ اس ترجمہ میں ایک امر تنقیح طلب ہے جس کے ذکر سے قطع نظر کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا جو کتابیں فی زماننا مصر وغیرہ میں مغربی زبانوں سے ترجمہ ہوتی ہیں یا اہل مغرب کے طریقہ پر لکھی جاتی ہیں، ان کی نسبت ہندوستانی مترجموں کے دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ انگریزی یا فرانسیسی الفاظ جو اہل مصر وغیرہ نے معرّب کرکے اپنی تصانیف میں داخل کیے ہیں، جب اُن کا ترجمہ اُردو میں کیا جائے تو اُن کو اُسی تعریب کی حالت پر رکھنا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ تا بہ مقدور اُن کو اپنے اصل کے موافق لکھنا چاہیے۔ میری رائے میں پچھلا قول بہ نسبت پہلے کے اقویٰ ہے اور دلیل اس کی قوت کی ظاہر ہے۔ لیکن اس ترجمہ میں زیادہ تر قولِ اول کے مطابق عمل کیا گیا ہے، اور اس سے جو دقتیں ناظرین کو پیش آتی ہیں،

اُن کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔آدمیوں اور مقامات اور جزائر وغیرہ کے بے شمار نام جو اس ترجمہ میں لیے گئے ہیں وہ ناظرین کو نہایت تشویش میں ڈالتے ہیں۔ ہندوستان کا آدمی کیسا ہی جغرافیہ داں ہو، ان اسما کو سن کر بغلیں جھانکنے لگتا ہے۔ چند مثالیں جو اس وقت ہمارے ذہن میں حاضر ہیں، یہاں لکھی جاتی ہیں۔مثلاً میونیشیا کی جگہ میانس، سینٹ ٹامس کی جگہ سان توماس، سینٹ برنارڈ کی جگہ صان برنار، سینٹ ہلینا کی جگہ صانت الان آگہٹس کی جگہ اغطوس، پوپ لیودسویں کی جگہ بابالیون عاشر، پوپوں کی جگہ بابوات، کرسٹوفر کولمبس کی جگہ......کولومب، جزائر ماریشس کی جگہ جزائر موریس، سینگال اور گنی کی جگہ سنیغال اور غنی۔اس قسم کے الفاظ اگر بالاستیعاب لکھے جائیں تو ایک جدا مجلد مرتب ہو جائے۔پس میری رائے یہ ہے کہ طبع ثانی میں ضرور اس کی ترمیم کی جائے۔اگرچہ اس درستی میں کسی قدر دقت بے شک اُٹھانی پڑے گی مگر جو فوائد اس کتاب کے ترجمہ سے متصور ہیں وہ خاص و عام کو برابر اور بے تکلف پہنچیں گے۔

نیرنگِ خیال

(ازعلی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۱۸۸۰ء، صفحہ:۳۶۱)

اس کتاب کے مصنف ان قابلِ ادب شخصوں میں سے ہیں جن کی تصنیفات نے تمام سر رشتۂ تعلیم پنجاب کو اپنا احسان مند کیا ہے اور جن کے مضامین اور خیالات سے اہل پنجاب نے بہت کچھ فائدہ اُٹھایا ہے۔ اگر چہ کسی ملک یا کسی قوم میں اہلِ کمال کا نفسِ وجود ہی اُس ملک یا اُس قوم کا فخر کا باعث ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں فخر انھیں لوگوں پر کرنا بجا ہے جو اپنے ہنر اور کمال کی روشنی سے اپنے وطن یا قوم کو منور کرنا چاہتے ہیں اور اُن سے بھی زیادہ واجب التعظیم وہ لوگ ہیں جو اپنی بیش بہا کوششوں کا ثمرہ یقیناً اپنی زندگی میں نہیں پا سکتے اور پھر بھی کوشش کیے جاتے ہیں۔ وہ اُس مجلس میں جہاں مرہٹی اور بارہ ماسے کے شوقین جمع ہیں دُھرپت اور خیال الاپتے ہیں، مگر ان کی الاپ اس وقت پیاری معلوم ہوگی جب ایسی ایسی کئی مجلسیں برخواست ہو جائیں گی۔ اگر چہ ہمارے ملک کے تمام علوم وفنون نہایت پستی کی حالت میں ہیں مگر ہمارا علم انشا سب سے زیادہ تاسف کے قابل ہے۔ آج تک ایک ایسی ڈکشنری بھی جو عام ہندوستانیوں کے لیے مفید اور زبان کے ضروری حصہ پر حاوی ہو تیار نہیں ہوئی۔ آج تک ایک ایسی گریمر بھی جس میں نہایت ضروری قواعد منضبط ہوں نہیں لکھی گئی۔ جب کہ یہ ابتدائی مراتب بھی اب تک طے نہیں ہوئے تو اور باتوں کا کیا ذکر ہے۔ نظم میں جو الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں وہ اس قدر محدود ہیں کہ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ اور جو خیالات اُن الفاظ کے ذریعہ سے ادا کیے جاتے ہیں، وہ چند معمولی فرسودہ اور بوسیدہ مضامین کے سوا کچھ نہیں۔ نثر میں جو کچھ ترقی ہوئی ہے وہ انھیں دس بارہ

برسوں میں ہوئی ہے۔لیکن زیادہ تر اُس کا پھیلاؤ عرض وطول میں ہوا ہے، ارتفاع میں وہ ویسی ہی پست ہے جیسے ہمارے مکانوں کے تلیچے۔تاریخ، تذکرہ، قصہ، مثنوی، غزل، قصیدہ اوراور تمام اقسامِ نظم ونثر کی قدیم روش میں کوئی تغیر اس سے زیادہ نہیں ہوا کہ بعض لوگ اگلی روِش کو ناپسند کرنے لگے ہیں۔مگر یہ بالکل ایسی ہی بات ہے کہ ایک شخص بہلی اور چھکڑے پر ہنستا ہے مگر کوئی نمونہ ایسا نہیں دکھاتا جس کے آگے بہلی اور چھکڑا عام لوگوں کی نظر سے خود بخود ساقط ہو جائے۔ سچ یہ ہے کہ ہندوستان کی موجودہ حالت میں ایسا نمونہ دکھانا اور اس کو پسند خاص و عام کے لائق بنانا کوئی آسان بات نہیں ہے۔بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مصنف نے بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ کام اعلیٰ درجہ کے انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں سے سرانجام ہوگا، مگر میری رائے بالکل اس کے برخلاف ہے۔میرے نزدیک جب تک ہمارے اہلِ وطن مغربی علوم اور مغربی لٹریچر اپنی دیسی زبان میں نہ سیکھیں گے، کبھی اُن کے خیالات میں شگفتگی اور بالیدگی پیدا نہیں ہوسکتی۔فرض کرو کہ ایک باغ میں تمام دُنیا کی نباتات اور گل بوٹے فراہم کیے گئے ہیں اور اس اصلی مقصد علم نباتات کی تحقیقات ہے، لیکن اگر اُس باغ کی ترتیب اور آرائش اور صفائی بھی ایسے نرالے ڈھنگ کی ہے کہ کبھی ہماری نظر سے نہیں گزری تو ہم کبھی اُس کے اصلی مقصد تک نہیں پہنچ سکتے بلکہ ہماری سیر اور نظر اُس کی بیرونی نمائش اور اعجوبگی میں محدود رہے گی۔

انگریزی زبان جو ہماری زبانوں سے بون بعید رکھتی ہے اُس کے الجھاؤ ایسے نہیں ہیں جو طالب علم کو زبان کے پیچ وخم سے آگے بڑھنے دیں۔وہ لغات اور محاورات کی تفتیش اور تجس میں ایسا مستغرق رہتا ہے کہ مغربی خیالات جو انگریزی زبان کی جان ہیں اُس کی طبیعت پر اپنا رنگ نہیں جما سکتے۔یہی سبب ہے کہ ہم نے آج تک کسی اپنے ہم وطن بی. اے یا ایم.اے کی کوئی تصنیف وتالیف جو اس کی عالی دماغی یا وسعت خیال پر گواہی دیتی ہو یا ملک کے حق میں کوئی معتد بہ فائدہ رکھتی ہو نہیں دیکھی۔ برخلاف اُس کے اُن لوگوں نے جن کے دامن انگریزی زبان کی خار وار جھاڑیوں میں نہیں اُلجھے (یعنی جنھوں نے انگریزی زبان کو انگریزی انشا میں کمال حاصل کرنے کے لیے نہیں سیکھا) یا جن کے دماغ میں مغربی

خیالات کی لپٹ کسی مشرقی زبان کے ذریعہ سے پہنچی ہے، اپنی تصانیف اور تراجم سے اہل وطن کو اس قدر فائدہ پہنچایا ہے کہ جس قدر روشنی آج عام ہندوستانیوں میں عام پائی جاتی ہے، وہ اُنھیں کی بدولت پائی جاتی ہے۔

مصنفِ ''نیرنگِ خیال'' (دام بقائہم) بھی انھیں واجب التعظیم لوگوں میں سے ہیں۔ ہم نے ہمیشہ ان کو اسی دھن میں سرگرم پایا ہے کہ جس قدر واقفیت کا سرمایہ فراہم ہو وہ وقتاً بعد وقتٍ اہل وطن کی ضیافت طبع میں صرف ہوتا رہے۔ جس قدر اُن کے افادات کتابوں اور رسالوں اور اخباروں کے ذریعہ سے شائع ہو چکے ہیں ہمارے قیاس میں اُن سے وہ چند اُن کے پاس مرتب اور تیار ہوں گے جو اہل وطن کی بے پرواہی اور ناقدر دانی کے سبب سے اب تک شائع نہیں ہوئے۔ مگر جب تک ہمارے ہم وطنوں کے کانوں میں ''داستان امیر حمزہ'' اور ''بوستانِ خیال'' کی صفائیں بھری ہوئی ہیں ایسی ناآشنا آوازوں کو کون سنتا ہے ؎

مشامت اختلال آباد بوئے سیر و انگوزہ
شمیمِ مشک و بوئے عنبر سا را چہ میدانی

یہ کتاب جس وقت ہمارے ہاتھ میں آئی، ایک ہی جلسہ میں دوثلث سے زیادہ دیکھی گئی۔ جو ذوق اور خوشی ہم کو اس کے دیکھنے سے ہوئی وہ ہم کو مصنف کی شکر گزاری پر مجبور کرتی ہے۔ اب تک اکثر علوم کی کتابیں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ طبیعات، کیمسٹری، طب، فلسفہ، منطق، ریاضی کی تمام فروعات، ہیئت، حرکت وسکون وغیرہ وغیرہ بقدر ضرورت ہماری دیسی زبان میں موجود ہیں۔ بہت ضروری تاریخیں اور کچھ ناول بھی ترجمہ ہوئے ہیں۔ جغرافئے بھی لکھے گئے ہیں، مگر مغربی شاعرانہ خیالات کی جھلک تک آج تک ہندوستانیوں نے نہیں دیکھی تھی۔ ''نیرنگِ خیال'' پہلی ہی کتاب ہے جس نے اس سربستہ قفل کو کھولا ہے اور اہل وطن کے لیے علم انشا کی ترقی کا ایک نیا رستہ نکالا ہے۔ یہ کتاب دیباچہ کے علاوہ نو اسیز یعنی جواب مضمونوں پر مشتمل ہے۔ جن کے عنوانات حسبِ تفصیل ہیں:-

(۱) اُردو اور انگریزی انشا، (۲) آغاز آفرینش میں دُنیا کا کیا رنگ تھا اور پھر رفتہ رفتہ کیا ہوگیا؟، (۳) سچ اور جھوٹ کی لڑائی، (۴) امید، (۵) سیر زندگی، (٦) انسان کسی حالت میں خوش نہیں رہتا، (۷) علوم کی بدنصیبی، (۸) علم اور ذکاوت کا مقابلہ، (۹) شہرت اور بقائے دوام۔ پہلے مضمون میں اول مطلق زبان کی حقیقت بیان کی گئی ہے کہ وہ کیا چیز ہے اور اس کی ماہیت بہت سی تمثیلوں کے پیرایہ میں ظاہر کی ہے۔ پھر اُردو میں جو قصور اور نقصان ہیں وہ بتلائے ہیں اور جتایا ہے کہ زیادہ تر اُس کا قصور اور نقصان اس سبب سے ہے کہ اس کو پیدا ہوئے ڈیڑھ سو برس سے زیادہ نہیں گزرے اور وہ سلطنت انگریزی کے عروج سے پہلے روزمرہ کی گفتگو کے سوا کسی کام میں نہیں آئی۔ مگر انگریزی حکومت کی ترقی کے ساتھ اُس نے بھی ترقی کرنی شروع کی اور اب جس قدر ہندوستان میں علوم کی ترقی ہوگی اُسی قدر زبان کو ترقی ہوگی۔ پھر یہ ثابت کیا ہے کہ اصناف نوعِ بشر کے طبعی خیالات سب آپس میں متقارب اور متشابہ ہوتے ہیں اور اس کے ثبوت میں دقت، غصہ، عشق، شہرت اور حسن کی مثالیں دے کر سمجھایا ہے کہ جن پیرایوں میں ان چیزوں کو اہل مغرب نے بیان کیا ہے انھیں کے قریب قریب مشرقی زبانوں میں اہل مشرق نے بیان کیا ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اگر اُردو زبان کے علم انشا میں انگریزی لٹریچر کی چاشنی دی جائے تو کوئی بعید اور دشوار بات نہیں ہے اور اُردو کی اصلی ترقی ایسی بات پر موقوف ہے۔

دوسرے مضمون میں اول ابتدائے آفرینش کی خالص نیچرل حالت کا خاکا کھینچا ہے۔ دُنیا کو ملکِ فراغ اور خسروِ آرام کو اُس کا فرمانروا قرار دیا ہے۔ پھر فریب کو جاسوس اور سینہ زوری کو شیطان اور لوٹ مار کو اُس کی ذرّیات قرار دے کر ملک فراغ کا خلل پذیر ہونا اور غرور وخود پسندی وحسد کا دخل پانا اور احتیاج کی گرم بازاری اور قحط و وبا کے صدمے اور ملکِ فراغ کے انتظام میں ایک نئی اصلاح کی ضرورت بیان کی ہے۔ پھر دو تجربہ کاروں یعنی تدبیر اور مشورہ کی صلاح سے اہل عالم کا محنت پسند خردمند کے پاس جانا اور اُس کے حکم سے بسر کردگی ہمت وتحمل جنگلوں اور پہاڑوں کی راہ لینی اور تحصیل معاش میں سرگرم ہونا اور دُنیا میں تمدن کی بنیاد پڑنی بیان کی ہے۔ پھر افراط محنت کے مضر نتیجے دیسی ہی محسوسات کی

تمثیلوں میں لکھ کر انجام کو یہ نتیجہ نکالا ہے کہ دُنیا میں جب تک آرام اور محنت دونوں اعتدال کے ساتھ نہیں رہتے تب تک صحت، خوشی اور جرأت حاصل نہیں ہوسکتی۔

اس مضمون کا اسلوبِ بیان ہماری زبان کے قدیم اسلوبوں سے بہت کم ملتا ہے۔ اس میں معقولات کی تصویریں محسوسات کی شکلوں میں کھینچی اور انسانی خصلتوں کی نیچرل خواص ایسے موثر اور دلکش پیرایوں میں بیان کیے ہیں جن سے ہمارا لٹریچر بے شک خالی ہے۔ محنت و آرام میں اعتدال اور بے اعتدالی کے اچھے اور بُرے نتیجے اور آرام کے لیے محنت کی اور محنت کے لیے آرام کی ضرورت جس طرح پر کہ واقع ہیں ہے۔ اس مضمون کو پڑھ کر اُس کی صورت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اسی اسلوب پر اور تمام مضامین لکھے ہیں جن کے دیکھنے اور غور کرنے سے مغربی شاعرانہ خیالات کی بلندی اور وسعت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا علم انشا آئندہ کہاں تک ترقی کرے گا اور مغربی خیالات کے فوٹو ہماری زبان میں کس درجہ تک خوبی کے ساتھ کھینچے جائیں گے۔ مگر ہمارے ملک کی موجودہ حالت میں ''نیرنگِ خیال'' ایک ایسا نمونہ ہے کہ اگر میری رائے غلط نہیں تو زمانۂ آئندہ میں اس کی قدر ہی نہیں بلکہ پیروی بھی کی جائے گی۔ اگرچہ اس وقت اہل وطن کے محدود خیالات اور ادھورے مذاق اور ناتجربہ کار آنکھ سے یہ امید نہیں ہے کہ وہ مصنف کی کوشش کا پورا پورا اندازہ کر سکیں۔ وہ اُن دو کپڑوں کو جن میں سے ایک کل کے ذریعہ سے اور دوسرا دست و بازو کی محنت سے تیار ہوا ہو ایک ہی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ اُن دو آموں کے پھل ہیں جن میں سے ایک نے گرم سیر ملک اور دوسرے نے سرد سیر ملک میں نشو ونما پائی ہو، ایک ہی مزا ڈھونڈتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ جو شخص ایک ایسی وسیع اور علمی شائستہ اور با قاعدہ زبان سے جیسے کہ انگریزی ہے شاعرانہ خیالات کو لے کر ایک ایسی محدود اور بے قاعدہ اور ناکامل اور غیر علمی زبان میں جیسی کہ اُردو ہے ادا کرتا ہے اُس کی مشکلات کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو واقعی اُس کا ہمدرد ہے۔

بزیرِ شاخِ گل افعی گزیدہ بلبل را
نوا گرانِ نخوردہ گزند راچہ خبر

اگرچہ اس عام قاعدے کے موافق کہ ''الصفو و الکدر تو أمان.'' انسان کا کوئی کام خوبی اور عیب سے مبّرا نہیں ہوسکتا۔ خصوصاً تصنیف اور تالیف کا دشوار کام جس سے بے عیب ہونا محال ہے۔ لیکن ایک ایسے ملک میں جہاں ترقی ابتدائی حالت میں ہو، نئے اسلوب کی کتابوں کا کم عیب ہونا بھی بے عیب ہونے کی برابر ہے۔ شاید ایک زمانہ ایسا بھی آئے جس میں زمانۂ حال کی عمدہ تصنیفات پر اسی طرح نکتہ چینی کی جائے جیسے آج کل ارسطو اور بوعلی کی تصنیفات پر کی جاتی ہے۔ مگر اس وقت ایسی کتابوں میں خوردہ گیری کی نظر سے خوض کرنا کیا باعتبار ترقی کی حالت کے اور کیا باعتبار خیالاتِ اہل وطن کے اور کیا باعتبار مصنفوں کی امیدوں کے اور کیا باعتبار خوردہ گیری کی نیت کے ایک ایسا کام ہے جس کا شاید ابھی وقت نہیں آیا۔ پس اب ہماری یہ دعا ہے کہ اس کتاب کا دوسرا حصہ بھی چھپ کر شائع ہوجائے اور ہمارے لٹریچر کی ترقی کے لیے یہ کتاب ایک مبارک فال ہو۔ آمین۔

آب حیات

(از علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، بابتہ ۱۸۸۱ء، صفحہ: ۹۳)

ہم کو اس بے مثل کتاب کے مطالعہ سے مستفید ہونے کا موقع اُس وقت ملا جب کہ بہت سے اُردو اخباروں میں اُس پر ریویو لکھے جا چکے تھے اور اُس کے مضامین اور ابواب کی تفصیل اُن میں درج ہو چکی تھی۔ پس اب کوئی محل اس بات کا باقی نہ تھا کہ اُس کی نسبت کچھ زیادہ لکھا جائے مگر جو خاص کیفیت اُس کے دیکھنے سے ہمارے دل پر طاری ہوئی ہے، ہم چاہتے ہیں کہ اس کو اپنے ہم وطنوں پر ظاہر کریں۔ اس تذکرہ کو میں نے اول سے آخر تک دیکھا۔ حق یہ ہے کہ یہ اُردو زبان کا پہلا تذکرہ ہے جس میں تذکرہ نویسی کے فرائض ادا کیے گئے ہیں۔ ہمارے تذکرہ نگاروں کا ہمیشہ سے یہ دستور رہا ہے کہ شعرا نہایت ضروری حالات کے تجسس میں بھی کبھی کوشش نہیں کی گئی، یہاں تک کہ تاریخ ولادت، تاریخ وفات، مولد، مسکن، قوم، خاندان، تعلیم، مشورۂ سخن وغیرہ کا بھی بہت کم ذکر کیا گیا ہے۔ بلکہ تمام ہمت اس بات میں صرف کی گئی ہے کہ اُن کا کلام جس قدر اپنے مذاق کے موافق پایا انتخاب کر کے لکھ دیا اور اُن کی بے معنی اور لغو ستائش میں جس سے کلام اور صاحبِ کلام کی اصل حقیقت پر اور پردے پڑ جائیں، ورق کے ورق سیاہ کر دئے۔ مصنف نے شعرا کے اُن ضروری حالات لکھنے ہی پر قناعت نہیں کی۔ بلکہ چند شخصوں کے سوا جن کے نشانِ قدم اگلے تذکرہ نویسوں کی بے پرواہی سے کسی قدر محو ہو گئے ہیں، ہر شاعر کے سوانح عمری جہاں تک ممکن تھا نہایت تفصیل سے لکھے ہیں۔ اُس نے اُن کی تعریف میں وہ شاعرانہ مبالغے بھی نہیں کیے جن کا کچھ ثبوت نہ ہو بلکہ خود اُن کے وقائع ایسے لکھے ہیں جن سے اُن کو سیرت

اور اخلاق پر استدلال ہو سکے۔ اُس نے اُن کے کلام اور شاعری پر نکتہ چینی بھی کی ہے اور جابجا اپنی رائے بھی ظاہر کی ہے، مگر ادب اور تہذیب کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور نہایت خوبی کے ساتھ اس دشوار گزار مرحلہ کو طے کیا ہے۔ وہ تاریخ اُردو کے مضمون میں پارسیوں، ہندوؤں اور بودھ مت والوں کا نام ایسے ادب سے لیتا ہے کہ ہمارے بھائی مسلمان اپنے مسلمان بھائیوں کا نام بھی ایسے ادب سے نہیں لے سکتے۔ مصنف نے اس تذکرہ کے اول میں دو مضمون زبان اُردو اور نظم اُردو کی تاریخ پر لکھے ہیں۔ پہلا جو زبان اُردو سے متعلق ہے، اُس نے انگریزی مورّخوں کی کتابوں سے نہایت کوشش کی ساتھ چھان بین کر کے مدد لی ہے، اور پچھلا بڑا حصہ جو کہ اُردو، بھاشا، عربی اور فارسی زبانوں سے متعلق ہے وہ خاص مصنف کی بے انتہا اور بے بہا کوشش کا نتیجہ ہے۔ یہ تمام مضمون نہایت مفید اور بصیرت افزا اور زبان کی حقیقت کا آئینہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر مصنف سے اس باب میں کوئی ضروری بات فروگزاشت ہوگئی ہو تو اس پر کچھ اعتراض نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ جو شخص سب سے اول کوئی تاریخی مضمون لکھا ہے اُس کو ہزاروں پریشان باتیں فراہم کرنی پڑتی ہیں اور ممکن نہیں کہ کوئی ضروری چیز فروگزاشت نہ ہو جائے۔

لیکن ہم افسوس کے طور پر لکھتے ہیں کہ اُردو زبان کی ترقی کے بیان میں پرچۂ ''تہذیب الاخلاق'' کا کچھ ذکر نہیں کیا گیا۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو اس پرچہ نے اُردو زبان کو چند روز میں اس درجہ تک پہنچا دیا ہے جو کم سے کم پچاس برس کے بعد اس کو حاصل ہوتا۔ اُردو لٹریچر پر اس پرچہ کا بہت بڑا احسان ہے۔ مذہب، اخلاق، معاشرت اور تمدن پر جو اعلیٰ درجہ کے مضامین اس پرچہ میں لکھے گئے ہیں انھوں نے ثابت کر دیا ہے کہ اُردو زبان کسی مطلب کے ادا کرنے سے قاصر نہیں ہے۔ بلند خیالات کو سیدھے سادے لفظوں میں موثر طور بیان کرنا اسی پرچہ نے لوگوں کو سکھایا ہے اور اس فخر کا وہ ہمیشہ مستحق سمجھا جائے گا۔ نظم اُردو کی تاریخ کا مضمون بھی جس کو پہلے مضمون کا ضمیمہ کہنا چاہیے نہایت عمدہ ہے اس کی نسبت بھی کہا گیا ہے کہ اُس میں نیچرل شاعری کا ذکر جس کی بنیاد خود مصنف نے انجمن پنجاب میں ڈالی تھی قلم انداز کیا گیا ہے۔ لیکن اس باب میں مصنف کی طرف سے

عُذر ہوسکتا ہے کہ اس طرز کی شاعری ابھی ایسی حالت میں ہے کہ اُس کا عدم اور وجود برابر ہے۔ دوسرے جس چیز کی ہدایت خود مصنف سے ہوئی ہے اُس کا جتانا مصنف کے معاصرین کا حق ہے نہ کہ خود مصنف کا۔ اس مضمون کے اخیر میں مصنف نے میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کا رتبہ ہمارے نزدیک اس سے بہت بڑھ کر ہے۔ ہماری رائے میں اُردو شاعری کا پورا پورا اطلاق اگر ہوسکتا ہے تو میر انیسؔ ہی پر ہوسکتا ہے۔ میر انیسؔ پر نہ صرف اہل لکھنؤ بلکہ اُن سے زیادہ اہل دہلی کو فخر کرنا چاہیے، کیوں کہ اُن کے بزرگ اسی معدن کے جواہر تھے۔ یہ مثل کہ ''بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گویا مرثیہ خواں۔'' شاید اُس زمانے میں مشہور ہوئی ہوگی جب کہ مرثیہ گوئی کا آغاز تھا اور غزل اور مثنوی معراجِ کمال کو پہنچ چکی تھیں۔ جیسے ہماری قوم میں اب سے بیس برس پہلے علوم قدیمہ کے سامنے علوم جدیدہ ہیچ و پوچ سمجھے جاتے تھے، لیکن اب روز بروز خیالات وگرگوں ہوتے جاتے ہیں۔ نظم اُردو میں نیچرل شاعری کا پتہ اگر ملتا ہے تو میر انیسؔ ہی کہ کلام میں ملتا ہے اس کے بعد مصنف نے ولیؔ سے لے کر غالبؔ تک شعرائے اُردو کے پانچ طبقے کیے ہیں اور ہر ایک طبقہ کے نامور اور مستند شاعر (جو کہ اُس کے نزدیک مستند تھے، انتخاب کر لیے ہیں) اگر چہ بعض طبقات میں ایک آدھ ایسے شاعر کا حال قلم انداز کیا گیا ہے جو اپنے طبقہ میں مستند سمجھا جاتا تھا جیسے طبقۂ پنجم میں مومن خان مومنؔ یا میر نظام الدین خاں ممنون، لیکن اس کا یہ عذر ہوسکتا ہے کہ مصنف نے کہیں یہ دعویٰ نہیں کیا کہ کسی دور کا کوئی مستند شاعر فروگزاشت نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ اُس نے ہر دورہ میں سے چند شاعر بطور نمونہ کے کے انتخاب کر لیے ہیں اور اس سے اُن تغیرات کا دکھانا منظور ہے جو ہر ایک دورہ میں زبان اُردو پر واقع ہوئے ہیں۔

البتہ اگر مصنف تمام شعرائے اُردو کا حال بالاستیعاب لکھتا تو چند نامی شاعروں کا ذکر نہ کرنا محل اعتراض تھا۔ شعرا کے ذکر میں مصنف نے اس بات کا التزام کیا ہے کہ ابتدا سے اخیر تک ہر ایک دورہ میں جو جو الفاظ متروک اور اُن کی جگہ جو جو الفاظ مستعمل ہوتے گئے وہ بھی بوجہ استیفا ذکر کیے جائیں اور شہادت کے لیے جا بجا ہر ایک دورہ کے شعرا کا کلام نقل کیا جائے۔ یہ کوشش نہایت تحسین و آفرین کے لائق ہے اور ہر شخص اندازہ کرسکتا ہے کہ اس میں

کس قدر دقت اُٹھانی پڑی ہوگی۔ پھر جہاں جہاں معاصرین کو ایک دوسرے سے توارد ہوا ہے، وہ اشعار بھی نقل کیے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ ہر ایک کا طرزِ بیان ایک ہی مطلب کے ادا کرنے میں کیسا تھا۔ اُس نے اور تذکرہ نویسوں کی طرح غزلوں کا انتخاب نہیں کیا بلکہ ہر ایک شاعر کی سالم غزلیں لکھ دی ہیں تاکہ ناظرین اُس کے عام خیالات کا اندازہ کر سکیں۔ حقیقت میں یہ بات ٹھیک نہیں تھی کہ تمام شعرا کے کلام میں سے صرف ایک خاص طرز اور خاص روش کے مضامین انتخاب کیے جائیں اور ہر شخص کو مثلاً میر اور مرزا کا ہم پایہ ظاہر کیا جائے۔ لیکن ہمارے نزدیک عام خیالات ظاہر کرنے کے ساتھ (جیسا کہ مصنف نے کیا ہے) یہ بھی ضرور ہے کہ ہر ایک شاعر کے اعلیٰ درجہ کے خیالات اور اچھوتے مضامین بھی دکھائے جائیں تاکہ اس کا مبلغ فکر اور رسائی طبیعت کا منتہا معلوم ہو اور اُس کے پُر کن اور پست خیالات بھی بطور نمونہ کے ظاہر کیے جائیں تاکہ اُس کی طبیعت کے اُتار چڑھاؤ کا حال اچھی طرح خاطر نشین ہو جائے۔ بظاہر اس تمام تذکرہ میں ۲۳ شاعروں کا حال قلم بند اور اُن کا کلام نقل کیا گیا ہے، لیکن تراجم شعرا کے ضمن میں جابجا اُن کے معاصرین اور اُن کے ہم صحبتوں کا ذکر بھی کیا ہے اور ہر موقع پر بہت دلچسپ نقلیں اور لطیفے لکھے ہیں۔ اور تمام حالات کے فراہم کرنے میں جو محنت اور جانکاہی مصنف نے کی ہے اُس کا اندازہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے ابتدائے سن تمیز سے ایک ایسی جامع کتاب لکھنے کا ارادہ کیا ہوگا۔ اور وقتاً فوقتاً جہاں جو سرمایہ ملا اُس کو احتیاط کے ساتھ ضبط کیا ہوگا۔ ورنہ ایسے تفصیلی حالات جو کتابوں میں درج نہ ہوئے ہوں اور صرف افواہِ خلائق پر جاری ہوں، کسی طرح اس ترتیب کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ بہادر شاہ اول کے عہد سے لے کر بہادر شاہ ثانی کے اخیر وقت تک کہ سلطنت مغلیہ کے عین تنزل کا زمانہ ہے تقریباً ڈیڑھ سو برس ہوتے ہیں۔

اس عبرت انگیز زمانہ کے ایک خاص عالم کی تصویر جیسی اس تذکرہ میں نظر آتی ہے۔ صفحاتِ تاریخ اُس سے معرّا ہیں۔ ان حالات کو زیادہ تر دہلی سے اور اُس سے کسی قدر کم لکھنؤ سے تعلق ہے۔ اکثر مقامات پر ان حالات کو پڑھ کر بے اختیار جی بھر آتا ہے اور زمانۂ گزشتہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ اس کتاب کو مورخانہ نگاہ سے دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے

کہ جس طرح قومی ترقی کا ابتدائی ہنگامہ قابل دید ہوتا ہے اُسی طرح قومی تنزل کا ابتدائی تماشا دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ عالی خاندان مٹتے ہیں اور پست بلند ہوتے ہیں، امیر زادے منصب اور خدمت سے مایوس ہو کر پیشہ یا مزدوری اختیار کرتے ہیں، بعضوں کا دل دُنیا سے سرد ہو جاتا ہے اور وہ لباس فقر پہن کر کوئی تکیہ آباد کرتے ہیں۔ جن فلک زدہ خاندانوں کو تلاش معاش میں رئیسوں اور دولت مندوں کے دروازے جھانکنے پڑتے ہیں وہ عجب کشمکش میں مبتلا ہیں، ضرورت اور فلاکت یہ کہتی ہے کہ پیٹ کے لیے تمام مکروہات کو گوارا کیجیے مگر خاندانی غیرت جو ابھی طبیعتوں سے بالکل نیست و نابود نہیں ہوئی، ناگوار باتوں پر تحمل نہیں کرنے دیتی۔ اگر کہیں مقسوم سے قدم جم بھی جاتے ہیں تو اس کو قیام نہیں ہوتا، جہاں کوئی بات طبیعت کے خلاف دیکھتے ہیں فوراً بگڑ جاتے ہیں اور پھر اُدھر رُخ نہیں کرتے۔ خاندان تباہ ہو چکے ہیں، مگر خاندانی افتخار ایک ایک دماغ میں بھرا ہوا ہے۔ شرفا کے قافلے جوق جوق دلّی سے لکھنؤ کو چلے جاتے ہیں۔ جن کے باپ دادا دربار شاہی کے رکن رکین تھے اُن کی اولاد بادل شاہ اور شاہ تسلیم کے تکیوں میں دھونی رمائے بیٹھی ہے۔ جو عالی شان محلوں میں رہتے تھے وہ درختوں کے سایہ میں پڑے اینڈ رہے ہیں۔ جن لوگوں کا استقلال مہمات ملکی میں صرف ہوتا تھا اُن کی نسلوں کا استقلال اب خالی پھیکی وضع داریوں میں صرف ہوتا ہے۔ میر صاحب باایں ہمہ تقدس بی نورن کی چوکھٹ کو ایک دفعۂ روز سلام کرآتے ہیں۔ شاہ صاحب کا تکیہ ہے اور ہر روز سہ پہر کو شریف زادوں کا جم گھٹا ہے۔ اُمرا کی سفلہ مزاجی سے اہل کمال کو مسخرگی اختیار کرنی پڑی ہے، وہ اپنا تمام علم و فضل اور ذہن و جودت اسی میں صرف کرتے ہیں۔ اسی قسم کے صدہا واقعات ہیں جن کو اس کتاب میں دیکھ کر بے انتہا عبرت ہوتی ہے اور نیرنگیِ روزگار کا ایک طرفہ تماشا نظر آتا ہے اگر چہ مصنف نے اپنی کتاب میں کہیں اس بات کی تصریح نہیں کی کہ اُردو شاعری نے ہماری معاشرت، ہمارے اخلاق، ہمارے خیالات پر کیا اثر کیا لیکن اُس نے شعرا کا حال ایسا واشگاف لکھا ہے کہ ہر صاحب رائے اُس کو دیکھ کر اس باب میں اپنی رائے قائم کر سکتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو شاعری کی رفتار سرے ہی سے ایسی بے اصولی تھی کہ وہ جس قدر آگے بڑھتی تھی اُسی قدر منزلِ مقصود سے دور ہوتی جاتی تھی۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ اُردو شاعری کا آغاز اور

سلطنت مغلیہ کا زوال ایک ہی وقت سے شروع ہوتا ہے، گویا اُس کا بیج ایسی زمین بویا گیا تھا۔ جس میں زراعت کی قابلیت نہیں رہتی تھی۔ شاعری کی اصلی ترقی کا مدار ملک کی عام شائستگی اور تعلیم پر ہے۔ کیوں کہ شعرا کو جس قدر شائستہ اور نکتہ فہم مخاطب میسر آتے ہیں اُسی قدر اُن کے خیالات شائستہ اور معقول ہوتے جاتے ہیں۔ اسی بنا پر زمانہ کو عربی میں ''افصح المؤدبین'' اور انگریزی میں ''گریٹ رفارمر'' کہا گیا ہے۔ دوسری چیز جو شاعری کو شگفتہ اور باردو کرتی ہے وہ قومی سلطنت ہے۔ جس ملک میں یہ دونوں صورتیں نہیں ہوتیں تو شاعری کی اصلی ترقی ناممکن ہوتی ہے۔ مگر شخصی سلطنت سے بھی اس کو بہت کچھ مدد پہنچتی ہے۔ شعرا کو ایک خاص جماعت کے مذاق کے موافق جو کہ دربار شاہی کے رکن رکین اور اپنے زمانہ کے علم وفضل ولیاقت میں سب سے ممتاز ہوتے ہیں، اپنے خیالات کی تہذیب اور اصلاح کرنی پڑتی ہے۔ چناں چہ اکبری دورہ کی شاعری اس کی مصداق ہے۔ افسوس ہے کہ اُردو شاعری نے اُس وقت جنم لیا جب کہ اُس کا کوئی مربی اور سرپرست نظر نہ آتا تھا۔ وہ دربار جو اُردو زبان کا ملجا و ماوی تھا برخاست ہو چکا تھا۔

عام شائستگی وتعلیم جو ملک میں پہلے ہی سے نہ تھی۔ امرا میں بہت سے بگڑ چکے تھے اور جو کچھ باقی تھی اُن کے مذاق افراطِ عیش وعشرت کے سبب فاسد ہو گئے تھے۔ خواص کا گروہ جس سے اہل علم وفضل کی جماعت مراد ہے اپنی بے اقتداری سے اس قابل نہ تھا کہ شاعری کی بنیاد محض ان کے مذاق پر رکھی جاتی۔ غرض کوئی چیز ایسی نہ تھی جو شعرا کے خیالات کو تہذیب وشائستگی کی طرف کھینچتی۔ بلکہ دائیں بائیں تمام اسباب ایسے جمع تھے جو شاعروں کو بھاٹ اور مسخرہ بنانے والے یا مرض مالےخولیا میں مبتلا کرنے والے یا باہمی رشک وحسد کے باعث تھے۔ شعرا کو جن امیروں کے ہاں تعلق ہوتا تھا وہ یا تو علم وفضل اور مذاق سخن سے عاری یا عیش ونشاط میں منہمک ہوتے تھے اور اس لیے اُن کو سنجیدہ خیالات کبھی پسند نہ آتے تھے، بلکہ ہنسی اور چہل کی باتوں پر ہر طرف سے قرار واقعی داد ملتی تھی۔ ایسا ہی حال مشاعروں کا تھا کہ وہاں بھی فحش اور بے حیائی یا کسی کی ہجو پر جس قدر تحسین وآفرین کا غل ہوتا تھا، اُس کا عشرِ عشیر بھی ایک متین اور سنجیدہ کلام پر نہ ہوتا تھا۔ پھر چوں کہ شعرا کے قدر دانوں کا قحط تھا، اگر کسی کو قسمت

سے کوئی ٹھکانا مل جاتا تھا تو وہ اس کو ایک فوز عظیم جانتا اور دوسرے شاعر کا وہاں رنگ نہ جمنے دیتا تھا۔اسی بنا پر شاعروں میں باہم چشمکیں رہتی تھیں۔بھرے مشاعروں میں ایک دوسرے پر اعتراض کرتا تھا۔ایک دوسرے کی ہجو پڑھتا تھا،ایک دوسرے کی داد نہ دیتا تھا۔شاگردوں کو حکم تھا کہ بھری محفلوں میں حریفوں پر چوٹیں کرو،قہقہے لگاؤ،اور موقع نہ ملے تو رموز و کنایہ میں خاکہ اڑاؤ۔ یہ بلا اس قدر پھیلی تھی کہ ایک شاعر دوسرے شاعر کا سوانگ بنا کر سر بازار نکلتا تھا۔ جہاں اُس کے ننگ و ناموس کی بے حرمتی کی جاتی تھی،اُس کی ہجو کے اشعار ڈنڈوں پر گائے جاتے تھے۔شعرا کے باہم رشک وحسد کا یہ حال تھا کہ جس شاگرد کو ہونہار جانتے تھے اور خاص و عام کو اس کی طرف مائل دیکھتے تھے اس کے بتانے میں دریغ کرتے تھے اور اُس کو غلط اصلاحیں دے کر سرِ مشاعرہ ذلیل کرنا چاہتے تھے۔چند شاعر جو اعلیٰ درجہ کے قانع،مستغنی اور خود دار تھے اور سنجیدگی جن کی جبلت میں پیدا کی گئی تھی وہ بھی کوئی ایسی انوکھی روش اختیار نہ کر سکتے تھے جو سراسر مذاقِ جمہور کے خلاف ہو۔جیسے میر تقی علیہ الرحمتہ کہ اُن کا ایک شعر پڑھ کر بے اختیار منہ سے درد و نکلتا ہے اور دوسرا شعر پڑھ کر نہایت شرم آتی ہے۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ ہماری شاعری بگڑی اور خوب بگڑی اور اس کا اثر ہمارے اخلاق پر ایسا ہی ہوا جیسا ہوائے سمّی کا اثر صحت جسمانی پر ہوتا ہے۔اس مطلب کو زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کا یہ محل نہیں ہے۔اب ہم مصنف کی شکر گزاری پر اس ہزیان سرائی کو ختم کرتے ہیں، جس نے اپنے بیش قیمت اوقات کا ایک بہت بڑا حصہ صرف کر کے اہل وطن کے لیے ایک ایسی کتاب تیار کی ہے جو زبان کے محققوں کے لیے ہادی اور رہنما ہے۔سیر و اخبار کے شایقین کے واسطے ایک داستانِ عبرت انگیز ہے،ظرافت پسندوں اور نوجوانوں کے لیے سامانِ خندہ و نشاط ہے اور اصحاب رائے کے لیے ایک مفصل روئداد ہے،جس میں اُردو شاعری کے فیصلہ کے لیے کافی شہادتیں موجود ہیں۔اگر چہ وہ وقت ابھی نہیں آیا کہ شائستہ ملکوں کی طرح ہر نئی تصنیف و تالیف پر ہمارے ہم وطن بھی اس طرح گریں جیسے پیاسا ٹھنڈے پانی پر گرتا ہے لیکن عمدہ اور مفید تصانیف کا حق ہے کہ اہل وطن دل و جان سے اُن پر متوجہ ہوں اور اُن کی قدر کریں اور مصنفوں کے شکر گزار رہوں۔

منطقِ استقرائی

(از علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، بابت ۱۸۸۲ء، صفحہ: ۱۰۲۸)

اس رسالہ کے مصنف قصبہ مہم ضلع روہتک کے ایک بزرگ خاندان سے ہیں۔ جن میں سے مولوی سید رمضان صاحب کا نام مسلمانوں میں اب تک تعظیم سے لیا جاتا ہے۔ مولوی محمد حسین صاحب پنجاب کے مسلمانوں میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے ایم.اے کا درجہ حاصل کیا ہے۔ باوجودیکہ ان کو کالج چھوڑے ہوئے کچھ زیادہ عرض نہیں گزرا اور دو بڑے بڑے کام، ایک اورینٹل کالج لاہور میں فلسفہ و ریاضی کی تعلیم اور دوسرے اخبار ''انجمن پنجاب'' کی ایڈیٹری اُن سے متعلق ہے، پھر بھی اس تھوڑی سی مدت میں انھوں نے کئی مفید کتابیں اُردو میں تالیف اور ترجمہ کی ہیں، جیسے رسالہ ''علم سکون سیّالت''، رسالہ ''علم ہیئت''، رسالہ ''سیاست مدُن''، رسالہ ''اصول قانون'' اور یہ رسالہ جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔ ''منطقِ استقرائی'' میں اس رسالہ سے پہلے کوئی تصنیف یا تالیف یا ترجمہ اُردو زبان میں چھپ کر شائع نہیں ہوا۔ اگرچہ ''منطقِ استقرائی'' کا موجد لارڈ بیکن کو قرار دینا صحیح نہیں ہے بلکہ جیسا لارڈ مکالے نے بیان کیا ہے ارسطو نے بیکن سے دو ہزار برس پہلے یہ کہہ دیا تھا کہ تحقیقات جدید اور نئے اصول دریافت کرنے کے لیے صرف منطقِ استقرائی ہی رہنما ہوسکتی ہے اور اُسی نے منطق قیاسی کو جس پر آج کل ہماری قوم کی فضیلت اور فلسفیت کا مدار ہے محض بے ثمر اور عقیم بتایا تھا مگر اس میں شک نہیں کہ بیکن نے اُس کی سودمندی کو حد سے زیادہ بڑھا دیا اور جس لازوال دولت کی کان سے تمام دُنیا غافل تھی اُس کی طرف سب کو متوجہ کر دیا۔ جس طرح آج تک منطق قیاسی کو سرمایۂ فضیلت و استعداد

سمجھتے ہیں اُسی طرح ایک زمانے میں یعنی لارڈ بیکن کی رہنمائی سے پہلے تمام یورپ میں یہی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ اُسی بے براور بے ثمر منطق پر تمام اہل مغرب قانع تھے جس پر بالفعل مسلمان قانع ہیں۔ سوائے لفظی بحث و تکرار اور نکمّی مدقیقات کے کوئی نتیجہ اُن کے علم و فضل کا نہ تھا۔ مذہب رومن کیتھلک اور فلسفہ میں ویسا ہی رابطۂ اتحاد مستحکم تھا جیسا بالفعل اسلام اور ارسطو کی حکمت میں پایا جاتا ہے۔ مگر بیکن کی کتاب ''نودم آرگنیم'' نے لوگوں کے خیالات میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا اور بجائے اس کے کہ ایک کولھو کے بیل کی طرح صبح سے شام تک ایک دائرہ معین سے آگے قدم نہ بڑھاتے تھے اب ترقی کی سیدھی اور غیر محدود سڑک پر پڑ لیے۔ یورپ کے تمام صنائع و فنون اور تمام تحقیقات اور انکشاف کی کنجی یہی ''منطقِ استقرائی'' جس کی تشریح و تحلیل ''نودم آرگنیم'' میں کی گئی ہے اور جس کا انکشاف ہندوستانیوں کے لیے سب سے پہلے مولوی محمد حسین ایم.اے کے ہاتھ اور قلم پر محوم تھا۔ یہ مقولہ بالکل صحیح ہے کہ اشیا اپنی اضداد سے پہنچانی جاتی ہیں۔ پس ہمارے ہم وطنوں کے سامنے منطق قیاسی کی توہین اور تنقیص اُس وقت تک بکار آمد نہ ہو سکتی تھی جب تک کہ ''منطقِ استقرائی'' کا کوئی عمدہ نمونہ اُن کے سامنے پیش نہ کیا جاتا۔ ہم کو مصنف ممدوح کا شکریہ دل و جان سے ادا کرنا چاہیے جنھوں نہ یہ نمونہ اہل وطن کے لیے مہیا کیا اور اُن کو دونوں منطقوں کے مقابلہ کرنے کا موقع دیا ہے۔ کاش ہمارے ملک کے فضلا بھی اس گراں قدر کتاب پر ویسے ہی توجہ مبذول فرمائیں جیسے اہل یورپ نے ''نودم آرگنیم'' پر کی تھی۔ اس رسالہ پر تھوڑی سی توجہ کرنے سے کم از کم یہ بات ضرور اُن کے ذہن نشین ہو جائے گی کہ جس درخت کو وہ ایک ہزار برس سے پانی دے رہے ہیں اُس سے نہ کبھی کسی نے پھل حاصل کیا ہے اور نہ اُس کے پھل لانے کی آئندہ توقع ہے۔ وہ جس قدر زیادہ پھیلے گا اُسی قدر اُس کی ٹہنیاں زیادہ خاردار ہوتی جائیں گی اور جس قدر اُس کے ریشے زمین میں دوڑیں گے اُسی قدر زمین کو خراب اور برباد کریں گے۔ اگرچہ اس رسالہ کی بنیاد غالبًا کسی خاص انگریزی کتاب رکھی گئی ہے اور زیادہ تر کسی ایک ہی کتاب کے مطالب اس میں ترجمہ کیے گئے ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مترجم موصوف نے بعض مفید باتیں اور کتابوں سے بھی اخذ کی ہیں۔

اس کا اُردو ترجمہ جہاں تک کہ علمی مضامین کے بیان میں آسانی اور سہولت ہوسکتی ہے۔ بہت صاف اور سلیس ہے۔اگر چہ اس کے مطالب سمجھنے میں مستعد طالب علموں کو بھی کسی نہ کسی قدر تامل اور غور کرنے کی ضرورت ہوگی۔لیکن علمی مسائل کا بیان اس سے زیادہ سہل اور آسان ہونا نہایت دشوار ہے۔ ہندوستان کے انصاف پسند فاضلوں کا اتفاق ہے کہ جس طرح تمام یورپ میں ہر علم کی اصطلاحیں خاص لاطینی اور یونانی سے لی گئی ہیں اسی طرح ایشیا میں بھی کوئی خاص زبان ایسی ہونی چاہیے جس کی اصطلاحیں مشرق کی تمام علمی کتابوں میں داخل کی جائیں۔مشرقی زبانوں میں صرف دو زبانیں ایسی معلوم ہوتی ہیں جن سے یہ غرض پوری ہوسکتی ہے، ایک سنسکرت اور دوسری عربی، لیکن سنسکرت کا جاری ہونا عرب، شام، ایران، ترکستان اور افغانستان وغیرہ میں قریب محال کے ہے اور نیز علوم جدیدہ کی نئی اصطلاحیں بالفعل سنسکرت میں موجود نہیں ہیں۔ البتہ عربی زبان ایسی ہے جس کے اصطلاحیں ایشیا کے اکثر حصوں میں جاری ہوسکتی ہیں، اور نیز علوم جدیدہ کی بے شمار اصطلاحیں عربی میں وضع ہوچکی ہیں۔ اسی واسطے مصنف نے اس رسالہ میں عربی اصطلاحیں جو کہ مصر کے عربی ترجموں میں برتی گئی ہیں استعمال کی ہیں۔اگر چہ وہ سر دست کسی قدر اجنبی معلوم ہوں گی لیکن یقین ہے کہ بہت جلد وہ اُردو زبان میں گھل مل کر ہمارے ہم وطنوں کے کانوں سے مانوس ہوجائیں گی۔

رسالہ منتہی العروض

(منقول از ''منتہی العروض''، صفحہ:۳۔۴)

(فن شعر کے متعلق یہ کتاب دو چھوٹے چھوٹے رسالوں ''منتہی العروض'' اور ''مثنوی تحفۃ الشعرا'' پر مشتمل ہے۔ سید محمود صاحب خلف میر محمد صاحب مرحوم امام جامع مسجد دہلی اس کے مصنف ہیں۔ کتاب ۸۶ صفحہ پر ۱۸۸۳ء میں شائع ہوئی تھی۔)

میں نے یہ مفید رسالہ بقدر ضرورت اور مثنوی تمام وکمال دیکھی اور پڑھی۔ فارسی میں اس فن کی متعدد کتابیں متداول ہیں جن میں سے بعض کو تمام اہل صناعت نے تسلیم کیا ہے۔ مگر بظاہر کوئی اُردو کا جامع رسالہ خصوصاً پنجاب میں آج تک ایسا شائع نہیں ہو جو عروض کی تمام ضروریات کو حاوی ہو یا ایسے ضبط وانتظام کے ساتھ لکھا گیا ہو۔ جس سے اس فن کے وحشی اور اجنبی مسائل متحضر کرنے میں طالب علم کو مدد ملے۔

جہاں تک رسالہ ''منتہی العروض'' کو میں نے دیکھا ہے میرے نزدیک وہ اکثر اعتبارات سے ان دونوں تعریفوں کا مستحق ہے ظاہرا اس رسالہ میں عروض کی کوئی ضروری بات فروگزاشت نہیں ہوئی اور زحافات کا بیان جو اکثر فارسی رسالوں میں بھی پورا پورا بیان نہیں ہوا۔ اس رسالہ میں بوجہ استیفا لکھا گیا ہے۔ پھر زحافات کا باب جو اکثر کتابوں میں نہایت منتشر طور پر لکھا گیا ہے، اس رسالہ میں ایسا نہیں ہے بلکہ ایسے ضبط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ طالب علم کو اس کے یاد کرنے میں میرے نزدیک ضرور مدد دے گا۔

مثنوی کی نسبت صرف یہ کہنا کافی ہے کہ نظم میں عروض یا کسی اور فن کا بیان کرتا جس

قدر دشوار ہے وہ سب پر ظاہر ہے۔ باوجود اس کے مصنف نے بہت صفائی اور بے تکلفی
سے عروضی مباحث اس میں بیان کیے ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ اس صاف و شفاف نظم
کے ذریعہ سے طلبہ کو عروض کی ضروری باتیں بآسانی یاد ہو سکیں گی۔

فرہنگِ آصفیہ

(از علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ، بابت ۱۸۸۷ء، صفحہ: ۵۹۴)

یہ کتاب مولوی سید احمد صاحب دہلوی نے اہل وطن کے فائدہ کے لیے تیار کی ہے جس کی نسبت قوی امید ہے کہ چند مہینے میں ختم ہو کر اطراف ہندوستان میں شائع ہو جائے گی۔ اُردو زبان کی ایسی ڈکشنریاں تو کئی لکھی جا چکی تھیں جن میں لغات کی تفسیر انگریزی زبان میں کی گئی ہے۔ مگر یہ ڈکشنریاں جیسا کہ ظاہر ہے عام ہندوستانیوں کے لیے کچھ مفید نہ تھیں اُن سے صرف وہی معدود ہندوستانی فائدہ اُٹھا سکتے تھے جو انگریزی زبان سے واقف ہیں۔ اس کے علاوہ یہ تمام ڈکشنریاں جیسی کہ اُردوئے معلّٰی کے تمام الفاظ پر حاوی نہ تھیں۔ اسی طرح اُردو زبان کے فصیح اور غیر فصیح دونوں طرح کے الفاظ بلا امتیاز اُن میں جمع کر دئے گئے تھے۔ ہمارے ہم وطنوں کو خوش ہونا چاہیے اور مصنف کا تہ دل سے ممنون ہونا چاہیے کہ اُس نے اپنے آرام وراحت سے دست بردار ہو کر اور سالہا سال محنت و مشقت اٹھا کر اُن کے فائدے کے لیے ایک ایسی زبان کا ذخیرہ مہیا کیا ہے جو باوجود اس کے کہ ہندوستان کی عام زبان سمجھی جاتی ہے اور ملک کی عام تصنیف و تالیف، نثر و نظم اور دفاتر و اخبارات وغیرہ کی تحریرات کا مدار بالکل اسی پر ہے۔ بااینہمہ آج تک تمام ہندوستان میں اس کا شیوع جیسا چاہیے نہیں ہوا۔ اطرافِ ہندوستان کے وہ لوگ بھی جو فی الواقع ضروری تقریر و تحریر پر قدرت رکھتے ہیں، اگر میری رائے غلط نہیں تو اس ڈکشنری میں آدھے سے زیادہ ایسے الفاظ پائیں گے جن سے وہ پہلے واقف نہ تھے۔

شیخ ابوالفیض فیضی نے جب تفسیر ''سواطع الالہام'' لکھنے کا ارادہ کیا تھا تو لغتِ

عرب پر عبور حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ عربی لغات کی کتابیں خریدا کرتا تھا۔ ایک بار اُس نے کئی ہزار روپے کی کتابیں اسی غرض سے خریدیں اور جب ان کو اول سے آخر تک دیکھ چکا تو ایک روز مجلس میں کسی نے شیخ سے ان کتابوں کا حال پوچھا۔ اُس نے کہا الحمدللہ جو حقیر رقم میں نے ان کتابوں کے خریدنے میں صرف کی تھی اُس سے مجھ کو بہت فائدہ ہوا۔ میں نے دو لغت ان کتابوں میں ایسے پائے جو پہلے میری نظر سے نہ گزرے تھے۔ چوں کہ اس ڈکشنری میں قطعاً اور یقیناً اُردو کے ہزاروں ٹکسالی اور مستند الفاظ ایسے موجود ہیں جو اکثر ہندوستانیوں کے حق میں بالکل نئے اور اجنبی ہوں گے اس لیے جو قدر فیضی نے ان کتابوں کی کی تھی، اُس سے بہت زیادہ ہم کو اس ڈکشنری کی قدر کرنی چاہیے۔

ہندوستان میں جب سے کہ اُردو تحریر کا زیادہ رواج ہوا ہے، وقتاً فوقتاً اُردو ڈکشنری کی ترتیب کے لیے جا بجا تدبیریں ہوتی رہی ہیں۔ ایک زمانہ میں ''سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ'' نے بھی ایک نمونہ اُردو ڈکشنری کا چھاپ کر شائع کیا جو فی واقع بہت سلیقہ کے ساتھ لکھا تھا۔ لیکن جس حد تک کہ مصنف نے اس کام کو پہنچایا ہے، آج تک کسی نے نہیں پہنچایا۔

اُردو ڈکشنری لکھنے کے لیے دو نہایت ضروری شرطیں تھیں۔ ایک یہ کہ اُس کا لکھنے والا کسی ایسے شہر کا باشندہ ہو جہاں کی زبان تمام ہندوستان میں مستند سمجھی جاتی ہو اور ایسے تمام ہندوستان میں صرف دو شہر مانے گئے ہیں، دلّی اور لکھنؤ۔ مگر میں دلّی کو لکھنؤ پر ترجیح دیتا ہوں۔ اگرچہ اُردو زبان کا وہ حصہ جس کو زیادہ تر خواص استعمال کرتے ہیں دہلی و لکھنؤ میں چنداں تفاوت نہیں رکھتا، لیکن عوام کی زبان جس سے اہل حرفہ و اہل بازار کے محاورات و اصطلاحات مراد ہیں، اور جو زبان کا بہت بڑا حصہ اور آج ڈکشنری کا جزو اعظم ہے، وہ دہلی میں بہ نسبت لکھنؤ کے زیادہ مستند سمجھے جانے کے لائق ہے۔ شاہانِ اودھ کے مورث اعلیٰ کے ساتھ جو خاندان دہلی سے بگڑ کر لکھنؤ گئے تھے، وہ اکثر دہلی کے امرا و شرفا کے خاندان تھے جن کے اعقاب و اخلاف آصف الدولہ بلکہ سعادت علی خاں کے زمانہ تک تمام دربار پر حاوی رہے۔ اس لیے اعلیٰ طبقہ میں انھیں کی زبان جاری ہوئی۔ لیکن دہلی کے ادنیٰ طبقوں میں سے اگر کچھ لوگ وہاں گئے بھی ہوں تو اُن کی تعداد اس قدر ہرگز نہیں ہو سکتی کہ اُن کی

زبان لکھنؤ کے تمام عوام الناس کی زبان پر غالب آجائے۔ اس لیے ضرور ہے کہ لکھنؤ کے ادنیٰ طبقوں کی زبان اُس زبان سے مغایر ہو جو دہلی کے انھیں طبقوں میں متداول تھی۔ پس ہمارے نزدیک صرف دلّی ہی کی زبان ایسی ہے جس پر اُردو ڈکشنری کی بنیاد رکھی جائے۔

دوسری شرط یہ تھی کہ ڈکشنری لکھنے والا شریف مسلمان ہو۔ کیوں کہ خود دہلی میں بھی فصیح اُردو صرف مسلمانوں ہی کی زبان سمجھی جاتی ہے۔ ہندوؤں کی سوشیل حالت اُردوئے معلیٰ کو اُن کی مادری زبان نہیں ہونے دیتی۔ کمال خوشی کی بات ہے کہ ہماری ملکی زبان کی پہلی ڈکشنری جس پر تمام آئندہ ڈکشنریوں کی نیو رکھی جائے گی ایک ایسے شخص نے لکھی ہے جس میں دونوں ضروری شرطیں موجود ہیں۔

جانسن نے ۱۷۵۵ء میں جب انگریزی زبان کی پہلی ڈکشنری لکھنے کا ارادہ کیا تھا تو اُس نے ایک دولت مند امیر کو اپنی ڈکشنری کا پیٹرن بنانا چاہا تھا تاکہ اُس کی مدد سے اپنی کتاب چھپوا سکے، مگر اُس نے پیٹرن بننا منظور نہیں کیا۔ آخر محض اپنے دست و بازو پر بھروسا کر کے عام قبولیت کی امید پر اُس نے اپنا کام شروع کیا اور نہایت استقلال کے ساتھ اُس کو انتہا تک پہنچایا اور تمام قوم سے اپنی محنت کی داد لی۔ گو اس کے بعد ویبسٹر اور اوگلویز جیسی نہایت عمدہ عمدہ ڈکشنریاں لکھی گئیں جن سے جانسن کی ڈکشنری کو اب کچھ نسبت نہیں رہی، لیکن جب تک انگلستان اور انگلستان کی زبان زمین کے پردہ پر موجود ہے ہمیشہ جانسن کا نام سب سے اول نہایت ادب اور تعظیم کے ساتھ لیا جائے گا۔ ہماری یہ آرزو ہے کہ اُردو ڈکشنری بھی ہندوستان میں وہی وقعت حاصل کرے جو اول جانسن کی ڈکشنری نے انگلستان میں حاصل کی تھی۔ کیوں کہ اُردو ڈکشنری کے جامع نے بھی ہمت، استقلال، محنت اور سلف ہیلپ کے لحاظ سے بالکل ویسا ہی کام کیا ہے جیسا جانسن نے کیا تھا۔

اگرچہ ممکن ہے کہ اُردو ڈکشنری میں کچھ باتیں گرفت کے قابل نکلیں لیکن ایسی باتوں سے اوچھے نکتہ چینوں کی طرح تمام کتاب کو مورد طعن ٹھہرانا یا مصنف کا احسان نہ ماننا سخت بے انصافی ہوگی۔ آدمی بالطبع اپنی بزرگی اور تفوق ثابت کرنے کا شائق ہوتا ہے، اس لیے وہ کسی نہ کسی طرح اپنے دل کو تسکین دے لیتا ہے۔ جو لوگ کچھ کام نہیں کرتے نہیں

کر سکتے وہ اکثر اوروں کے کام میں عیب نکال کر نہ صرف لوگوں کی نظر میں اپنی فوقیت ظاہر کرتے ہیں بلکہ خود بھی اپنے تئیں اُن سے بہتر سمجھ لیتے ہیں۔ مگر جو لوگ منصف مزاج ہیں اور تحقیق الفاظ کی مشکلات کا اندازہ کر سکتے ہیں وہ امید ہے کہ ہرگز ایسا خیال نہ کریں گے۔ اکثر اوقات صرف ایک لفظ کی تحقیق میں لوگوں سے کئی کئی غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں، پس ممکن نہیں کہ جو شخص ایک مستقل اور وسیع زبان کے تمام الفاظ کی تحقیقات کرے وہ لغزش اور خطا سے محفوظ رہ سکے۔ ہر کام جب اول ہی اول کیا جاتا ہے تو اس میں بالضرور بہت سی باتیں فروگزاشت ہو جاتی ہیں۔ پھر وقتاً فوقتاً زمانہ اُن کی اصلاح کرتا ہے۔ مگر پیشوائی کا منصب صرف اُسی کام کے لیے ہے جو سب سے اول کیا گیا ہے۔

جوہری نے صحاح بیس برس میں مرتب کی تھی اور اُس کے بعد مجدالدین فیروز آبادی نے قاموس صرف تین برس میں لکھ لی۔ ایک منصف عالم کے سامنے صاحبِ قاموس کی نہایت تعریف کی گئی کہ اُس نے قاموس جیسی کتاب تین برس میں مرتب کر لی۔ اُس عالم نے کہا، تین برس میں نہیں ۲۳ برس میں لکھی ہے۔ ۲۰ برس جوہری کے بھی اس پر اضافہ کرنے چاہئیں۔ ہم کو امید ہے کہ ہمارے ہم وطن اس ڈکشنری کے بعد اس سے زیادہ جامع اور عمدہ ڈکشنریاں لکھنے کی کوشش کریں گے اور شاید وہ اپنی کوششوں میں کامیاب بھی ہوں، مگر اہل انصاف کے نزدیک تمام آئندہ ڈکشنریاں جو اُردو زبان کی تکمیل کے لیے لکھی جائیں گی وہ سب اس ڈکشنری کی طفیل ہوں گی۔

اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اُردو زبان کی متعدد ڈکشنریاں جو یورپین مصنفوں نے انگریزی زبان میں ترتیب دی ہیں (جیسے شیکسپیئر، فوربس اور فالن وغیرہ، جن میں سے فالن ڈکشنری تو خاص اسی مؤلف کی مصالح اور سات برس کی معاونت سے تیار ہوئی) ان سے اُردو ڈکشنری کے جامع کو ضرور کسی نہ کسی قدر مدد ملی ہوگی۔ مگر اس سے اُس کی وہ فضیلت جو کسی کام میں تقدم کرنے والے کو حاصل ہوتی ہے، زائل نہیں ہو سکتی۔ اول تو جو دقتیں ایک اورینٹل اسکولر کو انگریزی کتابوں سے مدد لینے میں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ وہ اُن مشکلات سے شاید کچھ ہی کم ہوں گی جو کسی زبان کی پہلی ڈکشنری کے جامع کو پیش آتی ہیں۔

دوسرے تمام مذکورہ بالا انگریزی ڈکشنریوں کو اس ڈکشنری کے ساتھ مقابلہ کرنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ مصنف نے اپنی کتاب کی بنیاد صرف انگریزی ڈکشنریوں ہی پر نہیں رکھی بلکہ بہت کچھ زیادت ونقصان وتغیر وتبدل اور دخل وتصرف جیسا کہ اہل زبان کو شایاں ہے اپنے علم و رائے کے موافق کیا ہے اور اسی لیے اُس کی ڈکشنری میں بمقابلہ انگریزی ڈکشنریوں کے وہ تفاوت پایا جاتا ہے جو اہل زبان اور زبان والوں کی تحقیقات میں ہونا ضروری اور ناگزیر ہے۔

ہم کو امید ہے کہ ہمارے ہم وطن اس اُردو ڈکشنری کی ایسی ہی قدر کریں گے جیسی کہ حق شناسوں کو اپنے محسن کے احسان کی قدر کرنی چاہیے۔

گلستانِ ناگری

(یہ کتاب ۱۹۲۸ بکرمی مطابق ۱۳۰۵ھ موافق ۱۸۸۸ء میں مطبع رائے بھوانی پرشاد دہلی میں چھپی تھی۔ پنڈت مہر چند داس صاحب اس کے مترجم ہیں۔ کتاب کے دو عالم تھے، ایک میں اصل فارسی اور دوسرے میں اُس کا ہندی ترجمہ۔ اب یہ کتاب نایاب ہے اور کہیں نہیں ملتی۔ یہ ریویواس ہندی ترجمہ کے ساتھ ہی شائع ہوا تھا۔)

''گلستانِ سعدی'' کے بے شمار ترجمے جو دُنیا کی مختلف زبانوں میں اب تک ہوئے ہیں اُن میں سے اخیر ترجمہ ہمارے لائق اور ذی وقعت دوست پنڈت مہر چند داس صاحب جینی رئیس قصبہ سونی پت ضلع دہلی کا ہے، جو کہ انھوں نے نہایت کوشش اور تندہی سے فصیح اور سلیس ہندی بھاشا میں محض اہل وطن کے فائدے کے لیے قلم بند کیا ہے اور جس کو مترجم ممدوح کی اجازت سے رائے بھوانی پرشاد صاحب نے اپنے مطبع میں چھپوا کر شائع کرنا چاہا ہے۔ نہایت تعجب کا مقام ہے کہ اس زمانے میں بھی جو کہ خیالات کی نہایت درجہ ترقی کا زمانہ ہے اور جس نے اکثر قدما کی تصنیفات کو تقویم پارینہ کی طرح اہل عالم کی نظر سے گرا دیا ہے، شیخ سعدی کی گلستاں اس زمانے میں بھی اسی قدر مقبول ہے جیسے کہ ساڑھے چھ سو برس تک تمام دُنیا میں مقبول رہی ہے۔ یہ کتاب اس وجہ سے کہ اس کا مصنف ایک مسلمان شخص ہے صرف مسلمانوں ہی میں مقبول نہیں ہے بلکہ ہر مذہب اور ہر ملّت کے لوگ اس کو عزیز رکھتے ہیں اور اس کی قدر کرتے ہیں اور اس کی داد دیتے ہیں۔ یورپ کی شاید ہی کوئی زبان ایسی ہوگی جس میں گلستاں کا ترجمہ نہ ہوا ہو۔ بعض زبانوں میں جیسے انگریزی،

فرانسیسی اور جرمن ہے آٹھ آٹھ دس دس ترجموں کی نوبت پہنچی ہے۔ ترکی زبان میں خاندان سلطنت کے ایک رکن رکین نے قدیم ترجموں کے علاوہ ایک اور ترجمہ گلستاں کا حال ہی میں مرتب کیا ہے۔ پنڈت مہر چند داس صاحب کی کوشش زیادہ تر اس سبب سے قدر کے لائق ہے کہ انھوں نے زبانِ حال کے مصنّفین اور مؤلفین کی طرح اس ترجمہ سے کوئی فائدہ ملحوظ اور مدنظر نہیں رکھا۔ جس طرح قدیم زمانے کے اہل علم اور ارباب تصنیف ابنائے جنس کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے مفید کتابوں کی ترتیب میں اپنی عمریں صرف کرتے تھے، اسی طرح پنڈت صاحب نے اس ترجمہ کے سرانجام کرنے میں محض اس لیے جدوجہد کی ہے کہ جولوگ فارسی خط اور اُردو زبان کی نسبت ناگری خط اور ہندی بھاشا سے زیادہ مانوس ہیں وہ شیخ کے پاکیزہ اور لطیف خیالات سے پورا پورا لطف اُٹھائیں۔ لائق مترجم نے اس ترجمہ میں یہ التزام کیا ہے کہ نثر کا ترجمہ نثر میں اور نظم کا نظم میں لکھا جائے۔ اور عربی فارسی الفاظ جہاں تک ممکن ہو استعمال میں نہ لائے جائیں اور جہاں تک ہو سکے ترجمہ میں اصل کتاب کے الفاظ کی پابندی کی جائے اور شیخ کا اسلوب بیان تا بہ مقدور اپنی حالت پر قائم رہے۔ نظم میں ہر بیت کا مضمون ایک ہی دوہرے میں ختم ہو جائے تا کہ ناظرین کو مصنف کا خیال سمجھنے کے لیے دوسرے دوہرہ کا منتظر رہنا نہ پڑے۔ یہ تمام التزام جس قدر ضروری ہیں اسے زیادہ دشوار ہیں۔ اور جب کہ مترجم کو بھی خیال ہو کہ زبان کی خوبی ہاتھ سے نہ جائے تو یہ دشواری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ہم کو امید ہے کہ پنڈت صاحب کی یہ کوشش ہم وطنوں کے حق میں نہایت مفید ثابت ہوگی اور یہ ترجمہ جس کی بنیاد محض نفع رسانی پر رکھی گئی ہے۔ ضرور مقبول خاص و عام ہوگا۔

سیرۃ النعمان

(از علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، بابت ۱۸۹۲ء، صفحہ:۵۶)

مولانا کی چند بیش بہا تصنیفیں اس سے پہلے چھپ کر شائع ہوچکی ہیں، جیسے ''مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم''، ''ماموں رشید کی سوانح عمری''، ''رسالہ جزیہ''۔ انھوں نے اپنی ہر ایک پہلی تصنیف میں جس بلندی پر آپ کو دکھایا ہے، اُس کے بعد کی تصنیف میں اُن کی لیاقت اور روشن دماغی اس سے بلند تر منظر پر جلوہ گر ہوئی ہے۔ اور جہاں تک میری نگہ پہنچتی ہے میں ''سیرۃ النعمان'' کو اُن سب سے اعلیٰ منظر پر پاتا ہوں۔ اگرچہ اس کتاب پر ریویو لکھنا ایک محدث، فقیہ، مورخ اور ممارس فن رجال کا کام ہے اور میں ان چاروں صفتوں سے معّرا ہوں، لیکن ممکن ہے کہ مثلاً ایک شخص جو ریل کی حقیقت سے واقف نہ ہو مگر اُس میں بیٹھ کر سفر کر چکا ہو، وہ لوگوں کے سامنے جو اب تک ریل میں سوار نہیں ہوئے محض آسائش یا تکلیف کی کیفیت جو اُس پر ریل کے سفر میں گزری ہو بیان کرے۔ ریویو لکھنے میں بشرطیکہ وہ دیانت اور سچائی سے لکھا جائے، اکثر اس اصول پر عمل کیا جاتا ہے کہ کتاب کا وہ حصہ جو ریویو نگار کی رائے کے موافق ہوتا ہے، اُس کی داد دی جاتی ہے اور جس قدر اُس کی رائے کے خلاف ہوتا ہے وہ مصنف کی لغزش یا خطا پر محمول کیا جاتا ہے۔ اور اس سے یہ لازم آتا ہے کہ مثلاً جو کتاب تسنن یا تشیع یا تقلید یا عدم تقلید کی تائید میں لکھی جائے، اُس پر مخالف مذہب کا آدمی کبھی عمدہ ریمارک نہ کر سکے۔ جو مضمون ایک اسکول کے فلسفہ پر لکھا جائے ہرگز دوسرے اسکول کا پیرو اُس کی داد نہ دے سکے۔ میرے نزدیک ریویو نگاری کا منصب صرف اس بات کا دیکھنا ہے کہ مصنف نے وہ فرائض جن کو زمانہ کا مذاق ہر نئی تصنیف

میں اس طرح ڈھونڈتا ہے جس طرح پیاسا پانی کو کس حد اور کس درجہ تک ادا کیے ہیں پس جب ہم کسی کتاب پر ریویو لکھ رہے ہیں ہم کو یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ مصنف کی رائے جزئیات مسائل میں فی نفسہ کیسی ہے، کیوں کہ اس کا فیصلہ کرنا پبلک کا کام ہے نہ ریویو لکھنے والے کا۔ بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ کتاب کا عنوانِ بیان کیسا ہے؟ ترتیب کیسی ہے؟ طریق استدلال مذاقِ وقت کے موافق ہے یا نہیں؟ اور کتاب لکھنے کی غایت جو مقتضائے وقت کے موافق ہونی چاہیے یا جو مصنف نے اپنی ذہن میں ملحوظ رکھی ہے وہ اُس سے حاصل ہوسکتی ہے نہیں؟ میں اس ریویو میں صرف انھیں باتوں سے بحث کروں گا اور ہرگز ریویو نگاری کی حد سے متجاوز نہ ہوں گا۔ ایک فاضل ادیب محقق (اور اگر وہ منظور کرے تو منشی اور شاعر بھی) جس کی متعدد تصنیفات مقبول خاص و عام ہوچکی ہیں، اُس کی طرزِ عبارت اور طرزِ بیان پر گفتگو کرنی صرف اُن اخبارنویسوں کا کام ہے جن کے پاس اپنے اخبار کے معمولی کالم پورے کرنے کے لیے کوئی مضمون سردست موجود نہ ہوا اور وہ ناچار اس مقولہ کے موافق کہ ''الغریق یتشبث بکل حشیش'' اسی بحث کو غنیمت سمجھیں۔ یہ اس باب میں اس کے سوا کسی بات کے کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ سادگی اور بے ساختہ پن جو عموماً ہر تحریر کی جان اور خاص کر تاریخ و بیوگرافی کا ایمان ہے، وہ اس مصنف کی ہر تصنیف میں ترقی پذیر ہیں۔ جو اسٹائل انھوں نے ابتدا سے اختیار کیا ہے اُس کا مقتضیٰ یہی ہے کہ رائٹر اور ریڈر دونوں کے لیے رستہ روز بروز زیادہ صاف اور زیادہ ہموار ہوتا جائے۔ ترتیب کا مرحلہ خاص کر کسی مشہور بزرگ کی لائف میں ایسا سخت اور دشوار گزار ہے کہ مصنف بشرطیکہ وہ حق تصنیف سے عہدہ برآ ہونا چاہتا ہو اس مرحلہ میں تھک کر چور ہو جاتا ہے۔ اگر اُس بزرگ کی لائف کچھ لوگ پہلے لکھ چکے ہیں اور اب ایک نیا مصنف انھیں کے قدم بقدم چلنا چاہتا ہے، اُس کو البتہ کچھ دشوار نہیں ہے۔ لیکن اگر اُس مشہور بزرگ کی لائف اب تک کسی نے نہیں لکھی یا لکھی ہے مگر یہ اخیر مصنف پہلی تصنیفات سے صرف واقعات اخذ کرتا ہے اور ترتیب میں کسی کی پیروی نہیں کرتا بلکہ اُس کو اپنے مذاق کے موافق بدلنا چاہتا ہے، اُس کو نہایت سخت عقبات سے عبور کرنا پڑتا ہے۔ وہ ابواب وفصول بالکل نئے ڈھنگ سے مقرر

کرتا ہے اور بے شمار پراگندہ اور منتشر باتوں کو پہلے اُن ابواب وفصول پر تقسیم کرتا ہے، پھر ہر ایک باب اور ہر ایک فصل میں ان کو ترتیب وار بیان کرتا ہے، ایک ہی بات کبھی اس کو اول لکھنی مناسب تر معلوم ہوتی ہے اور کبھی آخر اور بیچ میں۔ ''سترۃ النعمان'' کے مصنف کو شاید پہلے حصہ کی ترتیب میں جو امام صاحب کے حالاتِ زندگی پر مشتمل ہے، ایک آدھ کتاب سے جو تصنیف کے وقت اُن کے پاس موجود تھی کچھ مدد ملی ہو تو ملی ہو، لیکن دوسرا حصہ جس میں امام صاحب کے طرزِ اجتہاد اور اصولِ استنباط سے بحث ہے۔ اُس کی ترتیب میں یقیناً اُن کو اپنے مذاق اور سلیقہ سے کام لینا پڑا ہے۔ اور جہاں تک ہم دیکھتے ہیں دونوں حصوں میں حسنِ ترتیب کا حق پورا پورا ادا ہوا ہے۔ فلسفہ میں حسن کی تعریفیں مختلف طور پر کی گئی ہیں، لیکن سب سے زیادہ جامع و مانع تعریف یہ ہے کہ حسنِ تناسبِ اعضا کا نام ہے۔ پس جس طرح کسی حسین آدمی کی نسبت صرف یہ کہہ دینا کہ اُس کے اعضا متناسب ہیں، اس کے کمالِ حسن و جمال کا اقرار کر لینا ہے اسی طرح کسی کتاب کی نسبت صرف یہ کہنا کہ اس کی ترتیب ٹھیک ہے گویا یہ مان لینا ہے کہ اُس میں کوئی عیب نہیں ہے۔ اس کتاب میں جو استدلال نقل و روایت سے کیا گیا ہے گو وہ مخالف پر حجت نہ ہو سکے لیکن موافقین کی تسلی کے لیے کافی دوانی ہے۔ اور ایک ایسے سوال پر جس میں ہزار برس سے اختلافات چلے آتے ہیں ایسا استدلال جس کا مدار محض نقل و درایت پر ہو اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ رہا وہ استدلال جس میں قابلِ ادب مصنف نے اپنی رائے اور قیاس سے کام لیا ہے، اُس کی نسبت کم سے کم یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں ہے کہ ایسے طریقہ استدلال سے ہمارے لٹریچر میں فلسفۂ مذہب کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ مصنف نے نہایت عمدگی سے بتایا ہے کہ کیوں کہ امام صاحب اور اُن کے اتباع کو اہل الرائے کہا گیا؟ کس لیے انھوں نے مذہب میں قیاس کو کثرت سے دخل دیا؟ روایت حدیث کے لیے کیوں ایسی شرطیں لگائیں جن سے حدیث کا دائرہ تنگ ہو جائے؟ روایت کے اصول جو انھوں نے فن حدیث میں قائم کیے اُن سے اسلام کو کیا فائدہ پہنچا؟ فقہ کی حالت امام صاحب سے پہلے کیا تھی؟ اور انھوں نے اُس کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا؟ فقہ کی تدوین اور اُس کو ایک جامع قانون کی حد تک پہنچانے کا

خیال اُن کو کیوں کر پیدا ہوا۔ فقہ کی تدوین انھوں نے کس احتیاط کے ساتھ کی اور کیسے کیسے جلیل القدر لوگوں کو اس میں شریک کیا۔ فقۂ حنفی کو اس قدر حسنِ قبول کیوں حاصل ہوا؟ کس لیے وہ تمام ممالک اسلامیہ میں پھیل گئی اور باوجودیکہ امام صاحب میں مثل دیگر ائمۂ مجتہدین کے ذاتی خصوصیتیں نہ تھیں، کیوں اُن کی فقہ نے اس قدر رواج پایا؟ انھوں نے ثابت کیا ہے کہ امام صاحب ہی پہلے شخص ہیں جنھوں نے تشریعی اور غیر تشریعی حدیثوں میں فرق اور امتیاز قائم کیا، ورنہ اُن سے پہلے شارع کے تمام اقوال و افعال خواہ تبلیغ رسالت کے متعلق ہوں اور خواہ دنیوی مصالح سے سب تشریعی سمجھے جاتے تھے۔ انھوں نے بہت عمدگی سے یورپ کے بعض مورخوں کے اُس شبہ کو فقۂ حنفی رومن لا سے ماخوذ ہے دفع کیا ہے اور بتایا ہے کہ مسلمانوں نے غیر قانونی کتابوں سے بہت کم واقفیت حاصل کی ہے اور فقہ حنفی کی تدوین تک کوئی ترجمہ یونانی وغیرہ سے نہیں ہوا، چہ جائیکہ کسی قانونی کتاب کا ترجمہ جو آج تک ثابت نہیں ہے۔ انھوں نے کمال لیاقت سے وہ خصوصیتیں بیان کی ہیں جن کی وجہ سے فقہ حنفی کو تمام فقہوں پر ترجیح حاصل ہے۔ مثلاً یہ کہ امام صاحب بخلاف اشاعرہ کے حسن و قبح اشیاء کو عقلی مانتے ہیں نہ شرعی۔ یا یہ فقہ حنفی بہ نسبت تمام فقہوں کے زیادہ آسان ہے۔ اور شریعت کا اصل مقصد جس کی بابت تصریح کی ہے کہ ''جیسا فقہ حنفی سے حاصل ہوتا ہے اور کسی فقہ سے حاصل نہیں ہوتا۔ اس بات کو مصنف نے ایسی خوبی و بسط کے ساتھ لکھا ہے کہ اس کو دیکھ کر نہایت تعجب ہوتا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ جس قدر کتابیں امام صاحب کے حالات میں پہلے لکھی جا چکی ہیں، اس بات نے ''سیرۃ النعمان'' کو اُن سے بہت بلند درجہ پر پہنچا دیا ہے۔ اس باب میں ایک ایسا بڑا دعویٰ کیا گیا ہے جس کا کافی ثبوت دینا آسان کام نہیں ہے۔ بااینہمہ جہاں تک کہ ایک سرسری نظر سے رائے قائم ہو سکتی ہے۔ اُس کے لحاظ سے میں کہہ سکتا ہوں کہ مصنف نے جتنی خصوصیتیں فقۂ حنفی کی جتائی ہیں اُن کے ثبوت میں قابل اطمینان مثالیں پیش کی ہیں اور ان مثالوں کے بہم پہنچانے میں نہ صرف سعی و کوشش کا حق ادا کیا ہے بلکہ اپنی فضیلت اور لیاقت پر سے بہت سے پردے اُٹھا وئے ہیں۔ بااینہمہ جس طرح دریائے نیل کا اصل منبع ایک ہی سفر میں دریافت نہیں ہوا اسی طرح

ممکن ہے کہ اس باب کی تکمیل کے لیے مصنف کو اپنی پوری توجہ سے ایک آدھ بار پھر ہمت مصروف کرنی پڑے۔ خاتمہ میں مصنف نے منجملہ اُن چالیس بزرگوں کے جو امام صاحب کے ساتھ تدوینِ فقہ میں شریک تھے دس ممتاز شخصوں کا اور اُن کے علاوہ بعض اور ائمہ وقت کا جو حدیث و رجال میں امام کے شاگرد تھے تذکرہ لکھا ہے۔ یہ خاتمہ بھی نہایت دلچسپ اور ایک ایسے ضروری مضمون پر مشتمل ہے جس کے بغیر امام صاحب کی سوانح عمری ناتمام رہتی۔ اس کتاب کا خیال جس قدر کہ لفظ ''سیرۃ النعمان'' سے دل میں پیدا ہوتا ہے بہ نسبت اس کے میرے ریویو سے شاید کچھ ہی زیادہ پیدا ہوگا۔ پس جو لوگ اس کتاب کی اصل حقیقت اور مصنف کی لیاقت کا پورا پورا اندازہ کرنا چاہتے ہیں، ان کا فرض ہے کہ اُس کو خود اول سے آخر تک دیکھیں۔ اس کتاب سے صرف امام اعظم کی عظمت اور اُن کی فقہ کی جلالتِ شان ہی نہیں معلوم ہوتی بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی خالص آب و ہوا انسان کے دل و دماغ پر کیا اثر رکھتی تھی اور جب تک یہ چشمہ اپنے منبع سے قریب رہا، اُس سے علم و اخلاق کی کھیتیاں کیسی سرسبز و شاداب ہوتی تھیں۔ امام صاحب کے حالات، اُن کے اخلاق، اُن کا طریقۂ معاش، اُن کی طرزِ معاشرت اور اُن کی مساعیٔ جمیلہ جو اُن سے اسلام کی خدمت میں بن آئیں بلاشبہ ایسی ہیں کہ مسلمان بلکہ خود اسلام اُن پر جس قدر فخر کرے بجا ہے اور ایسی ہیں کہ اُن کو ہمیشہ نصب العین رکھنا ہر مسلمان کا فرض ہونا چاہیے، کیوں کہ وہ صرف دین ہی میں نہیں بلکہ دنیوی امور میں بھی بہت بڑی رہنما ہوں گی۔ ان فی ذالک لعبرۃ لاولی الالباب۔

انوارُالاخلاق

(منقول از ''انوارالاخلاق''، پانچواں ایڈیشن، ۱۸۹۷ء، صفحہ: ۱۹۔۲۰)
(مولوی نوراحمد صاحب نوؔر کی مصنفہ اُردو مضامین کی ایک کتاب ہے جو
عرصہ تک پنجاب کے مڈل اور ہائی اسکولوں میں بہت مقبول رہی۔)

جتنے مضامین اس کتاب میں درج ہیں، میں نے اول سے آخر تک کچھ خود دیکھے اور اکثر پڑھوا کر سُنے۔ مصنف کی طرزِ بیان سے جو ملک کی خیرخواہی اور طالب علموں کی ہمدردی کا جوش ظاہر ہوتا ہے وہ ہر وطن دوست کو ان مضمونوں کے اول سے آخر تک دیکھنے اور پڑھنے پر مجبور کرتا ہے۔

مصنف کی اصل غرض ان مضامین کے لکھنے اور ترتیب دینے سے جیسا کہ اُن کے عنوانِ بیان سے ظاہر ہے، یہ معلوم ہوتی ہے کہ مڈل اور انٹرنس کے طالب علم جن کو جواب مضمون میں امتحان دینا پڑتا ہے اُن کے لیے ایک ایسا ذخیرہ معلومات کا مہیا ہو جائے جو ان کی اس سبجیکٹ میں مدد دے، لیکن ضمناً ان مضامین سے وہ بکار آمد ہدایتیں اور نصیحتیں بھی حاصل ہوتی ہیں جن کی اس زمانہ میں نہایت ضرورت ہے۔

اس کتاب میں ۳۵ مضمون ہیں جن کے عنوان حسب تفصیل ذیل ہیں۔

وقت، کفایت شعاری اور فضول خرچی، ورزش، تعلیم نسوان، بچپن کی شادی، بچوں کو زیور پہنانا، شرافت انسانی، اخلاق (یعنی حسن معاشرت) خوشامد، اتفاق، ہمدردی صحبت یا ہم نشینی، ادب، محنت، ہمت اور استقلال، سفر، علم، مطالعہ، اخبار، چھاپہ لکھنا، پڑھنا، حساب، صنعت وحرفت، زراعت، تجارت، دیسی اور ولایتی کپڑا، ٹیکا اور چیچک، روشنی، ریل گاڑی،

تاریخ وجغرافیہ، ایک آدھ علمی مضمونوں کے سوا یہ تمام مضامین اُن نصائح واخلاق پر مشتمل ہیں جن کی فی زمانناہندوستانیوں کو عموماً اور طالب علموں کو خصوصاً نہایت ضرورت ہے۔ مصنف نے ہر ایک مضمون کے متعلق وہ باتیں لکھی ہیں جو اسکول کلاسوں کی استعداد اور سمجھ کے لائق اوراُن کی حالت کے مناسب ہیں اور مطالب کے ادا کرنے میں ایسا اسٹائل اختیار کیا ہے جس کی پیروی اور تتبع کرنے سے اسکول کلاسوں کے طالب علم مایوس نہ ہوں۔ مضمون نگاری میں جب کہ اس سے کسی خاص درجہ کے طلبہ کو انشا پردازی سکھانی مقصود ہو، سب سے اہم اور ضروری بات یہی ہے کہ طرزِ بیان ایسی اختیار کی جائے جس کو اس درجہ کے طالب علم بآسانی اختیار کر سکیں۔

رسالہ ''ادیب''

(منقول از رسالہ ''ادیب''، جلد:۱،نمبر:۱، بابت جنوری ۱۸۹۹ء)

(فیروز آباد ضلع آگرہ سے یہ ماہوار رسالہ جنوری ۱۸۹۹ء میں جاری ہوا تھا۔سید اکبر علی اس کے مہتمم اور ایڈیٹر تھے۔)

''ادیب'' کا پہلا نمبر پہنچا۔ایک ہی جلسہ میں اُس کو اول سے آخر تک پڑھ گیا اور بہت محظوظ ہوا۔ظاہرا یہ رسالہ ہونہار معلوم ہوتا ہے۔

انشائے نور احمد

(منقول از ''انشائے نور''، صفحہ:۱)

(''انشائے نور'' احمد مولوی نور احمد صاحب سابق ممبر ٹیکسٹ بک کمیٹی پنجاب نے مڈل اور پرائمر کے طلبہ کو خطوط نویسی سکھانے کے لیے مرتب کی تھی۔ مندرجہ ذیل ریویو انشائے مذکور پر ۲۸/نومبر ۱۸۹۹ء کو مولانا نے پانی پت سے لکھ کر مصنف کو بھیجا تھا۔)

اس انشا کو میں نے لیٹے لیٹے دیکھا۔ افسوس کہ میں اُس پر مفصل ریویو کرنے کے قابل نہیں ہوں، مگر اس قدر بلا تصنع لکھتا ہوں کہ اُردو میں آج تک میں نے کوئی انشا اس سے بہتر نہیں دیکھی۔ آپ کی کتاب ''انوار الاخلاق'' بلاشبہ عمدہ کتاب ہے لیکن اس انشا سے ہر شخص جو خط و کتابت سیکھنی چاہتا ہے پورا پورا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ علاوہ خط و کتابت کے عرضی نویسی، وثیقہ نگاری اور ہر قسم کی تحریریں جو کچہریوں اور دفتروں میں لکھی جاتی ہیں، سب کے لیے یہ کتاب ایک عمدہ رہبر ہے، امید ہے کہ اس کی قبولیت روز بروز بڑھتی جائے گی اور مبتدیوں کو اس سے بے انتہا فائدہ پہنچے گا۔

دیوانِ انور

(از رسالہ ''معارف'' بابت اپریل ۱۹۰۰ء)

غالبؔ ہے نہ شیفتہؔ نہ نیّرؔ باقی — وحشتؔ ہے نہ سالکؔ ہے نہ انورؔ باقی
حالیؔ اب اسی کو بزمِ یاراں سمجھو — یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

وہ زمانہ جب کہ دلّی نے اپنے آخری وقت میں تھوڑی دیر کے لیے سنبھالا لیا تھا، اگر چہ اس وقت پُرانے کمالات کی سوتیں آئندہ کے لیے بالکل بند ہوگئی تھیں مگر اگلے زمانے کے بچے کھچے اہل کمال سے شہر بھرا بھرا معلوم ہوتا تھا۔ باغ میں خزاں کے آثار نمودار ہو گئے تھے، لیکن مرغان خوش الحان خزاں کی آمد آمد سے بے خبر بدستور ہر طرف چہکتے نظر آتے تھے۔ دلّی کا یہ اخیر جھمکڑا جس کے تصور سے دل پر سانپ سا لوٹ جاتا ہے، ہم نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے اور اس کے پس ماندہ قافلہ کو ایک ایک کر کے اپنے سامنے دُنیا سے رخصت کیا ہے۔

اب محو بوئے گُل پہ ہوا کب دلِ حزیں
ہم کو چمن سے یاد ہے جانا بہار کا

اسی قافلے میں ایک جوان صاحب کمال سید شجاع الدین حسین انورؔ عرف امراؤ مرزا خلف الصدق صلاح الدولہ مرصع رقم خاں سید جلال الدین حیدر رضوی استاد بہادر شاہ بادشاہ تھے جو ۱۸۵۸ء میں جب کہ سپاہ باغی کے ہنگامہ نے دلّی کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی بعمر سیزدہ سالگی اپنے والد بزرگوار اور برادر بزرگ سید ظہیر الدین حسین ظہیرؔ کے ہمراہ پانی پت میں آکر کئی برس تک یہاں مقیم رہے یہ پہلا موقع تھا کہ اس یوسف خاناں آوارہ

اور خاک میں ملے ہوئے موتی نے راقم کو اپنا خریدار بنایا۔ بیگانگی ایک ہی نگاہ میں آشنائی کے ساتھ بدل گئی اور آشنائی نے جلد جلد محبت و یک جہتی کی سرحد میں قدم رکھنا شروع کیا۔ مگر زمانہ آناً فاناً رنگ بدل رہا تھا اور انقلاب پر انقلاب ہو رہا تھا، وہ صحبت بہت جلد برہم ہوگئی اور بھولے ہوئے خواب کی طرح اُس صحبت کا ایک دھندلا سا خیال باقی رہ گیا۔ لیکن کچھ بہت زمانہ نہ گزرا تھا کہ شاہ جہاں آباد ہمیشہ کے لیے فقیر کا رمنا بن گیا۔ اتفاق یہ ہے کہ محبت نے جس قید خانہ میں لے جا کر مقید کیا سید انورؔ بھی اُسی قید خانہ کے اسیر نکلے۔ مخدومی محمد کرم اللہ شیداؔ کا دیوان خانہ جو دوستی اور صداقت کا مرکز اور آزادوں کو ملجا و ماویٰ اور زندہ دلی کا جنم بھوم ہے۔ سالہا سال وہاں شعر و سخن کی صحبتیں گرم رہیں اور ان صحبتوں میں سید انورؔ، سید ظہیرؔ اور مرزا سالکؔ اکثر شریک ہوتے تھے اور تھوڑی دیر کے لیے دُنیا سے دست بردار ہو کر ہر شخص زبانِ حال سے اس شعر کا مضمون ادراک کرتا تھا۔

بزم مے اچھی ہے گو دُنیا ہے اے مے خوار ہیچ
یاں سمجھ لیتے تو ہیں دُنیا کو دم بھر یار ہیچ

لیکن آخر کار نہ معلوم شعر کی نحوست سے یا اس سبب سے کہ زمانہ تفرقہ کی بنیاد ہمیشہ کے لیے سوسائٹی میں ڈال چکا تھا، اکثر اصحاب دلّی چھوڑ کر اِدھر اُدھر منتشر و پراگندہ ہوگئے۔ اگرچہ ایک مدت کے بعد راقم لاہور سے اور سید انورؔ جے پور سے دلّی میں پھر آ گئے مگر چوں کہ دفترِ قضا سے فراقِ دائمی کا فرمان جاری ہو چکا تھا، ابھی گزشتہ مفارقت کا زخم بھرنے نہ پایا تھا کہ اُس مرحوم نے عالمِ آخرت کی راہ لی اور جو زخم بھرتا آتا تھا وہ ہمیشہ کے لیے ناسور بن گیا۔ سید انورؔ مرحوم میں کمالِ شاعری کے علاوہ متعدد کمالات جمع تھے۔ خطِ نسخ میں وہ بلا مبالغہ اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ اس فن میں جو کمال اُن کے جدِّ بزرگوار نے قاضی عصمت اللہ دہلوی سے حاصل کیا تھا، سید انورؔ پر گویا اُس کا خاتمہ ہوگیا تھا۔ باوجود اس کے نستعلیق میں بھی وہ شہر کے عام خوشنویوں میں کسی سے کم نہ تھے اور یہ جامعیت اُن کی خاندانی خصوصیات میں سے تھی۔ وہ صرف شاعر اور خوشنویس ہی نہ تھے بلکہ علوم متعارفہ میں بھی کافی دست گاہ رکھتے تھے۔ اُنھوں نے اس کلیہ کو کہ الکاتب جاھل غلط ثابت کر دیا

تھا۔ خصائل و عادات کے لحاظ سے میں ان کو مستثنیٰ لوگوں میں شمار کرتا تھا۔ سادگی و پرہیز گاری، آزادہ روی وخودداری، ہر حال میں خوش رہنا اور اُس اشراف گردی کے زمانہ میں پاسِ وضع کو ہاتھ نہ دینا، اُن کی خاص خصلتیں تھیں۔ انھوں نے اُس وقت جب کہ خدا کے سوا کوئی سہارا باقی نہ رہا تھا اپنے دست و بازو پر بھروسا کیا اور جس جان نے بےفکری اور فارغ البالی کے سوا کچھ نہ دیکھا تھا، اُس کو فوراً محنت ومشقت میں ڈال دیا اور جواں مردوں کی طرح اہل وعیال کے لیے دوڑ دھوپ اور تگ و دو میں بسر کی۔ بزرگوں کے کمالات جو اگلے زمانے میں نام ونمود اور عزت اور شرف کے ذریعے خیال کیے جاتے تھے، جب وقت پڑا تو اُن کو بے تکلف ذریعۂ معاش گردانا۔ اور جواہر گراں بہا کو جب کہ بازار میں کوئی جوہری نظر نہ آیا کنبے کے نان ونفقہ پر قربان کر دیا۔ اللہ اللہ اُس مرحوم جامعِ اوصافِ کمال کی تصویر آپ پندرہ برس بعد پھر آنکھوں کے سامنے آئی ہے۔

ہمارے عزیز دوست لالہ سری رام ایم.اے خلف الرشید آنریبل رائے بہادر لالہ مدن گوپال ایم.اے بیرسٹرایٹ لا رئیس دہلی نے سید انور مرحوم کا دیوان چھپوا کر از راہِ محبت ہمارے پاس بھیجا ہے، گویا مدت کے بچھڑے ہوئے دوست کو دوست سے ملایا ہے۔ ہم حیران ہیں کہ اپنے عزیز دوست لالہ سری رام کی اس مہربانی اور یاد آوری کا شکریہ ادا کریں یا اُن کی اس کوشش اور توجہ کی داد دیں جو انھوں نے اپنے وطن کے ایک صاحبِ کمال کی یادگار قائم کرنے اور اُن کے نام زندہ کرنے میں فرمائی، یا اُس احسان کا ذکر کریں جو عزیز موصوف نے اس دیوان کی اشاعت سے سید انور کے دوستوں اور عزیزوں پر کیا ہے، یا اُس کیفیت کو بیان کریں جو اس دیوان کو دیکھ کر ہمارے دل پر گزری ہے۔ اس دیوان نے وہ قدیم کوچہ ہم کو پھر یاد دلایا ہے جس کی تیس برس خاک چھاننے کے بعد زمانہ کی زبردستی سے اُس کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ چکے تھے۔ اس میں بہت سی غزلیں ان مشاعروں کی ہیں جن پر دلّی کی شاعری کا خاتمہ ہونے والا تھا۔ اور جن میں بارہا سید انور، سید ظہیر اور مرزا سالک کے ساتھ شریک ہو کر ہم نے اُن کی ہم طرحی کی عزت حاصل کی تھی۔ کبھی کبھی نواب مرزا خاں داغ بھی رام پور سے آ کر ان مشاعروں میں مشتاقوں کی سامعہ نوازی کرتے تھے

اور شہر کے اکثر شریف زادے اور امیر زادے جن میں سے بہت سے چل بسے اور خال خال باقی ہیں۔ ہر طرح کی زمینوں میں زور طبع دکھاتے تھے۔ مرزا غالبؔ مرحوم و مغفور کا اخیر زمانہ تھا۔ غالباً وہ خود کبھی ان جلسوں میں نہیں آئے مگر اُن کی دیکھی ہوئی اور اصلاح دی ہوئی غزلیں برابر آتی تھیں اور پڑھی جاتی تھیں۔ گو اب خیالات میں انقلاب عظیم پیدا ہو گیا ہے اور پچھلی حالت کے تصور سے شرم آنے لگی ہے مگر گزرا ہوا زمانہ خواہ بچپن کی نادانی کا زمانہ ہو یا جوانی کی بدمستی کا، اُس کی یاد میں عجیب لذت رکھی گئی ہے کہ کوئی چیز اُس کا نعم البدل نہیں ہوسکتی۔ پچھلا زمانہ جیسا کہ کہا گیا ہے بعینہٖ نمائشِ سراب کا حکم رکھتا ہے کہ جو پاس تھے تو ریت کے ٹیلوں کے سوا کچھ نہ تھا مگر دور سے وہی ٹیلے دریائے مواج کی طرح لہریں مارتے نظر آتے ہیں۔ وہی مشاعرے جواب بچوں کا کھیل معلوم ہوتے ہیں اگر اُن کا پھر ہاتھ آنا ممکن ہو تو کون ایسا بے دید اور طوطا چشم ہوگا جو نئی روشنی کو اُس قدیم تاریکی سے بدلنے پر فی الفور آمادہ نہ ہو جائے۔ سچ ہے ؎

لگے بڑھنے جب سے کہ ہوش و خرد
لگیں ساتھ بڑھنے پریشانیاں
بڑھاپے کی دانائی لے کر کوئی
بدل دے وہ بچپن کی نادانیاں

یہ دیوان جس کا نام معزز اشاعت کنندہ نے ''نظمِ دل فروز'' رکھا ہے اور ہم اُس کو اس لحاظ سے کہ وہ صاحبِ دیوان کی جدائی کا داغ تازہ کرنے والا ہے۔ ''نظمِ دل گداز'' کہتے ہیں۔ شاید نئے بگڑے ہوئے شاعر اُس کی جیسی کہ چاہیے قدر نہ کریں اور ایک نئے مسلمان کی طرح جس کا قصائی کی دوکان کے سوا کہیں جی نہیں لگتا، اس دیوان کے ساتھ شاید کچھ دلچسپی ظاہر نہ کریں مگر جو لوگ پُرانے مذاق کے متوالے ہیں اور اب تک اُنھیں پر ملک کی شاعری کا دادو مدار ہے اُن کے لیے یہ دیوان ایک نعمت غیر مترقبہ ہے جو ہمارے معزز دوست کی بدولت ملک میں عام طور پر شائع ہوا ہے اور مطبع رفاہ عام لاہور سے بہت ارزاں قیمت پر بحساب ۱۲/ فی جلد مل سکتا ہے۔

معلم الشطرنج

(از ''معلم الشطرنج''، مطبوعہ ۱۹۰۱ء)

اس کتاب کو بقدر ضرورت میں نے مختلف مقامات سے دیکھا۔ اگرچہ میرا یہ منصب نہیں ہے کہ ایک ایسی کتاب کی نسبت جس کا موضوع فن شطرنج بازی ہو اُس کے مضمون کی حیثیت سے کچھ چون و چرا کرسکوں، کیوں کہ یہ درحقیقت ایک ماہر ومشاق شاطر کا کام ہے جو اس فن میں یدطولیٰ رکھتا ہو۔ لیکن چوں کہ یہ کتاب اُردو زبان میں لکھی گئی ہے اس لیے ہر شخص جو اُردو زبان کو سمجھ سکتا ہو وہ کم سے کم اس بات کا حق رکھتا ہے کہ مصنف کی طرزِ تصنیف وطرزِ بیان یا کتاب کے مفید وغیر مفید ہونے کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرے۔

جہاں تک مجھ کو معلوم ہے آج تک کوئی کتاب ہماری زبان میں شطرنج پر ایسی جامعیت کے ساتھ نہیں لکھی گئی اور اس فن کے متعلق اس قدر معلومات کا ذخیرہ ہندوستانیوں کے واسطے کبھی جمع نہیں کیا گیا۔ ممکن ہے کہ بعض ہم وطن اس کتاب کے مفید ہونے میں تامل کریں، مسلمان تو اس وجہ سے کہ اُن کے مذہب میں لہو ولعب میں مشغول ہونا ممنوع ہے اور ہندو اس وجہ سے کہ جن لوگوں کو اس کھیل کا لپکا پڑ جاتا ہے وہ اکثر اپنے ضروری اور بڑے بڑے فرائض کو شطرنج بازی پر قربان کردیتے ہیں یہاں تک کہ بعض اوقات اُن کو کھانے پینے بلکہ اپنے آپے کی بھی خبر نہیں رہتی لیکن لعب کا اطلاق اُن کھیلوں پر ہوتا ہے جو کسی عمدہ مقصد کے لیے نہیں بلکہ صرف تضیع اوقات کے طور پر کھیلے جاتے ہیں پس شطرنج اگر خاص اوقات میں اس غرض سے کھیلی جائے کہ مآل اندیشی اور تدبر کی عادت پڑے اور دماغ میں سوچنے اور غور کرنے کا ملکہ پیدا ہو تو ہرگز لعب میں شمار نہیں

ہوسکتی۔اس کے سوا کوئی کام صرف اس وجہ سے مذموم نہیں ٹھہر سکتا کہ بعض اشخاص اُس کو بُری طرح کرتے ہیں۔

کتاب کا مطالعہ جو بالاتفاق ایک نہایت مفید اور عمدہ مشغلہ ہے وہ صرف اس وجہ قابل اعتراض نہیں ہوسکتا کہ بعضے لوگ اُسی کے ہو رہتے ہیں اور تمام دینی اور دنیوی کاموں کو مطالعہ کے شوق پر قربان کر دیتے ہیں۔اس کتاب کی نسبت صرف اس قدر لکھنا کافی ہے کہ جو کچھ اس کے متعلق لالہ جیون لال صاحب منیجر امپیریل بک ڈپو، چاندنی چوک بازار، دہلی نے اپنے اشتہار میں لکھا ہے اُس میں سرمو مبالغہ نہیں کیا گیا۔ بلکہ جس طرح اکثر عمدہ کتابوں کے اشتہارات میں بہ سبب اختصار کے اُن کتابوں کی اصلی خوبیاں پوری پوری بیان نہیں ہوسکتیں۔ اسی طرح صاحب منیجر امپیریل بک ڈپو کا اشتہار کتاب ''معلم الشطرنج'' کی بہت سی خوبیاں بیان کرنے سے قاصر رہا ہے۔لیکن اس کتاب میں ایک بات کی کسر معلوم ہوتی ہے یعنی جب کہ اس میں بہت سے یورپین شاطروں کے کمالِ شطرنج بازی کا ذکر جابجا کیا گیا ہے تو مقتضائے مقام یہ تھا کہ ہندوستان کے نہایت نامور اور باکمال شاطروں کا بھی کسی قدر تذکرہ کیا جاتا۔خصوصاً انیسویں صدی کے مشہور شاطر مثل کرامت علی خاں و میرزا رحیم الدین حیاؔ و امام علی خاں وغیرہ ہم ضرور اس بات کے مستحق تھے کہ جو کتاب ہندوستان کی زبان میں ایک ہندوستان ہی کے ایجاد کیے ہوئے کھیل پر لکھی جائے، اُس میں اُن کی خاص خاص بازیوں اور نقشوں کا ذکر کیا جائے۔لیکن حق یہ ہے کہ ہمارے لٹریچر میں کوئی ذریعہ ایسا موجود نہیں ہے جس سے ہندوستانی شاطروں کی کسی بازی یا کسی نقشے کا سُراغ لگانا ممکن ہو۔ جو شاطر مرگیا اُس کی بازیاں اور اُس کے نقشے بھی اُسی کے ساتھ مرگئے۔البتہ ہمارے عزیز دوست راجا بابو صاحب نے اُردو لٹریچر میں ایک ایسی مثال قائم کی ہے کہ اگر اُس کی پیروی کی گئی تو ہمارے آئندہ شاطروں کے عمدہ عمدہ نقشے آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ رہ سکیں گے۔

دلّی میں عبدالحکیم نامی ایک مشہور غائب باز تھا جس کو ہم نے خود حاضر و غائب دونوں طرح کھیلتے دیکھا ہے۔اُس کی نسبت یہ بات مشہور تھی کہ وہ حاضر بازی میں تو مات

بھی ہو جاتا ہے مگر غائب بازی میں کبھی مغلوب نہیں ہوتا۔لیکن افسوس ہے کہ آج اُس کی ایک بازی کا نقشہ بھی کسی کو یاد نہیں۔اسی لیے جیسا کہ راجا بابو صاحب نے اکثر کتاب میں تصریح کی ہے، اس ملک میں فن شطرنج بازی روز بروز تنزل کرتا جاتا ہے۔شاید بعض نکتہ چیں اس جدید تصنیف پر ریمارک کریں کہ اگر فن شطرنج بازی کو غیر مفید تسلیم کرلیا جائے تو بھی اس موضوع پر کتاب لکھنا اُس وقت زیبا تھا جب کہ ہمارا لٹریچر اور ہماری زبان تمام ضروری علوم وفنوں سے مالا مال ہو جاتی اور مصنّفین کے لیے کوئی میدان اس کے سوا باقی نہ رہتا کہ کھیلوں اور بازیوں کے قواعد منضبط کرکے ان کو کتابوں کے لباس میں جلوہ گر کریں۔ اسی قسم کا اعتراض اُس کتاب پر کیا گیا تھا جو حال ہی میں فرانس اور پروشیا کی جنگ کے بیان میں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کی گئی ہے۔اگرچہ یہ اعتراض ترجموں کی نسبت ایک حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے کہ کیوں کہ مترجم مختلف مضامین میں سے جس مضمون کو سب سے مقدم اور ضروری سمجھے ترجمہ کے لیے انتخاب کرسکتا ہے۔مگر ایک اوریجنل تصنیف کے لیے کسی مضمون کا اس طرح انتخاب کرنا ممکن نہیں، کیوں کہ ایسی تصنیف اُسی مضمون پر سرانجام ہوسکتی ہے۔جس میں مصنف نے کم وبیش کمال حاصل کیا ہو اور اُس کی ممارست میں ایک معتدبہ حصہ عمر کا صرف کیا ہو۔پس درحقیقت ایک اوریجنل مصنف کا یہ کام نہیں ہے کہ جو مضمون ملک کے لیے سب سے زیادہ ضروری اور مفید ہو اس پر خواہی نخواہی طبع آزمائی کرے بلکہ براہ راست اُس کا کام یہ ہے کہ جس فن میں اُس نے کمال حاصل کیا ہے اُس میں جو کچھ تجربہ اور معلومات اُس نے بہم پہنچائی ہوں اُن کو قدیم مصنفوں کی معلومات میں شامل کرکے اُس سے ملک کو مستفید کرے۔

ہم کو امید ہے کہ راجا بابو صاحب کی کتاب ''معلم الشطرنج'' اُن تصانیف کے لیے جو آئندہ اس فن پر خاص کر اُردو زبان میں لکھیں جائیں گی بمنزلہ اساس اور بنیاد کے ہوگی اور جتنی عمارتیں اُس بنیاد پر چنی جائیں گی اُن کے بانی ہونے کا فخر ہمارے لائق مصنف کو ہوگا۔

رسالہ ''معارف''

(منقول از رسالہ ''معارف'' جلد:۴، نمبر:۱۰، بابتہ اکتوبر ۱۹۰۱ء)

(رسالہ ''معارف'' یکم جولائی ۱۸۹۸ء کو مولوی وحید الدین سلیم کی زیر ادارت علی گڑھ سے نکلنا شروع ہوا۔ اس میں اعلیٰ درجہ کے تاریخی اور علمی مضامین شائع ہوتے تھے جو نہایت محنت اور جانکاہی سے مرتب کیے جاتے تھے۔ اپنے وقت میں یہ علمی مضامین کا ہندوستان بھر میں واحد میگزین تھا۔ ملک کے لائق ادیبوں نے اس کو بہترین رسالہ تسلیم کیا تھا۔ تین جلدیں علی گڑھ میں نکالنے کے بعد خرابیِ صحت کے باعث مولوی وحیدالدین اس کو اپنے وطن پانی پت میں لے آئے اور جنوری ۱۹۰۱ء میں سے چوتھی جلد کا آغاز کیا۔ مگر افسوس کہ مالی مجبوریوں کے باعث (جو ہر عمدہ رسالہ کے ایڈیٹر کو ضرور پیش آتی ہیں) دسمبر ۱۹۰۱ء میں یہ اعلیٰ درجہ کا علمی اور ادبی رسالہ بند ہو گیا۔)

''معارف'' بے شک موجودہ حالت میں عمدہ ترین رسالہ ہے جو ہندوستان میں اس وقت نکلتا ہے۔ میں ''معارف'' کی دل سے قدر کرتا ہوں اور ملک کے موجودہ میگزینوں میں اُس کو خاص امتیاز کی نظر سے دیکھتا ہوں۔

قوانینِ دولت

(منقول از ''قوانینِ دولت''صفحہ:۵۸)

(پولیٹکل اکانومی پر یہ ۵۸ صفحہ کی کتاب اکتوبر ۱۹۰۳ء میں استادِ محترم جناب مولوی خواجہ غلام الحسنین صاحب پانی پتی نے اُس وقت شائع کی تھی جب کہ وہ صوبہ گلبرگہ (دکن) کے انسپکٹر مدارس تھے۔ یہ کتاب ہاربس بل کی انگریزی تصنیف ''لاز آف ویلتھ'' کا ترجمہ ہے جس میں سیاست مدن کے ابتدائی اصول نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ بعض ضروری مضامین کی زیادتی عنوانات کی تقسیم نے کتاب کو اور بھی مفید بنا دیا۔ اب نایاب ہے۔ مندرجہ ذیل ریویو اس پر مولانا حاؔلی نے اُسی زمانے میں لکھا تھا۔)

میں نے رسالہ ''قوانینِ دولت'' کو اول سے آخر تک بہ نظرِ غور دیکھا۔ اگرچہ پولیٹکل اکانومی میں اب سے پہلے متعدد کتابیں انگریزی سے ترجمہ ہوئی ہیں مگر اب تک شاید کسی ایسی کتاب کا ترجمہ نہیں ہوا تھا جو مدارس کی درمیانی جماعتوں کی استعداد اور سمجھ کے لائق ہو اور نیز عام اُردوداں بھی اُس کے مضامین سے مستفید ہو سکیں۔

اُردو میں یہ رسالہ دو وجہ سے امتیاز رکھتا ہے۔ اول تو مترجم نے ترجمہ کے لیے ایسی کتاب انتخاب کی ہے جس میں مصنف نے اس فن کی ابتدائی مگر نہایت اہم اور ضروری باتوں کے بیان پر اکتفا کیا ہے اور ایسے دقیق مسائل سے کچھ تعرض نہیں کیا جو عام ذہنوں سے بالاتر ہوں۔ دوسرے خود مترجم نے جو انگریزی کے سوا عربی، فارسی اور اُردو میں بھی

عمدہ لیاقت رکھتے ہیں، اس بات میں نہایت کوشش کی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ترجمہ بامحاورہ اور فصیح اُردو میں ہو اور بیان میں کسی قسم کی گنجلک یا اُلجھاؤ باقی نہ رہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ اس رسالہ کی اشاعت سے مصنف اور مترجم دونوں کا مقصد بخوبی حاصل ہوگا اور یہ کتاب متوسط درجہ کی استعداد والوں کے لیے جو اس فن سے واقفیت پیدا کرنا چاہیں، بمنزلہ رہنما کے ثابت ہوگی۔

فلسفۂ تعلیم

(منقول از ''فلسفۂ تعلیم''، مطبوعہ ۱۹۰۴ء، صفحہ: ۳۰۰)

میں نے انگلستان کے نامور حکیم ہربرٹ سپنسر مرحوم کی بے مثل کتاب ''ایجوکیشن'' کا ترجمہ جو ''انجمن ترقی اُردو'' کی فرمائش سے مولوی خواجہ غلام الحسنین پانی پتی نے کیا ہے۔ مختلف مقامات سے خود بھی دیکھا اور مترجم موصوف نے بھی اُس کا بہت بڑا حصہ مجھے پڑھ کر سنایا۔ اور جس احتیاط اور صبر کے ساتھ اُنھوں نے اس ترجمہ کو پورا کیا ہے اُس سے بھی میں بخوبی واقف ہوں۔

اگرچہ اس ترجمہ کی نسبت، جو انگریزی سے اُردو زبان میں کیا گیا ہے ایک ایسا شخص جو انگریزی زبان سے بالکل نابلد ہو رائے دینے کا استحقاق نہیں رکھتا، لیکن وہ اس بات کا اندازہ کر سکتا ہے کہ مترجم نے اپنے ترجمے کے ذریعے سے مصنف کے عمیق و دقیق خیالات کو کہاں تک اُردو داں پبلک کے فہم کے لائق کر دیا ہے اور جس زبان میں اصل کتاب کے مضامین ادا کیے گئے ہیں وہ کہاں تک سائنس کے بیان کے لیے موزوں اور مناسب ہے۔ میرے نزدیک ان دونوں باتوں کے لحاظ سے مترجم کو توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی ہے۔ جس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اُنھوں نے ترجمے کی تکمیل اور زبان کی صفائی اور شستگی میں اپنے اصلی فرائض سے بہت زیادہ اور انجمن کی امیدوں سے بہ مراتب بڑھ کر عرق ریزی و جاں فشانی کی ہے۔

درحقیقت یہ ایک حسن اتفاق ہے کہ انجمن کو اس کتاب کے ترجمہ کے لیے ایک ایسا شخص مل گیا جو قطع نظر انگریزی، عربی اور فارسی کی جامعیت کے فطرۃً علمی مشاغل پر فریفتہ اور اپنے فرائض کو عاشقانہ دلچسپی اور شغف کے ساتھ انجام دینے والا ہے۔ فقط

رسالہ ''اتحاد''

(منقول از رسالہ ''اتحاد''، جلد:۱، نمبر:۳، بابت یکم مئی ۱۹۰۴ء، صفحہ:۱)

(مولوی عبدالحلیم شررؔ مرحوم نے ''اتحاد'' کے نام سے ایک پندرہ روزہ رسالہ لکھنؤ سے جاری کیا تھا جس کا واحد مقصد مسلمانوں اور ہندوؤں کو باہم شیر وشکر کرنا اور اُن میں اتحاد و اتفاق کی بنیاد ڈالنا تھا۔ رسالہ کا پہلا پرچہ یکم اکتوبر ۱۹۰۴ء کو شائع ہوا تھا نیچے کا ریویو اسی کے متعلق ہے۔)

جس مقصد کے لیے یہ رسالہ جاری کیا گیا ہے اس کو میں ایسا ضروری اور اہم جانتا ہوں کہ میرے نزدیک ہندوستان کے حق میں اس سے زیادہ مہتم بالشان کوئی مقصد نہیں ہوسکتا۔

رسالہ ’’آفتاب‘‘

(منقول از رسالہ ’’آفتاب‘‘، جلد:۲،نمبر:۱، بابت فروری ۱۹۰۷ء،صفحہ:۲)
(’’آفتاب‘‘ نامی ایک ماہوار رسالہ جھالراپاٹن (راجپوتانہ) سے سید محمد حسین صاحب رضوی کی زیرادارت فروری ۱۹۰۶ء سے جاری ہوا تھا۔ مندرجہ ذیل خط ریویو کے طور پر مولانا نے ایڈیٹر کولکھا تھا۔ مولانا اُس وقت حیدرآباد میں تھےاورآپ نے وہیں سے یہ ریویولکھ کر بھیجا تھا۔)

مکرمی!

رسالہ ’’آفتاب‘‘ کے دونمبر پہنچے۔ اُن کو دیکھ کر طبیعت بہت خوش ہوئی۔ اُس کو پڑھ کر بے انتہا مسرت حاصل ہوئی کیوں کہ ہمارے رئیسوں کا اس طرف متوجہ ہونا اور ایسی لیاقت سے علمی مضامین لکھنا ہندوستان کے بھلے دن آنے کی امید ہے۔ بابوامبالال صاحب کامضمون ’’تعلیم‘‘ پراورآپ کامضمون ’’تعصب‘‘ پربھی بہت عمدہ مضمون ہیں۔ خدا سے امید ہے کہ ’’آفتاب‘‘ ملک میں چمکے گا۔ دل سے دعا کرتا ہوں کہ آپ کامیاب ہوں اور ’’آفتاب‘‘ کی روشنی تمام راجپوتانہ میں پھیلے۔

سوانح عمری حضرت محمدؐ

(منقول از سوانح عمری مذکور۔ایڈیشن دوم،مطبوعہ ۱۹۰۸ء،صفحہ: ۱۳۵)

(یہ کتاب شردھے پرکاش دیو جی نے جو براہمو دھرم کے پرچارک ہیں اول مرتبہ اپریل ۱۹۰۷ء میں شائع کی تھی۔ ۱۳۶ صفحات کی چھوٹی تقطیع ہے۔تمام واقعات نہایت اختصار، بہت بے تعصبی اور بے حد دل نشیں اور دلچسپ پیرائے میں بیان کیے ہیں۔اعتراضات کے نہایت خوش اسلوبی، عمدگی اور متانت کے ساتھ معقول جوابات دئے ہیں۔ وہ لوگ جو جاو بے جا حضور صلعم پر اعتراض کرتے رہتے ہیں اس کتاب کو ضرور مطالعہ کریں۔)

اس کتاب کی نسبت جو کچھ میں نے اخباروں میں دیکھا اور لوگوں سے زبانی سنا تھا، اُس سے بہت زیادہ اس کو تعریف کے لائق پایا۔معزز مصنف نے یہ کتاب لکھ کر سچائی اور حق پسندی کی ایک ایسی مثال قائم کی ہے جس کی ہم سب ہندوستانیوں کو تقلید کرنی چاہیے۔ اب تک ہمارے تمام ہم وطن خواہ ہندو ہوں یا مسلمان اس خیال خام میں مبتلا رہے ہیں کہ غیر مذہب کی خوبیوں پر جہاں تک ممکن ہو پردہ ڈالیں اور چن چن کر اُس کی بُرائیاں ظاہر کریں۔ جہاں تک اندازہ کیا جاتا ہے تمام اہل مذاہب اس غلطی میں پڑے ہوئے ہیں کہ غیر مذہب کے کسی اعتراض کو تسلیم کر لینا یا اُس کی کسی خوبی کا اقرار کرنا اپنے مذہب سے نکل جانے کے برابر ہے۔ براہمو دھرم کا یہ اصول کہ وہ ہر ایک مذہب کے پیشواؤں کی تعظیم کرتا ہے۔ بالکل اصول اسلام کے مطابق ہے۔اور یہی وہ اصول ہے جس سے امید ہوتی ہے کہ

مذہبی جھگڑے شاید رفتہ رفتہ دُنیا سے مفقود ہو جائیں۔

اگرچہ مجھے یقین ہے کہ شردھے پرکاش دیو جی نے یہ کتاب مسلمانوں کے خوش کرنے کے لیے نہیں بلکہ محض صداقت کے ظاہر کرنے کے لیے لکھی ہے۔ لیکن چوں کہ مسلمانوں کا خوش ہونا اُس کا لازمی نتیجہ ہے، اس لیے وہ تمام مسلمانوں کی طرف سے دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔

تصانیف نواب عزیز جنگ بہادر

(از علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ، مورخہ ۴؍اگست ۱۹۰۹ء)

جن لوگوں نے زمانۂ حال میں اپنے گراں بہا تصنیفات سے اُردو زبان کو سرمایہ دار بنایا ہے اور اپنی لٹریری قابلیت سے جس قدر خود فائدہ اُٹھایا ہے اُس سے بہت زیادہ پبلک کو فائدہ پہنچایا ہے اُن میں نواب عزیز جنگ بہادر کا درجہ کسی سے کم نہیں ہے۔

وہ عرصہ دراز تک سرکاری عالی نظام (خلداللہ ملکہ) میں عمدہ خدمات پر سرفراز رہے ہیں اور اب یہ جلدوی حسن خدمت مختلف صیغوں سے معقول وظیفہ پاتے ہیں۔ زمانۂ ملازمت میں اُن کی تصنیف و تالیف کا میدان زیادہ تر فن قانون میں محدود رہا۔ چناں چہ اس عرصہ میں تیرہ کتابیں آپ نے بہ حسب ضرورت مختلف اوقات میں ترتیب دیں جن کے صلے میں پانچ ہزار روپیہ سرکار عالی سے مرحمت ہوا۔ یہ کتابیں صدر اور مفصلات کے تمام دفاتر میں عام قبولیت کا درجہ رکھتی ہیں اور تمام مالی اور حسابی دفتروں میں آج تک اُنھیں سے کام چلتا ہے۔

ان قانونی تالیفات کے بعد آپ نے ایک لاجواب کتاب موسوم بہ سیاق دکن ۱۳۱۳ھ فصلی میں شائع کی جس میں عالی قدر مصنف نے فن سیاق کی حقیقت مورخانہ طور سے بیان کی ہے اگر چہ اس کتاب کا نام سیاق دکن ہے لیکن درحقیقت خلافت کے زمانے سے آج تک تمام اسلامی سلطنتوں کے دفاتر میں جو طریقہ حساب کتاب کا جاری رہا ہے یہ کتاب اُس پر کلیتہً حاوی ہے۔ ہم اس کتاب کی تعریف میں شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کے ریویو کا صرف ایک فقرہ لکھنا کافی سمجھتے ہیں جو انھوں نے کتاب مذکور کی نسبت تحریر فرمایا

ہے وہ لکھتے ہیں کہ

''ہم نے تاریخ کے سیکڑوں ہزاروں ورق اُلٹے ہیں اور مدت تک جستجو کی ہے کہ قدیم زمانے کے ہر قسم کے طریقۂ کارروائی سے واقف ہوں اور گو ہم نے چند معمولی باتوں کو آب و رنگ دے کر ناظرین کو محظوظ کرلیا ہے لیکن انصاف یہ ہے کہ جو کچھ ڈھونڈ کر پاسکے وہ من میں چھٹانک بھی نہ تھا۔نواب عزیز جنگ بہادر مبارک باد کے مستحق ہیں کہ ''انھوں نے صرف حسابی سیاق کے متعلق ۱۶۶ صفحہ کی کتاب تیار کردی جو عجیب وغریب تحقیقات سے لبریز ہے۔''

اس کتاب کے دیکھنے سے سلاطین تیموریہ کے زمانے کا طریقہ سیاق اس طرح آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے کہ گویا ہر قسم کے دفاتر ہمارے سامنے موجود ہیں۔ یہ نادر الوجود کتاب سرکار نظام کے سررشتۂ تعلیم کے کورس میں داخل ہے اور ہندوستان کے اکثر حصوں میں اس کی قدر ہوئی ہے۔

مصنف ممدوح جہاں تک دیکھا جاتا ہے معمولی اور پامال مضامین پر ہاتھ نہیں ڈالتے بلکہ ہمیشہ اچھوتے مضامین پر جن کی ضرورت محسوس کرتے ہیں قلم اُٹھاتے ہیں۔

انھوں نے کاشت خرما، کاشت انگور، کاشت انجیر اور کاشت ترکاری پر بہت بسط کے ساتھ مفید کتابیں لکھی ہیں جن میں سے اول کی دونوں پر سرکار عالی سے معقول انعام عطا ہوا ہے اور گورنمنٹ آف انڈیا کے ایگری کلچر آفس نے اُن پر نہایت تعریف کے ساتھ ریویو لکھا ہے۔ایک اور کتاب فن فلاحت ہی کے متعلق موسوم بہ ''علاج النباتات'' زیر تصنیف ہے جس میں نباتات کی بیماریوں اور ان کے معالجات کا بیان ہے اور جو عنقریب چھپنے والی ہے۔

۱۳۲۶ھ ہجری میں مصنف ممدوح نے ایک اور مبسوط کتاب تقریباً پونے چھ سو صفحے کی فنِ تاریخ میں شائع کی تھی جو اپنے موضوع کے لحاظ سے بالکل اچھوتی ہے اور جس کا نام ''تاریخ النوایط'' ہے۔

تاریخ دکن میں مدت سے یہ سوال حل طلب چلا آتا تھا کہ مسلمانوں کی ایک جماعت کثیر جو مدت دراز سے سواحل بحر ہند یا جنوب مغربی ہند میں نایط یا نایطی کے نام سے نامزد ہے اور جس میں بڑے بڑے اہل اللہ، والیان ملک، وزراء، امراء، علماء، شعرا، اور تجار ہوتے رہے ہیں اس کی اصل کیا ہے۔ آیا یہ کوئی قوم حدیث الاسلام ہے یا کسی عہد میں سرزمینِ عرب سے ہندوستان میں وارد ہوئی ہے۔ اگرچہ قوم نایط کا اجمالی ذکر لغت اور تاریخ کی اکثر کتابوں میں کیا گیا ہے، مگر حق یہ ہے کہ اس عقدہ کے حل کرنے میں بہت سی ایسی مشکلات تھیں اور مصنّفین کے بیانات میں اس قدر اختلافات تھے کہ اجمالی ذکر سے اس مرحلے کا طے ہونا امکان سے خارج تھا۔

مصنف ممدوح نے کم و بیش چھ سو صفحے کی کتاب اس ایک تاریخی سوال کے حل پر لکھی ہے اور حق بات کا سراغ لگانے میں ایسی چھان بین کی ہے کہ اس سے زیادہ تصویر میں نہیں آسکتی۔ ہمارے نزدیک اگر جلیل القدر مصنف خود قوم نایط کے ایک مقتدر رکن نہ ہوتے تو ان تمام الجھنوں کا سلجھانا جو اس سوال کے حل کرنے میں پیش آنے والی تھیں ایک ایسا کام تھا جس سے شاید وہ عہدہ برآ نہ ہوسکتے جیسا کہ کہا گیا ہے **اهل البیت ادری بمافیه**۔

سب سے بڑی مشکل اس سوال کے حل کرنے میں یہ تھی کہ قوم نوایط کے مخصوصات رسم و رواج اور القاب وغیرہ میں بہت سی باتیں ایسی موجود تھیں اور ہیں جو ہندوؤں کے بعض اقوام سے ملتی جلتی ہیں اور جن سے قوی شبہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اقوام ہنود میں سے کوئی قوم ہے۔ مگر معزز مصنف نے متعدد تاریخی شہادتوں سے ثابت کیا ہے کہ قوم نوایط عرب کے اُن مہاجرین کی یادگار ہیں جنھوں نے زیادہ تر بنی امیہ کے عہد میں اور کسی قدر بنی عباس کے زمانے میں حکومت کی سختیوں سے تنگ آ کر عرب سے ہجرت اختیار کی اور آخر کار آٹھویں صدی[1] ہجری میں دریا کی راہ سے سواحل بحر ہند میں پہنچ کر بھٹکلہ، کوکن، گودہ وغیرہ میں سکونت اختیار کی اور محمد ہاشم خاں نظام الملکی کی کتاب ''منتخب اللباب'' سے کافی ثبوت اس بات کا دیا ہے کہ اس قوم کے لوگ جب اول ہی اول ہندوستان میں پہنچے تو ایک عرصہ

---

[1] غالباً اس میں غلطی ہے اس لیے عباسی خاندان کا خاتمہ ۶۵۶ھ میں ہوگیا تھا۔

درازتک ان کو ہندوؤں کی حکومت میں رہنا اوران تمام شرائط کومنظور کرنا پڑا جوفرمانروایان وقت کی طرف سے پیش ہوئیں اور جن کی منظوری بغیر وہاں آباد ہونے کی اجازت نہیں مل سکتی تھی۔ ان شرائط کے موافق ان کو مذہبی عقائد کے سوا تمام امور میں ہندوانی طرزِ معاشرت اختیار کرنی ضرورتھی۔ چناں چہ جب تک وہاں کی حکومت میں انقلاب پیدانہیں ہوا وہ تمام ہندوانی رسم ورواج کے پابندرہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک بھی اُس قدیم طرزِ معاشرت کے آثار بہت کچھ قوم نایط کے اکثر گھرانوں میں پائے جاتے ہیں۔

مصنف نے اس کتاب میں قوم نایط کے تمام مخصوصات یعنی مذہبی، لباس، زبان، طریقۂ تعلیم وتربیت، کفو کی پابندی، پردہ کا رواج اور دیگر رسوم اورقومی انقلاب جن سے ایک قبیلہ دوسرے قبیلے سے متمیز ہوتا ہے، ایسی تفصیل سے بیان کیے ہیں کہ تمام قوم کی طرزِ معاشرت کی تصویرآنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ مثلاً تعلیم نسواں کے بیان میں علاوہ سینے پرونے اور دیگر دست کاریوں کے اٹھائیں طرح کی مٹھائیاں اور پکوان بتائے ہیں، جوقوم نایط کی لڑکیوں بلکہ لڑکوں کو بھی سکھائے جاتے ہیں۔ یا مثلاً ساٹھ زیوروں کے نام اوراُن کی تعریف بیان کی ہے جواس قوم کی مستورات استعمال کرتی ہیں۔ خصوصاً قوم نایط کے مختلف قبائل کے تقریباً ستر (۷۰) القاب اوراُن کی وجہ تسمیہ نہایت کاوش اورتحقیق کے ساتھ بیان کی ہے۔ اس کے بعد ایک مستقل باب میں قوم موصوف کے مشاہیر کا حال جن میں سر سالار جنگ اول، حیدرعلی نایک اور ٹیپو سلطان جیسے ممتاز امرا اور بڑے بڑے علما اورشعرا اوراہل اللہ اورنامورتجار شامل ہیں، شرح اور بسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔

یہ کتاب مصنف کی اُس خاص صفت پر جوان کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے بدرجہ ادنیٰ دلالت کرتی ہے۔ یعنی ہر ایک کام کو پوری طاقت کے ساتھ انجام دینا اور تصنیف کے فرائض ادا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرنا۔ اس کتاب کوقطع نظر ممالک دکن کے جہاں قوم نایط کثرت سے پائی جاتی ہے اور اطراف ملک میں بھی قبولیت کا درجہ حاصل ہوا ہے۔ چناں چہ پنجاب یونی ورسٹی نے بھی اس کو بہت پسند کیا ہے اوراس کی معتد بہ جلدیں خریدی ہیں۔

فن تاریخ میں مصنف ممدوح نے ایک اور کتاب موسوم بہ محبوب السیر حضور آصف جاہ سادس (خلد اللہ ملکہ) کی بست سالہ حکومت پر لکھی ہے۔ یہ کتاب بھی ہندوستان میں بہ نظر استحسان دیکھی گئی ہے۔

حال میں انھوں نے ایک اور نفیس کتاب جس کا نام ''عطیات سلطانی'' ہے چھپوا کر شائع کی ہے۔ یہ کتاب بھی مصنف کی اکثر تصنیفات کی طرح بالکل ایک نرالی تصنیف ہے۔ کتاب کا نام سننے سے فوراً یہ خیال ذہن میں متبادر ہوتا ہے کہ شاید حضور شاہ دکن نے کسی خاص موقع پر کچھ عطیات لوگوں کو مرحمت فرمائے ہیں ان کی تفصیل اس کتاب میں درج کی گئی ہوگی۔ مگر جب کتاب کو کھول کر دیکھا جاتا ہے تو ایک عجب ذخیرہ معلومات کا نظر آتا ہے جس کی نسبت جناب مولوی ابوالمظفر محمد سعید الدین صاحب رام پوری نے اپنے ریویو میں بالکل درست اور بجا لکھا ہے کہ

> ''فن تاریخ میں یہ پہلی کتاب ہے جو ہماری نظر سے گزری ہے۔ ہم بے شک واقف تھے کہ بادشاہانِ سلف نے اہل ملک کو قیمتی معاشیں اُن کی گزر اوقات کے لیے عطا فرمائی ہیں اور اُن کے صدقۂ جاریہ سے صفحہ روزگار پر اُن کی اعلیٰ یادگار قائم ہے اور بعض صاحبان تاریخ نے کہیں کہیں اس کا اجمالی ذکر بھی کیا ہے۔ لیکن ہم یہ نہ جانتے تھے کہ اس کی کیفیت اس قدر مبسوط اور دلچسپ ہے کہ اُس سے فن تاریخ کا ایک مکمل ذخیرہ ہاتھ آ سکتا ہے۔''

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ مصنف ممدوح اُن معمولی مضامین پر بہت کم قلم اٹھاتے ہیں جن پر اُن کے پہلے لوگ طبع آزمائی کر چکے ہیں۔ یہ کتاب بھی اسی قبیل کی ایک تصنیف ہے۔ مما لک دکن میں معاش داروں کا ایک جم غفیر ہے جس کو شاہانِ سلف سے وقتاً فوقتاً کثیر المقدار اور کثیر التعداد انعامات و جاگیرات وغیرہ بطور مدد معاش کے عطا ہوتی رہی ہیں۔ اس کتاب میں مصنف نے انھیں انعامات و جاگیرات کو ایک خاص ترتیب اور نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ کتاب کی اصلی حقیقت اور مصنف کی عرق ریزی اور

تحقیقات کا حال تو بغیر اس کے کہ اس کو اول سے آخر تک بغور مطالعہ کیا جائے معلوم نہیں ہوسکتا۔ مگر اس میں ایک بات ایسی ہے جس کے بالا جمال بیان کردینے سے کتاب کی عظمت بخوبی منکشف ہوسکتی ہے۔ اس کتاب کے ورق ورق اور صفحہ صفحہ سے ریاست حیدرآباد کی عام فیاضی، بےتعصبی اور انسانی ہمدردی کا ایسا ثبوت ملتا ہے جو شاید دُنیا کی کسی حکومت یا سلطنت میں نہیں مل سکتا۔ ہندو مسلمانوں کے معابد اور اُن کی مذہبی رسوم میں جو امداد اس ریاست سے ہوتی ہے اُس کے متعلق معزز مصنف کا بیان ہے کہ

''ان اقسام عطیات سے جو خاص کر اس باب میں بیان ہوئی ہیں، ہم نے مسلمانوں کی معاش کی تعداد اور مقدار بہ نسبت معاش ہائے ہنود کے بہت کم پائی ہیں۔ ختم خوانی، اعتکاف اور چلہ کشی کی معاشیں (جو خاص مسلمانوں سے علاقہ رکھتے ہیں) صرف خال خال ہیں۔ برخلاف اس کے اگنی ہوتر، نند ادیپ اور اساڑھی کی معاشیں (جو ہنود سے متعلق ہیں) کثرت سے جاری ہیں۔''

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ

''ہمارا حتمی دعویٰ ہے کہ ہندوستان کی کل دیسی ریاستوں میں سے ایک ریاست بھی سلطنت آصفیہ کے ساتھ اس خاص صفت بےتعصبی میں ہم قدم نہ ہوسکے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے رحم دل رئیس پر جس طرح اُس کی مسلمان رعایا فدا ہے اُسی طرح اُس کی ہندو رعایا جاں نثار ہے۔ یہ صفت اس خاندان میں سلف سے چلی آتی ہے اور یہ پرداخت صرف لفظوں ہی میں نہیں ہے بلکہ اس کی مادی شہادت سررشتۂ عطیات کی سیر کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ ہمارا مالک جس طرح اسلامی تقاریب میں نذریں پیش کشیں قبول کرکے مسلمانوں کی عزت بخشتا ہے اسی طرح اپنی ہندو رعایا کی مذہبی تقاریب میں اُن کی نذریں اور تحفے قبول فرماتا ہے۔ اگر کسی نو وارد سجادہ نشین درگاہ کی مہمانی میں کوتاہی نہیں ہوتی تو ساتھ ہی کسی سیاح مہاتما

اور مہاجر کی خدمت اور امداد سے بھی کنارہ کشی نہیں کی جاتی۔ حیدر آباد کے چار صوبوں میں ایک کا گورنر مسلمان تو دوسرے کا گورنر ہندو ہے اور باقی دو کے گورنر بھی غیر مسلمان ہیں۔ معتمد مال کرسچین ہے تو معتمد عدالت مسلمان اور معتمد پولیٹکل پارسی تعلقہ دار ان اضلاع میں ہندو اور مسلمان دونوں دوش بدوش ہیں ہائی کورٹ کے نظما میں ہندو اور مسلمانوں کا جوڑا لگا ہوا ہے۔ نظمائے صوبہ کی بھی یہی کیفیت ہے۔ ججان و مددگان ان عدالت اور مجسٹریٹوں میں بھی یہی نسبت ہے۔ دو معین الہام مسلمان ہیں تو ایک کرسچین اور ان پر وزیر اعظم ہندو۔ یہی وجہ ہے کہ جو اتحاد و یک جہتی ریاست ممدوح کے ہندو مسلمانوں میں پائی جاتی ہے وہ کسی ہندوستانی ریاست میں دیکھی یا سنی نہیں گئی۔ اسلامی پیشواؤں کی نذر و نیاز کی تقریبیں اور عشرہ محرم الحرام میں عزا داری کے مراسم ہنود کے گھروں میں اسی طرح جاری ہیں جیسے مسلمانوں کے گھروں میں۔

علی ہذا القیاس جاتراؤں میں مسلمانان ریاست برابر ہندوؤں کا ساتھ دیتے ہیں جوبلی چہل سالہ کے موقع پر ہم نے خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے کہ خوشی اور شادمانی کے اظہار میں ہر ایک مذہب وملت کی جماعتیں ایک دوسرے پر سبقت کرنی چاہتی تھیں اور اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی تو میں کہہ سکتا ہوں کہ جس طرح ہر ایک قوم کے مردوں کی طرف سے پیش گاہ حضور نظام میں بے شمار سپاس نامے اور ایڈریس پیش ہوئے تھے اسی طرح عیسائی اور پارسی عورتوں نے بھی اس خوشی میں حصہ لیا تھا۔

اگرچہ یہ کتاب ایک مختص المقام مضمون (یعنی ریاست حیدر آباد کے اقسام عطیات) پر مشتمل ہے، لیکن درحقیقت وہ عام ہندوستانیوں کے لیے ہے جو مورخانہ مذاق رکھتے ہیں ویسی ہی دلچسپ اور پر لطیف ہے جیسی اہل دکن کے لیے۔

میں خیال کرتا ہوں کہ سر رشتہ تحقیقات عطیات جو حضور آصف جاہ سادس (خلد اللہ ملکہ) کے عہد میمنت میں قائم ہوا ہے، اگر معزز مصنف کو ایک معتد بہ مدت تک اُس سے

خاص تعلق نہ رکھا ہوتا اور اُن کی ہمہ گیر طبیعت میں اپنی ہر قسم کی معلومات سے فائدہ اُٹھانے اور عمدہ نتائج پیدا کرنے کا مادہ نہ ہوتا تو وہ اس مضمون پر ایسی دلچسپ اور پرلطیف کتاب لکھنے میں مشکل سے کامیاب ہو سکتے تھے۔

نواب عزیز جنگ بہادر کی تصنیفات کا سلسلہ مذکورہ بالا کتابوں ہی پر ختم نہیں ہوتا بلکہ اس میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہتا ہے انھوں نے ابھی ایک اور نادر کتاب موسوم بہ ''غرائب الجمل'' ۴۱۸ صفحہ پر چھاپ کر شائع کی ہے جو فن جمل میں (جس کی رو سے واقعات کی یاد داشت کے لیے تاریخی مادے استخراج کیے جاتے ہیں) جہاں تک کہ راقم کو معلوم ہے ایک بے مثل ولاجواب تالیف ہے۔

اس کے سوا کئی سال سے آپ نے ایک فارسی ڈکشنری بھی لکھنی شروع کر رکھی ہے۔ جس میں علاوہ فارسی الفاظ ومحاورات کے ہر فارسی لفظ یا محاوہ کی تحقیق کے بعد جو محاورہ اُس کی جگہ اُردو میں مستعمل ہوتا ہے اُسے بھی ساتھ کے ساتھ بیان کیا ہے اور دونوں زبانوں کا کوئی لفظ یا محاورہ (الا ماشاءاللہ) ایسا نہیں لکھا جس پر اہل زبان کے کلام سے ایک سند یا متعدد سندیں پیش نہ کی گئی ہوں۔ ظاہر ہے کہ معزز مصنف نے یہ ایک ایسا کام شروع کیا ہے جس کا پورا ہونا نہایت دشوار معلوم ہوتا ہے۔ حیدرآباد میں انھوں نے اس کتاب کا اندازہ فرما کر راقم سے کہا تھا کہ اگر وہ ختم ہوگئی تو ۲۸ جلدوں میں آئے گی اور ہر ایک جلد سات آٹھ سو صفحے سے کم نہ ہوگی۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ یہ کتاب میری زندگی میں ختم ہوتی نظر نہیں آتی لیکن خدائے تعالیٰ نے اُن کی ذات میں وہ تمام صفات جمع کر دئے ہیں جو بڑے بڑے مصنّفین میں سُنی اور دیکھی گئی ہیں۔ ہمت، جفاکشی، ضبط اوقات، حسن انتظام، فضول کاموں سے نفرت، سلیقہ، ستھرائی اور اسی قسم کے دیگر اوصاف جو اُن میں دیکھے گئے ہیں وہ بہت ہی کم لوگوں میں پائے جاتے ہیں۔

ہم کو خدا کی ذات سے امید ہے کہ وہ اُن کی عمر میں اُن کے اقات میں اور اُن کے مساعی جمیلہ میں برکت دے گا اور ان کو اپنے اس ارادے میں کامیاب فرمائے گا۔

و آخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العالمین۔

خطوط امیر احمد مینائی

(منقول از ''خطوط امیر احمد مینائی''، صفحہ:۱۔۳)

(منشی امیر احمد مینائی لکھنؤ کے رہنے والے مولوی کرم محمد صاحب مینائی کے فرزند ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۱۸ھ (۱۹۰۰ء) میں انتقال کیا۔ اعلیٰ درجہ کے شاعر اور ادیب تھے۔ یہ کتاب منشی صاحب کے اُن خطوط کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً انھوں نے اپنے شاگردوں، عزیزوں، رشتہ داروں اور دوستوں کو لکھے۔ یہ خطوط منشی صاحب کے شاگرد رشید مولوی محمد احسن اللہ خاں ثاقبؔ نے عرصہ دراز کی تلاش کے بعد جمع کر کے نومبر ۱۹۱۰ء میں شائع کیے۔)

کتاب مندرجہ عنوان کا مسودہ جو میرے لائق دوست خواجہ محمد احسن اللہ خاں ثاقبؔ مدیر رسالہ مرحوم ''قند پارسی'' نے مرتب کیا ہے، میری نظر سے گزرا۔ خواجہ صاحب موصوف جناب منشی امیر احمد صاحب مغفور سے نسبت تلمذ رکھتے ہیں۔ اُن کا شاگردانہ خلوص اس بات کا مقتضی تھا کہ اپنے واجب التعظیم استاد کا حق شاگردی کسی مناسب پیرائے میں ادا کریں۔ اول انھوں نے ان کی سوانح عمری لکھنے کا ارادہ کیا مگر بعض اسباب سے جن کا ذکر اُنھوں نے دیباچہ میں کیا ہے، میٹیریل بہت کم میسر آیا۔ پھر ان کے مکتوبات جمع کرنے کی طرف توجہ کی، لیکن باوجود اس کے کہ ایک عالم سے جناب ممدوح کی خط و کتابت تھی خطوط بھی بقدر توقع بہم نہ پہنچے۔ بایں ہمہ ایک معتد بہ مقدار مکاتیب کی جمع ہوگئی۔

اگر چہ ایک ایسے نامور بزرگ کے حالات لکھنے کے لیے یہ مختصر ذخیرہ کافی نہ تھا،

لیکن اس خیال سے کہ شاید آئندہ کوئی صاحب اس عمارت کے پورا کرنے کی طرف متوجہ ہوں اور یہ تالیف اس عمارت کے لیے ایک بنیاد کا کام دے سکے، خواجہ صاحب موصوف نے میٹیریل کی کمی سے ہمت نہیں ہاری اور اپنی خوش سلیقگی سے اس مختصر ذخیرہ کو ترتیب دے کر ایک دل کش پیرائے میں ظاہر کیا ہے۔

اُنھوں نے اس کتاب میں اول جناب ممدوح کی مختصر لائف قلم بند کی ہے، پھر اُن کے کلام پر نہایت آزادی کے ساتھ ریویو کیا ہے اور اُن کے دونوں دیوانوں کا مقابلہ فصیح الملک مرحوم کے دیوانوں سے کر کے دونوں استادوں کے کلام میں جو فرق دیکھا وہ بغیر کسی قسم کے حیف ومیل کے پبلک پر ظاہر کیا ہے۔ اور پست و بلند دونوں قسم کے اشعار کے نمونے دونوں صاحبوں کے کلام سے التقاط کر کے ناظرین کو دکھائے ہیں۔

اگرچہ بدقسمتی سے ہمارے ملک کے اہل قلم میں ابھی تک نکتہ چینی کا تحمل اور اُس کی برداشت پیدا نہیں ہوئی، لیکن اگر ان کو رفتہ رفتہ اس کا عادی نہ کیا جائے تو امید نہیں کہ ہماری تصنیف و تالیف کے عیوب و صواب کبھی پبلک پر ظاہر ہو سکیں۔

اس کے بعد انھوں نے اس مقصد کی طرف توجہ کی ہے جس پر کتاب کا نام مندرجہ عنوان دلالت کرتا ہے یعنی جناب منشی صاحب مرحوم کے خطوط جس قدر بہم پہنچے ان کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ مرتب کیا ہے۔

انسان کے اخلاق اور جذبات کا انکشاف جیسا اس کی بے تکلفانہ خط و کتابت سے ہو سکتا ایسا کسی اور چیز سے نہیں ہو سکتا، اسی واسطے مکتوب کو نصف ملاقات قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ جب اس کا وجود عنصری خاک میں پنہاں ہو گیا، اور اس سے ملنے کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہا، اب اس کی ملاقات محض اس کی خط و کتابت پر منحصر ہے اور بس۔ پس کسی مصنف کی وفات کے بعد اس کے مکتوبات کا فراہم کرنا درحقیقت اس کی سوانح عمری کا ایک مہتم بالشان حصہ قلم بند کر دینا ہے۔ مجھے امید ہے کہ مکتوبات امیر کی اشاعت خاص کر ان لوگوں کے لیے جو حضرت امیر احمد مینائی سے عقیدت رکھتے ہیں اور جن کی تعداد ہندوستان میں کچھ کم نہیں ہے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوگی۔

تسخیرشوہر

(منقول ازعلی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، جلد:۱۱، نمبر:۲، بابتہ ۲۴ رمئی ۱۹۱۱ء، صفحہ:۲۱)

(یہ ایک چھوٹی تقطیع کی ۴۴ صفحہ کی کتاب منشی سید احمد صاحب دہلوی مؤلف ''فرہنگ آصفیہ'' کی اہلیہ نے تالیف کی تھی۔ بلاشبہ مفید ہے۔ دراصل اس کتاب کا محرک رسالہ ''عصمت'' دہلی کا ایک انعامی اعلان تھا جو ستمبر ۱۹۱۰ء کے رسالہ میں مسز زاہدی کی طرف سے شائع ہوا تھا۔)

(اسماعیل)

یہ ٹھیک اُسی قبیل کی تالیف ہے جس کی اس زمانے میں کواری اور بیاہی شریف زادیوں اور شریف زادوں کی تربیت اور اصلاح کے لیے نہایت ضرورت ہے۔ کتاب کا اصل مقصد یہ ہے کہ بیبیوں کو خاوندوں کے ساتھ اور خاوندوں کو بیبیوں کے ساتھ ایسا برتاؤ برتنا چاہیے کہ طرفین میں روز بروز محبت، ہمدردی اور ایک دوسرے کی خیرخواہی کا خیال زیادہ ہوتا جائے۔ کبھی اَن بَن نہ ہونے پائے۔ گھر کے انتظام میں خلل واقع نہ ہو، اولاد کی تعلیم وتربیت پر میاں بی بی میں کش مکش نہ ہو۔ کتاب کی زبان اور بیان کی خوبی پر یہی دلیل کافی ہے کہ اس کی عبارت کی اصلاح اُس شخص نے کی ہے جس نے اُردو کی ایک جامع ڈکشنری لکھ کر دلّی کی خاص زبان اور خاص محاورات کو سب سے پہلے تمام اہل ملک سے روشناس کیا ہے۔ جہاں تک میں خیال کرتا ہوں مبتدی لڑکیوں اور لڑکوں کے حق میں یہ مختصر رسالہ نہایت مفید ہوگا۔

حیات النذیر

مؤلفہ سید افتخار عالم مارہروی مرحوم

(منقول از ''حیات النذیر''، صفحہ: ۹ تا ۱۲)

میں مصنف ''حیات النذیر'' کی اس خاص عنایت کا شکریہ تہ دل سے ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے مجھ کو مولانا کی سوانح عمری کے مطالعہ کا حصہ سے زیادہ مشتاق دیکھ کر اپنی کتاب پہلے اس سے کہ چھپ کر بہمہ جہت تیار ہو جائے، خاکسار کو عنایت کی ہے۔ ظاہرا مصنف نے ''حیات النذیر'' کی ترتیب مولانا کی زندگی ہی میں شروع کر دی تھی۔ ورنہ اُن کی وفات کے بعد جس کو بہت زمانہ نہیں گزرا ایسی مفصل و مشرح لائف کا سرانجام کرنا نہایت دشوار تھا۔ بہرحال مصنف نے اس کتاب کے لکھنے سے ایک ایسا فرض ادا کیا ہے کہ جب تک وہ ادا نہ کیا جاتا، میرے نزدیک قوم کا کوئی اہل قلم اس بار سے سبکدوش نہ ہوسکتا تھا۔ مولانا نذیر احمد نے اپنی عام تصنیفات سے جو احسان اُردو لٹریچر پر کیا ہے اور اپنے جادو اثر لیکچروں سے جو سکہ جمہور کے دلوں پر بٹھایا ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ خصوصاً قرآن مجید کی خدمت کے لحاظ سے جو امتیاز انھوں نے ہندوستان کے علمائے اسلام میں حاصل کیا ہے اُس کا صحیح صحیح اندازہ لوگ اُس وقت کرسکیں گے جب اُن کی وفات پر ایک معتد بہ زمانہ گزر جائے گا اور معاصرین کا دور ختم ہو کر حب و بغض کے جذبات فرد ہو جائیں گے۔

قرآن مجید کا ترجمہ جو انھوں نے کیا ہے اُس کی عام مقبولیت کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ اُس کی اشاعت کو سولہ برس سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ اس قلیل عرصہ میں اُس کے گیارہ ایڈیشن مختلف صورتوں میں چھپ کر شائع ہو چکے ہیں اور کل ایڈیشنوں

کی کچھ اوپر اڑتالیس ہزار جلدیں اب تک فروخت ہو چکی ہیں اور اُس کی مانگ یوماً زیادہ ہوتا جاتی ہے اس سے بھی زیادہ اُس کی قبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ کو اس وقت سوا سو برس کا عرصہ گزر چکا ہے اور جب مولوی نذیر احمد صاحب کے ترجمے کی اشاعت شروع ہوئی اُس وقت شاہ صاحب کے ترجمے کو ایک سو نو برس گزر چکے تھے۔ اس عرصہ میں اہل سنت میں سے بظاہر کسی عالم کو نیا ترجمہ کرنے کا خیال پیدا نہیں ہوا۔ مگر جب ترجمہ ''نذیریہ'' کی اشاعت روز بروز بڑھنے لگی اور ملک کے ہر طرف سے اُس کی مانگ آنی شروع ہوئی دفعتاً بہت سے اصحابِ قرآن مجید کی خدمت یعنی مولوی نذیر احمد کی تقلید پر کمر بستہ ہو گئے اور چند سال کی مدت میں متعدد وجدید ترجمے چھپ کر تیار ہو گئے۔ مگر یہ معلوم نہ ہوا کہ ان جدید ترجموں نے مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچایا؟ شاہ صاحب کے ترجمے سے بہ سبب اس کے کہ اُن کے زمانے میں اُردو زبان اور اُس کی بول چال اور مترجمِ قرآن کی ابتدائی حالت تھی، قرآن مجید کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں نہ آتا تھا مگر ترجمہ ''نذیریہ'' کی بامحاورہ اُردو طرز ادائے مطلب کی مدد سے قرآن کا مطلب پڑھے لکھے اور ان پڑھ سب بخوبی سمجھنے لگے اور کلام الٰہی سے ہر شخص اپنی اپنی سمجھ کے موافق لذت اور فائدہ اُٹھانے لگا۔ لیکن ان ترجموں نے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کیا کہ کہیں کہیں ترجمہ ''نذیریہ'' کے الفاظ بدل دئے جن کے بدلنے کی کوئی وجہ اس کے سوا معلوم نہیں ہوتی کہ چند الفاظ کی تبدیلی سے ایک مستقبل مترجم قرآن کہلانے کا ممتاز درجہ حاصل کر سکیں یا اس بہانے سے رجسٹری شدہ ترجمہ ''نذیریہ'' کے چھاپنے کے مجاز ہو جائیں۔ مگر جہاں تک ہم کو معلوم ہے نہ اُن کو پبلک میں ممتاز درجہ حاصل ہوا اور نہ اُن کے ترجموں کو وہ حسن قبول نصیب ہوا جس سے اُن کو کوئی مالی فائدہ پہنچ سکتا۔ بہر حال مولانا نذیر احمد مرحوم نے قرآن مجید کی جو خدمت کی ہے اُس کی مفصل کیفیت بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے اگر زندگی نے وفا کی اور خدا کو منظور ہوا تو کسی دوسرے موقع پر اس باب میں اپنے مفصل خیالات ظاہر کیے جائیں گے۔ مختصر یہ ہے کہ شاہ صاحب کے خاندان کے بعد ہندوستان کے عام مسلمانوں کے لیے قرآن کریم کی جو خدمت اس بزرگ سے بن آئی ہمارے نزدیک آج تک کسی سے

بن نہیں آئی۔ ہمارے علمائے دین سے نہایت تعجب ہے کہ اکثر صاحبوں نے ترجمہ مذکور پر اعتراض کرنے میں تو کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا (ممکن ہے کہ بعض صحیح ہوں۔) اور اکثر مدعیان ترجمہ نے اُس سے پیٹ بھر کر فائدہ اٹھایا مگر بدقسمتی سے کسی کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ اُس مرحوم کی کوشش کی داد دینا تو درکنار ایک حرف بھی اُس کے حق میں کسی کے منہ سے نکلتا۔ اِنَّ ھٰذلشیٔ عجاب۔

اب میں مصنف ''حیات النذیر'' کی شان میں چند الفاظ لکھتا ہوں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ کتاب نہایت لیاقت اور خوش سلیقگی سے لکھی گئی ہے۔ باوجودیکہ راقم کی حالت مدت سے مطالعہ کی اجازت نہیں دیتی پھر بھی کتاب کی دلچسپی اور ہیرو کی عظمت نے مجبور کر دیا کہ جہاں تک ممکن ہو اس معزز لائف کو خود پڑھوں یا اوروں سے پڑھوا کر سنوں۔

اس کتاب کا سب سے زیادہ دلچسپ حصہ وہ اقتباسات ہیں جو مولانا کی کتابوں یا اُن کے خطوں سے مصنف نے جابجا انتخاب کیے ہیں۔ مولانا مرحوم کی عام تحریروں میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ اُن کا کوئی بیان شروع ہونے کے بعد جب تک کہ ختم نہ ہو جائے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ پس جب کہ عام تحریروں کا یہ حال ہے تو جو اقتباسات مصنف نے خاص توجہ کے ساتھ مولانا کی کتابوں سے انتخاب کیے ہیں ظاہر ہے کہ وہ کس قدر دلاویز اور دل کش ہوں گے۔ اس سے زیادہ ہم مولانا کی طرزِ تحریر کے متعلق اس ریویو میں بحث کرنا نہیں چاہتے۔ صرف اس قدر کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ ہر مشکل اور آسان سے آسان مطلب کے بیان کرنے پر جو غیر معمولی قدرت اس شخص کو اپنے اسٹائل میں تھی وہ اُس قادر الکلامی سے کسی طرح کم نہ تھی جو سرسید مرحوم کو اپنے سیدھے سادے اسٹائل میں حاصل تھی۔ اسی طرح مولانا کے لیکچروں پر یہاں اس سے زیادہ کہنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے جو بقول مصنف مسٹر ماریسن بالقابہ نے مولانا کے لیکچروں کے متعلق کہا تھا کہ ''صدہا برس تک یورپ ایسا اسپیکر نہیں پیدا کر سکتا۔''

اس موقع پر مولانا کی تحریر و تقریر کا ذکر محض برسبیل تذکرہ آ گیا ہے کیوں کہ ہمارا اصل مقصد ''حیات النذیر'' کی ترتیب اور مصنف کے اس مہتم بالشان کام پر رائے زنی کرنا ہے ورنہ

مولانا کی اعلیٰ لیاقتوں کے بیان کرنے کے لیے ایک مبسوط کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔

''حیات النذیر'' میں مصنف نے مولانا نذیر احمد کی زندگی، اُن کی طرز ماند و بود، اُن کے اخلاق و عادات، اُن کے اوقات و مشاغل، اُن کے اعتقادات، ان کی رایوں کا جو صحیح نقشہ خود انھیں کی تصنیفات و تصریحات کی بنا پر کھینچا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حالات مذکورہ کے تفحص اور جستجو میں سعی و کوشش کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہے۔ اور اس مقصد عظیم کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے کہ ایک بڑے آدمی کی سچی بیوگرافی سے جو گراں بہا فائدے آئندہ نسلوں کو پہنچ سکتے ہیں اُن کے پہنچانے میں تا بہ مقدور کوتاہی یا بخل نہ کیا جائے۔

اس بیوگرافی کے متعلق ہم ریویو نگاری کا فرض ادا کرنے کی غرض سے مصنف کی خدمت میں ایک عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ انھوں نے جس طرح شاید ترجمہ ''نذیریہ'' کی فوقیت ظاہر کرنے کے لیے اُس کا موازنہ دیگر جدید ترجموں سے کیا ہے اسی طرح کتاب ''الحقوق والفرائض'' مرتبہ مولانا نذیر احمد بعض مقامات کا موازنہ ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے ہم مضمون مقامات سے کیا ہے اور ''الحقوق والفرائض'' کے بیانات کو ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے بیانات پر ترجیح دی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کا یہ بیان مولانا کی نظر سے نہیں گزرا اور نہ ہرگز توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ مصنف کو ایسی دلیری کی اجازت دیتے۔

مصنف نے شاہ ولی اللہ صاحب کی نسبت شمس العلماء مولانا شبلی کے اس قول کو نہایت تعجب سے دیکھا کہ شاہ صاحب کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی رازی اور ابن رشد کے کارنامے ماند پڑ گئے۔ اس ریویو میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ شمس العلماء کی رائے کی تائید دلائل کے ساتھ کے جائے۔ لہٰذا یہاں ہم خواجہ حافظ کے مشہور شعر پر اکتفا کرتے ہیں ؎

چو بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطاست
سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجا ست

رسالہ ''اُردو''

(منقول از رسالہ ''اُردو'' لاہور بابت اکتوبر ۱۹۱۳ء، صفحہ: ۲۔۳)
(مولوی فتح محمد خاں مرحوم جالندھری نے ''اُردو'' کے نام سے ایک ماہوار رسالہ لاہور سے نکالا تھا اس کا پہلا ڈبل نمبر ستمبر و اکتوبر ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا۔ ناقدری کی وجہ سے دو ہی تین نمبر نکلنے کے بعد بند ہو گیا۔)

''اُردو'' اس نام کا ایک رسالہ پنجاب کے نامور مصنف جناب مولوی فتح محمد خاں صاحب جالندھری نے انھیں دنوں میں شہر جالندھر سے نکالا ہے، جس کا پہلا نمبر میری نظر سے گزرا۔ تقریباً دس برس کا عرصہ گزرا ہوگا کہ پٹیالہ کے مشہور مدبر و رکن ریاست مرحومی جناب خلیفہ سید محمد حسین خاں صاحب بالقابہ نے صحبت میں فرمایا تھا کہ ملک میں ایک ایسا رسالہ جاری ہونے کی سخت ضرورت ہے جس کا مقصد براہ راست محض اُردو زبان کی خدمت اور اُس کے لٹریچر کی اصلاح ہو۔ اگرچہ اُس وقت تمام حاضرین نے بالاتفاق اس ضرورت کو تسلیم کیا تھا، مگر گزشتہ دس سال میں نہ اُس پر کچھ عمل درآمد ہوا اور نہ کسی کو وہ بات یاد رہی۔ مگر اصلی اور حقیقی ضرورتوں سے کیسی ہی بے اعتنائی یا بے پروائی کی جائے وہ کبھی نہ کبھی ضرور پوری ہو کر رہتی ہے۔ کوئی نہ کوئی خدا کا بندہ بغیر کسی کی تحریک کے خود بخود اس کے پورا کرنے کو کھڑا ہو جاتا ہے۔ چناں چہ یہ رسالہ جس کا نام ''اُردو'' رکھا گیا ہے اسی ضروری مقصد کے لیے جاری کیا گیا ہے۔ اگرچہ ابھی تک اُس کا صرف ایک نمبر شائع ہوا ہے جس سے اُس کے مستقبل کی نسبت کوئی صحیح رائے قائم نہیں ہو سکتی، لیکن جیسا کہ کہا گیا ہے ''سالے کہ نکوست از بہارش پیداست''، ہم کو قوی امید ہے کہ یہ رسالہ مقبول خاص و عام

ہوگا۔ اول تو جو مضامین پہلے نمبر میں شائع ہوئے ہیں وہ نہایت دلچسپ اور رسالے کے مقصد کے لحاظ سے نہایت موزوں ہیں۔ دوسرے رسالے کا مقصد ایسا اہم اور ضروری ہے جو پبلک کو بزور اُس کی طرف متوجہ کرے گا۔ تیسرے دہلی جو اُردو زبان کا مرکز ہے اُس کا دارالخلافہ بننا رسالے کی اشاعت کے حق میں خود ایک بڑی فال نیک ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جس زبردست ہاتھ رسالے کی باگ ہے وہ ہاتھ ہی اُس کی ترقی اور قیام کا ضامن ہے۔

ہماری دعا ہے کہ یہ رسالہ تمام ملک میں قبولیت کا درجہ حاصل کرے اور اُردو زبان کو اُس سے خاطر خواہ فائدہ پہنچے اور مالک و مہتمم کی مساعی جمیلہ مشکور ہوں۔

و آخر و دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العالمین

خم خانۂ جاوید

(جلد دوم)

(اُردو شاعروں کا سب زیادہ ضخیم تذکرہ ہے۔ جس کو جناب لالہ سری رام ایم.اے نے مرتب کرنا شروع کیا تھا۔ ابھی ۴ جلدیں ختم ہوئی تھیں کہ مؤلف کا انتقال ہوگیا۔ اس کی باقی جلدیں جناب پنڈت برج موہن دتاتر یہ کیفی ترتیب دے رہے ہیں۔)

(از ''خم خانۂ جاوید'' جلد دوم، مطبوعہ ۱۹۱۱ء)

''خم خانۂ جاوید'' یعنی تذکرہ شعرائے اُردو زبان مرتبہ جناب لال سری رام ایم. اے رئیس دہلی خلف الصدق جناب آنریبل رائے بہادر لالہ مدن گوپال سرگیاشی۔ اس تذکرے کی جو اہمیت میرے دل میں ہے اور جو خصوصیت مجھ کو صاحب تذکرہ اور اس کے معزز خاندان سے حاصل ہے اس کے لحاظ سے مجھ کو اس کی پہلی جلد پر سب سے پہلے اپنے خیالات ظاہر کرنے چاہئیں تھے مگر بدقسمتی سے ایسے مکروہات پیش آتے رہے کہ میں اطمینان کے ساتھ اس کی نسبت کچھ نہ لکھ سکا۔ اگرچہ کافی اطمینان اب بھی میسر نہیں ہے لیکن چوں کہ تذکرے کی دوسری جلد بھی عنقریب چھپ کر شائع ہونے والی ہے اس لیے میں نے خیال کیا کہ مبادا اس اہم تالیف کی نسبت پھر مجھ کو اپنے دلی خیالات ظاہر کرنے کا موقع نہ ملے۔ لہٰذا میں نہایت ضروری سمجھا کہ اپنی ناچیز رائے اس کے متعلق ظاہر کرنے میں اب دیر نہ کروں۔

اس تذکرے کی پہلی جلد کو چھپے ہوئے تین برس گزر چکے ہیں۔ دہلی و لکھنؤ اور اطراف ہندوستان کے بڑے بڑے نامور شعرا اور اہل کمال نے اس پر نہایت عمدہ رائیں

ظاہر کی ہیں۔ جس صفائی اور سلاست سے اس میں شعرا کے تراجم لکھے گئی ہیں اور جس سلیقے سے ان کا کلام انتخاب کیا گیا ہے اور جس کوشش و جاں فشانی سے ان کے حالات اور اُن کا کلام بہم پہنچایا گیا ہے اور جس ادب و احترام کے ساتھ قدما سے لے کر معاصرین تک سب کا نام لیا گیا ہے، ان سب باتوں کو تقریباً تمام تقریظ نگاروں نے تسلیم کیا ہے اور سب سے بڑھ کر میں نہایت صدق دل سے تسلیم کرتا ہوں۔ پس تذکرہ یا تذکرہ نویس کو پبلک سے روشناس کرانے کی اب زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ میں اس موقع پر صرف تذکرے کی جامعیت کی نسبت چند الفاظ لکھنے چاہتا ہوں۔

اب تک اس تذکرے کی صرف پہلی جلد راقم کی نظر سے گزری ہے جو ۷۸۹ صفحوں پر ختم ہوئی ہے۔ اُس کے دیکھنے معلوم ہوا کہ اس جلد میں صرف ان شاعروں کا کلام اور ان کے حالات درج ہوئے ہیں جن کا تخلص الف یا بے سے شروع ہوتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ منجملہ تیس (۳۰) کے صرف دو ردیفیں اس جلد میں قلم بند ہوئی ہیں اور کم سے کم ۱۸ ردیفیں باقی ہیں۔ اس سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ اگر سب ردیفیں اسی شرح و بسط کے ساتھ لکھی گئیں جیسی کہ ایف اور بے کی ردیفیں لکھی گئی ہیں تو یہ تذکرہ جامعیت کے لحاظ سے بلا مبالغہ شعرائے اُردو زبان کی ایک ایسی سائیکلو پیڈیا ہوگی جس کی نظیر اُردو تذکروں میں نایاب سمجھی جائے گی اور اُردو زبان میں ایک ایسا اضافہ ہے جس کا تمام اہل ملک کو ممنون ہونا چاہیے۔

آج کل اہل ملک کی بد قسمتی سے جو اختلاف ہندو مسلمانوں میں اُردو زبان کی مخالفت یا اس کی حمایت کی وجہ سے برپا ہے اس کی رفع دادا اگر ہوسکتی ہے تو اسی طریقے سے ہوسکتی ہے کہ ہندو تعلیم یافتہ اصحاب کشادہ دلی اور فیاضی کے ساتھ اُردو زبان میں جو درحقیقت برج بھاشا کی ایک ترقی یافتہ صورت اور اس کی ایک پروان چڑھی ہوئی اولاد ہے اسی طرح تصنیف و تالیف کریں جس طرح ہمارے عزیز ہیرو نے اس طولانی تذکرہ کو ختم کرنے کا ارادہ کیا ہے اور مسلمان مصنّفین نے ضرورت اُردو میں عربی فارسی کے غیر مانوس الفاظ استعمال کرنے سے جہاں تک ہوسکے پرہیز کریں اور ان جگہ برج بھاشا کے مانوس اور عام فہم الفاظ سے اُردو کو مالا مال کرنے میں کوشش کریں اور اس طرح دونوں قوموں میں آشتی اور صلح کی بنیاد

ڈالیں اور ایک متنازع فیہ زبان کو مقبولۂ فریقین بنائیں، جیسی کہ لکھنؤ جانے سے پہلے تقریباً اہل دہلی کی زبان تھی۔ مذکورۂ بالا اختلاف کے متعلق جو تعصب اور ناگواری کا الزام ہندوؤں پر لگایا جاتا ہے اسی قسم کا بلکہ اس سے زیادہ سخت الزام مسلمانوں پر لگایا جا سکتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ مسلمان باوجودیکہ تقریباً ایک ہزار برس سے ہندوستان میں آباد ہیں مگر اس طول طویل مدت میں انھوں نے چند مستثنیات کو چھوڑ کر کبھی سنسکرت یا برج بھاشا کی طرف باوجود سخت ضرورت کے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ جس سنسکرت کو یورپ کے محقق لاطینی و یونانی سے زیادہ فصیح زیادہ وسیع اور زیادہ باقاعدہ بناتے ہیں اور جس تحقیقات میں عمریں بسر کر دیتے ہیں، مسلمانوں نے عام طور پر کبھی اس کو قابل التفات نہیں سمجھا اگر یہ کہا جائے کہ سنسکرت کا سیکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے تو برج بھاشا جو بمقابلہ سنسکرت کے نہایت سہل الوصول ہے اور جس کی شاعری نہایت لطف شگفتہ اور فصاحت و بلاغت سے لبریز ہے اس کو بھی عموماً وہ ہمیشہ بیگانہ وار نظروں سے دیکھتے رہے۔ حالاں کہ جو اُردو ان کو اس قدر عزیز ہے اس کی گریمر کا دارو مدار بالکل برج بھاشا یا سنسکرت کی گریمر پر ہے۔ عربی، فارسی سے اس کو صرف اس قدر تعلق ہے کہ دونوں زبانوں کے اسماء اس میں کثرت سے شامل ہوگئی ہیں۔ باقی تمام اجزائے کلام جن کے بغیر کسی زبان کی نظم یا نثر مفید نہیں ہوسکتی، برج بھاشا یا سنسکرت کی گریمر سے ماخوذ ہیں۔ سچ یہ ہے کہ مسلمانوں کا ہندوستان میں رہنا اور سنسکرت یا کم سے کم برج بھاشا سے بے پروا یا متنفر ہونا بالکل اپنے تئیں اس مثل کا مصداق بنانا ہے کہ ''دریا میں رہنا اور مگر مچھ سے بیر''۔

قصہ مختصر جس ذوق وشوق سے معزز مؤلف نے اس تذکرے کے لکھنے پر کمر باندھی ہے اور جس استقلال کے ساتھ وہ طالب علمی کے زمانے سے لے کر آج تک ان تمام مشکلات پر غالب آتے رہے ہیں جو اس مفید کام کے انجام دینے میں اُن کو پیش آئیں اُس سے اس عام خیال کی بوجہ احسن تردید ہوتی ہے کہ انگریزی تعلیم بجائے اس کے کہ قومی تعصّبات سے دلوں کو پاک کرے اور اُلٹی تعصب و ناگواری کی آگ ملک میں مشتعل کرنے والی ہے۔

بہرحال ہم دل سے دعا کرتے ہیں کہ جو مفید کام ہمارے دلی دوست مسٹر سری رام صاحب نے شروع کیا ہے، اللہ تعالیٰ اُسے بخیر وخوبی انجام کو پہنچائے اور اس تصنیف کو قبول عام کے زیور سے آراستہ فرمائے۔

آخر میں ہم معزز مصنف کی خدمت میں اس بات کے عرض کرنے کی معافی چاہتے ہیں کہ صفحہ ۳۰۸ پر جہاں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمتہ اللہ کا حال لکھا گیا ہے اس میں چند فروگزاشتیں ہوگئی ہیں، اول تو شاہ صاحب ممدوح کا اُردو زبان میں شعر کہنا اور اشتیاق تخلص کرنا ثابت نہیں ہوا۔ دوسرے ان کا وطن سرہند اور مجدّد الف ثانی کی نسل سے ہونا اور فیروز شاہ کے کوٹلہ میں سکونت پذیر ہونا غلط معلوم ہوتا ہے۔ کسی طریقہ سے اس غلطی کی اصلاح فرمادی جائے۔

کلیاتِ دلگیرؔ

(''کلیات دل گیرؔ ایک خاص نوعیت کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ مولانا حالیؔ
سے اس کلیات کو عوام سے روشناس کروانے اور اس کے محاسن ظاہر کرنے
کی فرمائش کی گئی تھی، جس پر مولانا نے یہ ریویو لکھا۔ ریویو سب سے پہلے
دسمبر ۱۹۰۱ء کے ''معارف'' میں شائع ہوا۔ پھر مولانا وحیدالدین سلیمؔ نے
اس کو ''مضامین حالیؔ'' میں شائع کیا۔'')
(از ''مضامین حالیؔ'' صفحہ: ۲۳۵، مرتبہ مولانا وحیدالدین سلیمؔ، ۱۹۰۲ء)

''کلیات دلگیرؔ'' ایک نئی قسم کا دیوان ہے جس سے غالباً خاص خاص شخصوں کے سوا بہت کم لوگ واقف ہوں گے۔ صاحب دیوان ایک بزرگ منور خان نام دلگیرؔ تخلص۔ رئیس میرٹھ ہیں۔ ۱۸۵۰ء میں انھوں نے کچھ نظمیں گنواری زبان میں جو درمیان دوآب و ہریانہ کے دیہات میں عموماً بولی جاتی ہے، لکھ کر مرحوم ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ کی حضور میں پیش کی تھیں۔ وہاں اُن نظموں کی بہت داد ملی اور بادشاہ نے انعام اور خلعت عنایت کیا۔ اس قدر دانی نے میاں دلگیرؔ کے خیالات پر وہی اثر کیا جو سلطان سنجر کے ملک الشعرا کا تزک و احتشام دیکھ کر اوحدالدین انوری کے دل پر ہوا تھا۔ انھوں نے اُسی گنواری زبان پر اپنی شاعری کی بنیاد رکھی اور رفتہ رفتہ ایک نئی قسم کا دیوان مرتب کر لیا جو اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے۔

میرے ایک لائق دوست نے جو شاعری کا صحیح مذاق رکھتے ہیں مجھ سے یہ فرمائش کی ہے کہ اس دیوان میں جو شاعرانہ خوبیاں اور محاسن ہیں، ان کو کسی قدر پبلک پر ظاہر

کروں اور لوگوں سے میاں دلگیرؔ اوران کے کلام کو روشناس کراؤں۔

جس زبان میں یہ دیوان مرتب ہوا ہے وہ درحقیقت ایک قسم کی بگڑی ہوئی اُردو ہے۔ جیسا کہ ہر ملک میں دیہاتیوں اور گنواروں کی زبان شہر والوں کی بگڑی ہوئی زبان ہوتی ہے۔ پس اس دیوان میں زیادہ تر وہی الفاظ جو فصیح اُردو میں صحیح طور پر مستعمل ہوتے ہیں۔ کسی قدر تغیر کے ساتھ گنواری بول چال میں استعمال ہوتے ہیں جیسے خالق اور کھالک، باپ اور باپو، مھارے اور ہمارے، چتّے چتّے اور چپاں چّپاں، تو نے اور تین نے، کیا اور کینا، دیا اور دینا، وغیرہ وغیرہ ظاہر ہے کہ ایک موزوں طبع آدمی کو جس کی مادری زبان شہری فصیح اُردو ہو، بگڑی ہوئی اُردو سیکھ لینا اور اس میں اشعار موزوں کرنا زیادہ دشوار نہیں ہے مگر جو بات دشوار اور سخت دشوار ہے اور جس پر سوا اُس شخص کے جو ماں کے پیٹ سے شاعر پیدا ہوا ہو کوئی قادر نہیں ہوسکتا، وہ یہ ہے کہ جو مضمون ایک گنواری زبان میں بیان کیا جائے اس کا پیرایۂ بیان بھی گنواروں کے محدود خیالات کی حد سے متجاوز نہ ہو۔ کیوں کہ فصاحت درحقیقت اس کے اس کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے کہ مثلاً اگر بچوں کے ساتھ بات چیت کرو تو بچّے بن جاؤ اور گنواروں کے ساتھ گفتگو کرو تو اپنے تئیں ٹھیٹ گنوار بنالو جیسا کہ کہا گیا ہے۔

اس دیوان میں یہی وہ چیز ہے جو دلگیرؔ کے اصلی اور قدرتی شاعر ہونے پر بہ آواز بلند گواہی دیتی ہے۔ جس طرح اس کی زبان گنواری ہے اسی طرح اس میں ہر ایک مضمون گنواروں کے خیالات کے موافق ادا کیا گیا ہے۔ وہ خدا کی تعریف اس طرح شروع کرتا ہے۔

ہے مرے کھالک! ہے مرے مالک!
تو باپو ہم تیرے بالک

(ہے=حرف ندا یعنی اے۔ کھالک = خالق۔ باپو= باپ) خدا کی عظمت کا بیان گنواروں کے خیالات کے موافق اس سے بہتر کسی پیرایہ میں نہیں ہوسکتا کہ اس کو باپ اور اپنے تئیں اس کے بچے قرار دیں۔

مھارے[1] حاکم ہو، مھارے سوائی[2] — چپاں[3] چپاں تیری دُہائی
تیں[4] پانی سوں مانس[5] کینا[6] — سوجھ بوجھ مت سدھ بدھ دینا[7]
تیرے سانچے انیک[8] نرالے — جن سانچوں[9] لکھ کایا ڈھالے

خدا کی حکمت بالغہ کو جو قرآن میں ان لفظوں سے بیان کی گئی ہے کہ
اس طرح بیان کرتا ہے کہ تیرے سانچے بے شمار اور ان گنت ہیں کہ ایک سانچے کی ڈھلت دوسرے سانچے کی ڈھلت سے نہیں ملتی۔

انبر[10]، دھرتی، سورج، چندر — دئی[11]، دیوتا، پیر، پگمبر[12]
سب تری ڈوڑھی[13] سیس[14] نوادیں[15] — تجھے[16] نے پوجیں تجھے نے گاویں[17]
جے[18] تو اپنا چھوہ[19] دکھادے — انبر[20] دھرتی[21] چھو[22] ہوجاوے[23]
یوں[24] بیڑے کا کھیون[25] ہارا — تیرے ہاتھوں ہے نتارا[26]
آئے پڑی منجدھاروں[27] نیّا[28] — تجھ بنا دیکھے ناہیں[29] کھویا[30]
توں نیّا[31] نو پار لگادے — مجھ ڈوبے تو[32] تو ہی تراوے
توں ہی مارے تو ہی نواجے[33] — تیرا ڈھونا[34] انبر باجے[35]

چوں کہ بادشاہوں اور امیروں کے نقار خانے بہت بلندی پر بنائے جاتے ہیں تا کہ نوبت کی آواز دور دور پہنچے اور سننے والوں کو ان کی زیادہ شان و شوکت معلوم ہو۔ اس لیے عوام کے خیال کے موافق عظمت و جلالت الٰہی کو اس پیرایہ میں بیان کرتا ہے کہ تیرا نقارہ آسمان بجتا ہے۔

---

[1] ہمارے [2] سردار [3] چپے چپے [4] تو نے [5] آدمی
[6] بنایا [7] دیا [8] بے شمار [9] لاکھوں۔جسم [10] آسمان
[11] اوتار [12] پیغمبر [13] ڈیوڑھی [14] سر [15] جھکائیں
[16] تجھی کو [17] تیرا نام لیں [18] اگر [19] غصہ [20] آسمان
[21] زمین [22] سب فنا [23] ہوجائے [24] تو [25] ملاح
[26] نجات [27] یعنی منجدھار میں [28] کشتی [29] نہیں [30] کھینے والا
[31] کشتی کو [32] کو [33] نوازے [34] نقارہ [35] آسمان پر بجتا ہے

سورج کا ڈھے[1]، چندر چمکاوے　　　　پربت ڈھاوے[2] سمذر[3] بھاوے
تو ہی لاڑے[4] میگھ ملارا[5]　　　　تول ہی بُواوے بوہنڈا[6] مھارا[7]
تول کھیتال نویبال چلاوے　　　　تَوں پودا نو دھوپ لگاوے
کھیت اگاوے ناج پکاوے　　　　سگری پرجا[8]، جانو[9] کھاوے

سورج اور چاند کا نکالنا، پہاڑوں کا بلند کرنا، سمندر کا بہانا، مینہ برسانا، زمیں بوانا کھیتی پر ہوا چلانا، اُس پر دھوپ نکالنا، بیج اُ گانا، اناج پکانا اور اس سے ساری مخلوق کی پروش کرنا، یہ سب ایسے صاف اور کھلے ہوئے مظاہر قدرت ہیں جن سے بڑھ کر خدا کی عظمت و جبروت کا خیال خاص کر ایک زراعت پیشہ دیہاتی گنوار کے دل میں کسی ذریعہ سے پیدا نہیں کیا جاسکتا۔

تجھ[10] بناجن کوئی دوجا پوجا[11]　　　　واکی[12] انکھاں نیل کا سوجا
وین دُنی کی کھولی کھوبی[13]　　　　واکی[14] نیّا[15] ریت میں ڈوبی
ہے مرے صاحب بکسن[16] ہارے　　　　پاڑوے[17] کھوٹے کا گڈ[18] مھارے
توں ہی مھارا پالن ہارا　　　　تیرا ان[19] کھاوے جگ سارا
دلگیر ہے تیرا واسی[20]　　　　تو ہی دے گا تاتی[21] باسی

یہ چند بیتیں اس نظم میں سے لی گئی ہیں جو دلگیر نے اپنے دیوان کے شروع میں حمد الٰہی میں لکھی ہیں۔ ان کے پڑھنے سے ہر شخص جو شاعری کا صحیح مذاق رکھتا ہے بخوبی اندازہ کرسکتا ہے کہ صاحب دیوان جس طرح گنواری زبان اور اس کے محاورۂ روزمرہ پر پوری

---

۱ نکالے　۲ اٹھاوے یعنی بلند کرے　۳ سمندر　۴ نکالے یا برسادے
۵ باران رحمت　۶ کھیت　۷ ہمارا　۸ ساری مخلوق
۹ جس کو　۱۰ تیرے سوا جس نے　۱۱ پوجا　۱۲ اس کی آنکھوں میں سوا یعنی سلائی
۱۳ خوبی　۱۴ اس کی　۱۵ کشتی　۱۶ بخشنے والا
۱۷ پھاردے　۱۸ کاغذ یعنی نامۂ اعمال　۱۹ رزق　۲۰ غلام
۲۱ گرم یعنی تازی روٹی

قدرت رکھتا ہے اسی طرح وہ ہر ایک مطلب کو گنواروں کے خیالات اور ان کے مبلغ فکر کے موافق اُسی گنواری زبان میں ادا کرنا جانتا ہے۔

حمد کے بعد نعت میں اس مطلب کو کہ آنحضرتؐ قیامت کو ہماری شفاعت کریں گے، اس طرح ادا کرتا ہے ''جگ پرلوں مُھاری مکُتان اوٹی''

پھر اس مطلب کو کہ آپ کے چاروں یاروں نے دُنیا میں اسلام کو پھیلا دیا، اس طرح بیان کرتا ہے۔

نبیؐ صاحب کے چار سپائیؓ[1] جنھاں[2] نے ملکوں دھومیں[3] ٹھائی
کردئے لکھوں نیم[4] کے بندے ترمل[5] ہوگئے ماڑنس[6] گندے

پھر اس مطلب کو کہ جس نے آنحضرتؐ کی پیروی نہ کی وہ تباہ ہوا اس طرح ادا کرتا ہے۔

جو کوئی[7] وا کی گئیل[8] نہ چالا وا کا دوجگ[9] مہرا[10] کالا
ڈوب گیو وہ کرموں ہینا[11] جن[12] حجرت[13] کا سنگ[14] نہ لینا

ایک شخص اپنے وطن اور اہل وعیال سے دور جا پڑا ہے، گویا وہ خدا کی طرف مخاطب ہوکر اپنی مصیبت بیان کرتا ہے اور کہتا ہے۔

ہے مرے[15] صاحب! یو[16] کے کینا[17]
مجھ[18] نے دیس نکاڑا دینا[19]
میں[20] نے کے تیری بھوریں[21] کھیدیں
جے مرے[22] کاڑجے برچھی چھیدیں

---

[1] [2] [3] دھوم مچائی [4] ایمان
[5] پاک [6] آدمی [7] اس کی [8] ہمراہ
[9] دونو جہاں میں [10] منہ [11] نصیبوں کا ہیٹنا [12] جس نے
[13] حضرت [14] ساتھ نہ لیا [15] اے میرے خدا [16] یہ کیا
[17] کیا [18] مجھے دیس نکالا یعنی جلاوطنی [19] دیدی [20] میں نے کیا
[21] تری بھوری بھینس نکال لی ہے [22] کہ تو نے مرے کلیجہ میں برچھی چھیودی ہے

اپنے صاحب یعنی خدا سے کہتا ہے کہ کیا میں نے تیری بھوری بھینس چھین لی ہے جو تو نے مجھ پر یہ مصیبت ڈالی ہے۔ چوں کہ گنوار لوگ بھوری بھینس کو بہت عزیز رکھتے ہیں، اس لیے انھیں کے خیالات کے موافق خدا سے کہتا ہے کہ کیا میں نے تیری بھوری چھین لی ہے۔ جس کا تو نہ مجھ سے یہ بدلہ لیا ہے۔

چھٹ گئے سگرے[1] ناتی گوتی[2]
دادا نانا پوت[3] پڑوتی[4]
ناؤ[5]، بامن[6]، ہالی[7]، گمیرے[8]
جھاں[9] نت میرے ڈانگر گھیرے
کہاں گئے اوہ[10] ایکھہ کے گانڈے[11]
کہاں گئے اوہ مینڈے[12] ڈانڈے
کہاں گئی اور کھیتی مھاری
کہاں گئی اور گاجر کیاری

اسی طرح کہیں جتی حقے اور چوپاڑ کے ساتھیوں کو یاد کرتا ہے، کہیں بھابھڑ کے بانوں سے بُنی ہوئی کھاٹ، کھٹولی، گوبر کی ڈھیریوں، سانی کی ناندوں، دودھ دہی کی کوری مٹکیوں، سرسوں کے ساگ اور مکّا کی روٹی اور اسی قسم کی اور چیزوں کا جو دیہاتی زندگی کے مناسب ہیں حسرت کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔

سب سے زیادہ لحاظ کے قابل اس دیوان میں یہ بات ہے کہ ظاہر دلمیرؔ سے پہلے کسی نے گنواری زبان میں دیوان مدوّن نہیں کیا اور نہ اتنے مختلف مضامین جتنے کہ اس دیوان میں ہیں، کبھی اس زبان میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس میں حمد و نعت، منقبت،

---

[1] سارے [2] رشتہ دار [3] بیٹا [4] پوتے کی بیٹی
[5] نائی [6] برہمن [7] ہل چلانے والا [8] خادم
[9] (جو ہمیشہ میرے مویشی گھیر گھیر کے لاتے تھے) [10] وہ [11] گنّے
[12] کھیت کی ڈول اور پگڈنڈی

اخلاق، مدح، ہزل، عشق، ہجر وصل، رشک غرض کہ وہ تمام بیانات جو اُردو کے عام دیوانوں میں پائے جاتے ہیں، موجود ہیں۔ پس اُردوئے معلّٰی کے شعرا جو کئی سو برس سے اسی ایک ہڈی کو چچوڑتے چلے آتے ہیں، اُن میں اور دلمیؔر میں وہی فرق ہے جو مقلد اور موجد میں ہوتا ہے۔ وہ لوگ جب مضامین مذکورۂ بالا میں کسی مضمون کو باندھنا چاہتے ہیں تو اس کے ادا کرنے کے لیے سینکڑوں اسلوب بیان اور الفاظ و محاورات و تراکیب اُردو لٹریچر میں مہیّا پاتے ہیں۔ ان کے سامنے مختلف مقدار کے بندھے ہوئے موتیوں کا انبار موجود ہے، جیسے موتی کی ضرورت ہوتی ہے بے تکلف لڑی میں پرو لیتے ہیں۔ برخلاف اس شخص کے جس کو اول غوطہ لگا کر دریا میں سے سیپیاں بہم پہنچانی پھر اُن میں سے موتی نکالنے ہیں پھر ان کو جلا کرنا ہے پھر بیندھنا ہے پھر لڑی میں پرونا ہے۔

اس سے زیادہ مشکل یہ بات ہے کہ گنواری زبان ایک جاہل قوم کی زبان ہے جس کا دائرہ نہایت تنگ اور محدود ہے۔ باوجود اس کے دلمیؔر نے اس میں بہت سے ایسے مضامین بیان کیے ہیں جن کا ایک گنواری زبان میں سما جانا سخت مشکل ہے۔ مثلاً انگریزی عمل داری کی تعریف میں نو ایجاد توپوں اور بندوقوں کا بیان، ریل، تار برقی، سڑکوں اور نہروں کا بیان، برف کی کل اور واٹر ورکس کا بیان، دیا سلائی، گیس اور برقی روشنی کا بیان وغیرہ وغیرہ۔ مذکورہ بالا بیان میں سے چند اشعار یہاں لکھے جاتے ہیں۔

جگ[1] جگ رہے پھرنگی راج
یوراجے[2]، راجوں سرتاج
راجا راجی سکھی کسان
یوراجا[3]، پرجا کی جان
بڑے باوچھا[4]، بڑے نساپھ[5]
بڑے اکل[6] ور، بڑے سراپھ[7]

---

[1] ہمیشہ ہمیشہ [2] (یہ بادشاہ بادشاہوں کے سرتاج ہیں) [3] راجا
[4] بادشاہ [5] انصاف [6] عقل در [7] اشراف

انگریجاں کا ملکوں راج   راجا بڈے گریب نواج

انگریجاں کی بانکی پھوج   جابڈ[1] چڑھے سمندر موج

پڑے سمندروں گھنے جہاج   جامیں[2] راکھیں بھربھر ناج

کھاوے پھوج، انگھاوے[3] پھوج   بیٹھی باجے بجاوے پھوج

تو پان چلیں گھٹا گھنگور   کاسوں[4] ہو سرکار کی ہوڑ[5]

توڑا[6] لگے نہ دارو[7] موکہہ[8]   اپو آپو چلیں بندو کہہ

ہند[9] بند دکھاں لمبی نال   داگی[10] دگیں نہ دو دو سال

ہند راج کھوٹی تر وار   گاجر کٹے نہ سو سو مار

راج پھرنگی رہے انند   جد لگ انبر، سورج، چند

ریل لگاڑی[11] کاڈھے تار   دن میں چالے میل ہجار

تار کھبر سوں راتوں رات   لاکھ کوس سوں کر لو بات

اچرچ بڑی برپھ[12] کی کل   واے[13] گھو ماوے کو نسامل[14]

کاگج دام جلاوے کون؟   ایسا ٹھاڈا آوے کون؟

سڑک[15] بنائیں کھودیں نہر   کھیت کھیت پانی کی لہر

جاسے ہو لکھوں من ناج   کدھیں[16] رہیں ناٹھالی[17] چھاج

بمبے دئے دھرتی ماں گال   تلے تلے پانی کی چال

بگڑ بگڑ مانھ لائے[18] نل[19]   جا میں آوے نرمل جل

---

۱ جن میں   ۲ جن میں   ۳ سیر ہو   ۴ کس سے

۵ برابری   ۶ توڑا   ۷ بارود   ۸ پیالہ میں

۹ ہندوستان کی بندوقیں   ۱۰ داغنے سے نہیں دغتیں   ۱۱ نکالی   ۱۲ برف

۱۳ اس کو   ۱۴ پہلوان   ۱۵ (سڑکیں بنائیں نہریں کھودیں)

۱۶ بیکار   ۱۷ (بمبے زمین میں لگائے)

۱۸ میں   ۱۹ لگا کے

یاہی بُدسوں جلیں چراگ   ناباتی، ناتیل، نہ آگ
ناکوئی دیوا بالن[۱] واڑا   آپو آپو ہو اُجیاڑا[۲]
آپو تڑکے[۳] جاویں بجھ   اچرج[۴] مانیں مجھ اور تجھ
بڑے بڑے پر جانو سکھہ   ناہیں رہے اب دھرتی دُکھہ

اب ہم چند اشعار دلمیر کی غزلوں میں سے بطور نمونے کے نقل کرتے ہیں۔

آجا مھارے منتر[۵]! آجا   موا پڑا ہوں موئے[۶] جواجا[۷]
پیت نہ کرلے، میت کسی کی   پیت نہ چھوڑے کوٹھی ناجا[۸]
ہے من اَوت[۹]! گیو کے تیرو؟   مھارے[۱۰] ہی اوپر دھونا باجا

◆◆◆

باوَلے[۱۱] من! یو کے کینا؟   من، دھن سگرا نیامی[۱۲] دنیا
پیت[۱۳] لاکے[۱۴]، پرتیت[۱۵] گنوادی   پھٹ پھٹ بیری! تیرا جینا
ایک[۱۶] دنانو کھکے گیو ہے   بیت[۱۷] گیو اب ایک مہینا
مھارا گات[۱۸] سندھ[۱۹] نے تیرے   رین[۲۰] دنا[۲۱] پھلاسا[۲۲] پینا

◆◆◆

ناہیں رہو من بیری بس کا   یانے[۲۳] پڑگیو چسکا جوبن رس کا
بیٹھ گیو دیہل[۲۴] پیتم[۲۵] لڑکی   کسی کا ناکھسکا[۲۶] یا کھسکا
میں کیلی تونے بن بن ڈھونڈوں   تو تو جوڑا بچھڑ گیو سارس کا

◆◆◆

---

۱ روشن کرنے والا   ۲ اجالا   ۳ صبح کو   ۴ اجنبھا
۵ دوست   ۶ مجھے   ۷ جلا جا   ۸ غلہ
۹ (اے احمق دل تیرا کیا گیا)   ۱۰ (یعنی مصیبت ہمیں پر آپڑی)
۱۱ اے بادلے دل   ۱۲ مفت دیدیا   ۱۳ محبت   ۱۴ لگا کے
۱۵ عزت   ۱۶ (ایک دن کو کھکے گیا ہے)   ۱۷ گزر گیا   ۱۸ بدن
۱۹ غم نے   ۲۰ رات   ۲۱ دن   ۲۲ روئی کی طرح
۲۳ اس کو   ۲۴ چوکھٹ   ۲۵ معشوق   ۲۶ کسی کا

دوڑ یورے دوڑ یو میرے بگڑ دھاڑا پڑا
ناج کھایو، مال کھوسا[1] ایک چھوری[2] نے ہڑا[3]
توں مڑ دڑے[4] سیج[5] مارے سانجہہ[6] سوں تڑکا[7] لکاڑ
میں لکھاؤں[8] بات تیری گانو کے گورے[9] کھڑا
تیر پڑکاں[10] سوں چلادے سین[11] مارے نین[12] سوں
کے گیو[13] تیرو کو کرمی[14]! ٹھوڑ میں مارا پڑا
مات کھائی لات کھائی دھول جوتی اوٹ لی
ہوگیا دلگیر! توں تو اِسک[15] ماں چکن[16] گھڑا

◆◆◆

اِسک کریگا پھجیت[17] ہوگی اسک[18] کرے مت رے بیرا
بوئے کھیت[19] ارنڈ کے پودا، کن کھائے ککڑی کھیرا
باڈھی[20] کے نے پران گنوائے اسک[21] لائے کے سیری[22] سے
کھسرو[23] کی تو موچھہ نہ کھوسی[24] آپو اپنا سر چِہرا
لیلیٰ پاچھے ہوؤ[25] باوڑا[26] مجنوں[27] کی کے مت ہینی
سگری[28] پاگ ٹوک کر لاڑی لتّا سگ[29] لیرم لیرا

---

۱ چھینا ۲ لڑکی ۳ لوٹ لیا ۴ کروٹیں
۵ سیج پر ۶ شام سے ۷ صبح نکلنے تک ۸ دیکھوں
۹ قریب ۱۰ پلکوں سے ۱۱ اشارے ۱۲ آنکھ سے
۱۳ کیا گیا تیرا ۱۴ اے ظالم! یعنی مارا تو میں گیا ۱۵ عشق
۱۶ چکنا گھڑا ۱۷ فضیحت ۱۸ عشق
۱۹ بوکر کھیت میں ارنڈ کے پودے کس نے کھایا ہے ککڑی کھیرا ۲۰ بڑھئی کے بیٹے فرہاد نے
۲۱ لگا کے ۲۲ شیریں سے ۲۳ خسرو ۲۴ کھسوٹی
۲۵ ہوا ۲۶ باولا ۲۷ مجنوں کی کیسی بودی عقل تھی
۲۸ ساری پگڑی ٹکڑے کر ڈالی ۲۹ لتّے سارے لیر لیر ہو گئے

ہیر نمانی[1] ہوئی دوانی، رانجھے لیکے دکھہ اوٹے[2]
پیت[3] کروں پر تیت جائے ہے پیت نکرے دلمیرا!

◆◆◆

لارے[4] کلاڑکے! پھول سراب[5] سیسہ[6] دکے جیسے گڑاب[7]
پاؤں پاگ[8]، کاکھ[9] میں جوتی ایسی دارو[10] پیو زناب[11]

◆◆◆

گھوڑے چڑھ کے چلے نسے میں پاؤں پاسر[12]، گلے رکاب
آئے صاحب جٹل میں ہاتھ ہتھوے[13] پاؤں جراب
اونچا کوٹ لمبی پتلوں یوہی مہارے بڑے نباب[14]
داروپی کے ٹھلن لاگے مونہہ مان چڑٹ ہاتھ کتاب
تون دلمیرا جیب[15] کا پھوڑا یا جیبا[16] نو دانتوں[17] داب
مونہہ ماں بان[18] چلائے جیب سگڑی[19] آپھت[20] ڈھاوے جیب
یا جیبا کے سگڑے کھوٹ بھیوں[21] راڑ[22] کراوے جیب
کدھیں[23] تو بولے امرت بول کدھیں بکھ کھنڈاوے[24] جیب
پٹ[25] سوں بول[26] اپاؤ کے بول ٹرت پھرت لک جاوے جیب

---

۱ بھولی ۲ اُٹھانے ۳ پیت کرنیسے ۴ اے کلاں والے
۵ عمدہ شراب ۶ بوتل ۷ گلاب ۸ پاؤں پر پگڑی
۹ بغل میں جوتی ۱۰ شراب ۱۱ جناب
۱۲ (پاؤں پر سر اور گلے میں کاب) ۱۳ دستانے ۱۴ نواب
۱۵ زبان کا پھوڑا ۱۶ اس زبان کو ۱۷ دانتوں تلے داب ۱۸ تیر
۱۹ ساری ۲۰ آفت ۲۱ بھائیوں میں ۲۲ تکرار
۲۳ کبھی ۲۴ نہر ۲۵ جلدی ہے ۲۶ فساد کے بول بول کر

جیب[1] کہا؟ تنک سی جونک　　لہو ماس کھاجاوے جیب
دھرتی[2] پالکھوں کرے بگاڑ　　انبر آگ لگاوے جیب
یوہی گیرے[3] نرکھوں کُنڈ　　یوہی سبرگ[4] کماوے جیب
تون دلگیرا جیب کے بس میں　　تیری کوئی کٹاوے جیب

افسوس ہے کہ اس دیوان میں جتنے اصناف کا کلام ہے ان سب کا نمونہ ہم نہیں دکھا سکتے کیوں کہ بہت سے اشعار ہزل بلکہ فحش کی حد تک پہنچ گئے ہیں۔لیکن جہاں تک خیال کیا جاتا ہے اس میں زیادہ تر ہماری سوسائٹی کا قصور ہے۔جس کے خوش کرنے اور جس سے داد لینے کے لیے شاعر کو اس کے سوا کچھ چارہ نہ تھا کہ کہیں کہیں تہذیب کی حد سے متجاوز ہوکر سامعین کے دل کو لُبھائے جائیں۔یہی وہ مجبوری ہے جس نے ہماری شاعری کو گندہ اور ناپاک کردیا ہے۔لیکن اگر اس دیوان میں سے غیر مہذب اشعار نکال دئے جائیں تو بھی ایک معتد بہ مجموعہ مہذب اور شائستہ کلام کا باقی رہتا ہے جو صاحبِ دیوان کی ایک عمدہ یادگار ہوسکتا ہے۔

❑❑❑

---

[1] جیب کیا ہے ذرا سی جونک　[2] زمین پر
[3] ڈالے نرکھ کے کھنڈ میں　[4] بہشت